ساتواں حصہ

دیوی



PDFBOOKSFREE.PK

طاہر جاوید مغل

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

بار اول ——— ۲۰۰۹ء
مطبع ——— یو ایند ڈی پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ——— عاطف رحمٰن۔ لاہور
قیمت ——— ۳۰۰ روپے



ISBN 978-969-517-282-7

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

www.pdfbooksfree.pk

رستم، ناصر، اجمل اور واس کے درمیان علیحدگی میں بات چیت ہوئی۔ رحیم اللہ اور ڈولا دیرہ برق اور اس کے دونوں ساتھیوں کی نگرانی پر مامور تھے۔ رستم نے ناصر کی طرف گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں شریف کے علاوہ ہمیں زری کو بھی وہاں سے ہر صورت نکالنا ہوگا۔''

ناصر نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''تمہارا کیا ارادہ ہے واس؟''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' واس..... پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ اس برف زار اور ٹھنڈے موسم میں بھی اس کو پسینے آ رہے تھے۔ یہ شاید اچانک پیش آنے والے اس واقعے کا اثر تھا۔

ناصر نے احترام سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سنہری موقع زندگی میں پھر نہیں ملے گا۔ اسے ضائع نہیں کرنا واس۔ اس برفیلے قبرستان سے نکل کر اپنے گلی کوچوں اور اپنے پیاروں میں واپس پہنچ جاؤ۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر الجھے ہوئے انداز میں بولا۔ ''لیکن خانم کو تو اب یہی گلی کوچے اپنا گھر لگنے لگے ہیں۔ شش..... شاید وہ یہاں سے جانے کو تیار نہ ہو۔''

''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اسے اپنا گھر بار، اپنے بچھڑے ہوئے لوگ یاد نہ آتے ہوں۔ وہ صرف خطروں سے ڈرتی ہوگی۔ اسی طرح ڈر ڈر کر اس نے اس پنجرے کو ہی اپنا گھر سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ پنجرہ ہے واس..... اس کو توڑ دو۔''

انہوں نے واس کو سمجھایا بجھایا۔ انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ واس کے اندر یہاں سے جانے کی تڑپ نہیں ہے..... اگر وہ جانے کے لیے نیم رضامند نظر آ رہا تھا تو اس کی وجہ

صرف یہ تھی کہ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں آٹھ لاشیں تڑپتی دیکھ چکا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان لاشوں کی وجہ سے خود اس پر کتنا بوجھ پڑے گا۔ تین چار منٹ کے مکالمے کے بعد واس نے اس بات پر رضامندی ظاہر کر دی کہ جو لوگ یہاں سے شریف اور زری کو لینے جائیں، وہ اس کی بیوی خانم کو بھی لے آئیں۔ جب یہ طے ہو گیا کہ بستی میں سے تین افراد کو یہاں بلوایا جائے گا..... اور یہ بھی طے ہو گیا کہ کس طرح بلوایا جائے تو برق جان کو بلا لیا گیا اور اس سے بات چیت شروع ہوئی۔

رستم اب مترجم واس کی مدد کے بغیر بھی برق کو اپنی بات سمجھا لیتا تھا۔ اس نے براہِ راست برق جان سے بات شروع کی۔ ''برق جان! تم نے ابھی تک میرا صرف ایک روپ دیکھا ہے۔ میں زندگی دینا جانتا ہوں تو زندگی لینا بھی جانتا ہوں۔ بے شک تمہارے دل میں میرے لیے کہیں نہ کہیں ہمدردی موجود تھی۔ میرے دل میں بھی تمہارے لیے کہیں نہ کہیں ہمدردی موجود ہے مگر یہاں اب جو بھی فیصلہ ہونا ہے وہ ایک ہاتھ دو، دوسرے ہاتھ لو کے طریقے سے ہونا ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مجھے تمہاری اور تمہارے دونوں ساتھیوں کی ان کے بدلے اپنے تین ساتھیوں کی واپسی چاہیے۔'' رستم کا لہجہ اٹل تھا۔

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' برق جان بولا۔

''تو پھر تم آج کی شام نہیں دیکھ سکتے۔'' رستم نے رائفل کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ ''اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں آسان موت نہیں مرنے دوں گا۔''

رستم کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ برق جان جیسا شخص بھی کانپ کر رہ گیا۔ یہ لہجہ نہیں تھا، یہ آگ تھی جو پورے ایک برس تک رستم کے سینے میں دہکتی تھی۔ یہ اس درندے کی گرج تھی جس نے ایک مدت تک پنجرے کی سلاخوں میں راستہ بنانے کی دیوانہ وار کوشش کی تھی۔

برق جان چونک کر رستم کی طرف دیکھنے لگا..... پھر سنبھل کر بولا۔ ''کیا ہم تینوں کے مر جانے سے تمہارے ساتھی تمہیں واپس مل جائیں گے؟''

''نہیں ملیں گے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی انتہائی قدم نہ اٹھانا پڑے میں سچ مچ نہیں چاہتا کہ میں آخر تک کوشش کروں گا کہ تمہاری جان نہ لوں۔''

''اس کی وجہ؟''

''وجہ میں نے تمہیں ابھی بتائی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے زندہ واپس اپنے بیوی بچوں میں پہنچو۔ اپنے لوگوں میں پہنچو..... اور وہ سب کچھ کرو جو تم کرنا چاہتے ہو۔ تم یہاں تبدیلیاں لانے کا سوچ رہے ہو اور تمہاری سوچ پوری ہونی چاہیے۔ کیونکہ اس سوچ کے پورا ہونے سے ہی تمہاری بستی اور تمہارے لوگوں کا بھلا ہے۔''

واس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے رستم کی تائید کی۔ ''ہاں ملک! رستم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ اس بستی کے لیے امید کی کرن ہیں۔ آپ وہاں تبدیلی لا سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو ناسمجھی کے اندھیرے سے نکال سکتے ہیں۔ ہماری ساری ہمدردیاں آپ کے ساتھ تھیں اور اب بھی ہیں۔''

''لیکن جب میرے لوگوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ نہیں رہیں گی تو میں ایک دم بے کار ہو جاؤں گا۔ تم لوگوں کو چھوڑ کر میں ایک ایسا جرم کروں گا جس کی معافی مجھے میرے لوگ مشکل سے ہی دیں گے۔''

''تم ہمیں چھوڑو گے مگر تمہاری بہادری میں کسی کو شبہ نہیں ہے۔ تم نے چند دن پہلے شوتم جیسے شخص کو چاروں شانے چت کیا ہے۔''

''کچھ بھی ہے۔ میں تمہاری بات مانوں گا تو ایک دم صفر ہو جاؤں گا۔ اپنا جینا حرام کرنے سے بہتر ہے کہ میں تمہارے ہاتھوں موت قبول کر لوں۔''

''موت اتنی آسان نہیں ہے برق جان۔ تم دوسروں کو تو موت اور زندگی کے درمیان لٹکاتے رہے ہو مگر تم نے کبھی خود لٹک کر نہیں دیکھا۔''

ابھی رستم کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ایک زوردار چنگھاڑ سنائی دی۔ رستم نے پلٹ کر دیکھا۔ منظر بالکل غیر متوقع اور ہلا دینے والا تھا۔ برق جان کے دونوں ساتھیوں میں سے ایک کسی جنگلی جانور کی طرح رستم پر جھپٹ رہا تھا۔ وہ ایک گرانڈیل شخص تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ رحیم اللہ کو اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اپنے پستول سے اس پر گولی چلا سکتا اور جب کافی تاخیر سے اس نے گولی چلائی تو وہ نشانے پر نہیں لگی۔ گرانڈیل محافظ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح رستم سے ٹکرایا اور اسے لیتا ہوا دور جا گرا۔ رستم اپنی رائفل سمیت برق جان کے بالکل پاس گرا تھا۔ برق جان نے بڑی پھرتی سے رستم کی رائفل پر ہاتھ ڈالا۔ اگر رستم سے تھوڑی سے کوتاہی ہوتی تو وہ رائفل اس سے چھین چکا ہوتا۔ رستم نے برق جان کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر اپنی طرف کھینچیں اور وہ پشت کے بل نیچے گر گیا۔ رستم سے ٹکرانے والے محافظ کے ساتھ ناصر گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ محافظ رو رہا تھا اور سینے کی پوری طاقت

www.pdfbooksfree.pk

کے ساتھ واویلا کر رہا تھا۔

''تم نے میرا بھائی مار دیا۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں بدلہ لوں گا۔''

اس کے ہاتھ کھلے ہوتے تو بھی شاید وہ ناصر کو زیر نہ کر سکتا۔ ناصر نے چند طوفانی مکے اس کے چہرے پر رسید کیے اور اس کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا۔ وہ بے بس ہونے کے باوجود جدوجہد کر رہا تھا اور اپنی زبان میں گالیاں بھی بک رہا تھا۔ یقیناً تھوڑی دیر پہلے گرنے والی آٹھ لاشوں میں اس محافظ کے بھائی کی لاش بھی شامل تھی۔ بھائی کی موت پر اس کا غیظ و غضب اپنی جگہ..... لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بالکل جس طرح کچھ دیر پہلے تک رستم اور ناصر بے بس تھے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

دوسری طرف رستم نے برق جان کے ہاتھ سے اپنی رائفل چھڑا لی اور پھر اس رائفل کو دستے کی طرف سے استعمال کرتے ہوئے برق جان کے سینے اور کندھوں پر چند ضربیں لگائیں۔ برق جان مرعوب ہونے کے بجائے دیوانہ وار جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھا۔ برق کے اس انداز نے رستم کو مزید مشتعل کر دیا۔ اس نے رائفل کے..... کندے سے برق جان کو بے دریغ پیٹنا شروع کر دیا۔ برق جان کے اکلوتے ہاتھ کی کلائی ٹوٹ گئی اور چہرہ لہولہان ہو گیا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی کلائی دیکھ کر بھی رستم نے اپنا ہاتھ ہلکا نہیں کیا۔ واس تڑپ کر آگے آیا اور برق جان کے اوپر گر گیا۔ ''بس کرو رستم۔ خدا کے لیے بس کرو۔'' واس چلایا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ۔'' رستم گرجا۔ ''میں دیکھتا ہوں، یہ کہاں تک اکڑ سکتا ہے۔''

رستم کی دو تین ضربیں واس کو اپنے جسم پر بھی جھیلنا پڑیں..... بالآخر رستم پیچھے ہٹ گیا۔ رائفل ابھی تک بڑی مضبوطی سے اس کے ہاتھ میں تھمی ہوئی تھی۔

واس نے برق جان کو اپنی آڑ میں رکھا اور رستم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''رستم! تم پیچھے چلے جاؤ۔ میں خود بات کرتا ہوں ملک سے۔''

رستم اپنے ملیٹش کو سنبھالتا ہوا دور ہٹ گیا۔ واس نے لہولہان برق جان کو اٹھایا۔ اپنا مفلر اُتار کر اسے پٹی کی طرح برق جان کی مضروب کلائی پر باندھا۔ ایک کپڑے سے برق کا لہولہو چہرہ صاف کیا اور پھر اسے پانی پلایا اور اس سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

''وہ دوسرا حراری کہاں ہے؟'' رستم نے ناصر سے پوچھا۔ اس کا اشارہ دوسرے حملہ آور کی طرف تھا۔

''اجمل نے اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے ہیں۔ وہ سامنے پتھر کے پیچھے لٹا دیا ہے ان دونوں کو۔'' ناصر نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

رحیم اللہ اور فرقان یہ خون خرابہ اور مار پیٹ دیکھ کر سخت ہراساں تھے۔ فرقان بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا تھا۔ واس اور برق جان میں بات چیت طول پکڑتی جا رہی تھی۔ رستم تک آواز نہیں پہنچ رہی تھی۔ تاہم وہ دور ہی سے دیکھ کر اندازہ لگا سکتا تھا کہ گفتگو کس رخ پر جا رہی ہے۔ برق جان اگر ایک بار اثبات میں سر ہلا تا تھا تو تین بار نفی میں ہلا دیتا تھا۔ واس کا لہجہ التجائیہ تھا۔ اس نے ایک دو بار برق جان کے گھٹنوں کو بھی ہاتھ لگائے۔

گزرنے والا ہر لمحہ ان کے لیے قیمتی تھا۔ آخر رستم لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واس اور برق جان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے برق جان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''سنو برق جان! ہم یہاں کسی چوہے دان میں پھنس کر بے بسی کی موت مرنا نہیں چاہتے۔ تم نے جو بھی فیصلہ کرنا ہے، جلدی کرو۔ ہمارے ساتھیوں کو یہاں بلا رہے ہو یا نہیں؟''

واس نے مداخلت کی۔ ''رستم! پلیز تھوڑا سا وقت اور دو..... میں نے.....''

''دیکھو واس!'' رستم نے واس کی بات کاٹی۔ ''جو اصل بات ہے وہ میں بھی جانتا ہوں۔ برق جان کے دل میں اندیشہ ہے کہ اگر ہم یہاں سے نکل گئے تو مارگ بستی کا کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔ لوگ یہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے، یہاں کے حالات جاننا چاہیں گے۔ اس پاؤندہ قبیلے کو اور یہاں کے رہن سہن کو تماشا بنا دیا جائے گا۔ یہی خدشے ہیں ناں اس کے؟''

واس خاموش رہا..... برق جان نے تھوڑے توقف کے ساتھ اپنے ہونٹوں کا خون پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ خدشے غلط نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے ان محافظ پہاڑوں کے اندر خود کو صدیوں سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ ہماری یہ دنیا اچھی ہے یا بری لیکن الگ تھلگ ہے۔ اس کی اپنی خوبصورتیاں ہیں اور اپنے مسئلے مسائل ہیں۔ اگر یہ بستی اب تک اپنی اصل حالت میں آباد ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں باہر سے آنے والا کوئی شخص کبھی واپس نہیں گیا۔ وہ ہماری مرضی سے یا اپنی مرضی سے پھر یہیں کا ہو کر رہا ہے۔ شاید تم لوگوں کے نزدیک یہ ہماری بے رحمی ہو لیکن یہ ہماری مجبوری رہی ہے..... اور اب بھی ہے۔''

رستم گہری سانس لیتے ہوئے زخمی برق جان کے قریب برف پر بیٹھ گیا۔ ''اگر ہم تمہاری اس مجبوری کا حل نکال دیں تو پھر؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مرد کی زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے برق جان..... اگر ہم تم سے وعدہ کریں کہ ہم یہاں سے جا کر کبھی کسی کو یہاں کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے تو پھر؟''

www.pdfbooksfree.pk

''یہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' برق جان نے کہا۔

''یہ ہو سکتا ہے برق جان..... اور تمہیں پتا ہے یہ کیوں ہو سکتا ہے؟'' رستم نے برق کا شانہ تھام کر عجیب لہجے میں کہا۔

وہ سوالیہ نظروں سے رستم کا چہرہ تکتا رہا۔

رستم نے کہا۔ ''اس لیے کہ اب اس بستی کی باگ ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ تم اس بستی اور یہاں کے لوگوں کی کایا پلٹو گے اور جب یہاں کی کایا پلٹے گی اور یہاں کے گندے رواج ایک ایک کر کے ختم ہوں گے تو پھر یہ بستی عجوبہ نہیں رہے گی۔ نہ تمہارے لیے..... اور نہ ہی باہر سے آنے والے کسی شخص کے لیے۔ ہم اس بستی کے راز کو اپنے سینوں میں دفن کر دیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندر یہ تمنا بھی رکھیں گے کہ کسی دن تم لوگ خود ہی اپنے گرد اٹھائی ہوئی دیواروں کو گرا دو گے۔ دس سال نہیں تو بیس سال بعد بیس سال نہیں تو پچاس سال بعد.....''

برق جان دھیان سے رستم کی باتیں سن رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جو بات دل سے نکلتی ہے، وہ دل پر اثر کرتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ رستم کی باتیں بھی کچھ نہ کچھ برق جان پر اثر کر رہی ہیں۔

ان چاروں کے درمیان طویل مکالمہ ہوا۔ رستم اور ناصر نے دوٹوک لہجے میں برق جان کو بتایا کہ اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں اور ان میں سے اسے ایک منتخب کرنا ہوگا۔ پہلا راستہ یہ ہے کہ برق جان، رستم کے دیئے ہوئے قول پر بھروسہ کرے اور اپنا اختیار استعمال کر کے ان تینوں افراد کو بستی سے یہاں پہنچا دے جن کا انہوں نے مطالبہ کیا ہے۔ ایسی صورت میں برق جان اور اس کے دونوں ساتھیوں کو چھوڑ دیا جائے گا اور وہ واپس چلے جائیں گے

دوسری صورت میں برق جان اور اس کے دونوں ساتھی بطور یرغمال رستم وغیرہ کے ساتھ اسکردو جائیں گے۔ ان سے مکمل پوچھ گچھ ہوگی۔ پھر مارگہ بستی میں محبوس افراد کو چھڑانے کے لیے باقاعدہ کارروائی کی جائے گی۔ عین ممکن ہے کہ یہ کارروائی وسیع پیمانے پر ہو اور اس پورے پاؤندہ قبیلے کو حکومتی دائرہ اختیار میں لایا جائے۔ ایسی صورت میں زبردست اکھاڑ پچھاڑ کا ہونا یقینی بات ہے۔

رستم نے برق جان کو دونوں راستے پوری تفصیل اور نیک نیتی کے ساتھ سمجھا دیئے اور اسے سوچنے کے لیے دس پندرہ منٹ کا مزید وقت بھی دیا۔ اب واس مکمل طور پر رستم کی

حمایت میں تھا..... اور اپنے طور پر برق جان کو سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد اس ساری گفت و شنید کا نتیجہ مثبت شکل میں نکل آیا۔ برق جان کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ سب کچھ لٹا دینے سے بہتر ہے کہ وہ رستم کے دیئے ہوئے قول پر اعتبار کر لے اور مطلوبہ افراد کو رہا کر دے۔ تاہم اس موقع پر برق جان نے ایک نئی بات کی۔ وہ رستم سے بولا۔

''مجھے لگتا ہے واس یہاں سے واپس جانا نہیں چاہتا۔ وہ اور اس کی بیوی یہاں خوش ہیں..... تم ان پر ناممنا سب دباؤ ڈال رہے ہو۔''

''ہم کسی سے کوئی زبردستی کرنا نہیں چاہتے۔''

''میں بھی کسی پر زبردستی نہیں کر رہا ہوں۔'' برق جان نے کہا۔ ''تم واس کو یہاں بلا لو اور اسے اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا موقع دو۔''

رستم کو خود بھی محسوس ہو رہا تھا کہ واس شدید تذبذب کا شکار ہے۔ وہ اس کو جتنا سمجھا سکتا تھا، سمجھا چکا تھا، اب آخری فیصلہ تو اس نے ہی کرنا تھا۔ وقت زیادہ نہیں تھا۔ رستم نے واس کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ رستم نے وہ بات واس کے سامنے دہرائی جو ابھی برق جان نے اس سے کہی تھی۔

ادھیڑ عمر واس نے رستم سے نگاہ نہیں ملائی۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ کئی سیکنڈ اسی طرح گزر گئے۔ آخر رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے واس! یہ تمہاری زندگی ہے، اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا تمہیں پورا حق ہے۔''

واس نے رستم کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ بولا۔ ''رستم! مجھے یہ موقع آج سے بارہ تیرہ سال پہلے ملا ہوتا تو میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا..... لیکن اب..... پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے۔ آہستہ آہستہ دل کو قرار آ گیا ہے۔ اب ہم میاں بیوی کو یہی بستی اپنا گھر لگنے لگی ہے۔ یہاں کا دکھ سکھ اپنا دکھ سکھ محسوس ہونے لگا ہے۔ وہ پیچھے بھی اب پیچھے ہمارا کون ہے۔ ایک بھائی ہی تھا جو اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب جو تھوڑی سی زندگی باقی رہ گئی ہے اس کے لیے پھر سے مہاجر بننا بہت بڑا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔''

رستم خاموش رہا۔ اس کے دل پر بوجھ تھا۔

''مجھے معاف کرنا رستم! میں تمہارے اور ناصر کے جذبات سمجھتا ہوں لیکن اگر تم لوگ میں یہیں رہنے دو تو یہ ہمارے لیے اچھا ہوگا۔''

رستم اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس نے کئی بار سنا تھا کہ پنچھی اپنے پنجرے سے، اپنے

www.pdfbooksfree.pk

گھونسلے ہی کی طرح مانوس ہو جاتے ہیں۔ آج وہ اس کی زندہ مثال دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں سب کچھ طے پا گیا۔ برق جان کے حکم پر واس اور ریان بخت گھوڑوں پر سوار ہو کر واپس مارگہ بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ واس کے پاس برق جان کا خصوصی پروانہ بھی تھا۔ پروانہ برق جان کی مہر والی انگوٹھی کی شکل میں تھا۔ برق جان کی ہدایت کے مطابق واس نے شریف اور زری کو یہاں لے کر آنا تھا۔

اس کام میں واس اور ریان بخت کو قریباً 10 گھنٹے لگ گئے۔ وہ رات کے بارہ بجے کے لگ بھگ واپس آبی گزرگاہ پہنچ سکے۔ کچھ تاخیر اس وجہ سے بھی ہوئی کہ شریف ابھی ٹھیک سے چل پھر نہیں سکتا تھا۔ زری سرتاپا ایک کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رستم کو حیرانی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ اب وہ رستم کی طرف کم ہی توجہ دیتی تھی۔ وہ سیدھی ناصر کی طرف گئی اور اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کھڑی ہو گئی۔ شریف کو بھی احتیاط کے ساتھ گھوڑے سے اُتار لیا گیا۔ شریف اور زری کے ساتھ واس اور ریان بھی واپس آئے تھے۔ رستم نے محتاط رویہ اپنایا تھا..... جونہی یہ لوگ واپس پہنچے، رستم نے اجمل خان کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر واس اور ریان کی جامہ تلاشی لی۔

رستم اور ناصر جانتے تھے کہ اب ہر ہر لمحہ قیمتی ہے۔ انہیں جلد از جلد اس خطرناک علاقے سے دور نکل جانا چاہیے۔ برق جان، ریان بخت اور اُن کے تیسرے ساتھی کو زنجیروں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کی مدد نہ کر سکیں اور نہ ہی وہاں سے چل کر کہیں جا سکیں۔

رستم نے برق جان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے برق جان..... کہ ہم اس طرح جدا ہو رہے ہیں اور تمہیں باندھنا پڑ رہا ہے لیکن تم جانتے ہو یہ مجبوری ہے، جیسے تم ہمیں باندھنے پر مجبور تھے۔“

”نہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ برق جان نے کہا۔

”واس کے پاس ان زنجیروں کی چابیاں ہیں۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ جب ہم سمجھیں گے کہ محفوظ دوری پر پہنچ گئے ہیں تو واس کو واپس بھیج دیں گے۔ یہ آ کر تمہیں کھول دے گا۔ واس کے ذریعے ہمیں بہتر راستہ ڈھونڈنے میں بھی آسانی رہے گی۔“ رستم نے کہا۔

”واس کب تک واپس آئے گا؟“ برق نے پوچھا۔

”ہم تمہیں اس کھلی جگہ پر زیادہ دیر سردی کے حوالے نہیں رکھیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کل دوپہر سے پہلے ہی یہ واپس پہنچ جائے۔“

”اگر کسی وجہ سے واس یہاں نہ پہنچ سکا یا راستہ بھول گیا تو ہمارے لیے بہت مشکل ہو

جائے گی۔“ برق جان نے کہا۔

برق جان کا خدشہ غلط نہیں تھا۔ تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ واس کے علاوہ ریان بخت بھی رستم وغیرہ کے ساتھ جائے گا اور محفوظ فاصلے پر پہنچنے کے بعد ان دونوں کو آبی گزرگاہ کی طرف واپس روانہ کر دیا جائے گا۔

اجمل خان کسی جاں نثار باڈی گارڈ کی طرح رستم کے اردگرد تھا اور اس نے ساری صورت حال پر گہری نظر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے ڈولے کو ایک اونچے پتھر پر چڑھا دیا تھا۔ وہ وہیں پر ایک بھاری کمبل کی بکل مارے بیٹھا تھا۔ رستم نے اجمل سے پوچھا۔ ”ڈولے کو یہ سزا کیوں دے رکھی ہے؟“

اجمل نے کہا۔ ”یہ سزا نہیں ہے جی! یہ تو ڈولے کا من پسند ڈیوٹی ہے۔ آپ سچ پوچھتا ہے تو اس بندے کا دماغ ریڈار کی طرح کام کرتا ہے۔ پتا نہیں۔ کہاں کہاں سے بوئیں اور آوازیں لے لیتا ہے یہ شخص۔ خو، یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ یہ شخص یہاں بیٹھ کر دور دور تک کا خبر رکھ سکتا ہے۔“

اب جانے کا وقت تھا اس لیے ڈولے کو نیچے بلا لیا گیا۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو برق جان نے عجیب جذباتی لہجے میں رستم کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”اب یہاں کے حالات بدلیں گے اور مجھے یقین ہے کہ اب وہ سب کچھ بھی نہیں ہو گا جس کے نتیجے میں تمہیں یہاں آنا پڑا تھا۔ آبوک کے نام پر وہ مار دھاڑ، وہ خون خرابا..... لوگوں کو ذبح کرنا اور مقدس کپڑے پر ان کے ہاتھوں کی چھاپ لینا..... اور اس جیسے دوسرے سارے رواج اب آہستہ آہستہ بدلتے جائیں گے..... آج سے ایک دن پہلے یہ ممکن نہیں تھا مگر اب ممکن ہے۔ اب یہ مقدس مخنتی میری مدد کرے گی اور.....“ وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے سلسلہ کلام جوڑا اور کہا۔ ”جب جب یہ مخنتی میری مدد کرے گی، تم مجھے یاد آؤ گے رستم۔ شاید تمہیں احساس نہیں کہ تم نے کتنا بڑا کام کیا ہے..... کاش میرے بس میں ہوتا اور میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے آزاد کر سکتا۔ پھر تمہیں اس طرح نہ جانا پڑتا جس طرح اب جا رہے ہو اور مجھے بھی اس طرح زنجیروں میں جکڑے ہوئے تمہیں الوداع نہ کہنا پڑتا۔“

”یہ ہماری اپنی اپنی مجبوریاں ہیں۔“ رستم نے کہا۔

برق جان نے واس کو اشارہ کیا۔ واس نے کہا۔ ”رستم! یقیناً تم زری میں دلچسپی رکھتے ہو۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ زری تمہارے ساتھ خوش رہے گی۔ اگر تم زری سے شادی کرنا چاہو تو میری اور ملک برق جان کی طرف سے تمہیں پوری آزادی ہے۔“

www.pdfbooksfree.pk

''زری کو کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' رستم نے پورے وثوق سے کہا۔

برق جان کے مشتعل ساتھی کی طرح اب برق جان کی ٹانگیں بھی زنجیر میں جکڑی ہوئی تھیں۔ برق کے اکلوتے ہاتھ کو اس کے ساتھی کے دونوں ہاتھوں کے ساتھ ملا کر باندھا گیا تھا۔ اسی حالت میں ان سب نے برق جان کو الوداع کہا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر کے ٹو کی مخالف سمت میں چل دیئے۔ واس ان کی رہنمائی کر رہا تھا پھر بھی اجمل خان نے اس پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اجمل خان کا گھوڑا مسلسل ریان کے گھوڑے کے عقب میں تھا۔ لوڑ رائفل اجمل کے ہاتھ میں تھی۔ واس قدرے الجھن میں نظر آ رہا تھا۔ آج اس نے کئی دن کے بعد اپنی بھتیجی کو دیکھا تھا..... اسے بھتیجی کی کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ آج وہ رستم کے بجائے ناصر کا سایہ بنی ہوئی تھی..... اس کا گھوڑا مسلسل ناصر کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ بس اسی سے باتیں کر رہی تھی، اسی کے ساتھ ہنس بول رہی تھی۔

''میں اس کے بارے میں بہت حیران ہوں۔'' واس نے رستم کے پہلو میں چلتے چلتے سرگوشی کی۔

''کیا یہ پہلا موقع ہے کہ تم اس کی وجہ سے حیران ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ جب سے پیدا ہوئی ہے، لوگوں کو حیران کرنے والے کام کر رہی ہے۔''

''یہ تمہارے اردگرد رہتی تھی، اب یہ ناصر کے پاس نظر آ رہی ہے۔''

''وقت کے ساتھ بندہ کچھ بدل بھی تو جاتا ہے۔'' رستم زیر لب مسکرایا۔ ''کیا تم اور تمہاری بیوی نہیں بدلے ہو؟''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

رستم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''واس! سچ بتاؤ..... کیا تمہیں وہ وقت یاد نہیں آتا جو تم نے پاکستان کے بھرے پُرے شہروں میں گزارا ہے۔ ایبٹ آباد اور پنڈی کی سڑکیں، لاہور کی رونقیں، کراچی کی روشنیاں..... اور وہ سارے لوگ جن کے ساتھ تمہارا اٹھنا بیٹھنا تھا۔''

واس جواب میں خاموش رہا۔ رستم نے ایک وقفے کے بعد بات جاری رکھی۔ ''تمہیں ایک سنہری موقع ملا تھا..... اپنی دنیا میں واپس جانے کا..... لیکن تم نہیں گئے۔ کتنی بڑی تبدیلی آئی ہے تمہارے اندر..... ایسے ہی دوسرے لوگوں میں بھی تبدیلیاں آ سکتی ہیں..... زری میں بھی کچھ ہی تبدیلی آئی ہے۔''

''یہ کیسی تبدیلی ہے؟ وہ تم سے..... پیار کرتی تھی۔ میں جانتا ہوں، وہ کرتی تھی۔ پھر وہ اس رات تمہارے ساتھ..... میرا مطلب ہے تم اس کے ساتھ.....'' واس بات مکمل نہ کر سکا تاہم مفہوم رستم کی سمجھ میں آ گیا۔

رستم نے کہا۔ ''واس! آج میں تمہاری غلط فہمی بھی دور کر دیتا ہوں۔ اس رات بھی زری میرے ساتھ نہیں ناصر کے ساتھ ہی تھی.....''

واس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ ''مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' وہ ہکلایا۔

''کچھ باتیں سمجھ میں نہ آئیں تو ان پر زیادہ دماغ نہیں کھپانا چاہیے۔'' رستم نے واس کے پیچھے پیچھے گھوڑے کو ایک تنگ راستے پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

دونوں گھوڑے اب آگے پیچھے ہو گئے تھے اس لیے ان کی گفتگو کا سلسلہ تعطل کا شکار ہو گیا۔ واس اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس کے پاس ایک بڑی ٹارچ موجود تھی جسے وہ گاہے روشن کر کے راستے کی ''صحت'' کا جائزہ لے لیتا تھا۔ جہاں کہیں اسے ذرا سا بھی اندیشہ ہوتا تھا، گھوڑے سے نیچے اترتا تھا اور اس امر کی تسلی کرتا تھا کہ ان کے نیچے ٹوٹ جانے والی کمزور برف موجود نہ ہو۔ اس سلسلے میں تجربہ کار گائیڈ رحیم اللہ کی رہنمائی بھی انہیں حاصل تھی اور سب سے بڑھ کر عجیب صلاحیتوں والا کوتاہ قد ڈولا! وہ کسی بلی کی طرح اندھیرے میں بھی بڑی آسانی سے دیکھ لیتا تھا..... وہ اجمل خان کے پیچھے ایک ہی گھوڑے پر تھا اور عقب سے کسی بچے کی طرح اجمل خان سے چمٹا ہوا تھا۔ اس نے دو تین جگہوں پر راستے کے بارے میں مشورہ دیا، اجمل خان کا سینہ فخر سے چوڑا ہوا۔ ہر بار اس نے رستم سے ایک ہی سوال پوچھا۔ ''رستم بھائی! ام نے ڈولے کو ساتھ لا کر غلط کام تو نہیں کیا؟''

جب اس نے تیسری بار یہی سوال پوچھا تو ناصر نے کہا۔ ''لیکن اب تم بار بار یہ سوال پوچھ کر غلط کام ضرور کر رہے ہو۔''

اجمل نے ترت کہا۔ ''ناصر بھائی! غلط اور صحیح کا پیسلہ (فیصلہ) تم نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔ ابھی ام کو تمہارا چال چلن بالکل مشکوک نظر آ رہا ہے۔ یہ پیسلہ کوئی معزز آدمی کرے تو بہتر ہو گا۔''

''مجھے تو یہاں تمہارے سوا سارے ہی معزز نظر آ رہے ہیں۔'' ناصر نے جوابی فقرہ کسا۔

''دیکھو ناصر بھائی! تم عورت ذات کے ساتھ سپر (سفر) کر رہا ہے۔ اس نیک بی بی کی

www.pdfbooksfree.pk

وجہ سے ام تم کو کوئی ایسا بات کہنا نہیں چاہتا جس سے تمہارا بنا بنایا کام بگڑ جائے۔ اچھے اچھوں کو بھی اچھا لڑکی آج کل بڑی مشکل سے ملتا ہے..... تمہارا تو کوئی چانس ہی نہیں ہے۔''

''یہ.....خان صیب.....کیا کہتا؟'' زری نے ناصر سے پوچھا۔

''یہ جھوٹ بولنے کی پریکٹس کرتا۔'' ناصر نے کہا۔ ''یہ پاکستان کی طرف سے جھوٹوں کے عالمی مقابلے میں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔''

''میں نہیں جانتا..... یہ پاکستان کیا ہوتا؟'' زری معصومیت سے بولی۔

اجمل نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں.....آج کل بہت سا لوگ اس سوال کا جواب سوچ رہا ہے۔''

رستم نے کن انکھیوں سے رحیم اللہ کی طرف دیکھا۔ وہ حیران نظر آ رہا تھا۔ اس کی توجہ اجمل خان کی طرف تھی۔ غالباً اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی نسبتاً ہنستا بولتا شخص ہے جو صرف 20 گھنٹے پہلے بڑی بے دردی سے آٹھ افراد کو اپنی فائرنگ سے ہلاک کر چکا تھا۔ پورے آٹھ عدد جیتے جاگتے افراد جن کی لاشیں اس وقت کوہی ندی کے پل کے سامنے برف کی چوڑی گہری کھائی میں پڑی تھیں۔ اجمل کے ساتھ ساتھ یقیناً رحیم اللہ کو رستم، ناصر اور ڈولے وغیرہ پر بھی حیرت ہو رہی تھی جن پر اس ہولناک واقعے کا کوئی اثر اب نظر نہیں آ رہا تھا۔

راستہ کشادہ ہوا تو واس اور رستم کے گھوڑے پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ واس ابھی تک زری اور ناصر والی بات میں ہی الجھا ہوا تھا۔ رستم نے اس کے بوڑھے کمزور شانے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کہا نا، جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان پر زیادہ دماغ نہیں کھپانا چاہیے۔ ہاں، جس بات پر تمہیں پریشانی ہو سکتی ہے اس کا بڑا پکا جواب میرے پاس موجود ہے۔ میں تمہیں اس بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ اللہ نے چاہا تو زری کو کوئی دکھ نہیں پہنچے گا۔ وہ بڑی خوش اور عزت والی زندگی گزارے گی اور ان کو صرف لفظ نہ سمجھنا، یہ ایک وعدہ ہے۔''

واس نے سر گھما کر رستم کی طرف دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر اطمینان یوں پھیل گیا جیسے کسی برفانی طوفان کے بعد سنہری دھوپ نشیب و فراز کو چمکاتی ہے۔

دونوں خاموشی سے پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ یخ بستہ رات بھی سفر میں تھی اور اپنی منزل کے قریب پہنچ رہی تھی۔ رستم اور واس دونوں جانتے تھے کہ یہ ساتھ ختم ہونے کو ہے۔ کئی پُر آشوب واقعات کے ساتھ گزرا ہوا سال اب ماضی کا حصہ بننے والا ہے۔

اب پتا نہیں کہ انہیں پھر کبھی ملنا تھا یا نہیں؟ کچھ لوگ پہلی ملاقات میں ہی اچھے لگتے ہیں۔ رستم کو بھی واس پہلی نگاہ میں ہی اچھا لگا تھا۔ اس نے شروع سے آخر تک رستم اور ناصر کے لیے اچھے دوست کا کردار ادا کیا تھا۔ اب یہ دوست جدا ہونے والا تھا۔ رستم کا دل بوجھل تھا.....

آخر واس نے بھاری آواز میں کہا۔ ''رستم! میں جانتا ہوں کہ میرے ساتھ نہ جانے سے تمہیں اور ناصر کو دکھ ہوا ہے۔ بے شک دکھ کی بات ہے لیکن اس میں ایک پہلو امید اور بہتری کا بھی ہے۔ جانتے ہو کیا؟''

رستم نے نیم تاریکی میں سوالیہ نظروں سے واس کو دیکھا۔

واس بولا۔ ''تمہیں پتا ہی ہے، میری بیوی بہت مذہبی ہے۔ اس پر یہاں کے رہن سہن کا بالکل اثر نہیں ہوا۔ وہ باقاعدگی سے نماز پڑھتی ہے اور اب میں بھی پڑھنے لگا ہوں۔ وہ یہاں کے حالات پر بہت کڑھتی ہے۔ وہ پاؤندہ عورتوں میں اٹھتی بیٹھتی ہے تو انہیں مذہب کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ تمہیں یہ سن کر حیرانی ہوئی کہ وہ اندر ہی اندر کئی عورتوں کو اسلام کی طرف راغب کر چکی ہے اور ان میں برق جان کی دبنگ بیوی بھی شامل ہے۔ برق جان کی بیوی اس معاملے میں کافی آگے ہے۔ تم برق جان میں جو تبدیلیاں دیکھ رہے ہو، اس کی وجہ بھی اس کی بیوی ہی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات بتائی تم نے۔'' رستم نے کہا۔

واس بولا۔ ''ہم زیادہ امیدیں تو نہیں لگا سکتے لیکن لوگ پرانے عقیدوں اور رسم و رواج کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ پاتے۔ مگر تھوڑی بہت آس تو لگائی جا سکتی ہے۔ کیا پتا کہ اس برف میں جو چنگاری موجود ہے آہستہ آہستہ آگ میں تبدیل ہو جائے.....''

بات رستم کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

رات کا سرد اندھیرا اب دھیرے دھیرے صبح کے اجالے میں بدل رہا تھا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ دیو ہیکل کے ٹوٹ بھی عقب میں موجود تھا مگر اب وہ قدرے کم اونچا نظر آ رہا تھا۔ اس کا جو رخ چین کی سمت تھا، اس پر ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ یہ منظر قابلِ دید تھا لیکن وہ رک کر کسی بھی منظر کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ انہیں جلد از جلد آگے بڑھنا تھا۔

پھر کچھ ہی دیر میں وہ مقام آ گیا جہاں واس اور ریان بخت ان سے جدا ہو گئے۔

رستم اور ناصر نے واس کے ذریعے خاموش طبع خانم.....اور ریچھوں سے پنجہ آزمائی لڑنے والے نے مان کو اپنی نیک تمنائیں بھیجیں.....انہوں نے ایک دوسرے سے طویل معانقے کیے اور یخ بستہ پانی کے ایک آبشار کے کنارے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

دو مسافر اس ویرانے سے برفیلی دنیا کی طرف واپس چلے گئے اور دو اپنی آباد دنیا کی تلاش میں آگے بڑھ گئے۔ ابھی وہ خطرناک حدود سے باہر نہیں نکلے تھے..... ابھی منزل بھی بے نشان تھی لیکن ان کے گھوڑوں کے قدم مسلسل اٹھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کچھ کھوئے ہوئے مناظر کی پیاس تھی اور امید کی کرنیں تھیں..... وہ آگے بڑھ رہے تھے

☆======☆======☆

شانی حویلی کی وسیع و عریض نشست گاہ میں گم صم بیٹھی تھی۔ اب تو اس کی آنکھوں سے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ کہیں روشنی کی کرن نظر نہیں آتی تھی، کہیں کوئی زندگی بخش خبر نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اب سب تھک ہار کر بیٹھ چکے ہیں..... حاجی حیات، زوار، عارف کمبوہ اور رستم کے دیگر سنگی ساتھی۔ صرف اجمل خان تھا جو کچھ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ تاہم لگتا تھا کہ وہ بھی بس تاریکی میں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اسے شمالی علاقہ جات کی طرف گئے اب تک مہینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ خط لکھے گا یا کسی طرح ٹیلی فون کرے گا مگر اب تک اس کی طرف سے بھی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ڈولا بھی اجمل خان کے ہمراہ گئے تھے۔ جب دروازے پر آہٹ ہوتی یا فون کی گھنٹی بجتی یا رنگ والی کا ڈاکیا نمودار ہوتا تو شانی کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں مگر ہر بار اس کے حصے میں مایوسی ہی آتی تھی۔

تایا معصوم کو آج کل بار بار بہت پسند آ رہا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ادھوری نہ رہے، مکمل ہو جائے اور ان کے نزدیک شانی اسی طرح مکمل ہو سکتی تھی کہ وہ سہاگن ہو جائے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ سہاگن ہے اور ایسی سہاگن ہے جس کے سہاگ کا رنگ مر کر بھی پھیکا نہیں پڑ سکتا۔ شانی نے اس حوالے سے تایا معصوم کی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اس نے واضح الفاظ میں تو کچھ نہیں کہا تھا تاہم باتوں باتوں میں تایا معصوم اور خاندان کے دیگر لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ شادی کا خیال دور دور تک اس کے ذہن میں نہیں ہے۔ اگر حویلی والے اور علاقے والے اسے اسی طرح چھوٹی چوہدرانی تسلیم کرتے ہیں تو ٹھیک ہے، ورنہ اسے اس مسند پر بیٹھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ یوں کچھ عرصے کے لیے یہ معاملہ سرد پڑ گیا تھا۔ اس معاملے کے سرد پڑتے ہی ایک اور معاملہ گرم ہو گیا تھا..... اور یہ چھوٹی چوہدرانی کے الیکشن میں حصہ لینے کا معاملہ تھا۔ ایک اہم سیاسی جماعت کے لوگ شانی کو اس علاقے کی ایک بااثر اور ہر دلعزیز شخصیت سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ اگر وہ آئندہ الیکشن میں ایم این اے کی نشست کے لیے مقابلہ کرے تو اسے کامیابی مل سکتی ہے۔ شانی کو مختلف طریقوں سے قائل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ ہر

دوسرے تیسرے روز کسی علاقے کے معززین کا کوئی وفد اس سے ملاقات کرنے پہنچ جاتا تھا۔ شانی کو ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے الیکشن کے اس جنجال کا رخ تایا معصوم اور خالو اعجاز وغیرہ کی طرف موڑنے کی کوشش کی مگر کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ اب معاملہ احتجاج تک آ پہنچا تھا۔ روزانہ چھوٹے چھوٹے گروپوں کی شکل میں لوگ حویلی تک آتے تھے..... اور پُرزور مطالبہ کرتے تھے کہ ان کی چھوٹی چوہدرانی آئندہ الیکشن میں حصہ لے۔ شانی جانتی تھی کہ یہ بے چارے لوگ خود اتنی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے..... ان کے پیچھے وہی سرکردہ حضرات ہیں جو لٹھ لے کے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

اب پچھلے چھ سات روز سے چند سیاسی کارکنوں نے حویلی کے عین سامنے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ دو تین شامیانوں کے نیچے دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ بھوک ہڑتالیوں میں تین خواتین اور چار پانچ حضرات تھے۔ وہ پانی اور جوس وغیرہ لے رہے تھے پھر بھی ان میں سے دو خواتین کافی کمزور ہو گئی تھیں اور سنا تھا کہ ان میں سے ایک کل شام بے ہوش بھی ہو گئی تھی۔ یہ سب کچھ شانی کے دل و دماغ پر بہت بوجھ ڈال رہا تھا۔ وہ جو پہلے ہی غم کی چکی میں پس رہی تھی اب اور بھی غمزدہ ہو گئی تھی۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی، کسی کا دل نہیں توڑ سکتی تھی لیکن آج کل وہ تکلیف بھی دے رہی تھی اور دانستہ نادانستہ دل بھی توڑ رہی تھی۔

خالو اعجاز تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ ''شانی! اِنی خبر سنی ہے.....؟''

''کیا؟'' اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''آج ایک بڑا جلوس کریم پورہ سے رنگ والی کی طرف آ رہا ہے۔ اس میں بہت سے لوگ گوجرانوالہ سے بھی شامل ہوئے ہیں۔ راستے کے دیہات اور چھوٹی آبادیوں سے بھی لوگ جلوس میں شامل ہو رہے ہیں۔ کئی ہزار کا مجمع ہے۔ یہ سب لوگ تمہاری حمایت میں یہاں پہنچ رہے ہیں۔ تم سے الیکشن میں آنے کا مطالبہ کرنے کے لیے۔''

''یہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے خالو! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ یہ مجھے میری مرضی سے جینے کیوں نہیں دیتے؟ میں خود کو اتنی بڑی ذمے داری کے قابل نہیں سمجھتی۔ یہ کسی دوسرے کو کیوں نہیں چن لیتے؟''

''کسی دوسرے کے لیے ان کے دلوں میں اتنی جگہ نہیں ہے۔ وہ جس طرح تمہاری حمایت میں اکٹھے ہو رہے ہیں، اس سے تو واقعی اندازہ ہوتا ہے کہ تم باآسانی جیت جاؤ گی۔ اس جلوس میں دو ایسے بندے بھی شامل ہیں جو اس سے پہلے خود اس نشست کے لیے امیدوار تھے۔ مگر اب پارٹی کی ہدایت کے مطابق وہ تمہارے حق میں دستبردار ہو گئے ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''اوہ خدایا!'' شانی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ''جی چاہتا ہے کہ کہیں بھاگ جاؤں۔ کسی کو بتائے بغیر نکل جاؤں۔ میں نہیں اٹھا سکتی یہ بوجھ۔''

اتنے میں ملازم خادم حسین ہانپتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے خالو اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''چوہدری جی تین چار اور تمبو (شامیانے) آ گئے ہیں۔ یہ تمبو پہلے تمبوؤں کے ساتھ ہی لگائے جا رہے ہیں۔ وہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر آج بھی بی بی جی نے الیکشن لڑنے والی بات نہیں مانی تو بھوک ہڑتالی کیمپ میں تیس چالیس بندے..... ہاں جی کم از کم تیس چالیس بندے اور شامل ہو جائیں گے۔''

''یہ بندے کہاں ہیں؟'' خالو اعجاز نے پوچھا۔

''جلوس کے ساتھ ہی آ رہے ہیں..... اور سنا ہے جی کہ جلوس چھوٹی نہر تک پہنچ گیا ہے۔ بس دو ڈھائی گھنٹے میں یہاں حویلی کے سامنے ہوگا۔''

شانی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہ جلوس والے کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟''

خالو اعجاز نے اپنا نیم گنجا سر کھجایا اور زیر لب مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ ''چاہتے تو یہ لوگ یہی ہیں کہ تم ان کی پُر زور فرمائش پر الیکشن لڑنے کا اعلان کرو..... لیکن اگر ہم فی الحال یہ اعلان نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو کرنا ہی پڑے گا کہ تم حویلی کی گیلری میں جاؤ اور وہاں کھڑی ہو کر لوگوں کے سامنے پندرہ بیس منٹ کی تقریر کرو۔''

''تقریر میں کیا کہوں؟''

''وہی جو سارے سیاسی لوگ کرتے ہیں..... وعدے!''

''کیا مطلب خالو؟''

''بھئی وعدے..... یہی کہ وہی ہوگا جو آپ لوگ چاہتے ہیں۔ بس سوچنے کے لیے تھوڑا سا وقت دیں۔ میں آپ لوگوں کے خیالات سے پورا اتفاق کرتی ہوں۔ آپ کی محبت دیکھ کر اب میرے لیے ممکن نہیں کہ آپ سے زیادہ دیر دور رہوں۔ مگر مجھے اپنے بزرگوں اور اردگرد کے لوگوں سے مشورہ بھی کرنا ہے..... اس کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت دیں..... وغیرہ وغیرہ۔''

''خالو! آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ میری جان پر بنی ہوئی ہے۔ میں سامنا نہیں کر سکتی اتنے لوگوں کا۔''

''جب سامنا کرو گی تو مشکل نہیں رہے گی۔ جب بندہ چل پڑتا ہے تو راستے خود بخود نکل پڑتے ہیں۔'' خالو اعجاز نے کہا۔ پھر مزید سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ''سچی بات یہ ہے

شانی بیٹی کہ ایسے مواقع قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ ہر طبقے کے لوگ جس طرح تمہاری محبت اور حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب تمہارے ماں باپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ وڈی آپا نے اپنے پیچھے محبتوں کا جو ورثہ چھوڑا تھا، وہ کئی گنا بڑھ کر تمہاری طرف پلٹ آیا ہے۔ دیکھنے والی آنکھیں تمہیں بہت اونچے مقام پر دیکھ رہی ہیں شانی۔''

وہ زچ ہو کر بولی۔ ''خالو! کیا اونچا مقام صرف لیڈری کرنے اور انتخاب لڑنے سے ہی ملتا ہے؟ میرے لیے تو یہی بہت اونچا مقام ہے جہاں پر میں ہوں۔ میرے علاقے کے لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ وہ ہمارے دکھ سکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ ہم ان میں گھل مل جاتے ہیں اور ان کا دکھ سکھ بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا یہ بہت نہیں ہے خالو اعجاز؟''

''نہیں، یہ بہت نہیں ہے۔'' خالو نے دانائی سے کہا۔ ''ہمیں اپنی سوچ..... اپنے علاقے اور اپنے چند دیہات سے آگے بڑھانی ہوگی۔ اگر تم اس علاقے سے کامیاب ہو جاتی ہو تو ہم اپنے اردگرد کے بے شمار دیہات کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ وہاں سڑکیں بن سکتی ہیں، اسکول بن سکتے ہیں۔ جوہر آباد کے شانی بی بی اسپتال جیسے کئی اسپتال کھڑے ہو سکتے ہیں۔ بے شک سیاست ایک گورکھ دھندا ہے مگر جب صاف نیتوں اور اچھے ارادوں والے لوگ اس میدان میں آئیں گے تو پھر اس میں بہتری کے راستے نکلیں گے۔ جب ہی آہستہ آہستہ ڈپٹی ریاض اور قدرت اللہ جیسے ناسوروں کا خاتمہ بھی ہوگا۔''

خالو اعجاز پہلے بھی دو تین بار شانی کو سمجھا چکے تھے، اب بھی انہوں نے سمجھایا لیکن خاندان کے دوسرے بزرگوں کی طرح اس پر کوئی فیصلہ تھوپا نہیں۔ اسے خود سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا موقع دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد شانی اس حد تک تیار ہو گئی کہ اگر لوگ اصرار کریں گے تو وہ حویلی کی بالکنی سے ان کے سامنے آئے گی اور ان سے بات بھی کرے گی۔ وہ بھوک ہڑتالیوں کو بھوک ہڑتال ختم کرنے کا مشورہ دے گی اور الیکشن میں حصہ لینے کے حوالے سے کوئی فیصلہ کرنے کے لئے دو تین ہفتوں کا وقت مانگے گی۔ وہ خالو اعجاز کے پاس بیٹھی رہی اور دونوں نے مل کر متوقع تقریر کے لئے نوٹس تیار کیے۔ اس میٹنگ کے دوران میں خاندانی وکیل چوہدری نیاز احمد نے بھی شانی کی مدد کی۔

جلوس متوقع وقت سے قریباً ایک گھنٹہ تاخیر کے ساتھ رنگ والی پہنچا۔ جلوس کے پہنچتے

www.pdfbooksfree.pk

ہی رنگ والی کی فضا میں ہلچل مچ گئی۔ جلوس میں کوئی درجن گاڑیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں اور چھکڑے وغیرہ شامل تھے۔ رنگ والی کی گلیوں میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں جھنڈے اور بینرز تھے۔ بینرز پر شانی بی بی سے الیکشن میں حصہ لینے کا پُرزور مطالبہ موجود تھا۔

شانی پہلے تو گھبراتی رہی پھر اس کے اندر کی فطری دلیری نے اسے لوگوں کے سامنے آنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے بڑی سادگی سے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، بالوں کو کنگھی کر کے سمیٹا اور اوڑھنی لے کر باہر نکلنے میں جانے کو تیار ہو گئی۔ اسے دیکھ کر خالو اعجاز نے کہا۔ ''یہ تم تقریر کرنے جا رہی ہو یا کنویں سے پانی بھرنے؟''

''کیا ہوا خالو؟'' وہ ہکلائی۔

''اوئے جھلی! اب تُو چھوٹی چوہدرانی ہے۔ آنے والے دنوں میں تیرا حکم چلنا ہے۔ وہاں جلوس میں فوٹو گرافر ہیں، ٹی وی کیمرے والے ہیں۔ انہوں نے اپنے دماغوں میں تیری ایک بڑی رعب والی تصویر بنائی ہے۔ ایک تو تُو ویسے ہی کبوتری سی ہے۔ اوپر سے کپڑے بھی کڑیوں چڑیوں والے پہن لئے ہیں۔ جا کوئی دوسرے اچھے کپڑے پہن..... اور کچھ زیور بھی ہونا چاہیے وڈی آپا والا۔''

شانی نے بہتیرا انکار کیا مگر خالو اعجاز، ایڈووکیٹ نیاز احمد اور چند دیگر افراد نے اس کی ایک نہیں چلنے دی۔ انہوں نے پھوپھو آمنہ، فرزانہ اور شانی کی سہیلی سکینہ کی ڈیوٹی لگائی کہ اسے ٹھیک سے تیار کریں۔ شانی کو بروکیڈ کا ایک بھاری کام دار جوڑا پہنایا۔ کندھوں پر سونے کے تاروں والی وہ پوٹھوہاری شال رکھنا پڑی جو چند روز پہلے اسے نارپور کے تین سرکردہ زمینداروں نے بطور تحفہ پیش کی تھی۔ اس نے زیور پہننے سے صاف انکار کر دیا تھا پھر بھی روبی کے پتھر والے جھمکے تو اسے پہننا ہی پڑے۔

رنگ والی کا انسپکٹر اور اس کے ماتحت حویلی میں بھاگے پھر رہے تھے۔ انہوں نے دو قریبی تھانوں کی نفری بھی بلا لی تھی پھر بھی اتنے بڑے جلوس کو دیکھ کر ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ انسپکٹر نے چار مسلح ہیڈ کانسٹیبلوں کو شانی کی سکیورٹی پر مقرر کر دیا تھا۔ انہوں نے ہمہ وقت شانی کے پیچھے رہنا تھا۔ حویلی کے اپنے درجنوں مسلح محافظ بھی سکیورٹی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عارف کمبوہ ان محافظوں کو گائیڈ کر رہا تھا۔ شانی پر ہونے والے دو قاتلانہ حملوں کے بعد عارف وغیرہ بہت محتاط ہو گئے تھے۔

اسی دوران میں بیرونی دروازے کی طرف ہلچل کے آثار محسوس ہوئے۔

ذرا دیر بعد عارف کمبوہ نے آ کر اطلاع دی۔ ''دو اخبار والیاں اپنے کیمرہ مین کے ساتھ اندر آ گئی ہیں۔ یہ لوگ آپ سے انٹرویو لینا چاہ رہی ہیں۔''

''خدا کے لئے عارف! ان کو باہر بھیج دو۔ میں ان کے الٹے پلٹے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔''

''ٹھیک ہے شانی بہن۔'' عارف نے اطمینان سے کہا۔

خالو اعجاز نے عارف کو روکا۔ ''یہ ٹھیک نہیں عارف..... اخبار والوں سے بگاڑنی نہیں چاہیے۔ یہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں..... تم خود بھی تو اچھی خاصی بات کر لیتے ہو۔ شانی کی جگہ تم ان سے بات کر لو۔''

عارف نے سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھا۔ شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ عارف بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ جس طرح آپ کہتے ہیں۔''

شانی جانتی تھی کہ عارف میں ایک پُرجوش لیڈر کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ جب ان لوگوں نے جوہر آباد میں قدرت اللہ کے خلاف مہم چلائی تھی تو شانی نے عارف کو سینکڑوں لوگوں کے سامنے اعتماد سے تقریریں کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔

شانی نے خالو اعجاز سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''خالو جی! کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ لوگوں کے سامنے بھی میری جگہ عارف ہی دو چار منٹ بول دے؟''

''نہیں بھئی! جو کام اب تم کر سکتی ہو وہ تم ہی کر سکتی ہو۔ ہم سب صرف تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ چلو شاباش، ہمت کرو اور اب تیار ہو جاؤ۔''

شانی نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ شانی کو ہراساں دیکھ کر مُنا بھی سہم سا گیا تھا۔ وہ کبھی شانی کو اور کبھی اردگرد موجود لوگوں کو دیکھتا تھا۔ شانی نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کے سر و رخسار چومے۔ باہر لوگوں کا جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا۔ نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی..... لوگوں نے گلاب کی منوں پتیاں حویلی کے مین گیٹ کے سامنے ڈھیر کر دی تھیں۔

اچانک ساتھ والے کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ شانی ہر فون کال پر چونک اٹھتی تھی۔ آج بھی چونکی۔ وہ اٹھ کر فون کی طرف جانا چاہتی تھی..... مگر خالو اعجاز نے اسے روک لیا اور خود فون کی طرف بڑھے۔

''ہیلو کون؟'' انہوں نے پوچھا۔

دوسری طرف سے اجمل خان کی آواز آئی۔ ''آپ..... آپ چوہدری اعجاز صیب بول

www.pdfbooksfree.pk

رہا ہے؟''

اعجاز صاحب چونک گئے۔''ہاں..... اعجاز بول رہا ہوں۔ کہاں ہو م:

''ام لاہور پہنچ چکا ہے جی۔'' اجمل کی آواز لرز رہی تھی۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس کوئی نہایت اہم خبر ہے۔

''خیریت تو ہے ناں اجمل خان؟'' اعجاز صاحب نے ہولے سے کہا۔

''بالکل خیریت ہے جی..... سب کچھ ایک دم ٹھیک ٹھاک ہے۔ کیا آپ ذرا دیر کے لئے شانی بہن کو پون پر بلا سکتا ہے؟''

''شش..... شانی ذرا مصروف ہے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو مجھے پیغام دے دو، میں اس تک پہنچا دیتا ہوں۔''

''وہ جی..... دراصل..... ام شانی بہن سے ہی بات کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ زیادہ مصروف ہے..... اور یہ کچھ شور سا بھی سنائی دے رہا ہے۔''

''ہاں کچھ لوگ ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔'' اعجاز صاحب نے مبہم جواب دیا۔

''کیا ام تھوڑی دیر بعد پون کرلے؟'' اجمل نے بدستور جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں..... تم مجھے اپنا فون نمبر دے دو۔ وہ فارغ ہو کر خود تمہیں فون کرتی ہے۔'' اعجاز صاحب نے کہا۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اجمل خان نے اعجاز صاحب کو ایک موبائل نمبر لکھوا دیا۔ نمبر لکھوانے کے بعد اس نے کہا۔''شانی بہن سے کہیے ذرا جلدی پون کرلیں۔''

اعجاز صاحب نے ریسیور واپس رکھ دیا۔

اعجاز صاحب کو معلوم تھا کہ حاجی حیات، اجمل خان اور عارف وغیرہ ابھی تک رستم کی تلاش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ موہوم امید موجود ہے کہ شاید وہ اب تک زندہ ہو۔ خالو اعجاز کو شانی کے دل کی کیفیت بھی بڑی حد تک معلوم تھی۔ وہ جانتے تھے کہ رستم اب بھی شانی کے دل و دماغ میں موجود ہے۔ شانی نے رستم کی بہن اور بہنوئی کو بڑی چاہت سے حویلی میں رکھا ہوا ہے..... رستم کو تلاش کرنے والوں میں اجمل پیش پیش تھا..... وہ آئے دن کوئی جھوٹی سچی امید شانی کو دلا دیتا تھا اور اس کے زخم پھر ہرے کر جاتا تھا۔ شاید اسے اب بھی کوئی ایسی ہی خبر ملی تھی جس کے بارے میں بتا کر وہ شانی کو مخاطب کرنا چاہتا تھا۔

خالو اعجاز نے شانی سے پوچھا۔''کون تھا؟''

''کچھ نہیں۔ ناران پور سے باہر کا فون تھا۔ وہ بلوس نے معاملے میں پوچھ رہا تھا'' پھر خالو

اعجاز نے ذرا توقف سے کہا۔''شور سے اندازہ ہو رہا ہے کہ لوگوں کی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تمہیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔ جو باتیں کہنی ہیں، وہ ذہن میں ایک بار دہرا لو اور اٹھ جاؤ۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنی زندگی کی پہلی سیاسی تقریر کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں لرزش تھی مگر جوں جوں وہ آگے بڑھتی گئی اس کے اندر کی دلیر چھوٹی چوہدرانی بیدار ہوتی گئی۔ اس کا سینہ تن گیا، رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ درجنوں گارڈز اور پولیس اہلکاروں کے جلو میں وہ بڑے اعتماد سے طویل راہداری میں قدم رکھنے لگی۔ اسے لگا، اس کی ماں اسے سہارا دینے کے لئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ وہ مسکرا رہی ہے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے حوصلہ دے رہی ہے۔''گھبراتی کیوں ہے جھلی۔ تُو وڈی آپا کی بیٹی ہے۔ سب لوگ تیرے اپنے ہیں۔ ان کے دلوں میں تیرے لئے بڑی جگہ ہے.....''

باہر مائیکروفون پر شانی کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ ہزاروں لوگ پُر جوش نعرے لگا رہے تھے..... وہ بالکنی کی طرف بڑھتی ہوئی بڑی باوقار اور خوبصورت لگ رہی تھی..... کسی آسمانی مخلوق کی طرح!

☆======☆======☆

رستم لاہور میں تھا۔ وہی لاہور جہاں اس کی اَن گنت یادیں وابستہ تھیں۔ اقبال ٹاؤن کے علاقے میں رستم اور ناصر کے لیے اس خفیہ رہائش گاہ کا انتظام حاجی حیات نے ہی کیا تھا۔ حاجی حیات کا خاص آدمی پہلوان، انہیں ایک بند اسٹیشن وین کے ذریعے بڑی رازداری کے ساتھ اقبال ٹاؤن کی اس وسیع کوٹھی میں لے آیا تھا۔ حاجی حیات کو یقین تھا کہ فی الوقت یہ جگہ رستم، ناصر اور اجمل وغیرہ کے لیے محفوظ ترین ہے۔ شریف اور زری بھی ان کے ساتھ ہی تھے۔ عمر رسیدہ گائیڈ رحیم اللہ اور فرقان حمید اپنے آبائی شہر ایبٹ آباد میں رہ گئے تھے۔

رستم اور ناصر کو ابھی تک اپنے حالات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ سب کچھ تصوراتی محسوس ہوتا تھا۔ صرف پندرہ سولہ روز پہلے وہ چینی علاقے کے قریب ایک نامعلوم برف زار میں تھے۔ برق جان وغیرہ نے انہیں پا بہ زنجیر اس برفاب سے نکالا اور اس آبی گزرگاہ تک پہنچایا جہاں سے انہیں سنگی تختی حاصل کرنا تھی۔ رستم نے ایک مشکل آزمائش سے گزر کر داستانی ہیرو کی طرح وہ سنگی تختی حاصل کی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنا ڈرامائی اور تیز رفتار تھا کہ وہ خود بھی چکرا کر رہ گئے اور اب وہ اپنے جانے پہچانے لاہور اور لاہور کی جانی پہچانی فضا میں

www.pdfbooksfree.pk

تھے۔ وہ لاہور کے گلی کوچے نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ حاجی حیات نے انہیں چار دیواری کے اندر رہنے کے لیے بڑی سختی سے پابند کر رکھا تھا..... مگر شہر کی خوشبوئیں اور رنگ جیسے اڑ اڑ کر ان تک پہنچ رہے تھے۔

زری حیرت زدہ تھی۔ وہ ایک ایک شے کو بے حد تجسس سے دیکھتی اور پلکیں جھپکاتی تھی۔ وہ جیسے اچانک پتھر کے زمانے سے چل کر جدید دور میں آ گئی تھی۔ ٹی وی، ٹیلی فون، فریج اور اس قسم کی بہت سی اشیاء اس کے لیے عجوبہ تھیں۔ وہ اب پھول دار شلوار قمیص میں تھی مگر اس کی چال ڈھال میں وہی، درختوں پر چڑھنے اور برف پر دوڑنے والا جنگلی پن تھا۔ ناصر، رستم اور اجمل اس کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے۔ اس کی گردن میں سے وہ آہنی کڑا نکال دیا گیا جو پاؤں کے نزدیک اس نحوست کو ظاہر کرتا تھا کہ وہ بھینٹ نہیں چڑھائی جا سکی..... اب بھی وہ ٹی وی کے سامنے قالین پر اکڑوں بیٹھی تھی اور ہنسوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ رستم اور ناصر سامنے صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے نہایت ابتر حلیے اب ٹھیک ہو چکے تھے۔ رستم نے سر اور داڑھی کے بال ترشوائے تھے۔ وہ کاٹن کی سفید شلوار قمیص میں دلکش نظر آ رہا تھا۔ ناصر کلین شیو ہو گیا تھا۔ اس نے پینٹ اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اجمل خان حسب معمول چغوں والے کرتے اور بڑے گھیر کی شلوار میں تھا۔

زری مسلسل چینل بدلتی جا رہی تھی۔ ایک جگہ آبشار کے نیچے نیم عریاں انڈین ہیروئن، یکی عمر کے ہیرو سے اپنے تر بہ تر جسم کی پیمائش کرا رہی تھی۔ زری نے اپنے ہونٹوں سے "ہو" کی طویل آواز نکالی اور شرم سے سرخ ہو گئی۔ پھر اس نے چنچل نظروں سے ناصر کو دیکھا اور بے ڈھنگے طریقے سے ہنسنے لگی۔ سین مزید واہیات ہوتا گیا تو اس نے پھر بٹن دبانے شروع کر دیئے۔ ایک جگہ کارٹون آ رہے تھے۔

وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ "یہ مجھ کو بہت اچھا لگتا۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔

جدید دور کی یہ سب چیزیں زری نے بہت بچپن میں دیکھی ہوئی تھیں اور اب ان کی یادیں اس کے ذہن سے تقریباً محو ہو چکی تھیں۔

گاہے بہ گاہے وہ تالی بجاتی اور زور سے ہنسنے لگتی۔

ناصر نے کہا۔ "اتنے زور سے نہیں ہنستے۔"

"کیوں، کیا ہوتا؟" وہ معصومیت سے بولی۔

اتنے میں لائٹ چلی گئی۔ ٹی وی اسکرین بھی تاریک ہو گئی۔ ناصر نے کہا۔ "اس سے یہ

ہوتا۔ یہاں جب بھی کوئی زیادہ خوش ہوتا ہے، اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے لوگ تھوڑا تھوڑا خوش ہوتے ہیں..... تھوڑا تھوڑا ڈرتے ہیں۔"

اجمل خان نے گیس لیمپ روشن کیے۔ یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ وہ کھانا وغیرہ کھا چکے تھے۔ زری ٹیلی ویژن سے ہٹ کر ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور یونہی نمبر پریس کرنے لگی۔ اجمل خان لپک کر اس کی طرف آیا۔

"او خدائی خوار! یہ تم کیا کرتا..... بار بار اس کو کیوں چھیڑتا؟ ادھر بہت ضروری پون آتا ہے۔" اس نے ریسیور زری کے ہاتھ سے لے کر جھٹکے سے کریڈل پر رکھ دیا۔ دراصل رستم اور اجمل وغیرہ سہ پہر سے شانی کے فون کا انتظار کر رہے تھے۔ سہ پہر کے وقت اجمل کی بات شانی کے خالو سے ہوئی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ شانی فارغ ہوتے ہی خود اجمل کو فون کرے گی۔ یہ فون ابھی تک نہیں آیا تھا۔

اجمل کے انداز سے زری ڈر گئی۔ وہ ٹیلی فون سیٹ سے پیچھے ہٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔ ناصر نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا ہوا زری؟"

"مجھ سے غلطی ہوا۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں معافی مانگتا۔" اس نے بڑی اطاعت مندی سے اپنے دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔

ناصر نے اسے پچکارا۔ "دراصل ہم کسی کی کال کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس لیے منع کیا ہے۔ کل اس کے ساتھ جو کچھ مرضی کر لینا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ پھر ذرا چونک کر بولی۔ "یہ..... کال کیا ہوتا؟"

اجمل نے کہا۔ "ناصر بھائی! اس کو ذرا دوسرے کمرے میں لے جاؤ اور تفصیل سے بتاؤ کہ کال کیا ہوتا۔ اتنے میں ام ذرا خبریں وغیرہ سن لے۔"

ان باتوں کے دوران لائٹ آ گئی تھی۔ ناصر نے زری کی آنکھ بچا کر اجمل کو مکا دکھایا مگر اس کے ساتھ ساتھ اجمل کی ہدایت پر عمل بھی کیا۔ وہ زری کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اجمل نے چینل بدلنے شروع کیے۔ ایک چینل پر علاقائی خبریں آ رہی تھیں۔ ایک نہر کی پٹڑی ٹوٹنے کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ اس کے فوراً بعد ایک خبر آئی اور اس نے رستم اور اجمل وغیرہ کو بری طرح چونکا دیا۔ یہ ایک بڑے جلسے کی فوٹیج تھی اور دیہاتی علاقہ تھا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ پھر اس جلسے کا مقرر سامنے آیا۔ یہ ایک عورت تھی اور یہ وہ عورت تھی،

www.pdfbooksfree.pk

جس کو رستم ہزاروں، لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس کے چہرے کی بس ایک جھلک، بلکہ شاید چہرے کا ایک مختصر حصہ بھی دیکھ کر پہچان سکتا تھا..... کہ یہ کون ہے۔ یہ اس کی زندگی تھی..... اس کی روح تھی۔ یہ بی بی تھی۔ وہ بڑی خوب صورت اور باوقار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کچھ کہہ رہی تھی مگر اس مختصر تصویری جھلکی میں آواز نہیں تھی۔ پھر اسکرین پر دوسری خبریں نظر آنے لگیں۔

وہ تینوں دم بہ خود بیٹھے رہے۔ پھر اجمل خان نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ''اپنا شانی بہن تو بہت مشہور شخصیت بن گیا۔ ٹی وی پر اس کا پوٹو آ رہا ہے۔''

''یہ کیا چکر ہے اجمل؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔'' رستم نے کہا۔

اجمل نے ہنکارا بھرا اور پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''پورا بات تو ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر جب ام یہاں سے گیا تھا تو کچھ لوگ شانی بہن اور چوہدری اعجاز سے بار بار ملنے کو آ رہا تھا۔ خوان کا بُرزور خواہش تھا کہ شانی بہن آنے والے الیکشن میں حصہ لے۔ شانی بہن ایک دم انکار کر رہا تھا مگر چوہدری اعجاز اور چوہدری بابر وغیرہ کا خیال تھا کہ اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔''

''لیکن..... یہ تو بڑا مشکل راستہ ہے۔'' رستم کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں ابھر آئیں۔

''مشکل آسان کا تو ام کو پتا نہیں رستم بھائی! مگر پچھلے ایک سال میں شانی بہن کا بہت شہرت ہوا ہے۔ دراصل قدرت اللہ والے ماملے نے لوگوں کے ذہنوں کو بہت بدلا ہے۔ بے شمار لوگوں کو جھوٹ اور سچ کا تمیز ہوا ہے۔''

اجمل خان، رستم کو اس واقعے کے بارے میں تفصیل سے بتا چکا تھا جس میں قدرت اللہ کے جھوٹ کی بانگی چوراہے میں پھوٹی تھی۔ جس چلدی بیماری (خارش) کے ڈراوے سے قدرت اللہ نے بے شمار لوگوں کو بے وقوف بنا رکھا تھا، وہ چلدی بیماری خود اس کے اپنے گھر میں گھس آئی تھی..... اور اس کی دونوں بیویاں اس کی شکار ہوئی تھیں۔

قدرت اللہ نے اس حقیقت کو چھپانے کی اپنی سی کوشش کی تھی مگر ناکام ہوا تھا۔ کلی خان کی اُتاری ہوئی تصویروں نے اخباروں میں شائع ہو کر سارا پول کھول دیا تھا۔ اس واقعے کے بعد قدرت اللہ کی روز افزوں مقبولیت کو نہ صرف بریک لگے تھے بلکہ اس کو کئی جگہوں سے پسپائی بھی اختیار کرنا پڑی تھی۔

اسی دوران میں ناصر بھی آ گیا۔ وہ خبر کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔ ان کے لیے خوشی کی بات تھی کہ رنگ والی کی ویران حویلی نہ صرف پھر سے آباد ہو گئی تھی بلکہ لوگوں کی

نگاہوں کا مرکز بھی بنی ہوئی تھی۔

ناصر نے کہا۔ ''شاید اسی مصروفیت کی وجہ سے شانی بھابی کا فون نہیں آیا۔''

اجمل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''امارا خیال ہے کہ ان تک امارا پیغام ہی نہیں پہنچا ہو گا..... ورنہ وہ سب کام چھوڑ کر ام کو فون کرتا۔ ام جانتا ہے کہ جب ام رنگ والی سے آپ کی تلاش میں روانہ ہوا تھا تو شانی بہن کتنا بے تاب تھا۔''

ناصر نے کہا۔ ''لیکن تم بھی تو سرپرائز دینے کے چکر میں پڑ رہے ہو۔ تم نے چوہدری اعجاز کو بتا دینا تھا کہ رستم بھائی تمہارے ساتھ ہیں۔''

''چلو کوئی نہیں اب تو کافی رات ہو گئی ہے۔ امید ہے صبح فون آ جائے گا۔'' رستم نے کہا۔

''ام ایک بار پھر ٹرائی نہ کرے؟'' اجمل نے کہا۔

رستم خاموش رہا۔ ناصر کی خاموشی بھی نیم رضامندی جیسی تھی۔ اجمل نے کھٹا کھٹ دو تین بار نمبر ملائے مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔

اگلے روز اجمل صبح سویرے اٹھ گیا۔ وہ بے حد بے چین تھا۔ اس کے پاس اتنی بڑی خبر تھی کہ اس کا پیٹ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے شانی کو بہت روتے دیکھا تھا، اب وہ اسے بہت خوش دیکھنا چاہتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ شانی کو یہ خوشی اس کی زبانی ملے۔ اس نے ایک بار پھر رنگ والی کے نمبر ڈائل کیے۔ دوسری کوشش کامیاب رہی۔ وہ شانی کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا..... مگر اس کے کانوں میں حویلی کے پرانے ملازم خادم حسین کی آواز پڑی۔

''ام اجمل خان بول رہا ہے جاچا۔ تم نے ام کو پہچانا؟''

''اوئے تم کوئی بھولنے والی چیز ہو خان۔ تم رونقی بندے ہو اور رونقی بندوں کی اس حویلی کو بڑی لوڑ ہے۔''

''جاچا..... شانی بہن کدھر ہے؟''

''رات کو بہت سارے لوگ اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑی دیر سے سوئی ہے۔''

اتنے میں چوہدری اعجاز کی آواز سنائی دی..... ''کون ہے خادم حسین؟'' جواب میں خادم حسین نے اجمل کے بارے میں بتایا۔ چند سیکنڈ بعد چوہدری اعجاز لائن پر تھے۔

رسمی کلمات کے بعد چوہدری اعجاز نے معذرت کی کہ رات کو مصروفیت کی وجہ سے وہ شانی کو اجمل کا پیغام نہیں دے سکے۔

www.pdfbooksfree.pk

''کیا..... آپ ذرا دیر کے لیے شانی بہن کو جگا سکتا ہے؟ ان کے لیے ایک اچھا خبر ہے اور یہ خبر ام ان کو خود دینا چاہتا ہے۔''

چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''بھئی میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ اس خبر پر میرا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا شانی کا ہے۔''

''لیکن ام.....''

''چلو تم خود ہی اسے بتا دینا لیکن مجھے تو بتا دو، میں اسے نہیں بتاؤں گا۔''

اجمل چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''چوہدری جی! ام پچھلے ڈیڑھ مہینے سے جس کام کے لیے غائب تھا، وہ ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب..... تم تو رستم اور ناصر وغیرہ کو ڈھونڈنے نکلے تھے ناں؟''

''جی ہاں..... اور..... وہ دونوں مل گیا ہے۔'' اجمل کی آواز خوشی کی شدت سے لرز رہی تھی۔

چند لمحے تک لائن پر سناٹا رہا پھر چوہدری اعجاز کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو اجمل؟ کیا واقعی رستم..... میرا مطلب ہے، کیا واقعی وہ تمہارے ساتھ ہے؟''

''ایک سو دس پی صد جناب! ام جلد از جلد اس کو آپ سے اور شانی بہن سے ملانا چاہتا ہے۔ ام آپ کو بتا نہیں سکتا جناب کہ یہ کام کتنی مشکلوں سے ہوا ہے۔'' اجمل کی آواز میں داد طلب لرزش تھی۔

''تم نے تو حیران کر دیا اجمل خان۔'' چند سیکنڈ بعد چوہدری اعجاز کی آواز لائن پر ابھری۔ ''کیا میں رستم سے بات کر سکتا ہوں؟''

''وہ ابھی سو رہا ہے لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو ام جگا دیتا ہے۔''

''اچھا، چلو رہنے دو۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ..... خود تمہارے پاس آتا ہوں۔'' چوہدری اعجاز نے اچانک کہا۔

''لیکن شانی بہن؟'' اجمل نے پوچھا۔

''شانی سے بات کے لیے تمہیں کم از کم دو گھنٹے تو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کے سر میں سخت درد تھا، دوا کھا کر سوئی ہے..... تم ایسا کرو کہ مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ۔''

ایڈریس کے سلسلے میں حاجی حیات اور پہلوان نے انہیں بہت سختی سے منع کر رکھا تھا..... اجمل خان ایک بار پھر تذبذب میں پڑ گیا۔ ''کیا سوچنے لگے ہو؟'' چوہدری اعجاز نے

تیزی سے کہا۔

''دراصل ام کو خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ام کہاں ہے۔ اگر آپ کہتا ہے تو ام رستم بھائی کو جگاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، اسے جگا لو۔ میں بھی جلد سے جلد اس کی آواز سننا چاہتا ہوں۔''

اجمل خان نے رستم کو جگایا اور اسے بتایا کہ شانی کے خالو جان اس سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ رستم اپنے بکھرے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستا ہوا ٹیلی فون تک پہنچ گیا۔ رستم کی آواز فون لائن پر سن کر خالو اعجاز نے بے حد حیرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

رستم اور شانی کی شادی کے بارے میں ابھی تک خالو اعجاز کو بھی معلوم نہیں تھا۔ انہیں صرف اتنا پتا تھا کہ وڈے ڈیرے کے قتلِ عام میں بچ جانے کے بعد رستم، ناصر، اجمل اور شانی وغیرہ مری کی ایک نواحی آبادی میں قیام پذیر رہے تھے۔ جہاں سے ایک سال پہلے رستم اور ناصر اچانک لاپتا ہو گئے تھے.....

چوہدری اعجاز نے رستم سے کہا۔ ''میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں رستم۔''

''ملنا تو میں بھی چاہتا ہوں..... آپ سب سے اور شانی بی بی سے بھی۔''

''میں چاہتا ہوں رستم کہ شانی سے ملنے سے پہلے میری اور تمہاری ملاقات ہو جائے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں فون پر یہ سب کچھ نہیں بتا سکتا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ میرا تم سے ملنا ضروری ہے۔''

رستم نے چند لمحے سوچا۔ وہ جانتا تھا کہ چوہدری اعجاز اچھے آدمی ہیں۔ شانی بھی ان پر بہت اعتماد کرتی تھی۔ جو ہر آباد میں جب ڈپٹی ریاض ہٹلر شانی کو بار بار ہراساں کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو یہ چوہدری اعجاز ہی تھے جنہوں نے ہر جگہ شانی کا ساتھ دیا تھا۔ رستم نے چوہدری اعجاز کو اقبال ٹاؤن کی اس رہائش گاہ والا ایڈریس بتا دیا۔

اگلے تین چار گھنٹے رستم نے خاصی فکر مندی میں گزارے۔ چوہدری اعجاز نہ جانے اس سے کیا بات کہنے والے تھے..... انہوں نے ابھی تک شانی کو اجمل کی واپسی کی خبر کیوں نہیں سنائی تھی؟

چوہدری اعجاز بارہ بجے کے لگ بھگ اپنی ہنڈا گاڑی میں سوار مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ وہ خود ہی ڈرائیو کر کے آئے تھے۔ وہ رستم، ناصر، اجمل اور ڈولے کے ساتھ بڑے

www.pdfbooksfree.pk

تپاک سے ملے۔

انہوں نے رستم کی سلامت ٹانگ دیکھی اور خوشی کا اظہار کیا۔ ''مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا رستم۔ تمہیں اپنے دونوں پاؤں پر کھڑا دیکھ کر میرا سیروں خون بڑھ گیا ہے۔''

رستم نے خالو اعجاز سے ناصر اور زری کا تفصیلی تعارف کرایا۔ وہ اوٹ پٹانگ زری کو تعجب سے دیکھتے رہے اور اس کے بارے میں حیرت سے سنتے رہے۔ رستم اور ناصر کے لاپتا ہونے اور پھر بازیاب ہونے کی رُوداد بہت طویل تھی۔ اجمل اور رستم نے چوہدری اعجاز کو مختصر الفاظ میں اس رُوداد کے خاص خاص واقعات بتائے۔ ان واقعات میں سب سے اہم ذکر سپ گندل کا ہی تھا۔ وہی جادوئی پودا جو پہلے رستم کی ٹانگ کی معذوری ختم کرنے کا سبب بنا اور پھر ان کے لاپتا ہونے کی وجہ بن گیا۔ لاہور میں بیٹھ کر یہ ساری باتیں کرنا بڑا عجیب اور انوکھا لگتا تھا۔

کھانے کے دوران میں یہی باتیں ہوتی رہیں۔ تاہم کھانے کے بعد رستم اور چوہدری اعجاز کے درمیان اکیلے میں بات ہوئی اور یہی وہ خاص گفتگو تھی جس کے لئے چوہدری اعجاز نہایت عجلت میں یہاں پہنچے تھے۔ چوہدری اعجاز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رستم! شانی میری بھانجی ہے لیکن میں اسے بیٹیوں کی طرح چاہتا ہوں اور جس طرح میں اسے چاہتا ہوں اسی طرح اسے سمجھتا بھی ہوں۔ پتا نہیں مجھے یہ بات کہنی چاہیے یا نہیں مگر مجھے معلوم ہے کہ شانی اور تم ایک دوسرے سے بہت قریب ہو۔ تم دونوں کے دلوں میں جو جذبہ ہے، اس نے زمانے کا بہت گرم سرد دیکھا ہے۔ اس کے باوجود قائم دائم رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ آئندہ بھی رہے گا۔''

رستم نے کہا۔ ''آپ میرے بزرگ ہیں۔ آپ جو بھی کہنا چاہتے ہیں بے جھجک کہیں۔ میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔''

چوہدری اعجاز نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''رستم! میں سمجھتا ہوں کہ سچے جذبے دریا کے بہتے پانی کی طرح ہوتے ہیں، ان کو روکنا نہیں چاہیے۔ پر کبھی کبھی ضرورت کی وجہ سے وقتی طور پر اس پانی کو روکنا پڑ جاتا ہے۔ میں بھی عارضی طور پر تم پر ایک روک لگانا چاہتا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں چوہدری صاحب۔''

چوہدری اعجاز کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک نمودار ہوگئی۔ ''آج میں تم سے کچھ مانگنے آیا ہوں رستم..... اور مجھے امید ہے، تم مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹاؤ گے۔''

''آپ بولیں چوہدری صاحب۔'' رستم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

چوہدری اعجاز نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''تم ایک سال بعد لوٹے ہو رستم۔ اس دوران میں رنگ والی اور ارد گرد کے علاقے کی قسمت نے ایک عجیب پلٹا کھایا ہے۔ وہ کچھ ہو رہا ہے جو ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ رنگ والی کی حویلی کے بھاگ جاگ رہے ہیں۔ ہماری شانی کو ایک بہت اونچا مرتبہ ملنے والا ہے..... شاید تمہیں پتا نہ ہو، وہ علاقے سے ایم این اے کا الیکشن لڑنے والی ہے۔''

''یہ تو واقعی بہت حیرانی اور بہت خوشی کی بات ہے۔'' رستم نے اپنے اندرونی اضطراب کو کامیابی سے چھپاتے ہوئے کہا۔

''اسے ایک اہم ترین سیاسی پارٹی کی طرف سے یہ دعوت ملی ہے۔ ابھی اس بات کا فیصلہ تو نہیں ہوا کہ الیکشن سے پہلے اس پارٹی میں شامل ہوگی یا الیکشن جیت کر..... مگر یہ بات تقریباً طے ہوگئی ہے کہ اس پارٹی کی پوری سپورٹ شانی کو ملے گی..... تم نے سرفراز قزلباش کا نام تو سنا ہوگا؟''

''اس کا نام کس نے نہیں سنا۔ وہ بہت مشہور آدمی ہے۔'' رستم نے کہا۔

چوہدری اعجاز بولے۔ ''وہ آج کل اس سیاسی پارٹی کا سرکردہ لیڈر ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پنجاب کے کچھ علاقوں میں وہ سیاہ سفید کا مالک ہے۔ ٹکٹوں کی تقسیم کے سارے معاملے شاملے بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ہمارے علاقے میں بہت زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہم لوگوں کی خوش بختی ہے۔''

''شانی سیاست میں آنے کے لیے تیار ہے؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''وہ نا سمجھ ہے۔ انکار کر رہی تھی۔ ہم سب نے اسے سمجھایا ہے۔ بتایا ہے کہ اللہ کی طرف سے کتنی بڑی کامیابی اسے مل رہی ہے۔ اس میں سب سے بڑی بات یہ ہے ہمارے قدرت اللہ جیسے خبیث دشمن کے دانت بھی اپنے آپ کھٹے ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے ایم این اے کا، قدرت اللہ کے سر پر ہاتھ رہا ہے اور وہ اسی پارٹی کی طرف سے کامیاب ہوا تھا۔ اب یہ باتیں شانی کی سمجھ میں آرہی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ذہنی طور پر میدان میں آگئی ہے۔''

''مجھے بتائیں، میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میں ہر طرح حاضر ہوں۔''

چوہدری اعجاز نے اپنی کلف لگی قمیص کی کریز درست کی اور کچھ دیر تک پُرسوچ انداز میں اپنی ٹھوڑی کھجانے کے بعد بولے۔ ''رستم! میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر پوری سچائی سے کہتا ہوں کہ تم مجھے اپنی اولاد کی طرح عزیز ہو۔ مجھ سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے۔ مجھے پتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ تم جرم کی اس گار میں کیسے پھنسے ہو اور کیسے دھنسے ہو۔ میری ساری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں لیکن تم یہ بھی سمجھ گئے ہو گے کہ شانی اس وقت ایک بڑے نازک موڑ پر کھڑی ہے۔ یہاں اگر اس کے مخالفوں کو اس پر الزام تراشی کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ آ گیا تو ان کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ تم جانتے ہی ہو گے، جب دو سال پہلے شانی، چوہدری حشام اور اس کے بیٹے کو چھڑانے کے لیے وڈے ڈیرے کی طرف گئی تھی تو کیا ہوا تھا؟''

''ہاں، تھوڑا بہت معلوم ہے۔'' رستم نے مدھم آواز میں کہا۔

''ان باتیں بنانے والے لوگوں نے رائی کا پہاڑ کھڑا کر دیا تھا۔ ایسے ایسے الزام گھڑے تھے کہ سن کر کان جل اٹھتے تھے۔ تمہاری ذات کو بھی نشانہ بنایا گیا اور جو بھی دماغ میں آیا بک دیا گیا۔ اگر اب بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا ہوئی تو بہت نقصان ہو جائے گا رستم۔''

رستم نے اپنے لمبے بھاری بال دونوں ہاتھوں میں لے کر پیشانی سے پیچھے ہٹائے۔

''چوہدری صاحب! اگر اس سے پہلے کبھی میری لاعلمی میں ایسا ہو گیا ہو تو میں اس کے لیے بھی معافی چاہتا ہوں۔''

چوہدری اعجاز نے جذباتی انداز میں رستم کا ہاتھ تھام لیا۔ ''رستم! مجھے تمہارے دل کی حالت معلوم ہے لیکن کچھ عرصے کے لیے..... بس کچھ عرصے کے لیے تم شانی سے..... اور رنگ والی سے دور رہو۔ مجھے امید ہے، بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''آپ کچھ عرصے کے لیے کہہ رہے ہیں..... میں تو ہمیشہ کے لیے جانے کے لیے تیار ہوں۔ میرے پیچھے دنیا بھر کی آفتیں لگی ہوئی ہیں۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ میرا خطرناک سایہ شانی بی بی اور آپ لوگوں پر پڑے۔ بس مجھے لاہور میں ایک دو کام نمٹانے ہیں۔ ایک دو ہفتے میں یہ نمٹ جائیں تو شاید آپ کو میرا کھوج کھرا بھی نہیں ملے گا۔'' رستم کا لہجہ بے حد مہیب اور بوجھل تھا۔

''یہ بات تم ناراض ہو کر کہہ رہے ہو رستم؟''

''میں کسی سے ناراض نہیں ہوں چوہدری صاحب! اگر میری کوئی ناراضگی ہے تو اپنے حالات سے..... اور اس کے لیے میں خود ذمے دار ہوں۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر رہیں۔ وہی ہو گا جو آپ چاہیں گے۔ آپ سمجھیں کہ میں مری کے گاؤں سے لاپتا ہونے کے بعد واپس آیا ہی نہیں ہوں۔''

''تمہارا دل بہت بڑا ہے رستم۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' چوہدری اعجاز نے رستم کا ہاتھ دبایا۔

رستم جواب میں خاموش رہا۔ وہ تھوڑی دیر تک بے چینی سے اس کے بولنے کا انتظار کرتے رہے پھر خود ہی بولے۔ ''مجھے معلوم ہے رستم کہ ڈپٹی ریاض کے لیے تمہارے دل میں آگ بھڑک رہی ہے۔ تم جلد سے جلد اس سے حساب چکانا چاہو گے لیکن اگر تم مجھے اپنا بڑا سمجھتے ہو تو میں مشورہ دوں گا کہ ابھی کچھ دیر تک اس آگ میں ہاتھ نہ ڈالنا۔ یہ تمہارے لیے تو بہتر ہو گا ہی، ہمارے لیے بھی بہتر ہو گا۔ بس ذرا یہ الیکشن کا عرصہ گزر جائے پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم مل کر ڈپٹی ریاض کو گھیریں اور ایسا گھیریں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔''

رستم نے ذرا چونک کر چوہدری اعجاز کی جانب دیکھا۔ اسے لگا کہ چوہدری صاحب کو آئندہ الیکشن اور رنگ والی کی خوش حالی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے جوان عزیز جمشید کی موت کو بھی بھول گئے ہیں۔ وڈے ڈیرے کے قتلِ عام کو بھول گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ان ساری زیادتیوں کو فراموش کر چکے ہیں جو ریاض ہٹلر کی طرف سے بے پناہ قتار روا رکھی گئی ہیں لیکن رستم کیسے بھول سکتا تھا؟ رستم جیسے لوگ نہیں بھول سکتے۔ ایسے لوگ ساری مہر و وفا اور ساری چیرہ دستیوں کا حساب اپنے سینوں پر رقم رکھتے ہیں۔ یہ بڑے متبرک حافظوں والے لوگ ہوتے ہیں اور انہی کی مشکل پسندی و جی داری سے حق اور انصاف کے چہرے اجلے رہتے ہیں۔

رستم کو عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگا جیسے یہ ایک فلمی سچویشن ہے۔ اس قسم کے مناظر پرانی فلموں میں اکثر نظر آتے تھے۔ ہیروئن کا کوئی قریبی بزرگ خاموشی کے ساتھ اس کے محبوب سے ملتا تھا اور اسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ اپنا راستہ الگ کر لے۔ کہانیاں چاہے کسی طرح کی بھی ہوں، حقیقی زندگی سے ہی تو پھوٹتی ہیں۔ کہانیوں کو حقیقت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ آج ایک کہانی ایک نہایت سفاک اور سنگین حقیقت کی صورت رستم کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ جس کو دیکھنے کی چاہت میں ہر پل مر مر کر جیتا رہا تھا..... وہ اس کے قریب تو تھی لیکن رستم کو اس سے دور رہنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے رستم کو لگا کہ یہ دنیا کے ٹوٹے کے اس سرد ترین قید خانے سے بھی زیادہ بے رحم اور تکلیف دہ ہے جہاں وہ لمبی طویل راتوں میں صرف اپنے انتظار کے سہارے زندہ رہا کرتا تھا۔

گفتگو کے دوران میں چوہدری اعجاز دو منٹ کے لیے واش روم میں گئے تو سفاک کہانی نے ایک نیا پلٹا کھایا۔ جیسے تپتے صحرا میں اچانک تابڑ توڑ بارش برسنے لگے..... جیسے یخ بستہ تاریک رات کے وسط میں اچانک دوپہر کا سورج چمکنے لگے..... جو کچھ ہوا بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ایک قریبی کمرے سے اجمل خان تمتمائے ہوئے چہرے کے ساتھ برآمد

www.pdfbooksfree.pk

ہوا۔اس کا سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا اور آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن نظر آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک بہت بھاری بوجھ اس کے سر سے اُتر گیا ہے۔

''کیا بات ہے اجمل؟'' رستم نے پوچھا۔

''ابھی رنگ والی سے شانی بہن کا فون آیا ہے..... یہاں کوٹھی کے نمبر پر۔ ام نے اس کو سب بتا دیا۔ وہ اتنا خوش ہے..... اتنا خوش ہے کہ ام بتا نہیں سکتا۔ کاش ام اس وقت اس کا چہرہ دیکھ سکتا۔''

''اوئے..... یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' رستم حیرت سے قریباً چلا اٹھا۔

''دراصل آج صبح جب ام نے رنگ والی میں پون کیا تھا تو ادھر سے چاچا خادم حسین نے اٹھایا تھا۔ ام نے اس سے بولا تھا کہ وہ شانی بہن کو بلائے مگر پھر چوہدری صیب سے بات شروع ہو گیا۔ حویلی کے پون پر ہمارے پون کا نمبر آ گیا تھا۔ جب خادم حسین نے شانی بہن کو اماری کال کے بارے میں بتایا تو انہوں نے پون پر آئے ہوئے نمبر پر کال کر دیا۔ ابھی دو منٹ پہلے ان سے امارا بات ختم ہوا ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں پھر کال کرے گا۔''

رستم نے سر پکڑ لیا۔ ''اوئے اجمل کے بچے! یہ کیا کیا تم نے؟ یہ نہیں کرنا تھا۔ یہی کہنے کے لیے تو چوہدری صاحب.....'' رستم نے بات ادھوری چھوڑی اور اٹھ کر کمرے میں چکرانے لگا۔ اسی دوران میں ناصر اور ڈولا بھی آ گئے۔ وہ بھی اس بات پر خوش نظر آ رہے تھے کہ شانی سے بات ہو گئی ہے۔ اصل صورتِ حال کا علم کسی کو نہیں تھا۔

اتنے میں چوہدری اعجاز رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے واش روم سے برآمد ہوئے..... کمرے کی صورتِ حال دیکھ کر وہ ذرا سا چونکے۔ ''کیا بات ہے؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

رستم نے خشک لہجے میں اجمل اور ناصر وغیرہ سے کہا۔ ''تم لوگ ذرا باہر جاؤ۔''

وہ باہر چلے گئے۔ رستم نے چوہدری اعجاز کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گڑبڑ ہو گئی ہے چوہدری صاحب۔ شانی بی بی کو..... سب پتا چل گیا ہے۔''

''کیسے؟ کب؟'' چوہدری اعجاز کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔

''اجمل خان نے بتایا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی شانی بی بی سے فون پر بات ہوئی ہے۔''

''فف..... فون پر.....''

''جی ہاں۔ شانی بی بی نے ہی رنگ والی سے فون کیا ہے۔''

''اس نے کیسے فون کر دیا؟ اس کو فون کے بارے میں کس نے بتایا؟

''دراصل اجمل خان نے صبح حویلی فون کیا تھا۔ آپ کے ساتھ اس کی بات ہوئی تھی۔ مگر آپ سے پہلے اس کی بات خادم حسین سے ہوئی تھی۔ اس نے خادم حسین سے کہا تھا کہ وہ بی بی سے بات کرنا چاہتا ہے۔ بعد میں جب آپ رنگ والی سے لاہور روانہ ہو گئے تو خادم حسین نے بی بی سے اجمل کے فون کا ذکر کر دیا۔ فون پر لاہور کا نمبر آیا ہوا تھا۔ بی بی نے اسی نمبر پر رنگ کیا ہے۔''

چوہدری اعجاز کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''یہ برا ہوا ہے، بہت برا..... اس اجمل کے بچے کو کیا ضرورت تھی ہم سے پوچھے بغیر بات کرنے کی۔''

''معاف کرنا چوہدری صاحب! کچھ غلطی آپ سے بھی ہوئی ہے۔ آپ کو فون پر اجمل سے پوچھنا چاہیے تھا کہ خادم سے اس کی کیا بات ہوئی ہے اور پھر خادم کو اپنی زبان بند رکھنے کا کہہ دینا چاہیے تھا۔''

چوہدری اعجاز منہ بنا کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں کا رنگ پیلا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے اور پُرسوچ انداز میں سر تھام لیا۔ اجمل خان کھڑکی سے دیکھ رہا تھا اور رستم سے اشاروں میں پوچھ رہا تھا کہ کیا بات ہے؟ اس کے چہرے پر پُرمسرت چمک بھی تھی۔

چوہدری اعجاز دو تین منٹ تک بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔'' وہ مایوسی سے بولے۔ ''اب تمہیں اور اجمل وغیرہ کو کم از کم ایک بار تو شانی سے ملنا ہی پڑے گا۔ ورنہ وہ بہت ڈسٹرب رہے گی..... بہت زیادہ!''

''لیکن پھر آپ کا سارا پروگرام ڈسٹرب ہو جائے گا۔'' رستم نے دبا دبا طنز کیا۔

چوہدری اعجاز اپنے خیال میں مگن رہے۔ ''بہتر ہے کہ تم ایک بار اس سے مل لو۔ اس کے بعد کوئی ایسا بہانہ بنا لو کہ تمہیں دوبارہ نہ ملنا پڑے۔ مثلاً تم کہہ سکتے ہو کہ پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے تم کچھ عرصے کے لیے رُوپوش ہو رہے ہو..... یا پھر..... ملک سے باہر جانے کا بھی کہہ سکتے ہو۔''

اگلے دس پندرہ منٹ میں چوہدری اعجاز نے بڑی تفصیل سے رستم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ شانی، رنگ والی اور پورے علاقے کی بہتری کے لیے..... رستم کا کچھ عرصے کے لیے شانی اور حویلی کے دیگر لوگوں سے دور رہنا کیوں ضروری ہے۔

چوہدری اعجاز لاہور سے رنگ والی کے لیے واپس روانہ ہوئے ہی تھے کہ رنگ والی

www.pdfbooksfree.pk

سے پھر شانی کا فون آ گیا۔ فون سننے کے بعد اجمل کا چہرہ خوشی سے تمتمایا اور اس نے ریسیور فوراً رستم کی طرف بڑھا دیا۔ کچھ دیر کے لیے جیسے وقت تھم گیا۔ اردگرد کی ہر شے ساکت محسوس ہونے لگی۔ کان جس آواز کے لیے ایک مدت سے ترس رہے تھے، وہ آواز رستم کے کان میں داخل ہوئی اور سیدھی دل تک سرایت کر گئی۔

''ہیلو رستم! کیسے ہیں آپ؟'' شانی کی آواز لرز رہی تھی۔

''اور آپ؟'' وہ بولا۔

''بڑی دیر بعد یہ سوال پوچھنے کا خیال آیا آپ کو؟ کہہ کر گئے تھے کہ دو چار دن میں پلٹ آؤں گا۔ آپ جانتے ہیں..... آپ کے ان دو چار دنوں نے مجھے کند چھری سے ذبح کیا ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''ایسی ہی چھری میری گردن پر بھی چلی ہے شانی۔ میرے بس میں ہوتا تو آپ کو ایک دن کا انتظار بھی نہ کرواتا۔''

وہ خاموش ہو گئی۔ شاید سسکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس کی اٹکتی بار آواز ریسیور پر گونجی۔ آواز میں شکوے ہی شکوے تھے۔

''اب آپ شکل کب دکھائیں گے؟''

''میرے بس میں ہو تو ابھی آ جاؤں..... لیکن میں جانتا ہوں کہ میرا وہاں آنا ٹھیک نہیں۔''

''تو پھر میں آ جاتی ہوں۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''آپ کا آنا آسان ہو گا؟''

''یہاں آسان مشکل کا سوال نہیں ہے رستم۔ آپ کتنے بھی دور ہوں، میرے لیے تو نزدیک ہی ہیں۔ مجھے بتائیں..... مجھے کہاں آنا ہے اور کب؟''

''مُنا کیسا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ تایا معصوم، عارف، خالو اعجاز سب آپ کو یاد کرتے ہیں۔''

رستم نے شانی کو یہ نہیں بتایا کہ خالو اعجاز یہاں آئے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اعجاز صاحب نے شانی کو یہ بات بتانی ہے یا نہیں۔

''آپ کی تصویر اخبار میں دیکھی تھی۔ کل آپ کو ٹی وی پر بھی دیکھا.....''

''میں سب کچھ آپ کو بتاؤں گی۔ یہ ساری باتیں فون پر نہیں کی جا سکتیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ ہمیں کہاں اور کس طرح ملنا ہے۔'' اس کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔

''میں پہلے حاجی حیات سے بات کر لوں..... جب ہی کچھ کہہ سکتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

اسی دوران میں کمرے کے اندر بہت سا شور سنائی دینے لگا۔ یہ عورتوں کی آوازیں تھیں۔ شانی نے چلا کر کسی خادمہ سے کچھ کہا پھر رستم سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''یہ کسی دوسرے گاؤں کی عورتیں ہیں۔ مجھ سے ملنے بغیر اجازت اندر چلی آتی ہیں۔ آپ ذرا ہولڈ کریں، میں ان کو باہر نکال لوں۔''

''نہیں شانی۔ میں آپ کو دوبارہ فون کر لیتا ہوں۔ اس سے پہلے حاجی حیات سے بھی بات کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے..... کتنے بجے کریں گے؟ میں فون کے آس پاس رہوں گی۔''

''نو بجے کے لگ بھگ۔'' رستم نے کہا۔

''خدا حافظ! اپنا خیال رکھیے گا۔'' شانی نے اتنے دلنشیں انداز میں کہا کہ رستم کو سینے میں اپنا دل پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ رستم نے بھی خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

شام کے وقت رستم کی ٹیلی فون پر حاجی حیات سے گفتگو ہوئی۔ حاجی حیات کے ساتھ رستم کی گفتگو بڑی بے تکلف ہوتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو بے تکلف ناموں سے پکارتے تھے اور ایک دوسرے پر فقرے بھی چست کر دیتے تھے۔ رستم نے حاجی حیات کو بتایا کہ شانی سے اس کی بات ہو گئی ہے۔

حاجی حیات نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''چلو بات ہو گئی ہے تو اب بات آگے بھی بڑھے گی۔ ہمیں بھتیجا یا بھتیجی کب مہیا کر رہے ہو؟''

''شاید تمہیں یاد نہیں..... تم نے شادی کے ساڑھے تین سال بعد رزلٹ دیا تھا۔'' رستم نے سنجیدگی سے کہا پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''اگر شانی یہاں لاہور آنا چاہیں تو؟''

''جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔'' حاجی حیات بولا۔

''کوئی سکیورٹی کا مسئلہ؟''

''سکیورٹی کا مسئلہ تو تب ہو گا جب کسی کو پتا چلے گا۔ اگر شانی پردے میں آتی ہیں اور کسی ایسی گاڑی میں آتی ہیں جس کی شناخت نہ ہو تو کیا ڈر ہے۔ ویسے وہ کتنی دیر یہاں رہیں گی؟ میرا مطلب ہے کہ ایک دو دن یا اس سے زیادہ؟'' حاجی حیات نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

''اس کا تو ابھی پتا نہیں ہے۔''

''بہر حال شانی کو رنگ والی سے نکلتے ہوئے بہت رازداری برتنا پڑے گی۔ تم جانتے ہی ہو، اس سے پہلے دو تین بار شانی پر فائرنگ ہو چکی ہے۔''

اس سلسلے میں رستم اور حاجی حیات کے درمیان دس پندرہ منٹ بات ہوئی پھر انہوں

www.pdfbooksfree.pk

نے کچھ تفصیلات طے کرلیں۔

مقررہ ٹائم پر رستم نے شانی کو فون کرنے کے لیے اجمل خان سے کہا۔ اجمل خان نے تین چار بار کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ لائن انگیج جا رہی تھی یا پھر ایسے ہی کوئی خرابی تھی۔ اجمل نے رستم کے کہنے پر نو بجے سے ساڑھے دس بجے تک بار بار کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔''

کہیں کسی نے ریسیور اٹھا کر ہی تو نیچے نہیں رکھ دیا ہے۔'' اجمل نے خیال آرائی کی۔

ڈولے نے کہا۔ ''شاید ادھر حویلی میں بھی کوئی زری جیسی لڑکی ہے جو فون سیٹ سے چھیڑ خانیاں کرتی رہتی ہے۔''

زری اس وقت ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہی تھی شلوار قمیص اس کے جنگلی جسم پر شرمندہ شرمندہ سی نظر آتی تھی۔ اس نے رخ پھیر کر ڈولے اور اجمل وغیرہ کی طرف دیکھا۔ ''تم نے میرا نام لیا؟'' وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولی۔

''تو کیا تمہارا نام لینے کے لیے پہلے پرمٹ بنوانا پڑتا ہے۔'' اجمل نے پوچھا۔

''پرمٹ..... یہ پرمٹ کیا ہوتی؟'' زری نے ناک چڑھائی۔

''پرمٹ کا مطلب ہوتا ہے اجازت نامہ۔ جیسے ناصر کے پاس تمہارا اجازت نامہ ہے، وہ جب چاہے تمہارے پاس آ سکتا ہے۔ ہمارا مطلب سمجھتا ہے نا تم؟''

''پاس آ سکتا..... کیا مطلب؟ تم سب میرے پاس آ سکتا.....''

''توبہ..... توبہ..... کانوں کو ہاتھ لگاؤ۔ ایسا بات نہیں کرتے۔ اس سے گناہ ہوتا ہے۔''

''اس میں گناہ کا کیا بات۔ جب میں اپنی بستی میں تھا، بہت سا لوگ میرے پاس آتا۔ بلکہ جب مجھ کو بھینٹ چڑھنا تھا اس سے پہلے بہت سا لوگ اکٹھا میرے پاس آیا۔ کوئی ایک سو بندہ تھا۔ وہ قطار بناتا..... ایک ایک کر کے میرے پاس آتا..... مجھ کو سلام کرتا..... پھر.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

''پھر کیا؟'' اجمل نے آنکھیں پھاڑیں۔

''پھر سب کچھ الٹ پلٹ..... ام کو بھینٹ سے نکال دیا گیا۔ اما را زندگی بچ گیا.....''

زری کے چہرے پر شرم کا رنگ لہرا گیا۔ شاید اسے وہ پہلے ملاپ کی شب یاد آ گئی تھی۔ زری کی معصومانہ باتیں دلچسپ تھیں۔ مگر رستم اور اجمل وغیرہ اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے پا رہے تھے۔ ان کا دھیان مسلسل فون کی طرف لگا ہوا تھا اور فون جوں کا توں تھا۔ لس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔

وہ رات اسی فکر مندی میں گزر گئی۔ اگلے روز بھی اجمل نے صبح سویرے ہی کوشش

شروع کر دی۔ جب رستم قریباً آٹھ بجے کے قریب جاگا، اجمل فون کے سرہانے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ''یار کیوں خود کو ہلکان کر رہے ہو؟'' رستم نے قدرے بیزار لہجے میں کہا۔ ''دیہات کی لائن ہے، کہیں کوئی خرابی ہو گئی ہو گی۔''

اجمل کھسیانا ہو کر فون کے پاس سے اٹھ گیا۔ کچن کی طرف سے حلوہ پوری کی خوشبو آ رہی تھی۔ حاجی حیات کا مہیا کردہ خاص خانساماں ناشتا بنانے میں مصروف تھا..... اجمل پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ رستم نے منہ ہاتھ دھویا۔ کہنے کو تو اس نے اجمل کو فون سے دور جانے کو کہہ دیا تھا مگر اب اس کی نظریں بھی فون کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ اس کے اندر ایک بے تاب انتظار موجود تھا۔ اس نے کچن کی طرف دیکھا کہ کہیں اجمل دکھ تو نہیں رہا۔ پھر اس نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر اس سے پہلے کہ وہ ریسیور اٹھاتا اور شانی کا نمبر ڈائل کرتا، گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے ٹھٹک کر ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شانی کی زندگی بخش آواز تھی۔ ''ہیلو رستم! میں شانی بات کر رہی ہوں۔''

''لیکن آپ نے تو کل نو بجے بات کرنا تھی؟'' رستم کے لہجے میں ہلکا سا شکوہ تھا۔ ''ہم یہاں سے بار بار فون کرتے رہے مگر لائن ہی نہیں مل رہی تھی۔''

''سوری رستم..... ویری ویری سوری! دراصل کل یہاں بڑی نہر کی پٹڑی اچانک ٹوٹ گئی۔ ہمارے آٹھ دس دیہات میں پانی آ گیا۔ فون اور بجلی کی لائنیں بھی گڑبڑ ہوئی ہیں۔ کل سہ پہر جو عورتیں اچانک حویلی میں آ گئی تھیں نا..... وہ فلڈ والے علاقے سے ہی آئی تھیں۔ کل رات تک ہم متاثر ہونے والے لوگوں کی مدد میں لگے رہے۔ اب بھی بہت سے لوگ اپنے سامان کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہیں۔ ان کا انتظام وغیرہ ہو رہا ہے۔''

''اور یہاں میرے دل میں پتا نہیں کیا کیا خیال آتے رہے۔''

''میں نے آج سویرے اٹھتے ہی سب سے پہلے عارف سے کہہ کر فون لائن ٹھیک کروائی ہے۔ مجھے پتا تھا آپ رات کو فون کرتے رہے ہوں گے۔''

''اب کیا پروگرام ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ کی حاجی حیات صاحب سے بات ہوئی ہے؟''

''ہاں، وہ تو ہو گئی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آج شام تک مُنے کے ساتھ آپ کے پاس پہنچ رہی ہوں۔'' شانی کا لہجہ حتمی تھا۔

''لیکن آپ کے وہ پناہ گزین اور ان کی مدد کا کام؟''

www.pdfbooksfree.pk

شانی چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ''اس کے لیے لوگ موجود ہیں نا۔ تایا معصوم، عارف، خالو اعجاز اور اب تو سردار وراج بھی آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ چند سرکردہ مہتم بھی رنگ والی آئے ہوئے ہیں۔''

''لیکن آپ کی موجودگی بھی تو ضروری ہوگی۔''

''میں آپ سے مل کر پھر واپس آ جاؤں گی۔''

''کیا بہتر نہیں ہے کہ آپ وہاں اپنا کام نمٹا کر ہی نکلیں؟'' رستم نے کہا۔

شانی پھر چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو گئی۔ آخر اس کی قدرے ٹھہری ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ہاں..... یہ بات ہے کہ پھر میں اطمینان سے چند دن وہاں رہ سکوں گی۔'' اس کی آواز میں ہلکی سی شرم کی آمیزش بھی ہو گئی تھی۔

''جیسے آپ کی مرضی۔''

''آپ کی ٹانگ کے بارے میں اجمل نے جو کچھ بتایا ہے..... کیا وہ صحیح ہے؟'' شانی نے جذباتی انداز میں پوچھا۔

''اس نے کیا بتایا ہے؟''

''یہی کہ گورے کے بنگلے میں ماہر انگریز ڈاکٹروں نے آپ کی ٹانگ کو پھر سے آپ کے جسم کا حصہ بنا دیا ہے۔'' شانی کے لہجے میں حیرت موجزن تھی۔

''اس سوال اور اس جیسے دوسرے سارے سوالوں کے جواب آپ کو یہاں آ کر ہی مل سکتے ہیں۔'' رستم نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''میں تو ابھی آنا چاہ رہی تھی، پر آپ ہی روک رہے ہیں۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔ اتنی دیر آپ کے استقبال کی تیاری کر لیتے ہیں۔''

''کیسی تیاری؟'' شانی کی آواز میں ایک نو بیاہتا کی شوخی عود کر آئی۔

''ہر طرح کی تیاری۔'' رستم نے مبہم جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''آپ رنگ والی میں بہت مصروف ہو چکی ہیں۔ وہاں سے نکلنے کے لیے کیا بہانہ کریں گی؟''

''یہ سب میرے سوچنے کا کام ہے۔ آپ سرمت کھپائیں۔'' شانی نے اٹھلا کر کہا۔ ان لمحوں میں یہ بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ درجنوں دیہات کی مالک..... وہ ہر دلعزیز چوہدرانی ہے جس سے ہزاروں لوگوں کی تقدیر وابستہ ہے۔ اس کے پُر شباب پیکر کے اندر ایک الہڑ دوشیزہ بول رہی تھی۔

''ہماری شادی کا علم کس کس کو ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''صرف انہی لوگوں کو جو روکیٹ گاؤں میں ہمارے ساتھ تھے۔''

''تایا معصوم کو بھی نہیں؟''

''نہیں..... ابھی تک نہیں۔'' شانی نے کہا پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ''اور میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے ایک بہت اچھی خبر بھی ہے۔''

''کیا؟''

''پتا نہیں کہ مجھے یہ خبر آپ کو فون پر سنانی چاہیے یا نہیں..... چلیں میں آپ کو اشارہ دے دیتی ہوں۔ آپ کا کوئی بہت اپنا میرے پاس ہے۔ میرے ساتھ رہ رہا ہے..... بلکہ یہ دو ہیں۔''

''آپ پہیلیاں بوجھوا رہی ہیں۔''

''اس پہیلی کا جواب آپ کو خوشی سے نہال کر دے گا لیکن یہ جواب میں آپ کے پاس آ کر خود دوں گی۔'' شانی نے کہا۔

''اس کے لیے کتنا انتظار کرنا ہوگا؟''

''بس ایک یا دو دن اور آپ کو معلوم نہیں کہ یہ دو دن مجھ پر کتنے گراں گزرنے ہیں۔''

فون پر بات ختم کرنے کے بعد رستم دیر تک اس پہیلی کے بارے میں سوچتا رہا جو شانی نے اسے سنائی تھی۔ پھر اسے اچانک خیال آیا کہ اجمل اور ڈولا تو ڈیڑھ دو ماہ پہلے تنک رنگ والی میں ہی تھے۔ شاید انہیں معلوم ہو کہ شانی کے ساتھ وہ کون دو افراد رہ رہے ہیں جو اس کے بہت قریبی ہیں۔ رستم کے بہت قریبی تو بس اس کی بہن اور بہنوئی ہی تھے لیکن وہ ایسی جگہ پر تھے جہاں کوئی ان کی گرد بھی نہیں پا سکتا تھا۔ پھر وہ دونوں، رنگ والی کی حویلی میں کیسے پہنچ سکتے تھے؟

رستم اسی ادھیڑ بُن میں تھا جب اسے اجمل نظر آیا۔ ''اجمل! بات سنو۔'' رستم نے اسے پکارا۔

وہ ٹھٹک گیا..... جیسے چوری کرتا ہوا پکڑا گیا ہو۔ فوراً ہی رستم کو پتا چل گیا کہ وہ کیوں ٹھٹکا ہے۔ اس کے منہ میں اس کی پسندیدہ شے یعنی نسوار تھی۔ ''اوئے تم نے پھر نسوار رکھی ہوئی ہے۔'' رستم نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

وہ کھسیانے انداز میں مسکرایا۔ ''دراصل جی! پھر تو شانی بہن نے یہاں آ جانا ہے۔ ام نسوار کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گا۔ ام نے سوچا، ان کے آنے سے پہلے ذرا پرائی یادیں تازہ کر لے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''پرانی یادیں تو یوں کہہ رہے ہو کہ جیسے نسوار رکھے ہوئے مدتیں گزر گئی ہیں۔ حالانکہ ابھی پانچ دن پہلے ایبٹ آباد میں میں نے تمہارے منہ میں نسوار دیکھی تھی۔''

''بس جی۔ من پسند چیز کا تھوڑا سا چاندی بھی بہت زیادہ لگتا ہے۔ ام کو تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ شعر بھی کسی نے نسوار کے لیے ہی کہا ہے۔ تیرے بنا یوں گھڑیاں بیتیا، جیسے صدیاں بیت گیا۔''

''تم کو پتا بھی ہے، اس سے بہت بری بری بیماریاں لگتی ہیں۔''

''بیماریاں تو ہوتی ہی بری ہیں جی۔ اب ام اپنے دل کا کیا کرے۔ یہ کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ پہاڑوں میں رحیم اللہ صیب کے ساتھ رہ رہ کر ام کو بھی تھوڑا سا شاعری لاحق ہو گیا ہے۔ ابھی پرسوں ام نے چھوٹا سا شاعری نکالا ہے۔''

''شاعری نکالا ہے؟ کیا مطلب؟''

''یعنی شاعری کیا ہے۔ لیں آپ بھی سن لیں۔'' اجمل نے کہا اور فوراً ہی دو لنگڑے لولے شعر کہہ ڈالے۔

جب دل میں بہار نہیں، تو کیا بہار ہوگا
ام کہیں بھی ہو گا امارا زندگی دشوار ہوگا
جنت میں جانے سے پہلے ام پوچھے گا فرشتے سے
بتانا جی ذرا، وہاں جنت میں نسوار ہوگا؟

رستم منہ بنا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے ذرا سی شہ دی تو اجمل کی زبان چل پڑے گی اور پھر چلتی جائے گی۔ وہ فوراً اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے اجمل کو کریدا کہ وہاں رنگ والی کی حویلی میں شانی بی بی کے ساتھ کون سے دو خاص مہمان رہ رہے ہیں۔

اجمل خان ایک دم چکن گھڑا بن گیا اور اپنی لاعلمی ظاہر کرنے لگا۔ مگر جب رستم کا اصرار بڑھتا گیا اور اس اصرار میں تھوڑا سا غصہ بھی شامل ہو گیا تو اس نے زبان کھول دی۔

وہ کہنے لگا۔ ''رستم بھائی! ام کو شانی بہن نے بڑی سختی کے ساتھ منع کیا تھا لیکن اب آپ کو ناراض کرنا بھی امارے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لیے ام شانی بہن سے مافی مانگ لے گا۔''

''نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ تمہاری طرف سے میں خود ان کے ساتھ بات کر لوں گا۔''

چند لمحے خاموش رہ کر اجمل نے کہا۔ ''دراصل وہاں..... آپ کا بڑا بہن جی اور آپ کا

بہنوئی صیب موجود ہے۔ وہ پچھلے تقریباً تین مہینے سے حویلی میں رہ رہا ہے۔''

رستم کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو اجمل؟''

''ام ٹھیک کہہ رہا ہے جی۔ یہ سب کچھ اماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ شانی بہن کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ آپ کا بہن جی اور ان کا شوہر گجرات کے ایک تھانے میں بند ہے۔ شانی بہن آدھی رات کے وقت پورا وہاں پہنچا اور ان دونوں کو اس دیہاتی تھانیدار کے چنگل سے نکال لایا۔ اس وقت ام اور ڈولا بھی شانی بہن کے ساتھ تھے.....''

اس کے بعد اجمل نے تفصیل کے ساتھ وہ سارا واقعہ رستم کے گوش گزار کر دیا۔ رستم حیرت کے عالم میں سنتا رہا۔ یہ ساری رُوداد اس کے لیے بہت متاثر کن تھی۔ اس رُوداد میں اس بے پناہ اپنائیت کا اظہار تھا جو شانی، رستم سے اور اس کے خاندان سے رکھتی تھی۔

☆======☆======☆

اگلے دو روز سب نے شانی کے انتظار میں گزارے۔ رستم تو منتظر تھا ہی کیونکہ وہ اس کی بیوی تھی..... باقی سب بھی ایک ایک پل گن گن کر گزار رہے تھے۔ ناصر نے کوٹھی کے پہلو میں ایک پُرسکون کمرہ رستم اور شانی کے لیے تیار کرا دیا۔ کمرے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا خوب صورت برآمدہ تھا جس میں پھول دار بیلیں تھیں اور ماربل کے چمکیلے فرش پر شاندار آرام کرسیاں پڑی رہتی تھیں۔ اسی جانب آگے لان میں نیلے پانی والا چھوٹے سائز کا سوئمنگ پول بھی تھا۔ شانی نے رستم کو فون پر بتایا تھا کہ وہ ایک دن مزید لیٹ ہو جائے گی لیکن کم از کم دس روز یہاں رہے گی۔ اس نے ٹیلی فون پر ہی رستم کو یہ حیران کن اطلاع بھی دی تھی کہ اس نے اپنے ہم راز خالو کو اپنی شادی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ رستم شانی سے اس بات کا ردِعمل پوچھتا ہی رہ گیا تھا مگر اس نے کہا تھا کہ وہ یہ ردِعمل بھی آ کر ہی بتائے گی۔

اور پھر وہ سہانی شام آ گئی جب اس وسیع کوٹھی کے پورچ میں ایک ٹیکسی کار آ کر رکی۔ کار کی اگلی نشست پر حویلی کا پرانا نمک خوار خادم حسین موجود تھا۔ پچھلی سیٹ پر عام سے کپڑوں میں ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس نے ایک موٹی اوڑھنی کا پردہ کر رکھا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی رستم نے جان لیا کہ یہ بی بی ہے۔ بی بی کے ساتھ اور کچھ نہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خادم حسین نے ٹیکسی میں سے ایک اٹیچی کیس نکال لیا۔ اجمل خان نے کرایہ ادا کیا اور ٹیکسی واپس چلی گئی۔

شانی نورانی کے لباس میں تھی۔ اٹیچی کیس بھی بوسیدہ سا تھا۔ اندر آ کر اس نے اوڑھنی ہٹائی۔ کمرہ اس کے چہرے کی روشنی سے منور ہو گیا۔ رستم اور شانی کی بے تاب نگاہیں

www.pdfbooksfree.pk

ٹکرائیں۔ چند لمحوں کے لیے وہ جیسے اردگرد کی ہر شے سے بے خبر ہو گئے۔ پھر اجمل نے ہی کھنکھار کر اس محویت کو توڑا۔ ''شانی بہن! ام نے پچھلے ایک سال میں آپ کو روتے ہوئے دیکھا ہے، آج ام آپ کو ہنستے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اماری طرف سے آپ سے پُر زور درخواست ہے کہ آپ ایک بار کھل کر ہنس دے۔ امارا پیسا پورا ہو جائے گا۔''

اجمل کی بات پر شانی واقعی مسکرا دی۔ اس کے گہرے گلابی ہونٹوں کے پیچھے، اس کے موتیوں سے دانت چمک اٹھے..... لیکن اس کے ساتھ آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی بھی موجود رہی۔ اس دھوپ چھاؤں نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا۔ ڈولا بھی مسرور نظر آ رہا تھا۔ شانی نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور تھپکی دی۔

اجمل بولا۔ ''شانی بہن! اگر آپ ام سے سچ پوچھتا ہے تو کے ٹو کی طرپ ہمارے سپر (سفر) کا اصل ہیرو یہ امارا ڈولا بھائی ہی ہے۔ رستم اور ناصر بھائی کے مل جانے میں ڈولے کی کوشش میں بہت زیادہ دخل ہے۔ جی ہاں، ام سچ کہتا ہے۔ کیوں ناصر بھائی؟'' اجمل نے ناصر سے تائید چاہی۔

ناصر نے سنجیدگی سے سر ہلا کر اس بات کی تائید کی۔

اجمل بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''امارے سپر کے دوران میں ایک موقع ایسا آیا تھا جی کہ ام ایک دم مایوس ہو گیا تھا۔ ام سب ایک ٹیلے کے پاس بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ام اس برپستان میں بہت آگے نکل آیا ہے، اب ام کو واپس جانا چاپیے۔ یہی وہ وقت تھا جب ڈولے نے اپنے کانوں کی دورمین سے کچھ ایسا آوازیں سنا جو ام میں سے کوئی اور نہیں سن سکتا تھا۔ بعد میں ان آوازوں سے ہی رستم اور ناصر بھائی کا کھوج ملا۔ یہ بہت گریٹ بندہ ہے جی۔''

ڈولا سر جھکا کر شرما رہا تھا اور اجمل اس کی تعریفیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ ناصر نے کہا۔ ''بھائی! یہ تعریفیں کہیں کسی معاہدے کے تحت تو نہیں ہو رہیں۔ یعنی بعد میں ڈولا، اجمل کی تعریفیں کرنا شروع کر دے۔''

اجمل نے کہا۔ ''دیکھیں شانی بہن! پچھلے ایک ڈیڑھ سال میں یہ ناصر بھائی بالکل نہیں بدلا۔ ایک دم پہلے ہی کی طرح بے لحاظ ہے۔ ام نے اس کے لیے برپوں کے اوپر چل چل کر اپنے پاؤں کا کباڑا کر لیا ہے لیکن یہ اب بھی اماری ہر بات کا مذاق اڑاتا ہے۔ ام سے ٹھٹھا کرتا ہے۔''

''اوئے اجمل خان! یہ بھی پیار کی ایک قسم یعنی پیار کی اک ورائٹی ہے۔'' ناصر نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

''اگر یہ پیار کی ورائٹی ہے تو پھر امارے پاس بھی اس قسم کا بہت سا ورائٹی ہے۔ ام آپ کو پیار کرے گا تو آپ کا رونا نکلے گا۔ ام آپ کو سوتے میں رسے کے ساتھ باندھ دے گا، پھر آپ کے پاس بیٹھے گا اور آپ کو شاعری سنا سنا کر..... سنا سنا کر ہلکان کر دے گا۔''

ایک بار پھر سب بے ساختہ مسکرا دیئے۔ ناصر نے کہا۔ ''چھوڑیں جی اس کی باتوں کو۔ آئیں میں آپ کو آپ کا کمرہ دکھاؤں۔''

شانی نے کوٹھی کا وہ پُر آسائش حصہ دیکھا جہاں اس کی رہائش کا انتظام کیا گیا تھا۔ وہاں ہر سہولت موجود تھی۔ ایک ملازمہ بھی دست بستہ کھڑی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر شانی کو کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔ رستم کو لگا کہ وہ اس تکلف کو پسند نہیں کر رہی۔

اس نے اٹیچی کیس کھولا اور کپڑے الماری میں لٹکا دیئے۔ اس کے روزمرہ استعمال کی مختلف اشیا بھی اٹیچی میں موجود تھیں جو اس نے کمرے میں مناسب جگہوں پر رکھ دیں۔ اس کے بعد ڈریسنگ روم میں جا کر اپنا نوکرانی والا لباس بدلا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئی تو رستم دیکھتا رہ گیا۔ ہلکے رنگ کی گلابی شلوار قمیص میں وہ ایک دم قیامت دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بالوں کی موٹی چوٹی کمر کے سے نیچے تک لہرا رہی تھی۔ آدھی آستینوں کی قمیص میں سے اس کے ملائم بازو، دو موی شمعوں کی طرح دکھائی دیتے تھے اور ان موی شمعوں کی روشنی آنکھوں کے راستے سیدھی رستم کے دل پر پڑ رہی تھی۔ ان لمحوں میں وہ رنگ والی کی چوہدرانی نہیں تھی، ایک الہڑ لڑکی تھی جس کے لشکارے مارتے جسم کے اندر ایک ندی مچلتی تھی اور یہ ندی اپنے دریا کے محبوب پانیوں سے مل جانا چاہتی تھی۔

''مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟'' وہ ادا سے بولی۔

وہ جیسے چونک گیا۔ ''سوچ رہا ہوں کہ آپ حقیقت میں میرے سامنے ہیں یا یہ صرف میرا خیال ہی ہے۔''

''یہ لیں، چھو کر دیکھ لیں۔'' اس نے عجب دل ربائی سے اپنی کلائی رستم کے ہاتھ میں تھما دی۔

ست رنگی چوڑیوں سے سجی ہوئی نرم گرم کلائی، رستم کے ہاتھ میں آئی تو جیسے کائنات کی گردش تھم گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی بی بی کو اس طرح سینے سے لگائے کہ..... بس اپنے جسم کا حصہ بنا لے۔ قیامت تک کوئی انہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکے۔ ناصر کے کھنکھارنے کی آواز نے انہیں چونکایا۔ وہ برآمدے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ رستم نے بی بی کی کلائی چھوڑ دی۔

''جی اجازت ہے؟'' ناصر نے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے پوچھا۔

''آجاؤ ناصر بھائی۔'' شانی بولی۔

''خانساماں پوچھ رہا ہے کہ رات کے کھانے میں کیا ہوگا؟''

''رات کے کھانے میں جو کچھ بھی ہوگا مگر خانساماں نہیں ہوگا۔'' شانی نے کہا۔

''ہماری بھابی جان کا کیا مطلب ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''مطلب یہ ہے کہ جتنے دن میں یہاں ہوں، میں خود پکاؤں گی.....اور آپ سب کو کھلاؤں گی۔ آپ اپنی اپنی فرمائشیں ابھی سے ذہن میں موجود کرلیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ ہم آپ کو کچن میں گھسانے کے لیے یہاں لائے ہیں؟'' ناصر نے احتجاج کیا۔

''صرف کچن ہی نہیں، گھر کی باقی دیکھ بھال بھی میری ذمے داری ہے۔ میں یہ کام ملازمہ اور خانساماں کی مدد سے کروں گی اور پلیز، میرے کام میں دخل مت دیجیے گا۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' رستم نے کہا۔

''آپ تو چپ ہی رہیں جی۔ اگر کچھ بولنا ہی ہے تو مجھے صرف یہ بتائیں کہ رات کو کیا کھانا پسند کریں گے۔'' وہ کام کاج کے لیے بالکل تیار نظر آتی تھی۔

رستم اور ناصر تذبذب میں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ اپنی لمبی چوٹی کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ ''آپ کچھ نہیں بولیں گے.....چلیں، آج کے لیے میرا مینو ہی سہی۔ مجھے فوراً سے پہلے دو مرغیاں اور سلاد وغیرہ منگوا دیں۔ مٹن کا قیمہ فریج میں موجود ہے۔ میں دیکھ آئی ہوں۔ آج میں آپ کو اچار گوشت اور قیمے والے چاول کھلا رہی ہوں۔ مزہ نہ آجائے تو پیسے واپس۔''

اس نے وہیں کھڑے کھڑے ضروری اشیاء ایک کاغذ پر لکھ دیں اور یہ کاغذ خانساماں تک پہنچانے کے لیے کچن کی طرف چلی گئی۔

ناصر نے کہا۔ ''لیں جی، آپ نئے کپڑے سلوانے کی تیاری کرلیں۔ اگلے دس پندرہ روز میں آپ کو کافی موٹا ہو جانا ہے۔''

''لگ تو مجھے بھی ایسا ہی رہا ہے۔'' رستم ہولے سے مسکرایا۔

''اور.....ہاں.....منا کیوں نہیں آیا شانی بھابی کے ساتھ؟''

''تین دن بعد چوہدری اعجاز آئیں گے۔ وہ ان کے ساتھ آئے گا۔ بی بی چھپ چھپا کر آئی ہیں۔ تم نے دیکھا ہی ہے، وہ نوکرانی کے کپڑوں میں تھیں۔''

''وہ ملازم جو ساتھ آیا ہے، یہیں رہے گا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''نہیں۔ کل واپس چلا جائے گا۔ اس کا نام خادم حسین ہے۔ وہ حویلی کا پرانا وفادار ہے۔''

''آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم از کم اس ملازم کو اور چوہدری اعجاز کو تو آپ دونوں کی شادی کا علم ہو ہی چکا ہے۔''

''نہیں.....ملازم کو نہیں.....صرف چوہدری اعجاز کو۔ چوہدری اعجاز کی حیثیت شانی کے رازداں کی سی ہے۔''

شانی گھر میں آتے ہی یوں گھومنے پھرنے لگی تھی جیسے وہ عرصے سے یہاں رہ رہی ہو۔ اس نے سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ خانساماں اور ملازمہ بڑی خوشی اور محبت سے اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس میں ایک مقناطیسی کشش تھی جو بہت جلد دوسروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ ''بیگم جی.....بیگم جی'' کہتے ہوئے ملازمہ کا منہ سوکھ رہا تھا.....رات کا کھانا مزیدار و پُرتکلف تھا۔ ساتھ ساتھ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ناصر اور اجمل میں نوک جھونک بھی ہوتی رہی۔ سب سے دلچسپ کردار زری کا تھا۔ وہ ہر کام کو بچکانا حیرت سے دیکھتی تھی اور ناصر کی ہدایت کے مطابق اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے پہلے ایک سالن والا ڈونگا الٹا پھر اجمل کی پلیٹ کو ڈونگا سمجھ کر اس میں موجود ساری بوٹیاں اپنی پلیٹ میں منتقل کیں۔ اس کے بعد خانساماں کی شلوار کے لٹکتے ہوئے ازار بند کو کھینچ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس سے پانی مانگا۔ اس کی ان حرکتوں کی وجہ سے بغیر لطیفہ بازی کے ہی یہ محفل ہنستی مسکراتی رہی۔

کے ٹو کے سفر کی رُوداد طویل تھی تاہم اس کے چیدہ چیدہ حصے شانی کے گوش گزار کیے گئے۔ یہ ساری باتیں شانی کے لیے ناقابلِ یقین تھیں۔ اگر انہیں بیان کرنے والے رستم اور ناصر نہ ہوتے تو وہ شاید ان واقعات کو ذہن کی تصوراتی بھاگ دوڑ سمجھتی۔ پاؤندہ قبیلے کے عجیب و غریب رواج، خون ریز قبائلی لڑائی، خونی تماشے اور گارنیوں کی قربانی.....یہ سارے واقعات حیرت زدہ کر دینے والے تھے۔ رستم اور ناصر خود کو ان قدیم مہم جوؤں کی طرح محسوس کر رہے تھے جو طویل سفر کے بعد اپنے وطن واپس لوٹتے تھے اور پھر سرد راتوں میں آتش دانوں کے سامنے بیٹھ کر انجانی زمینوں کے قصے بیان کرتے تھے۔

☆======☆======☆

رات سہانی اور دلفریب تھی۔ رستم سرتاپا عشق تھا اور اس کا محبوب سرتاپا حسن اور وقار اس

www.pdfbooksfree.pk

کے سامنے تھا۔ وہ ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ چوڑیوں کی کھن کھن سانسوں کی آہٹ کے ساتھ مل کر بُسم کی خوشبو سے سرگوشیاں کر رہی تھی۔

''کیوں پیار کرتے ہیں مجھ سے اتنا؟'' شانی نے رستم کے کان میں جذباتی سرگوشی کی۔

''میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ آپ اپنے دل سے پوچھیں۔'' رستم نے کہا۔

''میں نے پوچھا ہے۔''

''پھر؟''

''میرے پاس بھی کوئی جواب نہیں۔'' وہ رستم کی بانہوں میں کچھ اور سماتے ہوئے بولی۔

نیم تاریک کمرے میں سانسوں کی آہٹ سنائی دیتی رہی۔ خدا کی پیدا کی ہوئی محبت اپنے حسین اور زور آور ترین روپ میں دو انسانوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھی۔

''مجھے یاد کرتے تھے نا؟'' وہ اَشک بار آواز میں بولی۔

''اس سوال کا جواب بھی خود سے پوچھیں۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ کئی سیکنڈ گزر گئے۔ رستم نے سرگوشی کی۔ ''کیا سوچ رہی ہیں؟''

وہ ہولے سے ہنسی اور بھیگے لہجے میں بولی۔ ''اپنے آپ سے، سوال کا جواب پوچھ رہی تھی۔''

''پھر کیا جواب ملا۔''

''ہاں..... آپ یاد کرتے تھے۔''

''کب کب؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ آپ بتائیں۔''

رستم نے کئی بار اپنی محبوب شریکِ حیات کے ہونٹ چومے اور جذباتی انداز میں بولا۔

''جب جب سورج نکلا، جب جب رات آئی اور تارے چمکے۔ جب جب صبح ہوئی..... اور پتا ہے، اس کے علاوہ کب کب؟''

''بتائیں!''

''جب جب میں نے سانس لی۔ مجھے زیادہ لفظ نہیں آتے شانی! لیکن میں سچ کہتا ہوں، میں نے ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ آپ کو یاد کیا ہے اور آپ سے پھر ملنے کی دعا کی ہے۔ اس عرصے میں کئی ایسے سخت موقعے بھی آئے جب بندے کو زندگی سے بڑھ کر موت اچھی لگنے لگتی ہے لیکن مجھے پھر بھی زندگی ہی اچھی ہی لگتی رہی۔ کیونکہ..... مجھے آپ سے ملنا

تھا۔''

شانی نے بے پناہ محبت کے ساتھ رستم کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے اپنی پلکوں سے اس کے جسم کے سارے کٹاؤں کو چن لیا۔ وہ ایک تپتے ہوئے صحرا سے..... گھنگھور گھٹا بن کر ملی اور اس کے نشیب و فراز سے دکھوں کی گرد کو بہا کر لے گئی۔ اس کی محبت دہری تاثیر رکھتی تھی۔ اس میں جذبوں کی حدت تو تھی مگر ایک مرہم کی سی ٹھنڈک بھی تھی اور یہ ٹھنڈک رستم کے ہر آتشیں زخم کو ڈھانپتی چلی جا رہی تھی۔

کہتے ہیں، غم آنسوؤں کی بنیاد ہوتا ہے یا پھر کبھی کبھی بے پناہ خوشی میں بھی آنکھیں اپنے موتی لٹانے لگتی ہیں..... مگر یہاں آنسو محبت کے عمل سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ محبت کر رہی تھی اور رو رہی تھی۔ اس کی محبت بھی انوکھی اور غیر معمولی تھی۔ ان سحر انگیز طلسماتی لمحوں میں رستم نے سوچا، اگر وہ کسی قدیم زمانے میں پیدا ہوتی تو شاید سچ مچ ایک دیوی ہوتی۔ اس کو نگاہوں سے سجدے کیے جاتے اور دلوں کے معبدوں میں اس کی پرستش کی جاتی اور یہاں اس کمرے کے نیم تاریک ریشم میں یہ دیوی اپنی تمام تر چاہت و خود سپردگی کے ساتھ اس پر مہربان تھی۔ رستم نے اپنی آنکھیں بند کر کے خود کو اس میں گم کر دیا۔

صبح ہمیشہ سے زیادہ سہانی اور دل رُبا تھی۔ ہر شے سے خوشی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ رستم دیر تک کوٹھی کی وسیع چھت پر ٹہلتا رہا اور اپنے اردگرد موجود مسرت کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والے چند دن بڑے سہانے ہیں۔ ایسے چند دنوں پر ایک نہیں کئی زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ چھت پر رکھی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک کسی نے عقب سے آ کر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ خوشبو کے جھونکے نے بتا دیا کہ وہ کون ہے۔

''آپ کو بھی نہ پہچانوں گا تو پھر اور کسے پہچانوں گا۔''

''میں نے اپنی شناخت کروانے کے لیے آپ کی آنکھیں بند نہیں کی ہیں۔'' وہ ادا سے بولی۔

''تو کس لیے کی ہیں؟''

''بس میری مرضی۔'' وہ اس کی پشت سے کھڑی ہوگئی اور اپنی ٹھوڑی رستم کے سر سے ٹکا دی۔

''اب میں کیا کروں؟'' رستم زیرِ لب مسکرایا۔

''بس مجھ سے باتیں کریں..... اسی طرح۔'' وہ ذرا شوخی سے بولی۔

www.pdfbooksfree.pk

''آپ کی پہلی ادائیں ہی میری جان نکالنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ نئی ادا کیوں ڈھونڈ لی ہے۔''

وہ کچھ دیر اسی طرح کھڑی رہی پھر رستم کی آنکھیں آزاد کر کے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ اب سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر شرم کا رنگ خود بخود چہرے کو ڈھانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں شاید بیتی ہوئی شب کے مناظر تھے۔

''آپ بڑی خوب صورت لگ رہی ہیں۔'' رستم نے بے ساختہ کہا۔

اس نے دائیں بائیں دیکھا اور بولی۔ ''آپ سے ایک بات کہوں؟''

''اب بھی اجازت کی ضرورت ہے؟''

''یہ بات تو اب ہم سب مان چکے ہیں کہ ڈولے کی حسیں بہت تیز ہیں۔ وہ بہت مدھم آوازیں بھی سن لیتا ہے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اسی چار دیواری میں موجود ہے۔ یہ جو آپ دل دھڑکانے والی باتیں کرتے ہیں، کہیں ڈولے کے کانوں تک نہ پہنچ جاتی ہوں۔''

''ایسی باتیں میں بہت مدھم آواز میں کرتا ہوں۔ پھر بھی آپ کو اندیشہ ہے تو ڈاکٹر ناصر سے کہہ کر ڈولے کے کانوں کا آپریشن کروا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ڈاکٹر ناصر کا بھی مسئلہ ہے۔ اس نے بھی تو زری سے ایسی باتیں کرنا ہوتی ہیں۔''

دونوں ہنس دیئے۔ شانی نے اپنے بالوں کو پیچھے اُڑسا اور قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''رستم! مجھے زری اور ناصر کا اس طرح اکٹھے رہنا اچھا نہیں لگا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟''

''شانی! میں ناصر کو اب بہت اچھی طرح جاننے لگا ہوں۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جس پر آنکھیں بند کر کے ہر طرح کا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ پاؤندہ بستی میں ہوا وہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں لیکن اب ناصر اور زری کے درمیان کوئی ایسا غلط تعلق نہیں ہے۔ ایک کمرے میں رہنے کے باوجود اس سلسلے میں بے حد احتیاط اور برداشت کا مظاہر کرتا ہے۔''

شانی نے پُرسوچ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ ''کیا ناصر..... اس کے بارے میں سنجیدہ ہے؟''

''ایک سو دس فیصد.....! میں اس کی سوچ سے بڑا متاثر ہوا ہوں شانی! وہ ایک سنگین اتفاق تھا جس کی وجہ سے زری، ناصر کی زندگی میں آئی۔ اس میں ناصر کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس واقعے کو ایک رات کا..... یا دو تین راتوں کا کھیل سمجھ کر بھول سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے ایک کھرا مرد ہونے کا ثبوت دیا ہے شانی! اور اب میں چاہتا ہوں کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے، وہ پورا ہو۔''

''کیا یہ لڑکی مسلمان ہے؟''

''یہ ابھی کچھ بھی نہیں ہے۔ سمجھیں کہ ایک کورے کاغذ کی طرح ہے۔ ہم اس پر جو کچھ لکھ دیں گے..... لکھا جائے گا۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا، ابھی تو اس کی حرکتیں بھی جنگلیوں جیسی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے فریج کا دروازہ کھول کر اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی تاکہ ٹھنڈک محسوس ہو۔ ناصر اسے آہستہ آہستہ اٹھنا بیٹھنا اور بات کرنا سکھا رہا ہے۔''

''ہاں..... وہ مردوں کی طرح بولتی ہے، میں کھاتا ہوں، میں سوتا ہوں۔''

''اس کی اچھل کود بھی مردوں جیسی ہے۔ وہاں پاؤندہ بستی میں یہ اونچی اونچی دیواروں کو پھاند جاتی تھی اور درختوں پر چڑھ جاتی تھی.....''

رستم شانی کو زری کے بارے میں بتاتا رہا۔ وہ کبھی حیران ہوتی رہی، کبھی مسکراتی رہی۔ پھر گفتگو کا رخ رستم کی بہن آپو زاہدہ اور بہنوئی اکرام کی طرف ہو گیا۔ رات کو بھی ان دونوں نے اس بارے میں دیر تک بات کی تھی۔ رستم شانی کا بے حد احسان مند تھا کہ اس نے ایک نہایت مشکل وقت میں نہ صرف آپو زاہدہ کی مدد کی بلکہ انہیں اپنی حویلی میں محفوظ ٹھکانا بھی مہیا کیا۔ رستم نے آپو زاہدہ، بھائی اکرام اور دونوں بچوں کے حالات تفصیل کے ساتھ شانی سے پوچھے۔ آخر میں وہ شانی کے ہاتھ تھام کر بولا۔ ''میں کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں؟''

''آپ اس بارے میں اپنا پیارا سا منہ بند رکھ کے میرا شکریہ ادا کر سکتے ہیں۔'' وہ بھی محبت بھرے لہجے میں بولی۔ پھر تھوڑے سے توقف کے ساتھ اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''رستم! آپ ایسی بات کیوں کرتے ہیں؟ اب ہم دو تو نہیں۔ آپو زاہدہ اور بچوں کا مجھ پر بھی اتنا ہی حق ہے جتنا آپ پر ہے۔''

سیڑھیوں پر قدموں کی تیز آہٹ سنائی دی۔ رستم نے جلدی سے شانی کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اجمل، ڈولا اور زری اور ناصر وغیرہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آ گئے۔ وہ رستم اور شانی کے اردگرد بیٹھ گئے۔ پہلے تو شانی کے رات والے کھانے کی تعریف ہوتی رہی پھر اجمل خان نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا کہ ہفتے میں کم از کم دو بار وہ کھانا خود پکائے گا۔ اس نے کہا۔ ''آپ سب اچھی طرح جانتا ہے کہ ام بہت اچھا کک ہے۔ یہ اماری کمری کا توہین ہے کہ امارے ہوتے ہوئے صرف شانی بہن ہی کچن میں گھسا رہے۔''

ناصر نے کہا۔ ''تمہاری اپنی توہین ہونے سے بہتر ہے کہ تمہاری کمری کی توہین ہو جائے۔ اگر تم نے برا کھانا پکایا یا اس میں سے نسوار کی بُو آئی تو کم از کم مجھ سے تو برداشت نہیں ہو گا۔ میں باقاعدہ تمہیں مار بیٹھوں گا اور مجھے یقین ہے اس کارِ خیر میں دیگر بھی میرا ساتھ دیں

www.pdfbooksfree.pk

گے۔''

''ناصر! یہ تم زیادتی کر رہے ہو۔'' شانی نے مسکراتے ہوئے ٹوکا۔ ''اجمل خان کے دادا واقعی بہت اچھے cook تھے اور انگریز صاحبوں کا کھانا پکاتے تھے۔''

''انگریزوں کے برصغیر سے جانے کی وجہ بھی تو یہی تھی۔'' ناصر نے فوراً پہلے سے سوچا ہوا جواب دیا۔

اجمل نے ناصر کو گھونسا دکھایا۔ اس سے پہلے کہ ان میں تُو تکرار شروع ہوتی، رستم نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب نے اچانک چھت پر چڑھائی کیسے کر دی؟ کوئی خاص بات ہے؟''

''ایک سے زیادہ خاص باتیں ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''دراصل سب چاہ رہے ہیں کہ کوئی تفریح وغیرہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ہم اس چار دیواری سے باہر تو نہیں جا سکتے۔ یہیں پر جو کچھ مہیا ہے، اس سے تفریح کے مواقع پیدا کیے جائیں۔''

''مثلاً کیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''کوٹھی کے پچھلے لان میں سیمنٹ کی پچ بنی ہوئی ہے۔ لان کی گھاس وغیرہ کٹوا کر وہاں صفائی کروائی جائے۔ ہم وہاں ٹینس بال سے کرکٹ کھیل سکتے ہیں۔ اجمل خان بہت اچھا باؤلر بھی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ بندوق کے نشانے کی طرح ہر بال کو درمیان والی وکٹ پر مار سکتا ہے۔''

''ام نے کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ہاں، ام بری بھلی کرکٹ کھیل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ امارا رائے ہے کہ سوئمنگ پول کا پرانا پانی نکال کر اس میں تازہ بھرا جائے۔ اس کا دو دو پائدہ ہوگا۔ ایک تو ام تیر سکے گا، دوسرے ام سے کرکٹ میچ ہارنے کے بعد ناصر بھائی کو خودکشی کرنے کا سہولت رہے گا۔'' ناصر جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا مگر شانی بول پڑی۔

• ''لیکن مجھے تو کرکٹ کھیلنا نہیں آتی۔'' شانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور زری کو بھی کچھ پتا نہیں۔'' ناصر نے کہا۔

اجمل نے فوراً کہا۔ ''زری کو آپ ہر الٹا سیدھا کام سکھا رہا ہے ناصر بھائی۔ کرکٹ بھی سکھا لے گا۔ باقی رہے شانی بہن کی بات تو شانی بہن ایمپائر کے پرائض انجام دے سکتا ہے۔''

اس مرتبہ ناصر نے اجمل کو مکا دکھایا۔ شانی نے کہا۔ ''چلو کرکٹ بھی ٹھیک ہے لیکن کوئی ایسا کھیل ہونا چاہیے جس میں کسی سامان وغیرہ کی ضرورت نہ پڑے اور اس میں ہر کوئی آسانی

سے حصہ لے سکے۔ خانساماں ظفر اور ملازمہ حمیدن وغیرہ بھی ہیں۔ ہمیں ان کو اپنی تفریح میں شریک کرنا چاہیے۔''

''ایسا کوئی کھیل ہو سکتا ہے جی۔ مثلاً..... مثلاً رسا کشی۔'' اجمل نے کہا۔

''اوئے! رسا کشی میں رسا نہیں چاہیے؟'' ناصر نے چہک کر کہا۔ ''مجھے لگتا ہے اجمل، تیری عقل گھاس چرنے گئی ہوئی ہے۔ شانی بی بی کہہ رہی ہیں، کوئی ایسا کھیل جس میں سامان کی ضرورت نہ ہو۔''

''تو پھر درختوں پر چڑھنے کا مقابلہ کر لو۔'' اجمل جل کر بولا۔ ''وہاں باغ میں جامن کا دو درخت ساتھ ساتھ کھڑا ہے اور ایک جتنا لمبا ہے، ام کو یقین ہے اس مقابلے میں آپ کا بیہ ''زری بیگم'' ایک دم پسٹ (فرسٹ) آئے گا۔ پلک جھپکتے میں یہ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر چڑھ کر بیٹھ جائے گا اور وہاں سے جامن توڑ کر کچر کچر کھائے گا اور اماری طرف پھینکے گا۔''

''دیکھو اجمل خان!'' ناصر انگلی اٹھا کر دہاڑا۔ ''تم عورتوں کو درمیان میں مت گھسیٹو۔ یہاں گولیاں چل جائیں گی، لاشیں تڑپتی نظر آئیں گی۔''

''تم پہلے اپنا اردو درست کرو ناصر بھائی۔ لاش کبھی نہیں تڑپتا..... کیونکہ وہ تو لاش ہوتا ہے۔ ہمیشہ زخمی تڑپتا ہے۔''

''بس یہ اپنے اپنے علاقے کا رواج ہے۔'' ناصر نے تیوری چڑھا کر کہا۔ ''اور اصل بات کی طرف سے میرا دھیان مت ہٹاؤ۔ اصل بات یہ ہے کہ تم دن بدن بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔''

''ہاں بھئی! اس کی تصدیق تو میں بھی کرتا ہوں۔'' رستم نے گفتگو میں حصہ لیا۔ ''ہم زری کو درختوں وغیرہ سے اُتارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تم اسے چڑھانے کی بات کر رہے ہو۔''

''لیکن آپ جانتا ہے رستم بھائی کہ پہلے چھیڑ خانی ناصر بھائی ہی کرتا ہے۔''

''اچھا چلو چھوڑو ان باتوں کو..... پروگرام بناؤ کیا بنانا ہے۔'' شانی نے کہا۔

سب سنجیدگی سے مشورہ دینے میں مصروف ہو گئے۔ اگلے چند روز کے لیے کھانے، پینے اور تفریح وغیرہ کا ایک اچھا سا شیڈول بن گیا۔ اجمل خان کی یہ بات بھی مان لی گئی کہ ہر دن کے بعد اسے اپنی مرضی کا کھانا بنانے اور کھلانے کا موقع ملے گا۔

اسی دوران میں ملازمہ حمیدن ایک بڑی ٹرے میں تازہ اورنج جوس سے بھرے ہوئے

www.pdfbooksfree.pk

گلاس لے کر آ گئی۔ وہ سب جوس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ گلاسوں میں اسٹرا موجود تھے۔ وہ اسٹراز کی مدد سے پینے لگے۔ زری بھی پینے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے وہی کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ اسٹرا کو منہ سے لگا کر اس نے گلاس کو بھی اوپر اٹھایا۔ جوس گر گیا اور اس کے گریبان سے ہوتا ہوا نیچے تک چلا گیا۔ اجمل اور رستم نے یہ مشکل اپنی ہنسی روکی۔ ناصر ٹپٹپایا۔ پہلے اس نے رومال سے اس کی گردن صاف کرنے کی کوشش کی پھر سمجھ گیا کہ یہ کام مشکل ہے۔

''چلو جاؤ کمرے میں..... خود کو صاف کر کے آؤ۔'' ناصر پیار سے اس کا کان کھینچتے ہوئے بولا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی مگر پھر کمرے کی طرف جاتے ہوئے رک گئی۔ ''تم بھی آؤ..... مجھ سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''ہاں ہاں جاؤ ناصر بھائی۔'' اجمل کے لہجے میں دبی دبی شرارت تھی۔ ناصر اسے گھورتا ہوا زری کے پیچھے چلا گیا۔

زندگی بڑی انوکھی اور عجیب شے ہے۔ یہ ہر حال میں خوشی اور غم کے موقعے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ بدترین دکھوں کے سمندر میں بھی سکون اور خوشی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے ملتے رہتے ہیں۔ سنگین ترین حالات میں بھی لوگ وقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے خوشی کشید کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ وہ کچھ دیر کے لیے ماضی اور مستقبل سے کٹ جاتے ہیں اور صرف حال کی خود فراموشی میں زندہ رہتے ہیں۔

رستم، ناصر، شانی اور اجمل وغیرہ کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ وہ جانتے تھے کہ خطرات اور آلام چاروں طرف سے انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ قدرت اللہ کے ہرکارے شانی کے خون کی پیاس لے کر اسے تلاش کرتے پھر رہے ہیں.....

اس دن شانی نے رستم اور ناصر کی فرمائش پر شملہ مرچ اور قیمہ بنایا۔ یہ ڈش وہ اکثر روکیٹ میں بھی بناتی رہی تھی۔ سب بہت پسند کرتے تھے۔ حتیٰ کہ بے جی اور چاچا ابراہیم کو بھی یہ پسند تھی۔ شملہ مرچ کی خوشبو جب کچن میں پھیلی تو رستم اور شانی کو وہ دونوں مہربان چہرے بہت یاد آئے۔ بے جی اور چاچا ابراہیم رستم اور شانی کو بھی اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھنے لگے تھے..... ان کے علاوہ نور عباسی، شریف، شریف کے بیٹے، نوید یا ہتا جوڑا سانگرا اور چندو، سب محبت کرنے والے لوگ تھے۔ اس دن چھوٹے سے سوئمنگ پول میں تازہ پانی بھرا گیا۔ اجمل اور ناصر نے دیر تک تیراکی کی۔ شام کو ہلکی پھلکی کرکٹ کھیلی گئی۔ اجمل کا نشانہ

واقعی کمال کا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے گیند کے ساتھ درمیانی وکٹ کو ہٹ کر لیتا تھا۔ ''تمہارا نشانہ واقعی اچھا ہے اجمل۔'' ناصر نے تعریف کی۔

''نشانہ تو تمہارا بھی اتنا برا نہیں ناصر بھائی۔'' اجمل نے زری کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

''لیکن نہاتے ہوئے تم ایک نمبر کے گاؤدی لگتے ہو۔ پورا تالاب ہلا دیتے ہو۔ لگتا ہے کہ ایک نہیں سات آٹھ بندے تیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ناصر نے جوابی وار کیا۔

''ایک تو آپ پورا نہاتے ہیں ناصر بھائی۔'' اجمل مسکرایا۔

اسی دوران میں شانی تیزی سے آئی۔ اس کے چہرے پر خوشی تھی اور کان کے ساتھ موبائل لگا ہوا تھا۔ اس نے اعلان کیا۔ ''لندن سے گریس کا فون ہے۔''

اس موقع پر گریس کے فون نے ان کی خوشی میں اضافہ کیا۔ سب نے گریس کے ساتھ تھوڑی تھوڑی بات کی۔ رستم سے گریس کی بات ذرا طویل تھی۔ گریس کے ساتھ رستم کی آخری ملاقات مری کے نواح میں گورے کے بنگلے میں ہی ہوئی تھی۔ وہ بڑے تشویشناک حالات تھے۔ اسٹیفن وغیرہ رستم کی ٹانگ کا زبردستی آپریشن کرنے والے تھے۔ اس آپریشن میں خطرات بہت زیادہ اور امکانات بہت محدود تھے۔ گریس کو علم ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر اسٹیفن، رستم کے ساتھ کتنا خطرناک کھیل کھیلنے جا رہا ہے۔ وہ رستم کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی تھی مگر اسٹیفن اس دیوار کو توڑتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

گریس نے اردو آمیز انگلش بولی اور رستم سے اس کی خیر خیریت دریافت کی۔ خاص طور سے اس کی ٹانگ کے بارے میں سوالات پوچھے۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھی کہ بالآخر رستم پھر اپنوں کے پاس واپس آ گیا ہے۔ اسے خصوصی مسرت اس بات کی تھی کہ اس وقت بھی رستم اور شانی ایک ساتھ ہیں۔

رستم نے اس کا حال احوال پوچھا۔ اسے اب اسٹیفن کے مرنے جینے سے کوئی غرض نہیں تھی، وہ اس کی زندگی سے نکل چکا تھا۔ وہ لندن میں اپنے بیٹے ڈیوس کے ساتھ خوش تھی۔ گریس کے ساتھ بات کر کے رستم نے فون ایک بار پھر شانی کو دے دیا۔ دونوں پھر بات کرنے لگیں۔ رستم نے کن انکھیوں سے شانی کا چہرہ دیکھا۔ گاہے گاہے اس کے چہرے پر شرم کا ہلکا سا عکس ابھر آتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ گریس، رستم کے حوالے سے ہی بات کر رہی ہو گی۔ گریس، شانی کی بے حد مخلص دوست تھی اور دوست ہی نہیں دو پنا پدل بہن بھی تھی۔ اسی نے شانی کے دل میں پھر سے زندگی کی جوت جگائی تھی اور اسے سمجھایا تھا کہ انسان کے نصیب

www.pdfbooksfree.pk

میں وہی کچھ ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر حاصل کر لیتا ہے۔ روکیٹ بستی میں شانی اور رستم کی شادی کی جتنی خوشی گریس کو ہوئی تھی، اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں تھا۔

شانی گریس سے باتیں کرتی اور اپنے چہرے کے رنگ چھپاتی کمرے کی طرف چلی گئی۔

.....ایک اور رات نے انہیں اپنی نرم گرم بانہوں میں لے لیا۔ وہ دیر تک کھڑکی میں بیٹھے رہے۔ آسمان کو تکتے رہے۔ چاند ننھے مُنے تاروں کے جھرمٹ میں بیٹھا تھا۔ اس نے جیسے کوئی طویل دلکش کہانی چھیڑ رکھی تھی جس میں نیلی جھیلوں کا ذکر تھا.....موتیوں سے بنے ہوئے غار تھے اور وادیوں میں ریشم کی طرح بہنے والی ہواؤں کا تذکرہ تھا۔

ایک ایسی کہانی جس میں گرم صحراؤں کے قاتل دن بھی تھے اور برسات کی ایسی راتیں بھی، جن کی رم جھم میں محبت کے لافانی نغمے گونجا کرتے ہیں۔ تارے سن رہے تھے اور حیرت سے پلکیں جھپکا رہے تھے۔ رستم اور شانی بھی سنتے رہے، چاند کی کہانی بھی اور ایک دوسرے کے دلوں کی دھڑکنیں بھی۔ پھر انہوں نے کھڑکی بند کر دی اور صرف ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک دوسرے میں کھو گئے.....گم ہو گئے۔ رستم سوچتا رہا۔ جو کچھ ہو رہا ہے، کیا اس نے کبھی اپنے کسی حسین ترین خیال میں بھی یہ سوچا تھا؟ وہ ایک ڈاکو تھا۔ اس کی زندگی گناہوں میں لتھڑی ہوئی تھی۔ شانی ایک پاکیزہ روح تھی، ایک دیوی تھی.....جس کے پاؤں چھونے کو دل مچلتے تھے اور وہ سرتاپا اس کی بانہوں میں تھی۔

☆======☆======☆

شانی صبح دیر سے اٹھی۔ رستم تب تک سو رہا تھا۔ وہ کروٹ کے بجائے سیدھا لیٹا تھا۔ شانی نے کہیں سن رکھا تھا، پُر اعتماد اور مضبوط اعصاب کے مالک لوگ سیدھے سوتے ہیں۔ اس کی چوڑی چھاتی سانسوں کے زیر و بم سے متحرک تھی۔ لمبے بالوں کی کچھ لٹیں اس کی پیشانی پر بکھری تھیں۔ ایک محبت بھری طمانیت اوتری تھی اس کے چہرے پر۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی مجرم کا چہرہ ہے۔ وہ بڑی محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اسے ڈر لگا کہ کہیں رستم کو اس کی نظر ہی نہ لگ جائے۔ مرحومہ ماں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ کہا کرتی تھیں، نظر اپنوں کی ہی لگتی ہے۔

اس نے بڑے ہولے سے ایک کھڑکی کا پردہ ہٹا کر اس کے پٹ کھول دیئے اور اپنے ریشمی منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی باہر برآمدے میں نکل آئی۔ برآمدے میں اس کی نظر سب سے پہلے دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر پڑی۔ اسے یاد آ گیا کہ آج اسے کیا کرنا ہے۔ وہ پچھلے چار پانچ

روز سے اس بارے میں سوچ رہی تھی۔ آج رستم کی تاریخ پیدائش تھی۔ اس تاریخ کا پتا شانی کو رستم کی بڑی بہن آپوزاہدہ سے لگا تھا۔ وہ آج رستم کو چھوٹا سا سرپرائز دینا چاہتی تھی اور اسے خوشی تھی کہ ناصر، اجمل اور ڈولا وغیرہ بھی یہاں موجود ہیں۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق آج کچن میں اجمل خان کا حکم چلنا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ آج وہ خاص افغانی پلاؤ بنائے گا اور اس پلاؤ کو کھانے کے بعد باقی تمام قسم کے پلاؤ ان کی زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے خارج ہو جائیں گے۔ اس کے لیے اجمل کو دنبے کا گوشت درکار تھا۔ اس گوشت کے لیے اس نے کل سے خانساماں کو دوڑایا ہوا تھا۔ خانساماں کے لیے حکم یہ تھا کہ اگر دنبے کا گوشت نہ ملے تو پورا جیتا جاگتا دنبہ لے آئے۔ ناصر نے اس میں اضافہ کیا تھا کہ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دو کم از کم دنبے کی چکی ضرور اُتار کر لے آئے۔ کل کی طرح آج بھی ایک مصروف اور رنگا رنگ دن کی تیاری تھی لیکن شانی اس سے پہلے ایک چکر بازار کا ضرور لگانا چاہتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ رستم کو اس کی سالگرہ پر کوئی بہت اچھا تحفہ دے سکے۔

گیارہ بارہ بجے کے قریب وہ دوبارہ کمرے میں گئی۔ رستم سکون سے سو رہا تھا۔ اس نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اپنا شولڈر بیگ لیا۔ چادر کے نقاب میں چہرے کو مکمل طور پر چھپایا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

''اجمل نے پوچھا۔ ''خو آپ کہاں جا رہی ہیں؟''

''بس ذرا انارکلی تک۔ ضروری کام تھا۔''

''لیکن آپ اکیلا جائے گا؟''

''کوئی مسئلہ نہیں اجمل۔ بس ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ جاؤں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ آج دوپہر کا کھانا ڈھائی تین بجے ہی کھایا جائے گا۔ تب تک واپسی ہو جائے گی۔ اگر تمہارے بھائی پہلے جاگ گئے تو ان سے چائے وغیرہ پوچھ لینا۔''

اجمل نے نیکسی گیٹ پر ہی منگوا دی۔ شانی پہلے لبرٹی گئی۔ وہاں سے رستم کے لیے شلوار قمیص کے چند جوڑے خریدے، پھر سالگرہ کے تحفے کے لیے انارکلی چلی گئی۔ یہ ایک خوشگوار دن تھا۔ لاہور کی چہل پہل دل آویز تھی۔ وہ سوچنے لگی، کیا وہ کبھی رستم کے ساتھ آزادانہ ان بارونق بازاروں میں گھوم پھر سکے گی.....جب وہ انارکلی کی ایک معروف دکان میں داخل ہو رہی تھی، اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف خالو اعجاز تھے۔ ان کی آواز میں بہت عجلت تھی۔ ''کہاں ہو شانی بیٹا؟'' انہوں نے پوچھا۔

''مم.....میں ذرا بازار میں آئی ہوئی ہوں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''کہاں؟'' انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

''انارکلی میں۔ خیریت تو ہے ناں خالو جی؟''

''ہاں خیریت ہی ہے۔ میں یہاں سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ راوی کا پل پار کر چکا ہوں۔ تمہاری طرف ہی آ رہا ہوں۔ تم ایسا کرو..... تم یہیں پر رہو انارکلی میں..... میں سیدھا تمہارے پاس ہی آتا ہوں..... انارکلی میں کس جگہ پر ہو تم؟''

''بانو بازار کے بالکل سامنے۔''

''بس ٹھیک ہے، تم ادھر ہی رہو۔ میں پہنچ رہا ہوں تمہارے پاس۔''

''لیکن خالو..... بات کیا ہے؟''

''میں آ کر بتاتا ہوں.....'' اس کے ساتھ ہی لائن میں شور ہوا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

شانی پاس ہی ایک چھوٹے سے اسٹیک بار میں جا کر بیٹھ گئی۔ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ خالو اعجاز آدھ پون گھنٹے میں ہی وہاں پہنچ گئے۔ ان کی چوڑی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ انہوں نے شانی کو نہیں پہچانا، وہ خود ہی ان کے پاس چلی گئی۔

''کیا بات ہے خالو جان! آپ گھبرائے ہوئے ہیں۔'' شانی نے اپنا نقاب ہٹائے بغیر پوچھا۔

وہ بولے۔ ''تمہیں ابھی واپس رنگ والی چلنا ہوگا..... میرے ساتھ۔''

''وہ کیوں؟''

وہ جوش کے ساتھ اس کا بازو دباتے ہوئے بولے۔ ''لگتا ہے تیری قسمت بہت زور مار رہی ہے شانی۔ تیرے لیے کامیابی کے دروازے کھل رہے ہیں۔ پتا ہے، آج شام چار بجے رنگ والی میں تم سے ملنے کون آ رہا ہے؟''

''کون آ رہا ہے؟''

''سرفراز قزلباش..... یہ وہ بندہ ہے جس شے کی طرف بھی نظر اٹھاتا ہے، سونا بن جاتی ہے۔ اس سے ملنے کے لیے اہم ترین لوگوں کو بھی ہفتوں انتظار کرنا پڑتا ہے اور جتنا بڑا اس شخص کا نام ہے، اتنا بڑا کردار بھی ہے۔ اپنے پرائے اس کی خدا ترسی اور نیکی کی تعریف کرتے ہیں۔ آج صبح سویرے اس کا فون آیا تھا۔ میں تو فون پر اس کی آواز سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ ہماری حویلی میں سرفراز صاحب کی آواز گونج رہی ہے۔ انہوں نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ یہاں ہماری حویلی میں آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر میں کہہ دیتا کہ تم حویلی میں نہیں ہو تو ان کا ارادہ بدل بھی سکتا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ

تم حویلی میں ہی ہو۔ انہوں نے کہا کہ وہ آج شام کی چائے ہمارے ساتھ پئیں گے۔'' چوہدری اعجاز کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔

''او ہو خالو جی! آپ نے مجھ سے پوچھ تو لینا تھا۔'' شانی جز بز ہو کر بولی۔

''اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔ ہمیں اب فوراً واپس چلنا ہوگا۔ ایک منٹ کی دیر بھی نہیں کرنی ہوگی۔ ورنہ ہم سب جھوٹے پڑ جائیں گے۔''

''لیکن خالو.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' انہوں نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ ''سرفراز صاحب سے ملنے کے بعد اگر تم واپس لاہور آنا چاہو گی تو میں تمہیں خود چھوڑ جاؤں گا۔ سرفراز صاحب سے ملاقات زیادہ لمبی نہیں ہوگی۔ ان لوگوں کے پاس تو وقت ہی نہیں ہوتا۔ میرے اندازے کے مطابق رنگ والی میں مشکل سے ایک گھنٹا ٹھہریں گے۔ اس کے بعد انہیں آدھ پون گھنٹا گوجرانوالہ میں رکنا ہے اور پھر لاہور پہنچنا ہے۔''

''مگر خالو! میں نے تو رستم کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ سوئے ہوئے تھے، میں انہیں جگائے بغیر بازار چلی آئی۔''

''اس کی پرواہ نہ کرو۔ میں نے تم سے بات کرنے کے بعد موبائل پر ہی رستم سے بھی بات کر لی ہے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ ایک ارجنٹ کام کے لیے میں تمہیں واپس رنگ والی لے جا رہا ہوں۔ وہاں جا کر تفصیل بتا دوں گا۔''

''پھر انہوں نے کیا کہا؟''

''پوچھ رہا تھا کہ تم کب واپس آؤ گی۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے کہ شام تک واپسی ہو جائے۔''

''میں ایک بار خود بات کر کے دیکھ لوں۔'' شانی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اپنا موبائل بھی نکال لیا۔ یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ موبائل کی بیٹری بھی ختم ہے۔

شانی چند لمحے تذبذب میں رہی، پھر اس نے خالو اعجاز سے ان کا موبائل مانگا اور اس لوتھی کا نمبر ڈائل کرنے لگی جہاں وہ سب رہائش پذیر تھے۔ کئی بار بیل ہوئی مگر کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ شانی نے دوبارہ نمبر ڈائل کیا مگر اس بار بھی رابطہ نہیں ہو سکا۔ اب مسلسل انگیج کی ٹون آ رہی تھی۔

فون پر ٹرائی کرتے ہوئے وہ خالو اعجاز کے ساتھ ساتھ بھی چل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ خالو اعجاز کے ساتھ ان کی کار میں بیٹھی تھی۔ کوشش کے باوجود اس کا رابطہ رستم یا اجمل

www.pdfbooksfree.pk

وغیرہ سے نہیں ہو سکا۔ جو چیزیں اس نے خریدی تھیں وہ پچھلی نشست پر رکھ دیں۔ اس کے دل پر بوجھ سا پڑ گیا تھا، مگر خالو اعجاز کی پریشانی دیکھتے ہوئے وہ کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی۔ اسی دوران میں رنگ والی سے تایا معصوم کا فون بھی آ گیا۔ انہوں نے خالو کے نمبر پر ہی کال کی تھی۔ خالو نے کال ریسیو کر کے فون شانی کی طرف بڑھا دیا۔

انہوں نے پوچھا۔ ''شانی بیٹا! کہاں ہو تم؟''

''تایا جی! میں خالو اعجاز کے ساتھ گاڑی میں ہوں اور واپس رنگ والی آ رہی ہوں۔''

آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا سی گئی۔

''بہت اچھا کیا تم نے۔ مجھے بھی تم سے یہی کہنا تھا۔ یہ ہم سب کی عزت کا سوال ہے۔ تم لوگ اندازاً کتنی دیر تک پہنچ جاؤ گے؟''

''ابھی تو لاہور سے نکل رہے ہیں تایا جی۔''

''ٹھیک ہے۔ آرام سے آؤ۔ ہائی وے پر جلدی نہیں کرتے۔ پتا چلا ہے مہمان پانچ بجے سے پہلے رنگ والی نہیں پہنچیں گے۔''

''ٹھیک ہے تایا جی۔'' شانی گہری سانس لے کر رہ گئی۔

سب اپنے انداز سے سوچ رہے تھے۔ کسی کو یہ فکر نہیں تھی کہ شانی کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

.....قریباً تین گھنٹے بعد خالو اعجاز کی کار دھول اُڑاتی ہوئی رنگ والی میں داخل ہوئی تو کار سے آگے اور پیچھے محافظوں کی ایک ایک جیپ موجود تھی۔ گاڑی کے شیشے رنگ دار تھے پھر بھی اپنے گاؤں کی حدود شروع ہونے سے بہت پہلے شانی نے خود کو اچھی طرح اوڑھنی میں ڈھانپ لیا تھا۔ شانی کو رنگ والی کا نقشہ بدلا ہوا نظر آیا۔ گلی کوچوں کی صفائی ہو چکی تھی۔ گلیوں میں دونوں طرف چونے سے لکیریں کھینچی گئی تھیں۔ جگہ جگہ جھنڈیاں اور آرائشی پنیاں لگائی جا رہی تھی۔ نالیوں کو لکڑی کے تختوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا.....حویلی کے مین دروازے کے سامنے دونوں طرف قناتیں کھڑی کی گئی تھیں اور سرخ دریاں اور قالین وغیرہ بچھائے گئے تھے۔ مہمانوں کی گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے ایک احاطے کو پارکنگ لاٹ کی شکل دے دی گئی تھی۔

علاقے کے لوگ ان تیاریوں میں رضا کارانہ طور پر جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔ شانی نے چند نوجوانوں کو دیکھا جو ہائی اسکول کی دیواروں پر رنگ اور برش سے معزز مہمان سرفراز قزلباش کے لیے استقبالیہ نعرے لکھ رہے تھے۔ کچھ سیاسی کارکن جو یقیناً کسی اور

دیہہ سے آئے تھے، سرفراز صاحب کی تصویر والے بڑے بڑے پوسٹر ہموار دیواروں پر چسپاں کرنے میں مصروف تھے۔ اس سے پہلے شانی نے بھی سرفراز قزلباش کی تصویریں اخباروں اور ٹی وی وغیرہ دیکھی تھیں۔ ان کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ کنپٹیوں سے بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر گہری متانت اور سنجیدگی چھائی رہتی تھی۔ کبھی کبھی نظر کا چشمہ بھی لگاتے تھے۔ ان کا تعلق ایک مضبوط سیاسی خانوادے سے تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ سادہ مزاج ہونے کے باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور باہر کی یونیورسٹیوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ عارف کمبوہ سرفراز صاحب کا پُر جوش حامی تھا اور ان کے نظریات کی تائید میں لمبی چوڑی تقریریں کیا کرتا تھا۔

اتنی بڑی شخصیت کی آمد پر رنگ والی کا ہر شخص پُر جوش تھا مگر ان میں سب سے زیادہ پُر جوش یقیناً عارف کمبوہ ہی تھا۔ شانی کی کار رکی اور حویلی میں داخل ہوئی تو عارف دوڑتا ہوا شانی کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بے حد جذباتی آواز میں بولا۔ ''ہم سب بے چینی سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت اچھا ہوا، آپ ٹھیک وقت پر پہنچ گئی ہیں۔''

چوڑے چکلے سردار دراج نے بھی آگے بڑھ کر سلام کیا اور مہتموں کے مخصوص انداز میں شانی کے لیے نیک خواہشات ظاہر کیں۔ سردار دراج کی خوش مزاج بیوی، ماکھو بھی وہاں موجود تھی۔ اس نے دہقانی جوش کے ساتھ شانی کا ماتھا چوما اور مقامی رواج کے مطابق شانی کے راستے میں گائے کے کچے دودھ کے چھینٹے دیئے۔ سردار دراج اور ماکھو نے اپنے انداز میں شانی کے لیے ککڑی کا لقب استعمال کیا۔ ایک طرف احاطے میں ڈیڑھ دو درجن دیگیں کھڑ کھڑا رہی تھی۔

''یہ کیا ہے عارف؟'' شانی نے پوچھا۔

''مہمانوں کے استقبال کی تیاری!''

''مہمان آ رہے ہیں یا پوری فوج آ رہی ہے۔ ویسے بھی مہمان کھانے پر تو نہیں آ رہے، چائے پر آ رہے ہیں۔''

''سرفراز صاحب کی جھلک دیکھنے کے لیے علاقے کے بہت سے سرکردہ لوگ یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ بلکہ سو ڈیڑھ سو پہنچ بھی چکے ہیں۔ یہ لوگ سرفراز صاحب کے جانے کے بعد بھی یہاں رکیں گے۔ یہ کھانا ان کے لیے ہے۔'' خالو اعجاز نے وضاحت کی۔

شانی بہت الجھن محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اسے زبردستی ایک کانٹوں بھرے راستے پر گھسیٹا جا رہا ہے.....اور اگر وہ ایک بار اس راستے پر چل پڑی تو واپسی ناممکن

www.pdfbooksfree.pk

ہو جائے گی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ حویلی کے پرستاروں کا ہجوم، باجے گاجے کا شور، نعروں کی گونج، مسلح محافظوں کے جتھے، اخباری نمائندے، فلیش گنوں کی چمک، ہاں..... اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ چند گھنٹے پہلے کتنی خوش تھی وہ۔ کتنی ہلکی پھلکی، کتنی آزاد، ہر شے سے مسرت پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتیں دل کو گدگداتی تھیں لیکن ایک دم سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ اب وہ رنگ والی حویلی کی وارث، وڈی آپا کی بیٹی، چھوٹی چوہدرانی تھی۔ اسے اپنے کندھوں پر منوں وزن محسوس ہوا۔

اسے اب فوری طور پر تیار ہونا تھا۔ نہا کر بھاری بھرکم کپڑے پہننے تھے۔ اپنے جسم پر خاندانی زیور ٹانکنا تھا۔ کندھوں پر ایک زرتار شال لے کر اور کمر کو تختے کی طرح سیدھا رکھ کر چلنا تھا۔ اس کے چاروں طرف خاندان کے بزرگوں کے اونچے اونچے شملے تھے۔

وہ سفر سے تھک گئی تھی۔ ایک کپ چائے پی کر اور چند منٹ لیٹ کر تازہ دم ہونا چاہتی تھی۔ مگر خالو اعجاز بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے اور یوں خاموشی کی زبان میں اسے سمجھا رہے تھے کہ وقت بہت کم ہے۔

شانی کو تیار ہونے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ خالو اعجاز نے دو سفید کاغذوں پر لکھے ہوئے چند نوٹس شانی کو تھما دیئے تھے۔ یہ وہ نکات تھے جن پر شانی کو سرفراز صاحب سے بات کرنا تھی۔ یہ نوٹس حویلی کے خاندانی وکیل اقبال ملک کے تحریر کردہ تھے۔ یقیناً ان کو تیار کرنے میں مزید افراد کی رائے بھی شامل رہی ہوگی۔ اس میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر بھی تھا۔ مثلاً شانی نے سرفراز احمد صاحب کو "سر..... جناب" کہہ کر مخاطب کرنا تھا۔ ان کے دائیں طرف والی کرسی پر بیٹھنا تھا۔ ان کے اٹھنے کے بعد کرسی سے اٹھنا تھا وغیرہ وغیرہ۔

شانی کو یہ ساری ہدایات اور گفتگو کے نکات وغیرہ ناگوار گزر رہے تھے۔ یہ نکات علاقے کے مسائل کے بارے میں تھے۔ شانی ان مسائل کو دوسروں سے بہتر جانتی تھی۔ اس نے کاغذ کو توڑ مروڑ کر ایک دراز میں پھینک دیا۔

چار بجنے میں پانچ دس منٹ ہی باقی تھے جب عارف تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ "کیا بات ہے عارف؟" شانی نے چونک کر پوچھا۔

"سرفراز احمد صاحب نہیں آ رہے۔ ان کے پاس وقت کم تھا۔ وہ پچھلے جلسے سے ہی گوجرانوالہ واپس چلے گئے ہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"بس مجبوری کی بات ہے۔ ان کے سیکرٹری صاحب کا فون آیا ہے۔ وہ کہتے ہیں

سرفراز احمد صاحب رنگ والی ضرور آئیں گے۔ اب وہ نئی تاریخ دیں گے۔ مگر یہ دو تین دن سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کل شام ہی دورہ کر لیں۔"

"اوہ گاڈ!" شانی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ باہر ابھی تک باجے اور ڈھول وغیرہ بج رہے تھے۔

وہ سوچنے لگی، جس شخص نے ابتدا ہی وعدہ خلافی سے کی ہے، اس سے آگے کیا توقع لگائی جا سکتی ہے۔ پتا نہیں کیوں شانی کو پہلے ہی اس بات کا خدشہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سرفراز احمد ایک بہت قد آور سیاسی شخصیت ہے، وہ رنگ والی جیسی چھوٹی جگہ پر کیوں آئے گا۔

اسی دوران میں خالو اعجاز کی ستی ہوئی صورت دکھائی دی۔ وہ رومال سے پسینا پونچھتے ہوئے آ رہے تھے، انہوں نے عارف کو کچھ ہدایات دے کر باہر بھیج دیا اور شانی کی طرف بڑھے۔ شانی نے رسٹ واچ دیکھی۔ ابھی چار نہیں بجے تھے۔ وہ پھوٹتے ہی بولی۔ "خالو جی! آپ کے مہمان تو آئے نہیں۔ آپ مجھے لاہور بھجوا دیں۔ وہاں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پھر جب یہاں کا پروگرام پکا ہو جائے آپ مجھے بلوا لیجیے گا۔"

"کیسی بات کر رہی ہو شانی بیٹا! سرفراز صاحب کا پروگرام خدانخواستہ کینسل تو نہیں ہوا ہے۔ بس ذرا وقت تبدیل ہوا ہے۔ ان کے سیکرٹری صاحب کا کہنا ہے کہ نوے فیصد امکان اس بات کا ہے کہ وہ کل یہاں پہنچیں گے۔"

"مگر یقینی بات تو نہیں ہے نا۔ عارف کہہ رہا تھا کہ دوبارہ پروگرام بننے میں دو تین دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"شانی بیٹا! سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم سب کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ سرفراز احمد صاحب کا یہاں ہمارے علاقے میں آنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہمیں ان کے استقبال کی پوری تیاری رکھنی چاہیے۔ وہ اس وقت بے حد مصروف ہیں۔ کیا پتا کس وقت اچانک وقت نکال کر یہاں کا دورہ کر جائیں۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ وہ الیکشن سے پہلے اس علاقے کے ترقیاتی کاموں کے لیے بہت بڑی امداد دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"وہ سب ٹھیک ہے خالو لیکن....."

"لیکن کچھ نہیں شانی۔" خالو اعجاز نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ "تم سمجھو کہ تم ہم سب کے لیے اور اس علاقے کے ہزاروں لوگوں کے لیے..... جو تمہیں چاہتے ہیں، دو تین دن کی قربانی دے رہی ہو۔"

شانی نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ وہ آنکھوں میں نمی لیے تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بے قراری سے دائیں بائیں ٹہلتی رہی..... پھر ٹیلی

www.pdfbooksfree.pk

فون کی طرف بڑھ گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اب ایک دو روز تک واپس نہیں جا سکے گی مگر وہ کم از کم یہ تو کر سکتی تھی کہ رستم کو صورتِ حال کی اطلاع دے دیتی۔ اس نے فون اٹھایا اور دل مسوس کر رہ گئی۔ لائن ایک بار پھر خراب تھی۔

موبائل فون اس کے پاس موجود تھا مگر اس کی بیٹری ختم تھی اور چارجر لاہور میں ہی رہ گیا تھا۔ بیٹری ہوتی بھی تو یہاں رنگ والی سے بذریعہ موبائل لاہور یا گوجرانوالہ رابطہ کرنا خاصا دشوار ہوتا تھا۔ پھر بھی ایک موہوم امید کے سہارے وہ خالو اعجاز کے موبائل کے ذریعے ٹرائی کرتی رہی۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے رسنے لگے۔ جو چیزیں وہ رستم کے لیے لے کر آئی تھی، وہ یہاں وہاں کمرے میں بکھری پڑی تھیں۔ اس دوران میں آہٹ ہوئی اور آپو زاہدہ ہولے سے اندر آ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں تفکر کی پرچھائیاں تھیں۔ انہوں نے پیار سے شانی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تُو اتنی پریشان کیوں ہے شانی! افسوس تو سب کو ہوا ہے، پر کوئی بات نہیں۔ سنا ہے کہ وہ ایک دو دن میں یہاں ضرور آئیں گے۔ اصل میں بڑے لوگوں کی پسوڑیاں بھی بڑی ہوتی ہیں۔'' انہوں نے اپنی طرف سے شانی کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں آپا! یہ بات نہیں ہے۔''

آپو زاہدہ دھیان سے اس کی طرف دیکھتی رہیں پھر جہاں دیدہ انداز میں بولیں۔

''اچھا میں سمجھ گئی..... تجھے لاہور سے ایک دم یہاں واپس آ جانے کا افسوس ہوا ہے۔ وہاں تیری سہیلی کا سارا پروگرام بھی الٹ پلٹ ہو گیا ہو گا۔''

شانی خاموش رہی۔ درحقیقت خالو اعجاز کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ شانی لاہور میں کہاں اور کیا کرنے گئی تھی۔ تایا معصوم اور عارف وغیرہ بھی بے خبر تھے۔ سب کو بس یہی معلوم تھا کہ وہاں لاہور میں شانی کے کالج کے زمانے کی ایک دیرینہ سہیلی بیاہی ہوئی ہے۔ وہ عرصے سے خواہش رکھتی تھی کہ شانی لاہور آئے اور چند روز اس کے پاس ٹھہرے۔ اب اس کے دیور کی شادی بھی تھی۔ شانی نے اس شادی پر آنے کا وعدہ کر رکھا تھا لہٰذا اسے جانا پڑا۔

آپو زاہدہ نے بڑے لاڈ سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر واپس جانا زیادہ ضروری ہے تو چلی جاؤ۔ جب مہمانوں کے آنے کا پروگرام پکا ہو جائے گا تو چوہدری اعجاز صاحب تمہیں پھر واپس لے آئیں گے۔''

''وہ نہیں مانتے۔'' شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہاں سب کو بس مہمانوں کی ہی پڑی ہوئی ہے۔'' شانی نے نمناک لہجے میں کہا۔

''تو پھر سہیلی کو فون کر لو۔ اس کا دل بھی دکھا ہو گا۔ کیا نام ہے اس کا؟''

شانی نے چونک کر آپا زاہدہ کی طرف دیکھا..... ایک بار تو دل چاہا کہ آپا زاہدہ کو اس سہیلی کا نام بتا ہی دے۔ اس دکھی بہن کو بتا ہی دے کہ اس کا بھائی زندہ ہے۔ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کا شوہر بھی ہے..... اور وہ اسی سے مل کر اور اسی کی محبت کی نہایت گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر آ رہی ہے۔ وہ اسے سب کچھ بتا دے اور اس کی جھولی خوشیوں سے بھر دے۔ اسے وہ راحت دے جو اسے زندگی کی آخری سانسوں تک یاد رہے لیکن..... وہ رستم سے وعدہ کر کے آئی تھی کہ ابھی آپا زاہدہ اور بھائی اکرام کو کچھ نہیں بتائے گی۔ وہ اس وعدے کا پاس کرنا چاہتی تھی۔

اچانک حویلی سے باہر بہت سا شور سنائی دیا۔ شانی نے اٹھ کر کھڑکی میں سے دیکھا۔ یہ بہت سے مفلوک الحال لوگ تھے۔ ان میں ویران چہروں والے مرد تھے۔ عورتیں تھیں جنہوں نے اپنی گود میں ننگ دھڑنگ بچے اٹھا رکھے تھے۔ کچھ لوگوں کے سروں پر سامان کی ٹھڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

خادم حسین نے اندر آ کر بتایا۔ ''چھوٹی بی بی! یہ ہڑ (سیلاب) کے مارے ہوئے لوگ ہیں۔ امداد چاہتے ہیں۔''

''ہمیں واقعی کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے..... مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''نقد امداد بھی دی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ راشن، کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں۔ ان میں سے کچھ لوگ زیادہ دکھی ہیں اور یہ وہ ہیں جن کے گھر کا کوئی فرد مارا گیا ہے یا لاپتا ہے۔''

شانی بے تاب ہو گئی۔ اس کا دل چاہا کہ حویلی میں اس وقت جو کچھ بھی ہے ان لوگوں میں بانٹ دے۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ کسی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پھر اسے ایک پرانی بات یاد آئی۔ کئی برس پہلے بھی اسی طرح ایک بار برسات میں نہر کی پٹڑی ٹوٹی تھی۔ بیس تیس افراد مارے گئے تھے، سینکڑوں بے گھر ہوئے تھے۔ مال مویشی کا بھی بے شمار نقصان ہوا تھا۔ ان دنوں شانی کی والدہ وڈی آپا زندہ تھیں۔ انہوں نے شانی کے والد اور بڑے وکیل صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد ایک فنڈ بنایا تھا جس میں لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا تھا۔ کھانے پینے کی اشیا اور کپڑے کے انبار لگ گئے تھے۔ شانی کی والدہ نے اپنا بہت سا زیور بھی اس فنڈ میں ڈال دیا تھا۔

شانی کے ذہن میں یہ ساری باتیں گردش کرنے لگیں۔ اس کی یہ سوچ بناوٹی نہیں تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

اس کے اندر سے آواز آتی تھی کہ وہ اپنی مرحومہ والدہ کے نقشِ قدم پر چلے۔

اچانک حویلی کے باہر برپا شور میں اضافہ ہوگیا۔ شور کا آہنگ بھی بدل گیا۔ یوں لگا کہ کچھ لوگ رو پیٹ رہے ہیں۔ شانی ایک بار پھر تڑپ کر اٹھی۔ اس نے کھڑکی میں سے جھانکا۔ سیلاب زدہ لوگوں کے ایک گروہ نے ایک چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ چارپائی پر ایک انسانی جسم تھا جس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ یہ جسم یقیناً مُردہ تھا۔ چارپائی کے اردگرد موجود لوگوں کے چہرے غصے سے تمتما رہے تھے۔ ان میں سے کچھ عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔ شانی کا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ کس کی لاش تھی؟ شانی کو اندازہ ہوا کہ یہ کسی مہتم کی لاش ہے۔ چارپائی کے اردگرد بھی سانولی رنگت والے مہتم ہی نظر آرہے تھے۔ پھر شانی نے عارف کمبوہ کو دیکھا۔ وہ لوگوں کے درمیان چلا گیا اور انہیں سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں کا غیظ و غضب قدرے ماند پڑتا ہوا محسوس ہوا تاہم وہ بدستور احتجاج کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد خالو اعجاز پریشان چہرے کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔

وہ کُھوتے ہی بولا۔ ''اسی لیے کہتا ہوں نا شانی! کہ ہمیں اپنی پوزیشن مضبوط بنانے کا یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم کمزور ہوں گے تو ہمارے دشمن آگے بڑھ بڑھ کر وار کریں گے۔ وہ ہر وقت ہمیں چھوٹے بڑے جھٹکے دیتے رہیں گے۔''

یہ باہر کیا ہوا ہے خالو؟'' شانی نے پوچھا۔

''ڈپٹی ریاض نے اپنی طاقت شو کی ہے۔'' خالو اعجاز گہری افسردگی سے بولے۔

''کیا مطلب خالو؟''

''مہتم برادری کے ایک بندے کو پھڑکا دیا ہے، شاد پور کے سب انسپکٹر طفیل نے اور تمہیں شاید معلوم نہ ہو، طفیل اسی ڈپٹی ریاض کا رشتے دار ہے اور دیکھو مارا بھی کس بندے کو ہے۔ یہ سردار دراج کا چھوٹا بھائی بادل ہے۔'' شانی نے کھڑکی سے نیچے نگاہ دوڑائی۔ اسے سردار نظر آیا جو چارپائی سے لپٹ کر زار زار رو رہا تھا۔

''لیکن اس بندے نے کیا کیا ہے؟''

''اس پر پولیس نے الزام لگایا ہے کہ یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سیلاب زدہ علاقے میں لوٹ مار کر رہا تھا۔ یہ لوگ گھروں سے قیمتی چیزیں نکال رہے تھے۔ پولیس نے للکارا تو انہوں نے جوابی فائرنگ کر دی۔ باقی بھاگ گئے۔ یہ مارا گیا۔ وہی گھڑی گھڑائی کہانی۔''

چوہدری اعجاز کی آواز طیش سے کانپ رہی تھی۔

''یہ تو ظلم ہے۔ جمشید بھی اسی طرح جھوٹے پولیس مقابلے میں مار دیا گیا تھا۔'' شانی

کراہی۔

''اصل بات سنو گی تو تمہیں اور زیادہ دکھ ہوگا۔'' چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''سب انسپکٹر طفیل نے جس وقت بادل کو گولی ماری، وہ سادے کپڑوں میں تھا اور آن ڈیوٹی بھی نہیں تھا۔ وہ آج کل کسی وجہ سے معطل ہے۔ یہاں اپنے سسرال آیا ہوا ہے۔ گولی بھی پرائیویٹ ریوالور سے ماری گئی ہے۔''

شانی کو اس تانے بانے کی سمجھ نہیں آرہی تھی مگر اس کا دل غم سے ضرور بھر گیا تھا اور اسے خالو اعجاز کی یہ بات بھی غلط نہیں لگ رہی تھی کہ اس کارروائی کے پیچھے ریاض ہٹلر کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ چند روز پہلے ریاض ہٹلر نے فون پر شانی سے نہایت زہریلی گفتگو کی تھی اس کی گونج ابھی تک شانی کے کانوں میں تھی۔ باہر لوگوں کا واویلا بڑھتا جا رہا تھا۔ شانی تیز قدمیں اُتر کر نیچے آگئی۔ اسے اپنے دل و دماغ پر بہت بھاری بوجھ محسوس ہوا۔ ان لمحوں میں اسے وہ سب کچھ بھول گیا جو تھوڑی دیر پہلے اسے بے حد اداس کر رہا تھا۔ رستم، ناصر، اجمل خان، زری اور ان کے دلچسپ پروگرام سب کچھ وقتی طور پر اس کے ذہن سے نکل گیا۔ وہ بڑے مضبوط قدم اٹھاتی ہوئی ان لوگوں کے سامنے پہنچ گئی جو اس سے اپنا دکھ بیان کرنے آئے تھے۔ جنہوں نے پتا نہیں کیوں اس سے بے شمار توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ مرنے والوں کے لواحقین نے شانی کو دیکھا اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ سردار دراج اَشک بار آنکھوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑا تھا۔

☆======☆======☆

رستم بارہ بجے کے قریب جاگا تھا۔ ایک چمکیلا دن اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک بستر پر لیٹا گزشتہ شب کی نیرنگیوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ بی بی اسے کہیں نظر نہیں آئی..... وہ شاید کچن میں چلی گئی تھی یا پھر زری کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ اتنے میں اسے اجمل خان نظر آیا۔ اس کے منہ میں نسوار دیکھ کر رستم ذرا سا چونکا۔ شانی کے ہوتے ہوئے اجمل نسوار رکھنے کی جسارت نہیں کرتا تھا۔ تو کیا شانی گھر میں موجود نہیں تھی؟

رستم کے پوچھنے سے پہلے ہی اجمل بول پڑا۔ ''وہ انار کلی تک گئی ہیں۔ کہتی ہیں کہ کھانے سے پہلے آجاؤں گی۔ خو، آپ نے چائے مائے پینا ہے تو بتا دیں۔''

''انہوں نے بتایا نہیں تھا، کیا کام ہے؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ کہتا تھا کہ ام کھانے سے پہلے لوٹ آئے گا۔''

''تم نے کسی کو ساتھ بھیج دینا تھا۔''

www.pdfbooksfree.pk

''ام نے پوچھا تھا مگر وہ اکیلا جانا چاہتا تھا۔''

رستم سوچنے لگا کہ وہ کہاں گئی ہوگی۔ کیا کوئی ایسا کام تھا جو وہ اس کو بھی نہیں بتانا چاہتی تھی؟ قریباً ایک گھنٹے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ اجمل نے فون اٹھایا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کی مدھم سے شکن ابھری۔ پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر رستم سے کہا۔ ''چوہدری اعجاز صیب کا کال ہے۔''

رستم نے کال ریسیو کی۔ چوہدری اعجاز موبائل فون سے بات کر رہے تھے اور غالباً گاڑی میں تھے۔ ''ہیلو رستم! میں اعجاز بول رہا ہوں۔'' انہوں نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

''ہاں جی۔ کہیں، خیریت تو ہے؟''

''دراصل رنگ والی میں ایک ایمرجنسی ہے۔ کچھ بہت اہم لوگ آ رہے ہیں۔ شانی کا رنگ والی جانا ضروری ہوگیا ہے۔ ابھی میں اس کو وہیں سے واپس لے جا رہا ہوں لیکن پریشانی کی بات نہیں۔ میں اسے رات تک یا کل صبح تک واپس چھوڑ جاؤں گا۔'' چوہدری اعجاز نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے جی! اگر وہ جانا چاہتی ہیں تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے لیکن وہ خود فون کر لیتیں تو.....''

''چلو اگر میری بات سے تسلی نہیں ہوئی تو وہ بھی کر لے گی۔ بلکہ کہتے ہو تو اسے اجازت دلوانے کے لیے تمہارے پاس لے آتا ہوں۔'' کوشش کے باوجود چوہدری اعجاز کے لہجے میں ہلکی سے تپش داخل ہوگئی۔

''نہیں، میں نے یہ کب کہا ہے۔''

''اچھا خدا حافظ!'' چوہدری اعجاز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رستم کے سینے میں ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ اسے چوہدری اعجاز کا لہجہ اچھا نہیں لگا تھا۔ اس سے پہلے بھی چوہدری اعجاز نے جو باتیں کہی تھیں، وہ رستم کے سینے میں اٹکی ہوئی تھیں۔ خیر اس وقت تک تو چوہدری اعجاز کو شانی اور رستم کی شادی کا علم نہیں تھا۔ اب تو وہ جان چکا تھا کہ شانی اور رستم ازدواجی بندھن میں بندھ چکے ہیں۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم بیٹھا رہا۔ اسی دوران میں چوہدری اعجاز کا فون پھر آ گیا۔ ایک جھنجھلاہٹ سی رستم کے رگ و پے میں دوڑی اور اسی جھنجھلاہٹ کی وجہ سے اس نے چوہدری اعجاز کا پھر سے آنے والا فون ریسیو نہیں کیا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ بی بی جانے سے پہلے فون پر اس سے رابطہ کریں گی اور جب رابطہ نہیں ہو سکے گا تو وہ یہاں آئیں گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سہ پہر ہوگئی اور پھر شام..... مگر بی بی نہیں آئیں۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ وہ اپنی ایمرجنسی کی وجہ سے اپنے خالو کے ساتھ رنگ والی واپس چلی گئی ہیں۔

کل تک جس چار دیواری میں قہقہے گونج رہے تھے اور نت نئے پروگرام بن رہے تھے، وہ ایک دم اداس ہوگئی تھی۔ سب بجھ سے گئے تھے۔ اجمل خان کو دنبے کا گوشت مہیا ہوگیا تھا مگر اس نے گوشت ریفریجریٹر میں رکھوا دیا۔ آج کسی نے کرکٹ بھی نہیں کھیلی۔ سب سے زیادہ اداس زری تھی۔ وہ ان دنوں میں شانی کے ساتھ بہت مانوس ہوگئی تھی۔

اگلے روز دس بجے تک بھی شانی کا فون نہیں آیا اور نہ کسی اور طرح اس نے رابطہ کیا۔ اجمل آتے جاتے کئی بار فون کا ریسیور اٹھا کر یہ جانچ چکا تھا کہ لائن ٹھیک کام کر رہی ہے یا نہیں۔ زری آلتی پالتی مارے قالین پر بیٹھی تھی اور ٹی وی پر کارٹون دیکھ کر دل بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ آخر اس نے ٹی وی کی طرف سے رخ پھیرا اور ناصر سے پوچھا۔ ''شانا! کب آئے گا؟''

ناصر نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''لو جی..... یہ نئی مصیبت پڑ گئی ہے۔''

''نئی مصیبت؟'' وہ حیرانی سے بولی۔ ''پرانا مصیبت کیا تھا؟''

''پرانی مصیبت یہ تھی کہ تم خود کو مرد سمجھتی ہو اور اپنے بارے میں مردوں کی طرح بولتی ہو۔ میں کھاتا ہوں..... میں جاتا ہوں..... میں سوتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اب نئی مصیبت یہ ہے کہ تم نے شانی بی بی کو شانا کہنا شروع کر دیا ہے۔''

ڈولا بولا۔ ''کل یہ شادی کو شادا کہہ رہی تھی اور روٹی کو روٹا کہہ رہی تھی۔''

''دراصل تمہاری انہی باتوں کی وجہ سے شانی بی بی واپس گئی ہیں۔'' ناصر نے ہونٹ سے اس کا کان کھینچتے ہوئے کہا۔ ''شانی بی بی چاہتی تھیں کہ تم اپنے بارے میں مردوں کی طرح نہ بولو۔ انہوں نے تم سے کتنا سر کھپایا اس بات پر۔''

''اب میں کب بولتا ہوں..... ہم میرا مطلب، بولتی ہوں۔''

''تم بولتی ہو۔ ہاں تھوڑا سا فرق ضرور پڑا ہے لیکن اس فرق کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ تم نے روٹی کو روٹا اور سیڑھی کو سیڑھا کہنا شروع کر دیا ہے۔''

''اس کے اندر کوئی ٹیکنیکل پالٹ (فالٹ) ہے ناصر صیب۔'' اجمل نے روانی میں کہا۔

ناصر نے برا سا منہ بنایا۔ ''خیر ٹیکنیکل پالٹ تو تمہارے اندر بھی ہے اجمل خان۔''

اس سے پہلے کہ اجمل کوئی کرارا سا جواب دیتا، بیرونی گیٹ پر کال بیل ہوئی۔ سب

www.pdfbooksfree.pk

کے چہرے سے چمک اٹھے۔ زری کی آنکھوں میں روشنی نمودار ہوئی۔ وہ پُر امید لہجے میں بولی۔ ''شانا باجی..... نن نہیں شانی باجا آئی۔''

رستم نے ڈولے کی طرف دیکھا۔ اس کی حیات شاید کوئی اور اشارہ دے رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر خوشی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اجمل نے خود دوڑ کر دروازہ کھولا۔ غیر متوقع طور پر سامنے حویلی کا ملازم خادم حسین نظر آیا۔ وہ ''السلام علیکم'' کہتا ہوا اندر آ گیا۔

''خیریت سے آئے ہو خادم حسین؟'' رستم نے پوچھا۔

''جی ہاں..... میں چھوٹی بی بی کا سامان لینے آیا ہوں۔''

''سامان لینے؟ کیا مطلب؟'' اجمل نے حیرانی سے کہا۔ ''بی بی کو تو آج واپس آنا ہے۔''

''نہیں، وہ نہیں آ رہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اس کا پتا تو ان کو ہو گا جی۔ اصل میں لاہور سے کچھ بڑے لوگ رنگ والی آنے والے ہیں۔ انہوں نے کل آنا تھا۔ ان کے استقبال کی پوری تیاری ابھی ہو چکی تھی۔ مگر وہ کسی وجہ سے آ نہ سکے۔ اب شاید وہ ایک دو روز کے اندر آئیں گے۔ چھوٹی بی بی ان کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''کیا سارا سامان لے جانا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ چوہدری اعجاز صاحب نے یہی کہا ہے۔''

رستم کے سینے میں ایک بار پھر ایک ناگوار سی لہر سی دوڑی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ خادم حسین شانی کا سامان لے کر چلا گیا۔ وہ سارے پروگرام دھرے رہ گئے تھے جو اجمل، ناصر وغیرہ نے اگلے چند روز کے لیے بنائے تھے۔ رستم کو یوں لگا جیسے اردگرد کی ہر شے کو گہری اداسی نے ڈھانپ لیا ہے۔ اتنی طویل اور کٹھن جدائی کے بعد اتنی مختصر ملاقات..... ابھی تو..... وہ جی بھر کر اس چہرے کو دیکھ بھی نہ سکا تھا جس کی جدائی مارگہ بستی کی طویل یخ بستہ راتوں میں اسے ماہی بے آب کی طرح تڑپاتی تھی۔

شام تک وہ سب اسی انتظار میں رہے کہ شاید شانی یا خالو اعجاز کی طرف سے کوئی فون آئے گا مگر یہ امید پوری نہیں ہوئی۔ ناصر نے ایک ٹی وی چینل پر پنجاب کے کچھ دیہاتی علاقوں میں نامور سیاست دان سرفراز احمد قزلباش کی مصروفیات دیکھیں۔ خبروں میں بتایا گیا کہ سرفراز احمد آئندہ الیکشن کے لیے اپنے ووٹروں کو متحرک کرنے کے لیے وسطی علاقوں کا

طوفانی دورہ کر رہے ہیں تصویری جھلکیوں میں ان کی گاڑیوں کے قافلے کے گرد، دھول اُڑاتے لوگوں کا ایک جمِ غفیر نظر آتا تھا۔ لوگ اپنے محبوب قائد کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے دیوانہ وار امڈ آئے تھے۔

شانی کا یوں اچانک لاہور سے چلے جانا رستم کو بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر وہ چلی ہی گئی تھی تو اسے کم از کم رابطہ تو ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اگر حویلی کا ٹیلی فون خراب تھا تو شانی کسی اور طریقے سے رابطہ کر سکتی تھی اور کچھ نہیں تو پرانے ملازم خادم حسین کے ذریعے ہی کوئی پیغام بھیج دیتی۔

رستم نے دوبارہ فون کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اجمل بہ دستور اس کام میں لگا ہوا تھا۔ وہ شانی اور چوہدری اعجاز کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے کے وقفے کے بعد وہ فون سیٹ کے سامنے بیٹھ جاتا اور نمبر پریس کرنے لگ جاتا۔ یہ اگلے روز سہ پہر کی بات ہے، وہ ایک دم بلند آواز میں رستم کو پکارنے لگا۔ ''رستم بھائی..... جلدی آئیں..... پون مل گیا ہے..... بیل جا رہا ہے۔''

رستم نے آگے بڑھ کر ریسیور تھاما۔ بیل جا رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد مدھم سے شور کے ساتھ چوہدری اعجاز کی آواز سنائی دی۔ یہ چوہدری اعجاز کا ہی موبائل نمبر تھا۔ ''ہیلو! چوہدری اعجاز بول رہا ہوں۔''

''میں لاہور سے رستم بات کر رہا ہوں۔''

''ہاں رستم، کہو کیا بات ہے؟'' قدرے نرم لہجے میں کہا گیا۔

''میں کافی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔ لائن ہی نہیں مل رہی تھی۔ میں شانی سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ چوہدری اعجاز دوبارہ بولے تو ان کی آواز میں تپش تھی۔ وہ کہنے لگے۔

''یار! تمہیں کہا تو تھا کہ وہ مصروف ہے۔ جونہی وقت ملا، وہ تمہیں فون کرے گی۔''

''مجھے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ بس ایک منٹ کے لیے انہیں بلا دیں۔'' رستم نے بھی خشک لہجے میں کہا۔

''کچھ مہمان آنے والے ہیں۔ وہ اس وقت نہیں آ سکتی۔ تم نے جو بھی ضروری بات کرنی ہے، مجھ سے کہہ دو۔ میں اس تک پہنچا دیتا ہوں۔'' چوہدری اعجاز کی آواز میں جھنجھلاہٹ اور عجلت تھی۔ تاہم وہ دھیمے سُر میں بول رہا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

اسی دوران میں رستم کو کچھ فاصلے سے شانی کے ہنسنے اور کسی سے بات کرنے کی آواز آئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مہمانوں میں گھری ہوئی ہے۔ وہ چوہدری اعجاز سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''میں نے کہا ہے نا صرف شانی سے بات کرنی ہے، آپ اسے بلا دیں۔ میں ایک دو منٹ سے زیادہ نہیں لوں گا۔'' وہ اپنے طیش کو سنبھالنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

''شانی اس وقت یہاں نہیں ہے۔''

''وہ یہیں ہیں۔ مجھے ان کی آواز آ رہی ہے۔''

''میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''تو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔''

''یار! تم کس نسل کے بندے ہو۔ میں نے تم سے کہا ہے کہ.....''

''دیکھیں چوہدری اعجاز! آپ منہ سنبھال کر بات کریں۔ میں کسی غیر سے نہیں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''بیوی ہونے یا نہ ہونے کی باتیں تو بعد کی ہیں۔ فی الحال تم اپنی ٹرٹر بند کرو۔'' چوہدری اعجاز نے جیسے پھٹ کر کہا اور فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

رستم کا جسم جیسے بخار میں پھنکنے لگا۔ چوہدری اعجاز سے چند دن قبل ہونے والی پہلی ملاقات میں ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ صورت حال کیا رخ اختیار کرنے والی ہے۔ چوہدری اعجاز اور رنگ والی کے دیگر چوہدری، شانی کو سونے کی چڑیا سمجھنے لگے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اپنی پرکشش شخصیت کے سبب وہ تیزی سے شہرت حاصل کر رہی ہے۔ ''شانی بی بی اسپتال'' پورے علاقے میں مشہور ہو رہا ہے اور اس کی نئی نئی شاخیں کھل رہی ہیں۔ انسانوں کا ایک جم غفیر ہے جو شانی سے والہانہ عقیدت رکھتا ہے..... اور اب سیاست کے میدان میں شانی کے لیے شاندار کامیابی کے راستے کھل گئے تھے۔ یہ بڑے بڑے چوہدری اپنے اندرونی اختلافات بھلا کر اب شانی کے گرد جمع ہو گئے تھے..... اور اسے ایک پل بھی نظروں سے اوجھل رکھنا نہیں چاہتے تھے۔

چوہدری اعجاز کے لب و لہجے نے رستم کو ہیجانی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ اس سے پہلے وہ شانی کے فون کا انتظار کر رہا تھا مگر اب اس نے خود اجمل سے کہا کہ وہ شانی کے موبائل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرے۔ اجمل خان نے رابطے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ وقفے وقفے سے تقریباً دو گھنٹے تک نمبر ڈائل کرتا رہا۔ آخر ایک بار قسمت نے یاوری کی اور شانی کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اجمل کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی اور اس نے ریسیور تیزی سے

رستم کی طرف بڑھا دیا۔ چند سیکنڈ بعد شانی کی مدھم ہیلو سنائی دی۔ پس منظر میں باجے گاجے کا شور تھا۔ پٹاخے چل رہے تھے..... اور نعرے لگ رہے تھے۔

''ہیلو..... میں رستم بول رہا ہوں۔'' رستم نے بلند آواز میں کہا۔

''ہیلو رستم! میں اس وقت مصروف ہوں۔ بعد میں فون کروں گی۔'' شانی کی آواز شور میں سے نکل کر بہ مشکل رستم کے کانوں تک پہنچی۔

''ہیلو..... ہیلو!'' رستم نے دو تین بار کہا مگر شانی فون بند کر چکی تھی۔

رستم نے گہری مایوسی کے عالم میں ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

خیر معمولی مسرت کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد غیر معمولی دکھ کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اسے لگ رہا تھا کہ جو بدمزگی بھی پیدا ہوئی ہے، وہ چوہدری اعجاز وغیرہ کی وجہ سے ہے، مگر اب محسوس ہونے لگا کہ شاید شانی بھی کچھ کاموں کو زیادہ اہمیت دے رہی ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ خادم حسین بی بی کا سامان یہاں سے لے کر گیا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ مرضی شانی بی بی کی بھی شامل ہوگی۔ سامان واپس منگواتے ہوئے انہوں نے از خود رستم سے بات کرنا ضروری کیوں نہ سمجھا۔

سخت پریشانی کے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا..... کوئی شدید مجبوری ہی ہوگی ورنہ بی بی اس طرح فون بند نہ کرتیں۔ کال کرتے ہوئے پس منظر میں جو سخت شور سنائی دے رہا تھا، وہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا تھا کہ شاید سرفراز، عمر اور دیگر معزز مہمان رنگ والی پہنچ ہوئے تھے۔ بہرحال..... جو کچھ بھی تھا..... چوہدری اعجاز کا رویہ رستم کے لیے سخت تکلیف دہ تھا۔

رستم اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے اجمل اور ناصر کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ اب ان میں سے کوئی رنگ والی فون نہیں کرے گا۔ جب شانی نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ خود ہی فون کریں گی تو پھر ان کے فون کا انتظار کیا جانا چاہیے تھا۔ وہ کمرے میں آ کر لیٹ نہیں گیا بلکہ ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ ذہن مسلسل شانی میں الجھا ہوا تھا۔ شانی سے محبت میں وہ اتنا آگے جا چکا تھا کہ اس حوالے سے کوئی منفی بات اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ عشق کا وہ مرحلہ تھا کہ جہاں ایک فریق رات کو دن کہے تو دن ماننا پڑتا ہے۔ یہاں اپنی کوئی مرضی، اپنی کوئی رائے باقی ہی نہیں رہتی..... سب کچھ اپنے محبوب کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے۔ رستم خود کو ملامت کرنے لگا کہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی مگر اس کے دل میں شانی کے حوالے سے بدگمانی کیوں پیدا ہوئی۔ شانی بی بی جو کریں گی ٹھیک کریں گی۔ اگر اپنا سامان واپس لے جاتے

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے انہوں نے اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا تو اس میں بھی کوئی مصلحت یا مجبوری ہوگی۔

وہ بستر پر لیٹ گیا اور اپنا دھیان موجودہ حالات کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا، لیکن بستر پر لیٹ کر تو موجودہ حالات مزید شدت سے یاد آنے لگے۔ بستر اسے ایک ویرانہ محسوس ہوا۔ کمرے کے ہر شے میں بی بی کی جھلک نظر آنے لگی۔ بی بی کی سرگوشیاں، بی بی کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔ چوڑیوں کی چھن چھن اسے اپنے کانوں کے بالکل قریب محسوس ہوئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ باہر باغیچے میں نکل آیا۔ باغیچہ بھی اداس تھا۔ ہر شے جیسے سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ بس ایک شخص کے چلے جانے سے حدِ نگاہ تک نظر آنے والی ہر چیز اداس ہوگئی تھی۔

وہ باغیچے میں چکرا.. ..ہا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ اب بھی موجود تھی۔ اس نے ٹہلتے ٹہلتے خود سے سوال کیا۔ ''اتنی سی خوشی..... بس اتنی سی؟'' اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں کھنچ گئے۔ یہ سخت زخمی مسکراہٹ تھی۔

☆======☆======☆

شانی رنگ والی حویلی میں تھی۔ حویلی میں جشن کا سماں تھا۔ ڈھول تاشے بج رہے تھے، آتش بازی ہو رہی تھی۔ حویلی کی شاندار نشست گاہ میں سرفراز احمد قزلباش اپنے معزز ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے۔ ان کی میزبانی علاقے کی معزز ترین شخصیات کر رہی تھیں اور ان میں سب سے اہم بی بی تھیں۔

اتنے اہم شخص کو اپنے روبرو دیکھ کر شانی پہلے تو مرعوب ہوئی تھی پھر آہستہ آہستہ سنبھل گئی تھی۔ اب وہ اعتماد کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی۔

سرفراز احمد نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''ہم آپ کو دیکھ کر حیران ہوئے ہیں۔ ہم نے سمجھا کہ آپ چوہدرانی جی کی بیٹی ہیں مگر آپ تو خود چوہدرانی نکلیں۔''

''جی..... والدہ اور والد کی وفات کے بعد یہ ذمے داریاں مجھے سنبھالنا پڑیں۔''

''اور ہمارا خیال ہے کہ آپ بڑے اچھے طریقے سے سنبھال رہی ہیں۔ ہم نے علاقے کے لوگوں میں جو جوش و خروش دیکھا ہے اس سے آپ کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔''

''بس یہ اللہ کی مہربانی ہے۔ ورنہ میں تو خود کو کسی قابل نہیں سمجھتی۔'' شانی نے سادگی سے کہا۔

''آپ کے بنائے ہوئے اسپتال نے بہت نام پایا اور تھوڑے وقت میں کافی ترقی بھی کی ہے۔ ہم آپ کا اسپتال دیکھنا چاہتے ہیں مگر وقت کم ہے پھر کبھی چکر لگائیں گے۔''

ڈاکٹر بہروز بھی میزبانوں میں موجود تھے۔ شانی نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہیں ڈاکٹر بہروز۔ دراصل یہی اس اسپتال کو چلا رہے ہیں۔ اس حوالے سے آپ کو جو بھی بہتری نظر آتی ہے، وہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔''

ڈاکٹر بہروز اور سرفراز احمد کے درمیان اسپتال کے حوالے سے کچھ دیر بات ہوئی۔ سرفراز احمد نے یہ عندیہ ظاہر کیا کہ وہ اس اسپتال کے لیے فنڈز کا اہتمام کریں گے اور صحت کے اس منصوبے کو خاطر خواہ وسعت دی جائے گی۔ اس کے بعد علاقے میں مختلف ترقیاتی کاموں کے بارے میں بات ہوئی۔ سرفراز احمد سادگی سے بات کر رہے تھے۔ اتنی اہم شخصیت ہونے کے باوجود ان میں بناوٹی رعب داب نہیں تھا۔

گفتگو کے آخر میں انہوں نے اس بات پر دلی معذرت کی کہ وہ تین دن پہلے پروگرام کے مطابق رنگ والی حویلی نہیں پہنچ سکے جس کی وجہ سے میزبانوں کے ساتھ ساتھ دیگر ہزاروں لوگوں کو بھی پریشانی ہوئی۔ پھر ایک دم جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔ انہوں نے شانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں خبر ملی ہے کہ اس دن یہاں آپ کی حویلی کے سامنے کچھ لوگوں نے مظاہرہ بھی کیا۔ شاید کسی بندے کو گولی لگ گئی تھی۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ایک بندے کی موت ہوئی ہے، دو سر از خمی ہوا ہے۔ اس کو پولیس گردی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔''

''کیا آپ تفصیل بتانا پسند کریں گی؟'' سرفراز احمد نے پوچھا۔

شانی تو پہلے ہی کسی ایسے سوال کی منتظر تھی۔ دراج کے بھائی کی ہلاکت نے اسے شدید ذہنی صدمہ پہنچایا تھا۔ اس نے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ وہ قصوروار سب انسپکٹر کے خلاف پرچہ درج کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر پرچہ درج نہ ہوا تو وہ عدالت سے آرڈر لے کر پرچہ کٹوائیں گے۔

سرفراز احمد نے یہ ساری بات بڑے دھیان سے سنی۔ ان کی آنکھوں میں معاملہ فہمی کی چمک تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''آپ اس معاملے میں جلدی نہ کریں اور یقین رکھیں کہ مجرم کو قرار واقعی سزا ملے گی۔ ہم اس سارے معاملے کو خود دیکھتے ہیں اور تین دن کے اندر ہی آپ سے دوبارہ رابطہ کرتے ہیں۔''

''لیکن ایف آئی آر کٹوانے میں جتنی دیر ہوگی، کیس کمزور پڑے گا۔'' شانی نے کہا۔

''اس کی فکر آپ نہ کریں۔ اگر واقعی یہ کیس بن رہا ہے تو پھر ہم اسے کمزور نہیں ہونے دیں گے۔ دراصل ہمیں اس سارے معاملے میں سازش کی بُو آ رہی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے

www.pdfbooksfree.pk

کہ اس میں ڈپٹی ریاض کا نام بھی آ گیا ہے۔ ہم اس معاملے کی تحقیق کر لیں پھر آپ کو تفصیل بتائیں گے۔"

شانی چونک کر سرفراز احمد کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں دور اندیشی کی بہت گہری پرچھائیاں تھیں۔ وہ ایک بڑے دل و دماغ کا حامل شخص محسوس ہوتا تھا۔

اہم معاملات تو پہلے ہی طے ہو چکے تھے، اس میٹنگ میں یہ رسمی اعلان بھی کر دیا گیا کہ شانی ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے آئندہ الیکشن میں حصہ لے گی۔ تاہم اسے سرفراز احمد کی سیاسی پارٹی کی بھرپور حمایت حاصل رہے گی اور اس کی انتخابی مہم کو ہر طرح سپورٹ کیا جائے گا۔

رات آٹھ بجے کے لگ بھگ معزز مہمان حویلی سے واپس روانہ ہو گئے۔ ایک بار پھر وہی شور قیامت برپا ہوا۔ نعروں کی گونج سے رنگ والی کے در و دیوار لرزنے لگے۔ مہمانوں کی آمد کے موقع پر گلاب کی جو سینکڑوں من پتیاں نچھاور کی گئی تھیں، ان سے رنگ والی کے گلی کوچے ابھی تک سرخ نظر آ رہے تھے۔ اس ہنگامے سے فارغ ہونے کے فوراً بعد شانی کا دھیان اس فون کال کی طرف گیا جو سرفراز احمد کی آمد کے بعد اس کے سیل فون پر آئی تھی۔ یہ رستم کی کال تھی۔ شانی خود بھی رستم سے بات کرنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی مگر یہ کال ایسے موقع پر آئی تھی کہ سرفراز احمد اور دیگر مہمان شانی کے عین سامنے موجود تھے۔ علاقے کے بڑے بڑے زمیندار اور چوہدری حضرات ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو کر ان سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ شانی نے بس دو جملے بول کر فون بند کر دیا تھا۔ اس موقع پر وہ اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اب فرصت ملتے ہی اس کا دھیان رستم کی کال کی طرف گیا اور وہ اس سے بات کرنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ وہ بڑے غلط وقت میں اور بڑے غلط طریقے سے ان سب کو پھوڑ کر آئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ سب غم زدہ ہوں گے اور سب سے زیادہ رستم۔ اس کے تصور میں رستم کی اداس آنکھیں آئیں اور اسے ان آنکھوں پر بے تحاشا پیار آیا۔

وہ تیز قدموں سے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی مگر پھر یکایک اس کے قدم سست پڑ گئے۔ اسے یاد آیا کہ فون لائن تو کل سے پھر خراب ہے۔ اب وہ کیا کرے؟ اس نے خود سے پوچھا۔ موبائل پر رابطہ بہت مشکل سے ہوتا تھا بلکہ اسے اتفاق ہی کہنا چاہیے۔ پھر بھی کوشش تو کی جا سکتی تھی۔ وہ موبائل پر رستم کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ اچانک اسے خالو اعجاز کی صورت نظر آئی۔ وہ بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے، آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

"کیا بات ہے خالو جان؟" شانی نے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"آج دل بہت دکھا ہے۔" چوہدری اعجاز نے بھرائے لہجے میں کہا۔

"خیریت تو ہے خالو؟" شانی نے چوہدری اعجاز کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہے پھر ایک آہ بھر کر بولے۔ "رستم جو کچھ بھی ہے مگر اب رکھ رکھاؤ والا نظر آتا ہے۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ بہت بدل چکا ہے لیکن آج اس نے جس طرح بات کی ہے میں حیران رہ گیا ہوں۔ سچ کہہ رہا ہوں، میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔" چوہدری اعجاز کی آواز بھرا گئی۔

"کک..... کیا کہا ہے انہوں نے؟"

"بہت بدتمیزی سے بولا ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ مہمان آ گئے ہیں۔ شانی انہیں وعلیکم کہہ رہی ہے۔ وہ جونہی فارغ ہوئی خود فون کرے گی۔ بس اس بات پر وہ بھڑک اٹھا۔ پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا۔ آپ چوہدری ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ میں نے اپنی بیوی سے بات کرنی ہے..... اور مجھے منہ سنبھال کر بات کرنے کے مشورے دے رہا تھا۔ ایک دو بڑی سخت باتیں کہی ہیں اس نے۔ میں اب پچھتا رہا ہوں کہ میں نے فون ریسیو ہی کیوں کیا۔ تمہیں دے دیتا..... تم خود بات کر لیتیں۔"

"لیکن اس وقت میں کیسے بات کر سکتی تھی۔ مہمان سامنے کھڑے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔"

"بہرحال وہ بڑے غصے میں تھا۔ تم بھی ابھی اسے فون مت کرنا۔ ذرا غصہ ٹھنڈا ہو لینے دو۔ پتا نہیں کس موڈ میں ہے وہ..... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

چوہدری اعجاز چلے گئے اور شانی کا دل بجھ سا گیا۔ ایسا کیوں کیا ہے رستم نے؟ اسے تھوڑی دیر انتظار کر لینا چاہیے تھا۔ وہ بے چینی سے برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ مُنا اس کی نقل اتارتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے ٹہلنے لگا۔ شانی کی طرح اس نے بھی اپنے ہاتھ پشت پر باندھ رکھے تھے۔

"تانی! تم پلے شان ہو؟"

"نہیں تو۔"

"جب تم اس طرح چلتی ہو، مجھے پتا چل جاتا ہے کہ تم پلے شان ہو۔"

شانی نے اسے گود میں اٹھا کر اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی پھر اس کی ناک کھینچ کر بولی۔ "تم زیادہ نجومی مت بنا کرو۔"

"میں نجومی نہیں۔ میری کوئی دالی (داڑھی) ہے۔" شانی نے اس کے پیٹ میں انگلی

www.pdfbooksfree.pk

چھوئی۔ رستم کے لیے اس کے ذہن میں جو تھوڑا سا تناؤ پیدا ہوا تھا، وہ اب دور ہو چکا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی یقیناً کوئی معقول وجہ ہو گی، جس کے سبب رستم نے ترشی سے بات کی ہے۔ شانی نے دیکھا تھا کہ اس کے اندر بے پناہ برداشت تھی۔ بڑی سے بڑی بات کو وہ بے حد آسانی سے سہہ لیتا تھا۔ محبت نے اسے جینا سکھایا تھا..... اور اسی محبت نے شانی کو بھی جینا سکھایا تھا۔ یہ محبت اتنی طاقتور تھی کہ اس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر ہی نہیں سکتی تھی۔

''تم کیوں پلے شان ہو؟ مجھے بتاؤ نا!'' مُنا اپنے مخصوص انداز میں ٹھنک کر بولا۔

''سچ سچ بتاؤں؟'' شانی نے لاڈ سے کہا۔ مُنے نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔

''تمہارے انکل مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔''

''کیوں ہو گئے ہیں۔ کیا تم ان سے پڑھتی ہو؟''

''پڑھتی ہو؟ کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ جب میں تم کو سبق نہیں سناتا تو تم مجھ سے ناراض ہو جاتی ہو۔ کیا تم نے بھی ان کو سبق نہیں سنایا تھا؟''

شانی مسکرائی۔ ''ہاں..... یہی سمجھ لو۔ میں ان سے پیار کا سبق پڑھتے پڑھتے اچانک بھاگ آئی ہوں، ان کو بتایا بھی نہیں۔ انہوں نے ناراض تو ہونا ہی تھا۔''

''تو کیا، وہ اب تم کو ماریں گے؟''

''پتا نہیں۔ یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔'' وہ مسکرائی۔

''تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ وہ مجھ پل بھی غصہ نہیں ہوتے۔ میں تم کو ان سے مافی لے کل دوں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' شانی نے اس کی ناک مروڑی۔ ''معافی تو وہی مانگتا ہے جس نے غلطی کی ہو۔''

''مگر میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' شانی نے اسے گلے سے لگا کر چوما۔

مُنا چلا گیا تو وہ ایک بار پھر رستم کو فون کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے موبائل فون اٹھایا مگر رکھ دیا۔ خالو اعجاز نے کہا تھا کہ ابھی رستم کا موڈ بہت خراب ہے۔ اس نے سوچا کل کوشش کرے گی اور اگر فون نہ ہو سکا تو پھر خادم حسین سے کہے گی کہ وہ لاہور جا کر اس کا پیغام رستم تک پہنچا دے۔ درحقیقت دراج کے بھائی کے قتل والے واقعے نے اسے یہاں پھنسا کر رکھ دیا تھا۔ وہ کل اپنے وکیل، اپنے خالو اور چند دیگر افراد کے ساتھ تھانے جا

www.pdfbooksfree.pk

کر باقاعدہ ایف آئی آر درج کرانا چاہتی تھی مگر آج سرفراز صاحب نے کچھ اور بات کہہ دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ انہیں اس معاملے میں سازش کی بُو آ رہی ہے۔ وہ خود اس معاملے کو دیکھیں گے اور ایک دو دن میں خود ذاتی طور پر شانی کو آگاہ کریں گے۔ شانی جانتی تھی کہ اب اس کا رنگ والی سے فوری طور پر واپس لاہور جانا ممکن نہیں ہو گا۔

اگلے روز بھی رنگ والی حویلی کی لینڈ لائن ٹھیک نہیں ہو سکی۔ شانی موبائل پر کوشش کرتی رہی مگر رابطہ نہیں ہوا۔ سہ پہر کو وہ کمرے میں گئی تو یہ دیکھ کر حیران ہوئی کہ اس کا اٹیچی کیس ایک کونے میں پڑا ہوا ہے۔ یہ وہی اٹیچی کیس تھا جس میں وہ اپنا سامان لاہور لے کر گئی تھی۔ اس نے ملازمہ مجیداں کو بلایا۔ اس نے بتایا کہ یہ اٹیچی بابا خادم حسین رکھ کر گیا تھا۔

شانی نے فوراً خادم حسین کو طلب کیا اور اپنے سامان کے بارے میں پوچھا۔

خادم حسین نے کہا۔ ''چھوٹی بی بی! مجھے چوہدری اعجاز صاحب نے بھیجا تھا۔ انہوں نے ایک دو دوائیاں لاہور سے منگوائی تھیں۔ کہنے لگے کہ آتے ہوئے چھوٹی بی بی کا سامان بھی اقبال ٹاؤن سے لے آؤں۔ یہ پرسوں کی بات ہے۔''

''اور تم نے مجھ سے پوچھا تک نہیں؟''

''میں نے سمجھا، آپ کو پتا ہو گا۔''

شانی سٹپٹا کر رہ گئی۔ کبھی کبھی خالو اعجاز اتنی عجلت میں کام کرتے تھے کہ پریشانی ہوتی تھی۔ شانی کو محسوس ہوئی۔ وہ اتنا لمبا چوڑا پروگرام لے کر لاہور گئی تھی اور وہاں سے دو دن میں اس کا سامان اور وہ خود واپس رنگ والی پہنچ گئے تھے اور یہ سب کچھ آناً فاناً بغیر کسی کو بتائے ہوا تھا۔ شانی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی کہ رستم، ناصر اور اجمل وغیرہ کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔

اس نے خادم حسین کو واپس بھیج دیا۔ وہ خالو اعجاز سے سامان کی واپسی کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی مگر وہ زمین پر گئے ہوئے تھے۔ شانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ رستم سے رابطہ اب اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ فون کام نہیں کر رہے تھے۔ اب واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ خادم حسین کے ہاتھ رستم کو ایک تفصیلی خط بھیج دے..... یا پھر خادم حسین سے کہے کہ جنڈے شاہ کے مزار سے پانچ میل کا سفر طے کر جنرل اسٹور پہنچے اور وہاں سے بذریعہ فون رستم کو یہاں کی صورت حال سے آگاہ کر دے۔ یہ وہی جنرل اسٹور تھا جہاں ایک ٹیلی فون کا بوتھ موجود تھی۔ اس ٹیلی فون سے شانی نے ایک مرتبہ اپنے جابر شوہر فاخر کو کال کر کے اپنی رہائی کی اطلاع دی تھی اور اسے بتایا تھا کہ وہ غیر مشروط طور پر اس کے پاس آنا چاہتی ہے۔

سوچ بچار کے بعد اسے فون والی تجویز زیادہ آسان اور قابلِ عمل لگی۔

اس نے ایک بار پھر خادم حسین کو بلایا۔ خادم حسین گھر کے فرد کی طرح ہی تھا۔ خاص طور سے شانی بچپن سے ہی اپنے دل کی ہر بات اس سے کہہ دیتی تھی۔ خادم حسین کو ابھی تک رستم اور شانی کی شادی کا علم نہیں تھا۔ ہاں، یہ بات وہ بڑی اچھی طرح جانتا تھا کہ چھوٹی بی بی اور رستم سیال ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں..... بہت گہری محبت!

شانی کی جھنجھلاہٹ اب ذرا کنٹرول میں تھی۔ اس نے خادم حسین سے پوچھا۔ ''جب تم سامان لے کر آئے رستم صاحب نے کچھ کہا؟''

''بس جی یہ پوچھا تھا کہ سامان منگوانے کا کس نے کہا ہے۔ میں نے چوہدری صاحب کا نام لیا۔ وہ چپ ہو گئے۔ کچھ پریشان نظر آنے لگے تھے۔ پھر پوچھنے لگے، کیا سارا سامان لے جانا ہے؟ میں نے کہا، ہاں۔''

''فون کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا؟''

''میں نے انہیں بتایا تھا کہ حویلی کا فون پھر خراب ہو گیا ہے۔''

شانی کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ''بابا! بیٹھ جاؤ''

خادم حسین ہمیشہ کی طرح صوفے پر بیٹھ گیا۔ شانی نے کہا۔ ''بابا! تم نے میرا ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔ میں تمہیں پیسے دیتی ہوں، تم ابھی مزار سے بس میں بیٹھ کر جنرل اسٹور پر چلے جاؤ، پرانے جنرل اسٹور..... لاہور میں رستم کا فون نمبر ہے نا تمہارے پاس؟''

''ہاں جی! میں نے لکھا ہوا ہے۔'' خادم حسین نے جیب سے چٹ نکال کر دکھائی۔

''بس ٹھیک ہے۔ تم نے جنرل اسٹور سے رستم کو فون کرنا ہے۔ کوشش کرنا کہ رستم سے ہی بات ہو۔ رستم کو تم نے بتانا ہے کہ یہاں کیا پوزیشن ہوئی ہے۔ بادل مہتم کے قتل والی ساری بات کھول کر بتا دینا۔ یہ بھی بتا دینا کہ مہتم غصے میں ہیں اور ان کا زور ہے کہ قاتل کے خلاف فوراً پرچہ کٹوایا جائے۔ اس معاملے کی وجہ سے میرا یہاں دو چار دن رکنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ انہیں بتانا کہ میں یہاں سے فون کرنے کی بہت کوشش کرتی رہی ہوں مگر فون نہیں ہوا۔ انہیں یہ بھی بتا دینا کہ خالو اعجاز نے مجھے بتائے بغیر میرا سامان منگوا لیا ہے۔ سامان آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اب لاہور نہیں آؤں گی۔ جیسے ہی یہاں کا معاملہ نمٹ جاتا ہے، میں مُنے کے ساتھ پہنچ جاؤں گی۔ میری طرف سے ناصر اور اجمل سے بھی معذرت کرنا کہ میں انہیں بتائے بغیر یہاں چلی آئی۔ جیسے ہی حویلی کا فون ٹھیک ہوتا ہے، میں خود بھی ان سب سے بات کروں گی.....''

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے سب کچھ تفصیل سے خادم حسین کو سمجھا دیا اور کرایہ، کال چارجنگ وغیرہ دے کر فون کے لیے بھیج دیا..... اسے معلوم نہیں تھا کہ خادم حسین جنرل اسٹور نہیں پہنچے گا اور نہ ہی اس کا یہ اہم ترین پیغام رستم تک پہنچ پائے گا۔

خادم حسین شانی سے رخصت ہو کر حویلی کے مردانے میں پہنچا ہی تھا کہ اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ چوہدری اعجاز اس کے پیچھے آ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے خادم حسین کو روکا اور نشست گاہ کے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''شانی نے کیا بات کی ہے؟'' انہوں نے رازداری کے لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں چوہدری جی۔ وہ پوچھ رہی تھیں کہ وہاں کوٹھی میں کون تھا اور کیا بات ہوئی تھی؟''

''دیکھو خادم حسین!'' چوہدری اعجاز نے نہایت گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ کچھ بھی ہے، شانی ابھی بچی ہے۔ ہم نے اس کے مطابق نہیں چلنا بلکہ اسے اپنے مطابق چلانا ہے۔ ہر قدم پر اس کو راستہ دکھانا ہے۔ یہی بات تم سے معصوم بھائی نے بھی کہی تھی، کہی تھی نا؟''

خادم حسین نے گھبرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''اور معصوم بھائی نے یہ بھی کہا تھا کہ سامنے بے شک شانی ہے لیکن اس حویلی میں ہر کام میری ہدایت کے مطابق ہوگا۔ کہا تھا نا یہ بھی؟''

خادم حسین نے ایک بار پھر سر ہلا کر اقرار کیا۔

چوہدری اعجاز نے طویل سانس لی اور بولے۔ ''دیکھو خادم حسین! ہم جس کھیل میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ جتنا شان و شوکت والا ہے اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔ اس پورے علاقے کی نگاہیں رنگ والی حویلی پر اور ہم پر لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھانا ہے۔ اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا ہے۔ تم اس حویلی کے سب سے پرانے اور بااعتماد خدمت گار ہو۔ میں اور بھائی معصوم اور بیگم آمنہ تم سے یہ توقع ہرگز نہیں کر سکتے کہ تم ہم سے کوئی بھی بات چھپا کر رکھو گے۔''

''آ..... آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں چوہدری جی۔'' خادم حسین کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

''میں کہتا ہوں کہ شانی ابھی اتنی جہاں دیدہ نہیں ہوئی کہ اپنے سارے فیصلے خود کر

سکے۔ اس کے لیے بہت سے فیصلے ہمیں ہی کرنے ہوں گے اور میں امید رکھتا ہوں کہ تم اس کام میں ہمارا ساتھ دو گے۔''

خادم حسین سر جھکائے کھڑا رہا۔ اس کے عمر رسیدہ چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ ذرا توقف کے بعد چوہدری اعجاز نے اس سے پھر پوچھا کہ شانی بی بی نے اس سے کیا باتیں کی ہیں اور وہ کہاں جا رہا تھا۔ اس مرتبہ خادم حسین نے یہ ساری باتیں چوہدری اعجاز کے گوش گزار کر دیں۔ چوہدری اعجاز نے یہ سب کچھ تحمل سے سنا اور کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔

خادم حسین بات ختم کر چکا تو چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''خادم حسین! تم دیکھ ہی رہے ہو یہ سارا معاملہ کتنا خطرے والا ہے۔ تم لاہور ٹیلی فون نہیں کرو گے۔ مگر شانی بی بی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''وہ مجھ سے پوچھیں گی۔''

''اگر پوچھیں تو بتا دو کہ فون ہو گیا تھا۔ انہوں نے جو کہا، وہ تم نے فون پر رستم سے کہہ دیا۔ ٹھیک ہے؟''

''لیکن جب چھوٹی بی بی اور رستم وغیرہ میں فون پر یا کسی اور طریقے سے بات ہو گی تو میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔''

''تم پریشان نہ ہو۔ ان میں اب اتنی جلدی بات نہیں ہو گی۔ جب ہو گی تب دیکھا جائے گا۔ اور تب بھی تمہیں کسی کو جواب نہیں دینا پڑے گا۔ تمہاری جگہ بھائی معصوم جواب دیں گے۔''

خادم حسین سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں بدستور نم تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کے دل و دماغ پر بہت بوجھ ڈال رہا ہے۔

پھر وہی ہوا جو چوہدری اعجاز نے خادم حسین کو سمجھایا تھا۔ خادم حسین حویلی سے چلا گیا اور قریباً دو گھنٹے بعد واپس آیا۔ اس نے شانی کے پوچھنے پر اسے بتا دیا کہ وہ ان کے حکم پر عمل درآمد کر آیا ہے۔ اس نے فون پر رستم تک پیغام پہنچا دیا ہے۔

شانی کافی حد تک مطمئن ہو گئی۔ اب اسے سرفراز احمد قزلباش صاحب کی طرف سے رابطے کا انتظار تھا۔ فون لائن تو خراب پڑی تھی۔ یہ رابطہ یقیناً براہِ راست ہونا تھا۔ اس بات کی توقع تو کسی صورت نہیں کی جا سکتی تھی کہ سرفراز صاحب بہ نفسِ نفیس دوبارہ رنگ والی آئیں گے۔ اب ان کے کسی ماتحت یا سیکرٹری وغیرہ کو ہی آنا تھا۔ یہ رابطہ جتنی جلدی ہو جاتا اچھا تھا۔ شانی دیکھ رہی تھی کہ علاقے کی مہتم برادری میں غم و غصہ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ قاتل کے خلاف

کارروائی چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ کام فوراً ہو۔ سردار دراج نے ان لوگوں کو سنبھال رکھا تھا ورنہ زبردست قسم کا احتجاج شروع ہو سکتا تھا۔

شانی اور چوہدری اعجاز کی توقع کے مطابق اگلے روز دوپہر کو سرفراز احمد صاحب کا ایک نمائندہ تیمور حمدی اپنے دو محافظوں کے ساتھ رنگ والی پہنچا۔ تیمور حمدی چھدرے بالوں والا ایک ادھیڑ عمر خوش پوش شخص تھا۔ اس نے شانی، چوہدری اعجاز اور چوہدری معصوم کے ساتھ علیحدہ کمرے میں بات کی۔ اس نے سرفراز احمد صاحب کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارا یہ اندازہ بالکل درست ہے کہ مہتم برداری کے بندے کا قتل سازش کے تحت کیا گیا ہے اور یہ سازش بالکل واضح ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی سمجھ میں یہ بات آ رہی ہو۔''

''نہیں..... آپ وضاحت کریں۔'' چوہدری معصوم نے کہا۔

تیمور حمدی بولا۔ ''آپ کو پتا ہی ہو گا کہ ہماری سیاست میں برادری سسٹم کتنا اہم ہے۔ مہتم برادری کا سارا ووٹ آپ کی طرف ہے۔ اسی طرح گوراہی برادری کا ووٹ بھی آپ کو جانے والا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے جیتنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ آپ کے مخالف یہی چاہ رہے ہیں کہ ایسا نہ ہو اور ان دونوں میں سے کم از کم ایک برادری آپ کی حمایت چھوڑ دے۔''

''بادل کے قتل کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہمارے خیال میں یہی نکتہ آپ لوگوں کی نظر سے اوجھل ہے۔'' تیمور حمدی نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے اس نے تایا معصوم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ سب انسپکٹر طفیل کی شادی کن لوگوں میں ہوئی ہے؟''

''نہیں۔ مجھے معلوم نہیں۔''

''سب انسپکٹر طفیل گوراہی برادری کا داماد ہے۔ طفیل کے دو بڑے بھائی بھی گوراہی برادری میں بیاہے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پولیس میں ہے، دوسرا آبپاشی کے محکمے میں بڑا افسر ہے۔ داماد ہونے کی وجہ سے گوراہی برادری میں ان کا کافی اثر ہے۔ اگر اب آپ لوگ اس قتل کی وجہ سے طفیل کے خلاف کارروائی کراتے ہیں تو گوراہی برادری میں بہت سے لوگ آپ کی مخالفت پر اُتر آئیں گے۔ اس برادری کا ووٹ اگر ٹوٹ گیا تو الیکشن میں بہت نقصان ہو گا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ ان ووٹوں کی خاطر ہم.....''

''نہیں نہیں، ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں۔'' تیمور حمدی نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔

www.pdfbooksfree.pk

''آپ نے میری پوری بات نہیں سنی۔ جو اندر کی حقیقت ہے، وہ یہ ہے کہ سرفراز احمد صاحب خود بھی ڈپٹی ریاض کے حد سے بڑھے ہوئے اثر و رسوخ کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر طفیل نے جرم کیا ہے تو اس کی پوری پوری سزا اسے ملے لیکن اس کے لیے وہ مناسب وقت کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں..... سیاست میں اس طرح کی حکمتِ عملی اکثر اختیار کرنا پڑتی ہے۔''

''میں کسی حد تک آپ بات سمجھ رہا ہوں لیکن مدعی پارٹی کا ردِعمل سخت ہے۔'' خالو اعجاز نے کہا۔

''اس ردِعمل کو ہم کسی طرح کنٹرول کر لیں گے۔ اس دوران میں ہم خاموشی سے ملزم کے خلاف ٹھوس ثبوت بھی مہیا کریں گے۔ اس کام کے لیے ہمارے پاس وافر ذریعے موجود ہیں۔ آپ اس سارے معاملے میں بالکل بے فکر رہیں۔ ملزم اگر مجرم ثابت ہو گیا تو اسے آپ کی توقع سے بھی سخت سزا ملنی ہے۔''

''لیکن آپ ایک بات پر غور نہیں کر رہے۔'' شانی نے کہا۔ ''اگر ہم ملزم کے خلاف پرچہ نہیں کٹواتے اور مقتول کی پارٹی کی مدد نہیں کرتے تو یہ لوگ ہم سے بدظن ہو جائیں گے۔ مہتم برادری بھی تو ایک کافی بڑی برادری ہے۔ یہ لوگ ہمیں ووٹ نہیں دیں گے۔''

تیمور حمدی نے بڑی دانائی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''جی ہاں۔ درحقیقت ڈپٹی ریاض اور اس کے پیچھے موجود لوگ یہی چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ دونوں برادریوں میں سے ایک برادری ضرور ہم سے ناراض ہو جائے۔ ہمیں ان کی اسی چال سے بچنا ہے۔ میری معلومات کے مطابق مہتم برادری پر آپ لوگوں کا زیادہ اثر و رسوخ ہے بلکہ سردار دراج تو آپ کے ساتھ بہت عقیدت بھی رکھتا ہے۔ مہتم برادری کو آپ لوگ تھوڑے عرصے کے لیے کسی نہ کسی طور سنبھال لیں گے۔ مگر گوراہیوں کو سنبھالنا بہت مشکل ہے۔ ان کا رویہ ذرا مختلف ہے اور تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ ووٹر ہے اس برادری کا۔ جس طرح ہم پر چال چلی گئی ہے۔ ہم بھی اس کا جواب چال سے ہی دیں گے اور اللہ نے چاہا تو جواب بڑا کافی شافی ہوگا۔''

اس موضوع پر تیمور حمدی اور رنگ والی کے نمائندوں میں تقریباً آدھ گھنٹا بات ہوئی۔ تیمور حمدی نے بڑی گہری باتیں کیں۔ ان باتوں میں وزن تھا اور اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ سرفراز احمد صاحب اور ان کے ہمکاروں کے ہاتھ کافی لمبے ہیں۔ مسز سرفراز احمد کی طرف سے شانی کے لیے ایک بیش قیمت شال کا تحفہ بھیجا گیا تھا۔ چوہدری اعجاز، تایا معصوم اور شانی

www.pdfbooksfree.pk

کی پھوپھو آمنہ کے لیے بھی قیمتی تحفے آئے تھے۔

☆======☆======☆

رستم زبان سے کچھ نہیں کہہ رہا تھا مگر وہ ہر گھڑی شانی کے فون کا انتظار کر رہا تھا۔ آتے جاتے اکثر اس کی نگاہ ٹی وی لاؤنج میں رکھے فون کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ فون خاموش تھا اور اس کی خاموشی اس کے دل پر کچوکے لگاتی تھی۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ناصر، اجمل، زری اور ڈولا بھی پریشان تھے۔ سب بجھ سے گئے تھے۔ ایک دوسرے سے زیادہ بات چیت بھی نہیں ہوتی تھی۔ رستم کو گلا ہے بے گلا ہے آپوزاہدہ اور بھائی اکرام کا خیال بھی شدت سے آ رہا تھا۔

ایک دن اجمل نے اداسی سے پوچھا۔ ''کہیں بی بی..... اماری کسی بات پر ناراض تو نہیں ہو گیا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' رستم نے کہا پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ''وہ ایسی نہیں ہیں..... وہ ناراض نہیں ہو سکتیں۔ وہ بہت خوش تھیں یہاں۔ یقیناً وہاں کوئی مجبوری ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ رستم کو جیسے کرنٹ لگا۔ اس کا دل چاہا کہ لپک کر فون کی طرف جائے مگر اس میں اسے ہلکا پن محسوس ہوا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اجمل دوڑ کر فون کی طرف گیا۔

''ہیلو!'' اس نے پُرشوق انداز میں کہا۔

دوسری طرف سے جو آواز سنائی دی اسے سن کر اجمل کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ یقیناً یہ شانی کی آواز نہیں تھی۔ ''جی وہ ادھر ہی ہیں۔ ام ان کو بلاتا ہے۔'' اجمل نے مؤدب لہجے میں کہا۔ پھر رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''حاجی صاحب کا کال ہے جی۔''

رستم نے کال ریسیو کی۔ حاجی حیات نے کہا۔ ''ہاں بھئی، کیا ہو رہا ہے رستم زماں!''

''کھیاں مار رہے ہیں۔'' رستم نے جواب دیا۔

''اکھیاں مار رہے ہو..... کس کو؟''

''مذاق چھوڑو..... میں بہت سنجیدہ ہوں۔''

''شادی شدہ سنجیدہ ہی ہوتے ہیں۔ کوئی نئی بات کرو۔ ہماری بھابی پٹی یا نہیں؟''

''نہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ اب جلدی پلٹے گی بھی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''ادھر رنگ والی میں کچھ گڑ بڑ گوٹالا ہو گیا ہے۔ وہ اسے سنبھالنے میں لگ گئی ہو گی۔ کافی سیریس معاملہ ہے۔ شاید تمہیں ابھی تک پتا نہیں چلا۔''

''پتا کیسے چلے گا، تم نے ہمیں مرغیوں کی طرح اس کوٹھی کے ڈربے میں تاڑ رکھا ہے۔''

''یہ تمہاری بہتری کے لیے ہی ہے بھئی۔ دو ٹانگوں والے بہت سے کتے تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔''

''ہاں خبر کیا ہے؟''

''سردار دراج کا بھائی قتل ہو گیا ہے۔ اسے گولی مار دی گئی ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو..... کس نے ماری ہے گولی؟' رستم کے لہجے میں بے حد حیرت شامل ہو گئی۔

''یہی بات زیادہ پریشانی کی ہے۔ دراج کے بھائی کو قتل کرنے والا ڈپٹی ریاض کا قریبی رشتے دار ہے۔ بھتیجا ہے اس کا۔''

رستم سناٹے میں تھا۔ دراج کے بھائی کا قتل اس کے لیے اندوہناک تھا۔ اس جواں سال شخص کا نام بادل تھا۔ دراج کو اس سے بڑی الفت تھی۔ رستم کو یاد تھا، جب کٹھولی کے میلے سے دراج اور عارف وغیرہ نے اسے سنگین خطرے سے بچایا تھا اور شانی سمیت اسے مہتم بستی میں پہنچایا تھا..... یہاں سردار دراج نے جس طرح رستم اور شانی کی میزبانی کی، وہ یادگار تھی۔ وہ اور اس کے قریبی عزیز ہر خطرے کے سامنے دیوار بن گئے تھے۔ دراج اور اس کے بھائی نے اپنے لوگوں سے بھی لڑائی مول لی تھی مگر رستم اور شانی پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ آج رستم اور شانی کو پناہ دینے کا صلہ دراج کو اپنے بھائی کی موت کی صورت میں ملا تھا اور اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اس میں ڈپٹی ریاض کا نام آ رہا تھا۔ وہی خون آشام شخص جس کی گردن پر وڈے ڈیرے کے اَن گنت بااسیوں کا خون تھا۔ رستم کا خون کھول اٹھا اور اسے اپنے جسم کی رگیں تڑختی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''کس خیال میں کھو گئے ہو؟'' حاجی حیات کی آواز نے اسے چونکایا۔

''کیسے ہوا یہ قتل؟'' رستم نے دریافت کیا۔

''چند دن پہلے بڑی نہر کی پٹڑی ٹوٹ گئی تھی۔ علاقے کے کئی گاؤں میں پانی آ گیا تھا۔ گوراہیوں نے الزام لگایا ہے کہ بادل مہتم اور اس کے ساتھی تباہ حال گھروں میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ انہیں للکارا گیا، انہوں نے گولی چلا دی۔ جوابی فائرنگ میں سب انسپکٹر طفیل نے بادل کو شوٹ کر دیا۔ باقی افراد بھاگ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق یہ سب جھوٹ ہے۔

ان لوگوں نے بادل کو پروگرام کے تحت مارا ہے۔''

''قاتل کہاں ہے؟''

''وہ ابھی تک تو آزاد پھر رہا ہے۔ میں نے کل سنا تھا کہ رنگ والی کے چوہدری اس کے خلاف پرچہ کروانا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں تمہاری بیگم اور چوہدری اعجاز وغیرہ خود پولیس اسٹیشن پہنچیں اور ایف آئی آر کے لیے درخواست دیں۔ سردار دراج بھی ان کے ساتھ ہو گا۔''

''عام مہتم تو بڑے غصے میں ہوں گے؟'' رستم نے پوچھا۔

بہت زیادہ۔ آخر سردار کا بھائی قتل ہوا ہے۔ برادریوں میں ایسے معاملے بہت زیادہ بھڑ کتے ہیں۔ لوگ جنازہ لے کر حویلی کے سامنے پہنچے تھے۔ وہاں شانی نے لوگوں کو یقین دلایا کہ قاتل سزا سے بچ نہیں سکے گا۔ مہتم، شانی کی بہت عزت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں کا غم و غصہ کم ہوا اور وہ چارپائی واپس لے گئے لیکن اب میں کچھ اور خبر سن رہا ہوں.....''

حاجی حیات نے ذرا الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیسی خبر؟''

''پتا نہیں اب یہ خبر صحیح ہے یا نہیں مگر ایک انفارمر نے بتایا ہے کہ رنگ والی کے چوہدری کچھ ڈانواں ڈول ہو گئے ہیں۔ کہا جا رہا ہے قرلباش صاحب نے چوہدریوں کو منع کیا ہے..... انہوں نے کہا ہے کہ سب انسپکٹر طفیل کے خلاف پرچہ نہ کرایا جائے۔ اب اس کے پیچھے کیا وجہ ہے، اس بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر پرچہ درج نہ کرایا گیا تو مہتم برادری کا ری ایکشن کیا ہو گا۔''

حاجی حیات سے دس پندرہ منٹ اس موضوع پر بات ہوئی۔ پھر انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون بند کر کے رستم چند سیکنڈ تک خاموش رہا۔ یہ کرخت صورت والا سب انسپکٹر طفیل، رستم کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ رستم اسے ڈپٹی ریاض کے بھتیجے کی حیثیت سے جانتا تھا۔ جن دنوں رستم شانی کی چاہ دل میں لیے رنگ والی اور نار پور کے درمیان بھٹک رہا تھا، طفیل سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

یکایک رستم کے ذہن میں برق سی کوند گئی۔ اسے یاد آیا کہ یہاں لاہور میں طفیل کا ایک بڑا اپکا ٹھکانا ہے۔ یہاں کے ایک قریبی پوش علاقے میں گیسٹ ہاؤس تھا۔ یہ نام کا گیسٹ ہاؤس تھا ورنہ اسے عیاشی کا بدترین اڈا کہا جا سکتا تھا۔ اس گیسٹ ہاؤس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں عموماً درمیانی عمر کے لوگ آتے تھے۔ جس طرح ہر ہوٹل اور ریسٹورنٹ وغیرہ کی کوئی

www.pdfbooksfree.pk

خاصیت ہوتی ہے، اس عشرت کدے کی بھی ایک خاصیت سنی گئی تھی۔ یہاں ''عورت طلبوں'' کو درمیانی عمر کی قریبہ ادام، گداز عورتیں دستیاب ہوتی تھیں۔ عموماً یہاں غیر ملکی عورتیں بھی دیکھی جاتی تھیں۔ اس کی مالکہ پہلے بازارِ حسن کی ایک مشہور نائیکہ داری بیگم تھی، اب وہ یہاں میڈم ڈی کہلاتی تھی۔ رستم کے ہمدم دیرینہ زوار نے اسے بتایا تھا کہ طفیل اور اس کے دو دوست ہفتے کی شام زیادہ تر اس گیسٹ ہاؤس میں ہی گزارتے ہیں۔ وہ کہیں بھی ہوں، کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ایک ویک اینڈ یہاں گزرے۔ زوار کے مطابق دو تین بار ڈپٹی ریاض بھی یہاں دیکھا گیا تھا۔ طوائفوں کے ساتھ ڈپٹی ریاض کے گہرے مراسم تھے، میڈم ڈی بھی ان میں شامل تھی۔ وہ اکثر مشکل وقت میں ڈپٹی ریاض کو آواز دیتی تھی۔

یہ سارے خیالات بس چند سیکنڈ کے اندر رستم کے ذہن میں سے گزر گئے۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ آج ہفتے کا دن تھا۔ اسے لگا، اس کے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ ایک دم شعلہ جوالا بن گئی ہے۔ ڈپٹی ریاض کے رستم پر بہت سارے قرض تھے۔ اب ان بے شمار قرضوں میں اک اور قرض کا اضافہ ہوا تھا..... بادل بہتم کا قتل اور اس کا قاتل اب سے تین چار گھنٹے بعد رستم کو ایک قریبی عشرت کدے میں مل سکتا تھا۔ صرف چند کلومیٹر کا فاصلہ تھا..... صرف چند کلومیٹر! رستم اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کے اندر بھڑکتی آگ پھیلتی اور بڑھتی جا رہی تھی۔

رات قریباً نو بجے کا وقت تھا۔ رستم باہر گیراج میں آ گیا، وہ پینٹ شرٹ میں تھا۔ وہ بس کبھی کبھار ہی پینٹ شرٹ پہنتا تھا۔ اجمل دیکھ کر حیران ہوا۔ ''خیریت ہے رستم بھائی! آپ کہیں جا رہے ہے؟''

''ہاں، تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔''

''لیکن آپ جانتا ہے کہ حاجی حیات صیب نے ام کو باہر جانے سے بڑی سختی سے منع کیا ہوا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' رستم نے خشک لہجے میں کہا۔ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ اجمل چونک کر رہ گیا۔ اسے وڈے ڈیرے کا وہ رستم یاد آ گیا جو خطرات سے دیوانہ وار ٹکراتا تھا اور جس کے اندر ہر گھڑی ایک آتش بھڑکتی رہتی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی خطرناک معاملہ ہے۔ یہ بات تو اسے معلوم ہو ہی چکی تھی کہ چار پانچ دن پہلے سردار دراج کا بھائی قتل ہو گیا ہے اور اسے قتل کرنے والا ڈپٹی ریاض کا ہی کوئی بھتیجا بھانجا ہے۔ اسے شک ہوا کہ شاید رستم کا نکلنا اسی سلسلے میں ہے۔ مگر رستم کا موڈ ایسا تھا کہ وہ کچھ بھی پوچھ نہ سکا۔

گیراج میں رنگین شیشوں والی ایک سوزوکی کار کے علاوہ ایک بڑی موٹر سائیکل بھی کھڑی تھی۔ کالے رنگ کی یہ موٹر سائیکل 175 سی سی تھی۔ رستم جانتا تھا کہ اس کی نمبر پلیٹ فرضی ہے۔ رستم کے ہاتھ میں ہیلمٹ اور موٹر سائیکل کی چابی موجود تھی۔ اس نے ہیلمٹ پہنا اور اس کا ہلکا براؤن شیشہ نیچے گرا لیا۔

اجمل نے کہا۔ ''اگر ناصر بھائی پوچھے تو.....''

''میں نے اسے بتا دیا ہے۔'' رستم نے کہا اور موٹر سائیکل کا سیلف مار کر انجن اسٹارٹ کر لیا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لاہور کی روشن روشن سڑکوں پر جا رہا تھا۔ وہ وحدت روڈ سے ہوتا ہوا، اچھرہ اور پھر نہر کی طرف نکل گیا۔ اس کی پنڈلی کے ساتھ بریفنگ کے ذریعے 38 بور کا پسٹل بندھا ہوا تھا۔ لاہور کی ہائپر مہاتی زندگی دیکھنے کا اتفاق اسے بہت دنوں بعد ہوا تھا۔ فضا میں کہرا جمی تھا تاہم موٹر سائیکل چلاتے ہوئے اسے خوشگوار ہوا لگ رہی تھی۔ خاص طور سے نہر کے کنارے ہوا میں ٹھنڈک موجود تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید رستم اس رائڈ سے لطف اٹھاتا مگر اس وقت تو اس کے اندر سرخ انگارے دہک رہے تھے اور ہر اندر جاتی سانس سینے کو شعلے کی طرح جھلسا رہی تھی۔ ایک طویل..... طویل انتظار کے بعد بالآخر ڈپٹی ریاض سے حساب بیباق کرنے کا وقت آ گیا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد رستم ایک کشادہ رہائشی آبادی کے ایک نہایت دیدہ زیب گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ وسیع لان میں اور باہر گرین بیلٹ کے ساتھ قریباً دو درجن گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مین گیٹ پر چوکیدار نے رستم کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے اندر چلا گیا کہ میڈم ڈی سے ملنے آیا ہوں۔ چوکیدار تذبذب میں کھڑا رہ گیا۔

رستم نے موٹر سائیکل پارکنگ میں ایک جانب کھڑی کر دی۔ ہیلمٹ بدستور اس کے سر پر تھا۔ وہ سوچ رہا تھا، یہ ہیلمٹ بھی بڑے کمال کی چیز ہے۔ اسے اب اصل پریشانی اس بات کی تھی کہ کیا آج رات وہ واقعی ریاض ہٹلر کے بھتیجے سے ملاقات کر سکے گا۔ یہی سوچتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک اس کی نظر سرخ رنگ کی ایک چھوٹی کار پر پڑی۔ اس پر لوہرا نوالہ کی نمبر پلیٹ تھی۔ رستم کے جسم میں برق سی دوڑ گئی۔ اس نے یہ کار پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔ یقیناً اس گاڑی پر طفیل یہاں پہنچا ہوا تھا۔

رستم عمارت کے اندرونی دروازے کے سامنے سے گزرا تو اسے اندازہ ہوا کہ محفل پچھلے لان میں جمی ہوئی ہے۔ وہ سائیڈ کی راہداری سے ہوتا ہوا پچھلے لان میں آ گیا۔ اوپن

www.pdfbooksfree.pk

ائیر میں کوئی پچیس تیس میزیں لگی ہوئی تھیں۔ بوفے کا اہتمام تھا۔ زیادہ تر میزوں پر جوڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیانی عمر کی کئی گداز بدن عورتیں بھی نظر آئیں۔ وہ سب کی سب خوش شکل اور نازنخرے سے آراستہ تھیں..... ان کے ساتھی مردوں میں بھی زیادہ تر درمیانی عمر کے تھے۔ تاہم دو چار اسمارٹ جوڑے بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف اسٹیج بنا ہوا تھا۔ یہاں بھرے بھرے جسم والی ایک عورت نما لڑکی، ایک طوائف کے لباس میں باقاعدہ تھنگروؤں کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

ہلکی ہلکی ہوا چلنا شروع ہوگئی تھی جس کی وجہ سے سفید میز پوش اور حسیناؤں کے پیراہن اُڑ رہے تھے۔ چند کرسیاں بوفے کے سیٹ اَپ سے علیٰحدہ پڑی ہوئی تھیں۔ رستم ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے ہیلمٹ کی شیلڈ یعنی شیشہ اوپر اٹھا دیا تھا لیکن..... ہیلمٹ بہ دستور اس کے سر پر ہی تھا۔ اچانک اس کی نظر طفیل پر پڑ گئی۔ وہ خود بھی کافی فربہ اندام تھا۔ پتلون قمیص پہنے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک میز پر موجود تھا..... نیلے اسکرٹ والی ایک گدرائی ہوئی لڑکی اس سے لپک لپک کر باتیں کر رہی تھی۔ لڑکی کی سفید رنگت سے پتا چلتا تھا کہ وہ غیر ملکی ہے تاہم رستم فاصلے سے اس کی قومیت کا اندازہ نہیں لگا سکا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہوا تیز ہوگئی اور پھر شدید آندھی کی شکل اختیار کر گئی۔ اوپن ائیر کی یہ تقریب شدید ہلچل کا شکار ہوگئی۔ میز پوش اُڑنے لگے، برتن الٹ گئے۔ عورتوں کے لباس..... تیز ہوا کے سبب ان کے ہر نشیب و فراز کی چغلی کھانے لگے۔ رستم نے دیکھا، غیر ملکی لڑکی کا اسکرٹ نما لبادہ ایک دم اوپر اٹھ گیا اور چند لمحے کے لیے اس کی ٹانگیں بالکل عریاں نظر آئیں۔ لوگ چلاتے شور مچاتے اندر کی طرف بھاگے۔ رستم کی نگاہ بہ دستور اپنے شکار پر تھی۔ اسی دوران میں اچانک لائٹ بھی چلی گئی۔ وسیع لان میں تیرگی پھیل گئی تاہم رستم کو اپنا شکار اب بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی اپنے بھاری جسم کو حرکت دیتا ہوا گیسٹ ہاؤس کی عمارت کی طرف بھاگا۔ رستم کا ارادہ اسے شوٹ کرنے کا تھا لیکن صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس نے اچانک ہی اپنا ارادہ تبدیل کر دیا۔ وہ ایک دراز قد سرو کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ طفیل اپنے بھاری جسم کو ہلکورے دیتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔ گرد کے سبب اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے ساتھی نسبتاً سبک بدن ہونے کے سبب اس سے آگے نکل چکے تھے۔ جونہی وہ قریب پہنچا، رستم اس کے سامنے آ گیا۔

''میری بات سنو جی۔'' رستم بلند آواز میں بولا۔

''کیا بات ہے؟'' طفیل، رستم کو سرتاپا دیکھتے ہوئے پھنکارا۔

رستم نے کہا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''میانی صاحب قبرستان میں۔'' رستم نے ہیلمٹ کے اندر سے ہی جواب دیا۔

''کیا بکواس ہے؟'' طفیل نے رستم کو راستے سے دھکیلنا چاہا۔

یکایک برق سے لپکی اور رستم نے سرو کی اوٹ میں فربہ اندام طفیل کو آکٹوپس کی طرح جکڑ لیا۔ اس کے 38 بور پسٹل کی نال طفیل کی کنپٹی سے آ لگی تھی۔

''ہلنے کی کوشش نہ کرنا۔'' رستم پھنکارا۔ ''ایک سیکنڈ میں ٹھنڈا کر دوں گا..... میں رستم سیال ہوں۔'' رستم کے آخری چار الفاظ نے چند لمحے کے لیے طفیل کو جیسے پتھرا دیا۔

رستم اس کے عقب میں تھا اس نے رخ موڑ کر رستم کو دیکھنے کی کوشش کی مگر اس کی گردن بازو کے شکنجے میں تھی، وہ چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ تیرا باپ ہوں۔ چہرہ شہرہ بعد میں دیکھ لینا۔'' رستم پھر پھنکارا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پسٹل کا بیرل بڑی بے رحمی سے طفیل کی چربی دار گردن میں گھسیڑا۔ وہ کراہ اٹھا۔

وہ رستم کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا مگر رستم کی آواز اور لہجہ شاید اس نے پہچان لیا تھا۔ ایک ہی لمحے میں اس کی ساری مزاحمت اور مدافعت دم توڑ گئی۔ رستم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''اگر زندگی سے تھوڑا سا بھی پیار ہے تو بھلے مانسوں کی طرح میرے آگے چل پڑ۔ اگر چالاکی دکھائے گا تو کم از کم تین گولیاں ضرور تیرے کھوپڑ میں اتاروں گا۔''

اس کے لہجے میں نہ جانے کیا بات تھی کہ طفیل پورے جسم سے کانپ گیا۔ رستم اسے چھوڑ کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور گرجا۔ ''چل..... اپنی گاڑی کی طرف چل۔'' طفیل نے بے بسی کی ایک نظر اردگرد ڈالی۔ لان یکسر خالی ہو چکا تھا۔ آندھی کے تیز جھکڑوں میں برتن لڑھکتے پھر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا اشتہاری بورڈ زمین بوس ہوگیا تھا۔ طفیل کی سرخ کار زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے کار کے قریب پہنچ گئے۔

''دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ۔'' رستم نے حکم جاری کیا۔

اس مرحلے میں ایک سیکنڈ کے لیے رستم کو لگا کہ شاید طفیل کوئی پھرتی دکھانا چاہتا ہے۔ اس نے پسٹل کی نال اس کی کمر سے لگا دی۔ اگر طفیل کے دماغ میں کوئی باغیانہ خیال آیا بھی تھا تو صاف ہوگیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے جیب ٹٹول کر گاڑی کی چابی نکالی اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رستم نے اس کے عین پیچھے نشست سنبھال لی۔

''چلو..... گیسٹ ہاؤس سے باہر نکلو۔'' رستم پھنکارا۔ ہیلمٹ بہ دستور اس کے سر پر تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

''مم..... مجھ سے کیا چاہتے ہو تم.....؟'' طفیل کے منہ سے پہلی بار لرزاں آواز نکلی۔

''زیادہ کچھ نہیں چاہتا..... لیکن فی الحال تم بلی بے بچوں کی طرح یہاں سے نکلو۔'' رستم کے لہجے میں زہریلی کاٹ تھی۔

''کیا تم..... رستم ہو؟'' طفیل نے خوف کے عالم میں بے معنی سوال کیا۔

''نہیں، اس کی روح ہوں۔ تجھ سے ملنے کے لیے وڈے ڈیرے سے یہاں تک کا سفر کیا ہے۔'' رستم نے ترت جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی پستول کی نال اس کی گردن سے لگا دی۔

چند سیکنڈ تک تذبذب میں رہنے کے بعد طفیل اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا۔ وہ تیز آندھی میں گاڑی چلا کر باہر لایا اور پھر کشادہ سڑک پر آگے بڑھنے لگا۔ وہ کوئی معمولی شخص نہیں تھا۔ بڑے بڑوں کا پتا اس کے نام سے پانی ہوتا تھا لیکن آج وہ رستم سیال کے نشانے پر تھا اور رستم سیال کی دہشت طفیل کی دہشت پر بہت بھاری پڑ رہی تھی۔

رستم جس موٹر سائیکل پر گیسٹ ہاؤس پہنچا تھا، وہ وہیں کھڑی رہ گئی تھی مگر اس کی طرف سے رستم کو کسی طرح کا اندیشہ نہیں تھا۔ اس موٹر سائیکل کے ذریعے حاجی حیات یا رستم وغیرہ کا کھوج لگانا کسی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ بھی اصلی نہیں تھی۔ یہ موٹر سائیکل حاجی حیات کے ماتحت انسپکٹر نے کسی خاص مقصد کے لیے رکھی ہوئی تھی۔

تقریباً آدھ گھنٹے بعد رستم اور طفیل آندھی کے تیز جھکڑوں میں ائیر پورٹ ٹاؤن کی مین روڈ پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں آکر رستم نے طفیل کو ایک جگہ گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ اس نے کنارے پر گاڑی روک دی۔ رستم نے گاڑی صاف کرنے والے کپڑے سے طفیل کی آنکھیں مضبوطی سے باندھ دیں۔ اس نے کوئی چون و چرا نہیں کی۔ آنکھیں باندھنے کے بعد رستم نے اسے ساتھ والی نشست پر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ وہ بیٹھ گیا تو رستم نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس کے بعد رستم نے طفیل کی نشست کو اس طرح اسٹریچ کر دیا کہ وہ گاڑی میں نیم دراز ہو گیا۔ یوں اس بات کا امکان بالکل ختم ہو گیا کہ طفیل کو باہر سے دیکھا جا سکے گا۔

تیز آندھی نے لاہور کے در و بام کو گرد آلود کر رکھا تھا۔ اسی گرد میں راستہ بناتے ہوئے مختلف سڑکوں سے گزرا اور پھر اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ ہارن پر ملازم نے دروازہ کھولا اور رستم کو پہچاننے کے بعد بڑا گیٹ کھول دیا۔ رستم گاڑی کو ڈرائیوے پر سے گزار کر سیدھا گیراج میں لے گیا۔ کچھ دیر بعد اجمل خان اور ناصر بھی باہر آ گئے۔

ناصر نے چہک کر کہا۔ ''رستم بھائی! یہ تو بڑا فائدے والا پھیرا رہا ہے۔ موٹر سائیکل لے

کر گئے تھے، گاڑی لے کر آ گئے۔''

''پہلے گاڑی کے اندر تو دیکھ لو کہ کیا ہے؟'' رستم نے سنجیدگی سے کہا۔

گاڑی کے اندر دیکھ کر ناصر اور اجمل ششدر رہ گئے۔ طفیل کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ کسی پریشان زچہ کی طرح نشست پر لیٹا تھا۔

''یہ بھینسا کون ہے؟'' اجمل نے پوچھا۔

''اسی حرامی نے بادل بہتھ کو گولی ماری تھی۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔

''اوہ گاڈ!'' ناصر ہونٹ سکوڑ کر رہ گیا۔ ''اس کو آپ کہاں سے اٹھا لائے؟''

''ہے اس کا ایک اڈا جہاں یہ باقاعدگی سے اپنا منہ کالا کرنے کے لیے تشریف لاتا ہے۔''

اجمل کا چہرہ تمتما گیا تھا۔ وہ جوش سے بولا۔ ''آپ نے امارا دل خوش کر دیا رستم بھائی۔ جب آپ ایسا کام کرتا ہے، امارا خون سیروں بڑھ جاتا ہے۔ ام کو امید ہے کہ آپ اس کو ذبح کرنے کا کام ام کو سونپے گا اور اگر زندہ اس کا کھال اُتارنا ہے تو بھی ام حاضر ہے۔''

''چلو، پہلے اس کو اندر تو لے جاؤ۔'' رستم نے کہا اور اپنا پٹھل اجمل کو تھما دیا۔

اجمل نے گریبان سے کھینچ کر طفیل کو اٹھایا اور اس کی پسلیوں میں پٹھل چبھونے کے بعد اسے اندر چلنے کی ہدایت کی۔ طفیل کی آنکھوں پر پٹی بہ دستور موجود تھی۔ زری، ڈولا اور خانساماں وغیرہ بھی طفیل کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ اجمل کے ہاتھ میں موجود پستول نے بھی سب کو ڈرایا۔

ناصر، اجمل اور رستم اس کو سیدھا کوٹھی کے ایک اندرونی کمرے میں لے گئے۔ یہاں رستم اچانک طفیل پر ٹوٹ پڑا۔ اس کے حملے میں بلا کا غضب تھا۔ صرف تیس چالیس سیکنڈ کے اندر طفیل کا بالائی لباس تار تار ہو گیا۔ رستم کے طوفانی گھونسوں اور ٹھوکروں نے طفیل کے ناک منہ سے خون چھڑا دیا..... اور وہ جو ایک گداز انگریزی کے ساتھ بوفے ڈنر کھانے کے لیے تیار تھا، قالین پر مچھلی کی طرح تڑپتا اور لوٹتا نظر آیا۔ وہ گاہے بہ گاہے کریہہ انداز میں چلاتا تھا اور اپنا چہرہ رستم کے ضربوں سے بچانے کی کوشش کرتا تھا۔

رستم نے اپنے طیش کو بڑی مشکل سے سنبھالا ورنہ شاید اسی جگہ طفیل کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا۔

رستم، اجمل سے مخاطب ہو کر گرجا۔ ''آج رات اس کی خوب خاطر مدارت کرو۔ اسے کسی طرح کی شکایت نہ رہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''بالکل جی۔'' ناصر نے تائید کی۔ ''ڈپٹی ریاض کا بھتیجا ہونے کی وجہ سے اس کی خاطر مدارت کون کرتا ہوگا۔ جس کو کوئی نہ پوچھے اس کو ضرور پوچھنا چاہیے..... اور بڑے اچھے طریقے سے!''

''آپ پھکڑ ہی نہ کریں جی۔ یہ پولیس والا ہے تو ام بھی پولیس والا ہے۔ سابقہ ہے تو پھر کیا ہوا۔''

''اس حرامی کو بھی سابقہ ہی سمجھو۔ معطل ہوا بیٹھا ہے۔'' رستم نے اس پر آتشیں نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

ناصر اور اجمل نے آگے بڑھ کر طفیل کے ہاتھ اس کی پشت پر مضبوطی سے باندھ دیئے۔ اس مقصد کے لیے اس کی پینٹ کی بیلٹ استعمال کی گئی۔ اس کے پاؤں باندھنے کے لیے نائیلون کی رسی استعمال کی گئی۔ اس دوران میں فربہ اندام طفیل ہانپتا رہا اور شعلہ بار نظروں سے رستم وغیرہ کو گھورتا رہا۔ شاید اتنی مار کھانے کے بعد بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ رستم زندہ سلامت اس کے سامنے موجود ہے۔ وہ تو شاید یہی جانتا تھا کہ رستم کو اس کے جلاد چچا ریاض نے لنگڑا کرنے کے بعد وڈے ڈیرے کی گھاٹیوں میں فنا کر دیا تھا۔

اس نے خون تھوکتے ہوئے رستم کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' غالباً وہ بھانپ گیا تھا کہ اس کے ساتھ مزید مار پیٹ کی تیاری ہو رہی تھی۔

''ہم چاہتے تو بہت کچھ ہیں۔ تم سے بہت سی باتیں بھی پوچھنا ہیں لیکن فی الحال ہم تمہیں مارنا چاہتے ہیں۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔

''کک..... کیا مطلب؟'' طفیل کا رنگ کچھ اور زرد ہو گیا۔

''اوہ خدائی خوار! تم مار کھا مطلب نہیں سمجھتا۔ مار مار کر لوگوں کا چمڑیاں ادھیڑ دیتا ہے اور خود کو مار کا پتا ہی نہیں۔ اس کو کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا..... بلکہ اندھیرا گھپ۔ یہ دیکھو، اس کو کہتے ہیں مار..... یہ دیکھو۔'' اجمل نے اس کے سر اور کمر پر ہاتھوں سے کئی زوردار ضربیں لگائیں اور پھر ٹانگ مار کر فرش پر لمبا لٹا دیا۔

طفیل نے غیض میں آ کر ایک دم گالیوں کی بوچھاڑ کر دی اور جنونی انداز میں فرش سے اٹھنے کی ناکام کوشش کی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اب یہ سب کچھ بے سود ہے۔ اس کی گالیوں کے انداز میں رستم کو ڈپٹی ریاض ہٹلر کی جھلک صاف نظر آئی۔ یوں لگا کہ چھوٹا ڈپٹی ریاض بول رہا ہے۔ رستم نے اجمل کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھ کر طفیل کی چھاتی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں

ہاتھوں سے طفیل کی چربی دار گردن دبائی تو اس کا منہ کھل گیا۔ ناصر نے پھرتی سے جھاڑ پونچھ والا کپڑا طفیل کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ اس کی آواز غوں غاں میں بدل گئی..... ناصر نے اس کے بند منہ کے اوپر ایک پرانی ٹائی کس کر باندھ دی۔

رستم اور ناصر تو باہر آ گئے تاہم اجمل نے بند کمرے کے اندر طفیل کو آدھ پون گھنٹے تک سخت پھینٹی لگائی۔ وہ اسے چمڑے کی بیلٹ سے مار رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے طفیل کے کراہنے اور چلانے کی آواز آتی تھی۔ رستم فطرتاً اذیت پسند نہیں تھا اور نہ ہی شدید منتقم المزاج تھا۔ مگر آج طفیل کی درد بھری چیخیں اسے اچھی لگ رہی تھیں۔

زری بار بار کانوں میں انگلی ٹھونستی تھی۔ آخر اس نے پوچھا۔ ''یہ کیوں چلاتا، کیوں شور مچاتا؟''

ناصر نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ یہاں کا رسم ہے۔ جو لوگ باہر سے آتے، ہم ان کو خوب پیٹتے۔''

''یہ کیا بات..... کیا تم..... ام کو بھی پیٹے گا؟''

''کیوں نہیں، بس ذرا شادی ہو جانے دو..... پھر ہم تم کو خوب مارے گا۔''

''کک..... کس چیز سے؟''

''کوئی ایک چیز تھوڑی ہے۔ مختلف موقعوں پر مختلف چیزوں سے مارا کروں گا۔''

زری واقعی ڈری ہوئی نظر آنے لگی۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوالیہ نظروں سے رستم کی طرف دیکھنے لگی۔ ناصر نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور زری کے کندھے پر بازو رکھ کر اسے بڑی محبت سے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''پاگلے! تجھے کیوں ماروں گا۔ تجھے تو پھول کی طرح رکھوں گا۔ یہ تو بہت خبیث بھینسا ہے۔ اس نے ہمارے ایک دوست کو قتل کیا ہے۔ اس کی جان لی ہے۔''

''تو..... تم اس کے ساتھ کیا کرے گا؟''

''جو تمہاری بستی کے لوگ گارنیوں کے ساتھ کرتے تھے بلکہ وہ تو کچھ بھی نہیں تھا..... تم دیکھتی رہنا۔''

''میں نہیں دیکھوں گا۔''

''پھر وہی دیکھوں گا۔'' ناصر نے اس کے بال پکڑے۔ ''دیکھوں گی..... بولو دیکھوں گی۔''

''ہائے..... میرے بال۔'' وہ کراہی۔

www.pdfbooksfree.pk

''پہلے بولو دیکھوں گی۔''

''وہ مسکی لے کر بولی۔''دیکھوں گی۔''

ناصر نے کہا۔''شاباش!''اور اس کے بال چھوڑ دیئے۔

وہ اٹھ کر دروازے تک چلی گئی۔ پھر ایک دم شرارت سے مسکرائی اور زور سے بولی۔

''دیکھوں گا..... دیکھوں گا۔''

''ٹھہر، تیری ایسی کم تیسی۔''ناصر اس کے پیچھے لپکا۔

وہ بھاگ کر کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگا لی لیکن ایک کھڑکی کھلی تھی۔ ناصر آرام سے کود کر اندر چلا گیا۔''دیکھوں گی..... دیکھوں گی۔''وہ زور زور سے چلانے لگی۔ پھر اندر سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگیں۔

طفیل سے مار پیٹ ختم ہو چکی تھی۔ اجمل وسطی کمرے میں سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک چمڑے کی بیلٹ تھی۔ چہرہ غضب سے تمتما رہا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''شاید بے ہوش ہو گیا یا شاید ڈراما کر رہا ہے۔''اجمل بولا۔

''چلو آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''ڈپٹی ریاض کے کسی ساتھی کو آسان موت نہیں مارنا رستم صیب۔''اجمل کے لہجے میں عجیب سی گرج تھی۔ اس گرج کے پیچھے ظلم و ستم کی ایک طویل داستان تھی۔

''لیکن ہم ڈپٹی ریاض تک پہنچ بھی سکیں گے؟''رستم نے کہا۔

''کیوں نہیں پہنچیں گے رستم بھائی۔ ہمارے اندر کا آگ ام کو راستہ دکھائے گا۔''

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ جب بھی گھنٹی بجتی تھی، رستم کے سینے میں ایک لہر سی دوڑ جاتی تھی۔ اس کا دل پکار کر کہتا تھا کہ یہ اس کی شانی بی بی کا فون ہے۔ اس مرتبہ بھی اس کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر فون کے پاس پہنچ جائے لیکن پھر اپنا رکھ رکھاؤ آڑے آیا۔ وہ وہیں بیٹھا فون کی طرف دیکھتا رہا..... اجمل لپک کر فون سیٹ کے پاس پہنچا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ پھر اس کے چہرے پر مسرت کی چمک صبح کے اجالے کی طرح پھیلتی چلی گئی۔

''ہیلو! ام ام اجمل خان بول رہا ہے۔''اجمل نے چہک کر کہا۔

دوسری طرف سے کچھ پوچھا گیا۔ اجمل نے اثبات میں سر ہلایا۔''جی جی! باقی سب امارے ساتھ ہے۔ ام آپ کی کال کا بہت انتظار کر رہا ہے۔ جی ہاں..... جی ہاں۔ اب بھی لائن میں شور آ رہا ہے۔ آپ شانی بہن ہی بول رہا ہے ناں؟''اجمل نے ذرا چونک کر پوچھا۔

جواب میں جو کچھ کہا گیا اسے سن کر اجمل کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ اس نے مایوس نظروں سے رستم کی طرف دیکھا..... پھر ریسیور رستم کی طرف بڑھا دیا۔

رستم کے دل پر بھی گھونسا سا لگا تھا۔ اس نے ریسیور تھام کر''ہیلو'' کہا۔ لائن میں ہلکا سا شور تھا۔ دوسری طرف کوئی لڑکی بول رہی تھی۔''آپ رستم ہیں''لڑکی نے پوچھا۔

''آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''رستم نے خشک لہجے میں کہا۔

''میں حاجی حیات صاحب کے لیے کام کرتی ہوں۔ پہلوان اور جیرا کے ساتھ ہوتی ہوں۔ حاجی صاحب آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ آپ چند سیکنڈ کے لیے ہولڈ کریں۔''لڑکی نے شائستہ لہجے میں کہا۔

دس پندرہ سیکنڈ بعد لائن پر حاجی حیات کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ حاجی حیات نے چھوٹتے ہی کہا۔''یار! یہ کیا چکر چل رہا ہے تمہارے سسرال میں؟''

''کیوں کیا ہوا؟''رستم نے بجھے بجھے لہجے میں پوچھا۔

''لگتا ہے کہ بھابی شانی پر دباؤ ہے اور دباؤ کے ساتھ اس سے غلط فیصلے کرائے جا رہے ہیں۔''

''تم کیا کہنا چاہتے ہو حاجی؟''

''دیکھو، اب یہ بات بالکل سامنے کی ہے کہ ڈپٹی ریاض کے بھتیجے نے مہتم برادری کا بندہ قتل کیا ہے اور بالکل ناجائز کیا ہے۔ دو تین دن پہلے تک یہ پروگرام تھا کہ رنگ والی کے چوہدری مہتم سردار کے ساتھ جا کر قاتل کے خلاف رپورٹ درج کرائیں گے اور اس کی پوری پیروی بھی کریں گے مگر اب پتا چلا ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ اس کے بجائے شانی بھابی اور اس کے تایا وغیرہ سردار دراج کو سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر مختلف طریقوں سے دباؤ ڈالا جا رہا ہے کہ وہ اس معاملے کو زیادہ نہ اچھالے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سنگی ساتھیوں کو بھی شدید قسم کے احتجاج سے روک کر رکھے۔ پتا نہیں کہ یہ لوگ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ اس طرح یہ ہزاروں مہتموں کو اپنے خلاف کر لیں گے۔''

''میرے خیال میں اگر صورتِ حال ویسی ہی ہے جیسی تم بتا رہے ہو تو پھر اس میں شانی بی بی کا زیادہ عمل دخل نہیں ہو گا۔''

''تمہاری یہ سوچ درست نہیں۔''حاجی حیات نے اطمینان سے کہا۔''میری اطلاع کے مطابق بھابی شانی اس معاملے میں کافی سرگرم ہے۔ وہ اس مسئلے میں گہری دلچسپی لے رہی ہے اور اسے لینی بھی چاہیے۔ لوگ اس کی بات بہت مانتے ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''لیکن..... یہ رپورٹ نہ کرانے والا فیصلہ کیوں ہوا ہے؟''

''شاید..... اس میں کچھ کردار سرفراز قزلباش صاحب کا بھی ہے۔ انہوں نے ہی بھابی شانی اور بزرگوں پر زور دیا ہے کہ وہ ابھی سب انسپکٹر طفیل والے کیس کو نہ چھیڑیں۔ بھابی شانی اور رنگ والی کے بزرگ چوہدریوں کو یہ بات ماننا پڑی ہے۔''

''مگر یہ تو ناانصافی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ مہتم برداری بھی پریشان ہو جائے گی۔''

''مگر یار جی! سرفراز صاحب جیسے بااثر بندے کی بات کو رد کرنا بھی تو آسان نہیں ہوتا۔ یہ شخص اس وقت بہت بلندی پر پرواز کر رہا ہے۔'' بات کرتے کرتے حاجی حیات اچانک خاموش ہو گئے۔ شاید ان کے موبائل کی بیل ہونے لگی تھی۔ ''ایک منٹ ہولڈ کرنا۔'' انہوں نے رستم سے کہا اور موبائل پر گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

قریباً دو منٹ بعد انہوں نے دوبارہ رستم کو مخاطب کیا۔

''ہیلو رستم! یہاں ایک نئی خبر ہے۔''

''کیا ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔

''سب انسپکٹر طفیل لاپتا ہو گیا ہے۔ اب سے کوئی دو گھنٹے پہلے تک وہ یہاں لاہور کے ایک گیسٹ ہاؤس میں موجود تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ یہاں کسی بندے سے تفتیش کرنے آیا ہوا تھا..... ایک دوست بھی اس کے ساتھ موجود تھا۔ جب زور کی آندھی چلی تب بھی وہ گیسٹ ہاؤس میں ہی تھا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کی کار بھی پارکنگ میں نہیں ہے۔''

رستم نے اطمینان سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کہیں گیا ہو۔ اتنی جلدی کیسے سوچ لیا گیا کہ وہ لاپتا ہوا ہے؟''

''موقع سے اس کی گھڑی ملی ہے۔ شاید اس کی کسی کے ساتھ کھینچا تانی ہوئی ہے جس کے سبب اس کی گھڑی کھل کر گری ہے۔''

رستم دانت پیس کر رہ گیا۔ طفیل کے ساتھ اس کی ایسی کوئی کھینچا تانی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کی رسٹ واچ گر سکتی۔ اس نے غالباً جان بوجھ کر رسٹ واچ گرائی تھی۔ رستم نے حاجی حیات سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا؟''

''ابھی تو اطلاع ہی ملی ہے۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ وہ اس گیسٹ ہاؤس میں کسی تفتیش کے لیے گیا ہوگا۔ وہ ایک بدنام گیسٹ ہاؤس ہے اور میری اطلاع کے مطابق طفیل ایسی تفتیشوں کے لیے وہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا کوئی ویری اسے گن پوائنٹ پر اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ اب تو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ اس

واقعے کا تعلق بادل مہتم کے قتل سے ہی ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ اس واقعے کا تعلق بادل مہتم کے واقعے سے ہی ہے۔'' رستم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' حاجی حیات چونک کر بولے۔

''تم ادھر آؤ گے تو بتاؤں گا۔ کب آ رہے ہو یہاں؟''

چند سیکنڈ تک لائن پر خاموشی رہی پھر حاجی حیات کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔ ''رستم! یہ تم کیا اشارہ دے رہے ہو مجھے؟''

''جو کچھ بھی ہے۔ ادھر آؤ گے تو پتا چلے گا۔''

حاجی حیات سناٹے میں تھے۔ انہوں نے بغیر کچھ کہے سنے فون بند کر دیا۔

وہ قریباً آدھ گھنٹے بعد اپنی پرائیویٹ کار میں کوٹھی پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ رستم نے علیحدہ کمرے میں انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ معطل سب انسپکٹر طفیل اس وقت کوٹھی کے اندرونی کمرے میں پابہ زنجیر موجود ہے۔

حاجی حیات پہلے تو کچھ ناراض نظر آئے مگر جلد ہی انہوں نے اپنا موڈ کسی حد تک بحال کر لیا۔ جب رستم نے انہیں بتایا کہ وہ طفیل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے یہاں تک لایا ہے اور اسے راستے کا بالکل اندازہ نہیں ہو سکا تو وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ ''رستم! کام تو تم نے بڑے تسک والا کیا ہے۔ چلو اب جو ہو گیا وہ تو ہو گیا۔ اب سوچنا یہ ہے کہ آئندہ کیا کرنا ہے۔ یہ طفیل بہت خطرناک بندہ ہے۔ میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ تم اسے اٹھا کر یہاں لانے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اب اس کی طرف سے ذرا سی غفلت بھی بہت مہنگی پڑ سکتی ہے۔ سب سے پہلا کام تو یہ کرو کہ اسے اس کمرے سے منتقل کر دو۔ یہاں ماسٹر بیڈ روم کے نیچے ایک تہہ خانہ موجود ہے۔ خانساماں ظفر کو راستے کا پتا ہے اور چابی بھی اس کے پاس ہے۔''

''زبردست..... یہ بہت اچھی بات بتائی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''اب تم سے دست بستہ درخواست ہے کہ اس طرح کا کوئی اور رسک نہ لینا۔ یہ ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہوگا۔ ڈپٹی ریاض کے بھتیجے کا اس طرح لاپتا ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ایک مرتبہ تو خوب تڑتھلی مچنی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ سرکردہ مہتموں کی شامت ہی نہ آ جائے۔ سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو اپنا انتظام کر لینا چاہیے۔ بلکہ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح عارف کمبوہ کے ذریعے ان تک یہ پیغام پہنچا دوں۔ اگر ہم نے.....''

www.pdfbooksfree.pk

اچانک حاجی حیات کو خاموش ہونا پڑا۔ اندرونی کمرے سے طفیل کے واویلا کرنے کی دھم آواز سنائی دی۔ حاجی نے کہا۔ ''دیکھو! آواز یہاں تک پہنچ رہی ہے۔ اس خبیث کو جتنی جلدی تہہ خانے میں پہنچا دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' پھر ذرا توقف سے حاجی حیات نے پوچھا۔ ''اس نے بادل کے قتل کے بارے میں کچھ بتایا ہے یا نہیں؟''

''ابھی تو نہیں بتایا لیکن بتا دے گا..... اور بتانا بھی اس نے کیا ہے۔ یہ تو کھلی بات ہے کہ اس حرامی نے پروگرام بنا کر بادل کو مارا ہے۔''

''مگر جو کچھ بھی ہے، تم اس سے یہ بیان پوری تفصیل سے لو..... اور اس کو ریکارڈ بھی کرو۔ بعد میں یہ کام آئے گا۔''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ حاجی حیات کے انداز سے نظر آتا تھا کہ وہ پریشان ہیں مگر اپنی پریشانی وہ پوری شدت کے ساتھ رستم پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ رستم کو اندازہ تھا کہ اس نے ڈپٹی ریاض کے بھتیجے کو اٹھا کر اور اس کوٹھی میں لا کر حاجی حیات کو ایک بڑی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ تاہم وہ یہ بھی جانتا تھا کہ حاجی حیات اس کی آزمائش پر پورا اُتر سکتا ہے۔ بلکہ وقت آنے پر وہ رستم کی خاطر اس سے بھی بڑی آزمائش کو گلے سے لگا سکتا تھا۔

اسی دوران میں حاجی حیات کے موبائل پر کال آ گئی۔ حاجی حیات کسی انسپکٹر سے بات کرتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔ رستم کو اندازہ ہوا کہ یہ کال بھی طفیل کی گمشدگی کے حوالے سے ہی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد حاجی حیات رستم کو ضروری ہدایات دے کر اپنی پرائیویٹ گاڑی پر تیزی سے واپس جا رہے تھے۔

حاجی حیات کے واپس جانے کے بعد رستم تادیر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے ذہن میں حاجی حیات کے یہ الفاظ بار بار گونج رہے تھے کہ بھابی شانی اس معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی ہے اور اس نے بزرگوں کے مشورے سے طفیل کے خلاف کارروائی نہ کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔

کیا واقعی ایسا ہے..... یا یہ صرف حاجی حیات اور دیگر لوگوں کے اندازے ہیں؟ یا پھر اس کے پیچھے کوئی خاص مجبوری یا وجہ ہے؟ مسئلہ تو یہ تھا کہ شانی کے ساتھ رابطہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ کئی روز پہلے شانی نے کہا تھا کہ وہ خود رابطہ کرے گی۔ مگر پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اب تک وعدہ ایفا نہیں کر سکی تھی۔

رستم دیر تک سوچتا رہا۔ اپنی شانی بی بی کے بارے کوئی مخالفانہ بات تو اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر کوئی بات ذہن میں آ سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ شانی بی بی کسی نہایت اہم

معاملے میں الجھی ہوئی ہے یا الجھائی گئی ہے۔ جب وہ اس انداز سے سوچتا تھا تو پھر یہ خیال آتا تھا کہ کہیں بی بی کو اس کی مدد کی ضرورت نہ ہو مگر اس ضرورت کا پتا بھی تو تب ہی چل سکتا تھا جب بی بی سے رابطہ ہوتا۔

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں اور دل ہی دل میں پکارا۔

''بی بی! مجھے کب تک انتظار کرنا ہے؟ کب تک؟ آپ کیوں کر رہی ہیں ایسا؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے بی بی۔ مجھے شاید بہت جلد آپ سے دور چلے جانا ہے۔ پھر آپ ابھی سے کیوں دور ہو رہی ہیں؟ کچھ دن تو میرے پاس رہتیں۔ بس تھوڑا سا عرصہ..... بس تھوڑا سا!''

اس کا دل جیسے کراہنے لگا۔ وہ جو بڑے بڑے صدموں اور تکلیفوں کو مصری کی طرح گھول کر پی جاتا تھا اور ماتھے پر شکن تک نہ لاتا تھا..... اپنی بی بی کی اچانک دوری سے آزردہ ہو گیا۔ ادھ کھلے دروازے سے اس کی نگاہ کچن میں گئی۔ کچن میں بی بی کے ہاتھوں سے سجائے ہوئے گلدستے اور برتن وغیرہ جوں کے توں رکھے تھے۔ بی بی کی کُک بک، بی بی کا ایپرن، دستانے اور دیگر چیزیں، سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ بی بی کہیں نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر افسردہ نظروں سے خاموش ٹیلی فون سیٹ کی طرف دیکھا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اندرونی کمرے سے ایک بار پھر طفیل کے چلانے اور شور مچانے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اسے فوری طور پر تہہ خانے میں پہنچایا جانا ضروری تھا۔ رستم نے اجمل خان اور خانساماں ظفر احمد کو بلایا اور اس کے ساتھ مل کر طفیل کو تہہ خانے میں پہنچا دیا۔ ایسا کرنے سے پہلے اس کی آنکھوں پر پھر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ وہ مسلسل واویلا بھی کر رہا تھا۔ کبھی دھمکیاں دینے لگتا تھا۔ کبھی ریکویسٹ کرتا تھا کہ وہ جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، وہ انہیں پوری سچائی کے ساتھ بتا دے گا لیکن اس کے ساتھ مار پیٹ نہ کی جائے۔ اس کا چیخ چیخ کر تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے قتل تقل کر رہا تھا۔

تہہ خانہ درمیانے سائز کا تھا۔ یہاں فرنیچر کے نام پر بس ایک پرانا صوفہ پڑا تھا۔ سونے کے لیے فوم کا ایک گدا بچھا ہوا تھا تاہم اے سی کی سہولت یہاں موجود تھی۔

طفیل کو تہہ خانے میں بند کرنے کے بعد رستم نے اجمل کو اس کا نگران مقرر کر دیا۔ اس نے باہر آ کر اجمل سے کہا۔ ''اس کا زندہ رہنا بہت ضروری ہے لیکن اس سے پوچھ گچھ بھی کرنی ہے۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں جی۔ ام دونوں کام کرے گا اور بہت اچھے طریقے سے کرے گا۔ بس آپ ام کو ایک ٹیپ ریکارڈر دے دیں تاکہ یہ جو بھی بکواس کرے، ام اس کو

www.pdfbooksfree.pk

ریکارڈ کر لے۔"

"ٹیپ ریکارڈر تمہیں مل جائے گا لیکن پتا ہے کہ اس سے کیا کیا پوچھنا ہے؟"

"ام سب کچھ پوچھ لے گا جی۔ بلکہ وہ بھی پوچھ لے گا جو اس کو پتا ہی نہیں۔"

"نہیں..... اتنا جوش دکھانے کی ضرورت بھی نہیں اور دیکھو..... اس کو کوئی زخم وغیرہ بھی نہیں لگنا چاہیے۔ خاص طور سے اس سے یہ پوچھنا ہے کہ اس نے بادل کو گولی کیوں ماری اور کس کے کہنے پر یہ کیا۔ یہ ساری تفصیل معلوم کرنی ہے۔"

☆======☆=====☆

اجمل کو یہ ذمے داری سونپ کر رستم مطمئن ہو گیا۔ اگلے روز صبح رستم نے ٹی وی لاؤنج میں جھانکا تو ناصر ٹی وی دیکھتا نظر آیا۔ وہ خبریں سن رہا تھا۔ زری صوفے کے عقب میں موجود تھی اور ناصر کو تنگ کر رہی تھی۔ وہ ماچس کی تیلی بار بار ہولے سے ناصر کے کان میں گھماتی۔ ناصر اس کا ہاتھ جھٹک دیتا اور خبروں کی طرف متوجہ رہتا۔ جب زری نے دیکھا کہ وہ کسی طرح اس کی طرف دھیان نہیں دے رہا تو وہ آرام سے دیوار کی طرف گئی اور وہاں سے ٹی وی کی پاور سپلائی کا بٹن آف کر دیا۔ ٹی وی اسکرین تاریک ہو گئی۔ ناصر بھنا کر اس کی طرف گیا تو وہ بیرونی دروازے کی طرف دوڑ گئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی مگر دوڑتی ایسے ہی تھی جیسے جسم پر پتے باندھے جنگل میں دوڑ رہی ہو۔ اس کے جسم میں جنگلی گھوڑی کی سی لچک اور لپک تھی۔ فرش چکنا ہونے کی وجہ سے دروازے کے قریب اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ گر گئی۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر کراہ کر بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں سے سینڈل نکل کر دور پھسل گیا تھا۔ ناصر اور رستم جلدی سے اس کے پاس پہنچے۔ اس کے پاؤں میں موچ آ گئی تھی۔

ناصر نے اسے سہارے سے چلانے کی کوشش کی مگر اسے درد ہو رہا تھا۔ ناصر نے اسے گود میں اٹھا لیا۔ اجمل نے دروازے میں نمودار ہو کر کہا۔ "ناصر بھائی! یہ بھوبیٹیوں والا گھر ہے۔ تم یہ دن دیہاڑے کیا کر رہا ہے۔"

"گر گئی ہے۔" ناصر نے برا سا منہ بنا کر وضاحت کی۔

"اگر تم نے اسے گرنے کی وجہ سے اٹھایا ہے تو پھر یہ روز گرا کرے گا۔ تم دیکھ لینا۔"

"تم اپنا منہ بند رکھو۔ کیا تم نہیں پھسل سکتے ہو۔"

"سارا پاکستان جانتا ہے، ام مضبوط کردار کا بندہ ہے۔ یہ پھسلنا اور سنبھلنا اور پھر سے پھسلنا آپ دونوں کا ہی کام ہے۔" پھر وہ رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ "رستم بھائی! امارا تو مشورہ ہے کہ ان دونوں کا جلد سے جلد دو بول پڑھوا دیا جائے۔"

ناصر نے اجمل کی طرف دیکھ کر منہ کا لہرایا۔ مطلب یہ تھا کہ زری کی طرف سے فارغ ہو لوں پھر تمہیں دیکھتا ہوں۔ زری کو صوفے پر بٹھا دیا گیا..... وہ کراہ رہی تھی۔ رستم نے کہا۔ "تم بھی تو ہر وقت بڑے بڑے ڈنگے مارتی ہو۔ آرام سے چلا کرو۔"

"میں آرام سے چلتا مگر یہ جوتی ایک دم خراب۔ یہ مجھ کو گراتا۔"

"یہ جوتی ٹھیک ہے..... تم ٹھیک نہیں ہو۔" ناصر نے ذرا غصے سے کہا۔

زری نے ناصر کا چہرہ دیکھا پھر ایک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ کچھ دیر گم صم رہی پھر بولی۔ "اگر میں ٹھیک نہیں..... تم مجھ کو واپس چھوڑو۔ میں اپنے گاؤں میں جاتا۔ میں ادھر نہیں رہتا۔"

"ہاں ہاں جاؤ تاکہ وہاں برق جان اور اس کے ساتھی تمہیں کلہاڑی سے دو ٹکڑے کریں اور اگیارے کے سامنے برف میں دفن کر دیں۔" ناصر یہ دستور غصے میں تھا۔

وہ ہچکیوں میں رونے لگی۔ اس کا سینہ دہل رہا تھا۔ اجمل نے دیکھا کہ معاملہ الٹ گیا ہے تو وہ فوراً زری کی حمایت میں سامنے آ گیا۔ اس نے زری کو بڑی محبت سے اپنے ساتھ لگایا اور بولا۔ "تم امارا ہونے والا بھابی کو کیوں تنگ کرتا۔ کیا تم وہاں پاؤندہ بستی میں برپ پر چلتے ہوئے نہیں پھسل جاتا تھا..... اور ناصر بھائی! اس سے پہلے بھی تم نہ جانے کہاں کہاں پھسلا ہے۔" اجمل نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

ڈولا بھی آ گیا تھا۔ وہ زری کے متاثرہ پاؤں پر لچک دار پٹی باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ زری بہ دستور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ "مجھ سے نہیں چلا جاتا ایسے۔ مجھ سے نہیں کھایا جاتا ایسے۔ میں بالکل بے وقوف ہوتا۔ مجھ کو مافی دے دو۔"

اجمل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "زری! ایک تو تم نے مافی مانگ مانگ کر ڈاکٹر کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ہر وقت کانوں کو ہاتھ لگاتا رہتا ہے تم۔ مافی کو اتنا سستا نہیں کرتے ورنہ اس کا کوئی قدر قیمت نہیں رہتا۔ اب امارے ڈاکٹر صیب کو ہی دیکھو، اس نے کبھی تم سے مافی مانگا..... جبکہ ام جانتا ہے کہ یہ جس طرح کے کام کرتا ہے اس کو ہر روز دو تین مرتبہ تم سے مافی مانگنا چاہیے اور ڈاکٹر صیب کو بھی چھوڑو، یہاں کوئی کسی سے مافی نہیں مانگتا..... لوگ ملک کا سارا خزانہ کھا جاتے ہیں پھر بھی مافی نہیں مانگتے..... بلکہ جن کا پیسا کھاتے ہیں ان سے کہتے ہیں کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگائیں۔"

ناصر کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے بے دھیانی میں سخت بات کہہ دی ہے۔ وہ ایک لٹی پٹی بے آسرا لڑکی تھی اور اس وقت کلی طور پر ان کے رحم و کرم پر تھی۔ رستم نے ناصر کو اشارہ

www.pdfbooksfree.pk

کیا کہ وہ زری کو دلاسا دے۔ ناصر نے بیٹھے بیٹھے زری کو اپنے ساتھ لگایا اور ذرا پچکارا۔ وہ اور زور سے رونے لگی۔ تاہم جلد ہی اس کے دل کا غبار ہلکا ہو گیا..... اور اس نے خود کو ناصر کی محبت بھری گرفت میں ڈھیلا چھوڑ دیا۔ ناصر اور اجمل، زری کو کمرے میں لٹا آئے۔ واپس آ کر ناصر نے پھر سے ٹی وی آن کیا مگر اب نیوز ختم ہو چکی تھیں۔ ناصر نے رستم کو بتایا کہ طفیل کی گمشدگی نے واقعی ہلچل مچائی ہے۔ اخباروں نے بھی اس خبر کو نمایاں جگہ دی ہے۔ کچھ افراد کو تفتیش میں لیا گیا ہے۔ ان میں مہتم برادری کے دو بندے بھی ہیں۔

خانساماں ناشتا لے آیا۔ ناشتے کے دوران بھی رستم اور ناصر میں گفتگو جاری رہی۔ رستم نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''ناصر! آنے والے دن میرے لیے بڑے اہم ہیں۔''

''ہم آپ کو تنہا کسی خطرے میں نہیں کودنے دیں گے۔'' ناصر نے مصمم ارادے کے ساتھ کہا۔

''ڈپٹی ریاض سے حساب چکائے بغیر تو میرے لیے مرنا بھی آسان نہیں ہو گا۔ تم جانتے ہی ہو اس نے ہم پر کتنے قرض چڑھا رکھے ہیں اور پھر قدرت اللہ ہے جو زخمی سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے۔ اپنی بیوی کی موت کے بعد وہ بی بی کی جان کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ اپنی زہریلی سوچ کے ساتھ جب تک زندہ ہے، بی بی کے سر پر خطرے کی تلوار لٹکتی رہے گی۔''

''بے شک جو آپ کی سوچ ہے، وہی میری ہے۔''

''میں اس چار دیواری میں چھپ کر بیٹھنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں، ناصر..... اور یہ کام نمٹانے کے لیے اس چار دیواری سے نکلنا ضروری ہے۔ اس چار دیواری سے نکلنے میں سب سے بڑی رکاوٹ میرا حلیہ ہے۔ میرے لمبے بال اور داڑھی میری شناخت کو بہت آسان بنا دیتے ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان بالوں سے چھٹکارا حاصل کر لوں۔''

''ہاں، یہ برا خیال نہیں ہے..... لیکن آپ بار بار میں اور مجھے کے لفظ کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ اس سفر میں ہم سب شریک ہیں اور ہماری منزل بھی ایک ہے، ان شاء اللہ۔''

''میں اس سے انکار تو نہیں کر رہا ہوں ناصر اور مجھے معلوم ہے کہ جہاں تم لوگوں کی ضرورت ہو گی، تم توقع سے بڑھ کر میرا ساتھ دو گے۔''

ناصر خاموش رہا۔ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد رستم نے کہا۔ ''ایک بار پھر حجام کو بلایا

جائے۔'' اس نے یہ بات از راہِ مذاق کہی تھی۔ حجام کو یہاں بلانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی جب وہ یہاں وارد ہوئے تھے انہوں نے اپنے بال ترشوائے تھے مگر کسی پیشہ ور حجام سے نہیں، ڈولے سے۔ ڈولا ہرفن مولا شخص تھا جب وہ کوکب کی بڑی بہن کے عشق میں گرفتار ہو کر لاہور میں فلم لائن کے دھکے کھا رہا تھا۔ اس نے حجام کا کام بھی سیکھا تھا۔

رستم کے کہنے پر ناصر نے اسے بلایا۔ ڈولے نے ایک گھنٹے کے اندر رستم کے نہ صرف سر کے بال خوب صورتی سے تراش دیئے بلکہ اسے کلین شیو بھی کر دیا۔ اس تبدیلی نے رستم کی مجموعی شخصیت کو کافی حد تک بدل دیا۔ رستم کے بال گہرے سیاہ تھے۔ ناصر نے تجویز پیش کی کہ اگر ''ڈائی'' کے ذریعے اس کے بالوں کی گہری سیاہی کو ذرا کم کر دیا جائے تو مزید بہتری آئے گی۔ مشورے کے بعد رستم نے یہ تجویز بھی مان لی۔

رستم کو ہیلمٹ کا استعمال بھی بہت پسند آیا تھا۔ یہ ایک ایسا نقاب تھا جسے پہن کر وہ بلا خطر پورے شہر کا چکر لگا سکتا تھا۔

رستم کے دل میں عجیب سی خجلت پیدا ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کرنا ہے، جلد سے جلد کر لے۔ اس کے اندر ایک عجیب سا خدشہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ یہ کہ کہیں بی بی کچھ کہہ نہ دیں۔ مثال کے طور پر اگر کسی بھی وجہ یا مجبوری کے تحت بی بی اس سے کہہ دیتیں کہ فی الحال وہ طفیل یا ڈپٹی ریاض کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائے تو اسے پابند ہونا پڑتا تھا۔ اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنی بی بی کی منشا کے خلاف چلتا۔ وہ عشق کی اس منزل پر تھا جہاں کسی کے ایک اشارے پر آنکھیں بند کر کے تحت الثریٰ میں چھلانگ لگائی جا سکتی ہے۔

اجمل خان کی آواز نے رستم کو چونکا دیا۔ ''آپ کن خیالوں میں کھو گیا رستم بھائی۔ یہ دیکھیں ام آپ کے لیے کیا لایا ہے۔''

اجمل کے ہاتھ میں ایک ٹیپ ریکارڈر تھا۔ رستم کے اشارے پر اجمل نے اس کو آن کیا۔ ریکارڈ شدہ آڈیو کیسٹ میں طفیل گرہ رہا تھا اور فر فر بول رہا تھا۔ طفیل نے اس ریکارڈ شدہ بیان میں اعتراف کیا تھا کہ بادل مہتم اور اس کے ساتھی سیلاب زدہ بستی میں لوٹ مار نہیں کر رہے تھے۔ وہ اپنا ہی سامان نکالنے کے لیے ایک گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے نیچے سمجھے منصوبے کے تحت ان پر گولی چلائی اور اس فائرنگ میں بادل کو نارگٹ بنایا۔ اس نے یہ اعتراف بھی کیا کہ بادل کو ٹارگٹ بنانے کی ہدایت اسے اپنے چچا حاضر سروس ڈپٹی

www.pdfbooksfree.pk

سپرنٹنڈنٹ ریاض کی طرف سے ملی تھی۔ اس ٹارگٹ کلنگ کا مقصد مہتم اور گوراہی برادری میں تفرقہ پیدا کرنا تھا۔

اس بیان سے اس واقعے کا ایک نیا رخ سامنے آرہا تھا۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا تھا کہ مقامی سیاست میں کھچڑی سی پک رہی ہے۔ بہرحال رستم کو ان معاملوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ اسے اگر فکر تھی تو وہ بی بی کی تھی کہ وہ کہیں ان معاملوں میں زیادہ نہ الجھ جائیں۔ اس کی دوسری پریشانی ڈپٹی ریاض تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کی شہ رگ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

رستم اور ناصر نے طفیل کا ریکارڈ شدہ بیان دو تین بار سنا۔ طفیل کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اجمل نے اس کی ساری تن فن ختم کر ڈالی ہے اور اب وہ مشکل سوالوں کے جواب بھی آسانی سے دے دے گا۔

رستم اٹھ کھڑا ہوا اور اجمل کے ساتھ تہہ خانے میں آگیا۔ ناصر بھی اس کے ساتھ تھا۔ تہہ خانے میں طفیل صرف ایک انڈرویئر کے ساتھ موجود تھا۔ اجمل نے اسے بڑی مضبوطی سے ایک آہنی کرسی سے باندھ رکھا تھا۔ کرسی کو زمین پر لٹا دیا گیا تھا۔ یوں طفیل کے پاؤں افقی رخ پر ہو گئے تھے۔ اس کے تلوے بری طرح سوجے ہوئے تھے۔ اجمل نے اسے بڑے پروفیشنل انداز میں مارا تھا۔ اس کے جسم پر کوئی تازہ چوٹ نظر نہیں آرہی تھی۔ چہرے پر بھی بس وہی چوٹیں تھیں جو رستم کی مار پیٹ سے آئی تھیں۔

رستم کے اشارے پر اجمل نے کرسی کو سیدھا کیا۔ طفیل بری طرح کراہنے لگا۔ اجمل نے کہا۔ ''دیکھ لیں جناب! ام نے اس کی خاطر مدارات میں کسی طرح کا کوئی کسر نہیں چھوڑا۔ اس کی مہمان نوازی کے لیے امارے پاس تین چار طرح کا ڈشیں موجود تھا مگر یہ ایک ہی ڈش سے شکم سیر ہو گیا ہے۔''

''کیوں بھئی، پیٹ بھر گیا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

طفیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اپنی چربی دار ٹھوڑی اپنی گردن پر ٹکائے کراہتا رہا۔

''ام نے کہا تھا جی، تھوڑا سا سوڈا واٹر پی لو۔ ایک دو ڈکار آئے گا، معدے میں مزید گنجائش پیدا ہو جائے گا۔ بعد میں تھوڑا سا سویٹ ڈش لے لینا لیکن یہ دہائی دینے لگا کہ مجھ کو میٹھے سے پرہیز ہے۔''

''کون سا میٹھا کھلا رہے تھے تم؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ والا۔'' اجمل نے پلاس سے طفیل کی مونچھوں کے بالوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم صوفے کو گھسیٹ کر طفیل کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اس نے بڑی سفاکی سے طفیل کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔ ''تمہارے چاچا جان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اب تم یہ بتاؤ گے کہ اس ملاقات کے لیے کون سی جگہ اور کون سا وقت بہترین ہے اور یاد رکھنا، غلط معلومات دو گے تو بہت زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔ ابھی تک تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے، وہ اس درندگی کا عشر عشیر بھی نہیں ہے جو تمہارا چاچا میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ کرتا رہا ہے۔''

طفیل نے اپنے خشک زخمی ہونٹوں پر زبان پھیری اور کراہا۔ ''مم..... مجھے صرف یہ پتا ہے کہ وہ آج کل گوجرانوالہ میں ہیں۔ ان کی ٹائمنگ وغیرہ کا مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

ناصر پھنکارا۔ ''یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ کتا آج کل گوجرانوالہ میں ہے۔ وہاں کسی تفتیش کے لیے ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کے آنے جانے کے ٹائم کیا ہیں؟ سکیورٹی وغیرہ کیا ہے؟ یہ تم بتاؤ گے اور تمہیں یہ سب پتا ہے۔'' ناصر نے آخری الفاظ کہتے ہوئے اس کی ٹانگ پر بے رحمی سے ٹھوکر لگائی۔ وہ بری طرح کراہنے لگا۔

''بولتے ہو یا پھر ام سویٹ ڈش پلیٹ میں ڈالے۔'' اجمل نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''میں سچ کہتا ہوں..... مم..... مجھے اس بارے میں زیادہ پتا نہیں..... اور..... اور دیکھو میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں..... اگر..... مم میرے دل کو کچھ ہو گیا تو.....''

''خو، یہ بہت پرانا ڈائیلاگ ہے۔ جب ام پولیس میں تھا تو ام بھی یہ ڈائیلاگ بہت سنتا تھا۔ خاص طور سے جب کوئی موٹا سیٹھ حوالات میں پھنستا ہے تو یہ ڈائیلاگ ضرور مارتا ہے۔''

رستم نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''لمبا چوڑا بوفے ڈنر کھانے کے بعد..... دو دو عورتوں کے ساتھ اکٹھے سونے کے بعد بھی اگر تمہارا بلڈ پریشر فاٹ رہتا ہے تو اب بھی ان شاء اللہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔''

اگلے تین چار منٹ میں اجمل نے طفیل کو تھوڑی سی مزید مار لگائی۔ اس کے واویلے سے تہہ خانہ گونجنے لگا۔ وہ موٹی کھال کا بندہ تھا اور خاصا ڈھیٹ بھی تھا..... تاہم اس کے اندر وہ کم ہمتی بھی موجود تھی جو سیاہ کار لوگوں کی فطرت کا خاصہ ہوتی ہے۔ جب اس نے اپنی ناک سے مسلسل خون بہتے دیکھا تو اس کا سارا جسم کانپنے لگا اور اس نے ایک دم حوصلہ چھوڑ دیا۔ اس کی خاطر مدارت کے بعد طفیل نے اپنے محترم چچا جان کے حوالے سے جو تازہ صورت حال

بتائی وہ کچھ اس طرح تھی۔

.....اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ ڈپٹی ریاض دو تین دن کے اندر اپنے کسی خاص کام سے آزاد قبائلی علاقے کی طرف یا شاید پڑوسی ملک کی طرف نکل جائے گا۔ اگر کوئی اس سے جلد ملاقات کرنا چاہتا تھا تو پھر اسے ایک دو روز کے اندر ہی کرنی تھی۔ اس ملاقات کے لیے ایک بہت موزوں موقع بھی طفیل کی زبانی ہی معلوم ہو گیا۔ مسلسل سوال جواب کر کے رستم وغیرہ نے جو کچھ طفیل سے معلوم کیا، وہ کچھ اس طرح تھا۔ وزیری گاؤں کے بہت بڑے زمیندار اور سیاسی شخصیت چوہدری شہاب الدین کے بیٹے کی شادی تھی۔ کل اس کی دعوتِ ولیمہ بھی تھی، اس نے کل وزیری گاؤں میں ضرور آنا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ایک آدھ گھنٹے کے لیے ہی آتا مگر اس کا آنا یقینی تھا۔

وزیری گاؤں کا فاصلہ لاہور سے صرف چالیس پچاس کلومیٹر تھا۔ گاؤں تک پختہ سڑک بھی پہنچتی تھی۔ گوجرانوالہ آنے کے بعد رستم، ناصر اور اجمل خان نے مشورہ کیا۔ یہ بات سامنے کی تھی کہ اگر وہ ڈپٹی ریاض سے جلد ملاقات کرنا چاہتے ہیں تو پھر انہیں کل کا موقع ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

ناصر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں ڈپٹی ریاض سے حساب بے باق کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ وہ اس وقت غفلت میں ہے۔ بس اسی غفلت میں ہی اسے دبوچ لینا چاہیے۔ بس ایک دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں صحیح جگہ پر ڈال کر ہم فارغ ہو سکتے ہیں۔''

''ہم کو تو لگتا ہے جی کہ اس پہ گولی چلانے کا ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب اس نے رستم بھائی کو زندہ سلامت اپنے سامنے دیکھ لیا تو اس کی آدھی واپات (وفات) تو وہیں ہو جائے گی۔ امارا مطلب ہے کہ نیم بے ہوش ہو جائے گا۔ ایسے میں اس کے سر پہ دو چار دو ہتڑ مار اس کو ہلاک کیا جا سکے گا۔''

''خیر اس معاملے کو اتنا آسان بھی مت لو۔'' رستم نے کہا۔ ''وہ غافل ہو کر بھی عام لوگوں سے کہیں زیادہ چوکس ہو گا۔ خاص طور سے اپنے بھتیجے کی گمشدگی کے بعد اسے اپنی طرف سے بھی خطرہ ہو گا۔ وہ آج کل جس علاقے میں ہے، وہاں سے مہتم زیادہ دور بھی نہیں ہیں۔''

''آپ کے ذہن میں کوئی پروگرام ہے؟'' ناصر نے ٹٹولنے والی نظروں سے رستم کو دیکھا۔

''میرے خیال میں ہمیں جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے۔ جو کام ایک اکیلا بندہ کر سکتا ہے اس کے لیے دو یا تین بندوں کو جانے اور خود کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا اصل مقصد تو یہی ہے نا کہ اس حرامی کو جلد از جلد لاش میں بدل دیا جائے۔''

ناصر اور اجمل نے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''کل رات میں نے جو ہیلمٹ لی اور موٹر سائیکل والا تجربہ کیا ہے، وہ بہت کامیاب رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کیوں نہ کل شام میں موٹر سائیکل پر ہی وزیری گاؤں پہنچ جاؤں۔ مجھے بس ایک بھرے ہوئے پستول اور اس کے تیس چالیس فالتو راؤنڈز کی ضرورت ہو گی۔''

''آپ کا کیا خیال ہے..... کارروائی کے بعد آپ آسانی سے نکل سکیں گے؟''

''وہ علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے۔ رات کے وقت بستیوں سے باہر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے اور میرے خیال میں موٹر سائیکل پر فرار ہونا، گاڑی یا کسی دوسری سواری پر فرار ہونے سے کہیں زیادہ آسان ہے۔''

اس موضوع پر ان تینوں میں تقریباً ایک گھنٹے تک بات ہوئی۔ تمام پہلوؤں پر باریک بینی سے غور کیا گیا۔ طے یہ ہوا کہ رستم اور ناصر دونوں اس مہم پر جائیں گے۔ ان کے اسلحے میں ایک پستول اور ایک ماؤزر شامل ہو گا۔ یہ دونوں ہتھیار موٹر سائیکل کے اندر ہی اس طرح چھپائے جائیں گے کہ آسانی سے نظر نہ آ سکیں۔ اس کے لیے موٹر سائیکل کی نشست کے نیچے فوم کے اندر جگہ بنانے کی تجویز تھی۔

ساری تفصیل طے ہو چکی تو ناصر نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''رستم بھائی! اب آپ کا کیا خیال ہے، حاجی حیات صاحب ہمیں اس مہم جوئی کی اجازت دیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بار بار یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اس چار دیواری سے نہ نکلیں۔''

''اس کو بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔

''تو آپ کا کیا مطلب ہے، ہم یہاں سے تین چار گھنٹے غائب رہیں گے اور ان کو پتا ہی نہیں چلے گا۔''

''پتا چل جائے گا تو زری کی طرح معافی مانگ لیں گے۔'' رستم نے غیر محسوس مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''مگر رستم بھائی! آپ حاجی صیب کو نہیں بتائے گا تو موٹر سائیکل کا انتظام کیسے ہو گا؟'' اجمل خان نے نکتہ اٹھایا۔

www.pdfbooksfree.pk

''موٹر سائیکل کا انتظام ہے۔ وہاں سرونٹ کوارٹر میں ایک موٹر سائیکل پڑی ہوئی ہے، بس اس پر ایک فرضی نمبر پلیٹ لگائیں گے اور کام چلائیں گے۔''

''اچھا، وہ پرانا بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل..... مگر اس کا تو بیٹری نہیں ہے۔''

''بیٹری کا انتظام کر لیتے ہیں۔ تھوڑا بہت اور نقص بھی ہوگا تو ہمارے پاس ہرفن مولا ڈولا موجود ہے۔ وہ ٹھیک کر لے گا۔''

اگلے روز شام سے ذرا پہلے رستم اور ناصر پانچ ہارس پاور سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو پر سوار، لاہور کے مضافات سے نکل رہے تھے۔ ہلکی ہلکی گرد آلود ہوا چل رہی تھی۔ رستم پینٹ شرٹ میں تھا اور موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ ناصر شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے چہرے کے گرد کپڑے کا منڈاسہ لپیٹ رکھا تھا۔ دیہاتی علاقے میں موٹر سائیکل والوں کے چہروں پر ایسے منڈاسے اکثر نظر آتے ہیں۔ اندھیرا پھیلنے کے قریباً آدھے گھنٹے بعد انہوں نے مین سڑک چھوڑی اور وزیری گاؤں کی طرف جانے والی ذیلی سڑک پر آ گئے۔

☆======☆=====☆





شانی کا دل تو بالکل بھی جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر خالو اعجاز اور تایا معصوم کا اصرار تھا کہ اسے شادی کی اس تقریب میں ضرور جانا چاہیے۔ چوہدری شہاب الدین کا شمار علاقے کے بااثر لوگوں میں ہوتا تھا۔ چوہدری شہاب الدین ذاتی طور پر رنگ والی آئے تھے اور دعوت نامہ دے کر گئے تھے۔ برات میں تو تایا معصوم اور پھوپھو آمنہ نے رنگ والی کی نمائندگی کر دی تھی تاہم اب ان کا اصرار تھا کہ ولیمے میں شانی ضرور شرکت کرے۔

اسے نہ چاہنے کے باوجود ایک بار پھر بھاری بھرکم قیمتی لباس پہننا پڑا۔ ہلکا پھلکا میک اپ بھی کرنا پڑا۔ ایئر کنڈیشنڈ کار اور گارڈز کی دو جیپیں روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں..... مگر شانی کا دل مسلسل رستم میں اٹکا ہوا تھا۔ آج کتنے ہی دن ہو چکے تھے رستم سے رابطہ ہوئے۔ اس نے چند روز پہلے خادم حسین کے ذریعے رستم کو تفصیلی پیغام تو دے دیا تھا مگر براہِ راست بات تو اب تک نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اس امید پر ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھی کہ شاید آج لائن ٹھیک ہو گئی ہو۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ریسیور اٹھایا..... لائن پر وہی منحوس سناٹا تھا۔ وہ جز بز ہو گئی۔ پتا نہیں کیوں لائن ٹھیک نہیں ہو پا رہی تھی۔ لائن مین ہر دوسرے روز آ کر امید دلا جاتا تھا مگر صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے سوچا کہ کل خالو اعجاز سے کہہ کر متعلقہ ایس ڈی او کو بلوائے گی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ درحقیقت خالو اعجاز ہی ہیں جو فون ٹھیک کرانے میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ شانی کی تمام تر توجہ حویلی کے معاملوں پر مرکوز رہے اور لاہور سے اس کا رابطہ کم سے کم ہو۔ وہ اپنے طور پر ایک محتاط اور پُرس بزرگ کا کردار ادا کر رہے تھے اور اپنے انداز سے سوچ رہے تھے جبکہ شانی اپنے انداز سے سوچ رہی تھی۔

بے شک اس کے لیے بھی حویلی اور حویلی کے معاملات بہت اہم تھے لیکن ان سے

www.pdfbooksfree.pk

کہیں زیادہ اس کے لیے رستم اہم تھا۔ اس نے جھنجھلا کر ریسیور دوبارہ کریڈل پر رکھ دیا اور تایا معصوم کی پکار کے جواب ''آئی تایا جی'' کہتی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف لپک گئی۔

وہ خوب صورت اور باوقار لگ رہی تھی۔ جب وہ حویلی کے اندرونی حصے سے نکلی تو احاطے میں موجود درجنوں افراد نے اسے سلام کیا اور اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ عارف کمبوہ بھی حفاظت کی غرض سے ایک جیپ کے ساتھ موجود تھا۔ شانی آرام دہ کار میں آ بیٹھی۔ اس کا ذہن مسلسل رستم اور لاہور میں الجھا ہوا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ سارے جھنجھٹ چھوڑ دے۔ یہ سارے معاملات کوئی اور بھی تو سنبھال سکتا تھا۔ وہ بس مُنے کو گود میں اٹھائے رستم کا ہاتھ پکڑے، آپا زاہدہ اور بھائی اکرام کو ساتھ لے.....اور کہیں بہت دور نکل جائے۔ جہاں دن رات اس کے گرد رستم کی بانہوں کا گھیرا ہوا اور وہ خود ہو۔

شانی کے ذہن میں بہت سے خطرات بھی منڈلا رہے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ رستم کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہوگا۔ وہ ڈے ڈیرے کے قتلِ عام کو کسی صورت بھول نہیں سکتا تھا اور اس قتلِ عام کا سب سے بڑا مجرم ڈپٹی ریاض تھا۔ اب ڈپٹی ریاض، رستم کے ارد گرد موجود تھا اور رستم یہ کسی طور برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ قاتل اس کے آس پاس موجود ہو اور زندہ بھی ہو۔ رستم کسی بھی وقت کوئی خطرناک ترین قدم اٹھا سکتا تھا۔ اگر وہ اس کے قریب موجود ہوتی تو اس کو سمجھا بجھا سکتی تھی لیکن فی الوقت تو اس سے رابطہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔

گاڑیوں کا قافلہ جنوب کی طرف رواں رہا۔ جنوب جہاں لاہور تھا اور جہاں رستم، ناصر، اجمل اور ڈولا وغیرہ تھے مگر شانی کو لاہور نہیں جانا تھا۔ اسے لاہور سے بہت پہلے وزیری گاؤں میں ہی رک جانا تھا اور ایک اَن چاہی تقریب میں شرکت کر کے واپس لوٹ آنا تھا۔ قریباً ایک گھنٹے میں وہ لوگ سنزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ دیہی علاقوں میں شادی ہال وغیرہ کا رواج نہیں ہے لیکن وزیری گاؤں کے نواح میں غیر متوقع طور پر ایک بڑا شادی ہال موجود تھا۔ جنریٹرز کی مدد سے اس شادی ہال کو بقعۂ نور بنایا گیا تھا۔ وزیری گاؤں کے وسط میں چوہدری شہاب الدین کی حویلی بھی جگمگا رہی تھی۔ حویلی سے شادی ہال تک روشنیوں کی دو طویل قطاروں کے ذریعے راستے کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہ سیدھے حویلی پہنچے۔ یہاں گاڑیوں کی قطاریں موجود تھیں۔ بھاری بھاری جسموں اور اونچے اونچے شملوں والے چوہدری شہاب الدین اور اس کے بیٹوں نے رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا پُر تپاک استقبال کیا اور انہیں پنڈال میں اسٹیج کے بالکل نزدیک بٹھایا۔

اسٹیج پر ایک ورائٹی شو چل رہا تھا۔ لاہور سے آئے ہوئے فنکار ہنسی مذاق کے آئٹم پیش کر رہے تھے۔ ایک گوشے میں سازندے موجود تھے۔ غالباً تھوڑی دیر پہلے رقص بھی ہو چکا تھا۔ تقریب میں موجود کیمروں کا رخ شانی کی طرف ہو گیا۔ اس کا چہرہ بار بار فلیش لائٹ میں نہانے لگا۔ علاقے کے زمیندار اور چوہدری شانی کے اردگرد بیٹھ کر فخر محسوس کر رہے تھے۔ ان میں چوہدری حشام، چوہدری بابر اور نار پور کے دیگر لوگ بھی شامل تھے۔ چوہدری حشام نے آگے بڑھ کر شانی کے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑی عاجزی کے ساتھ اسے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا۔ یہ وہی چوہدری حشام تھا جس نے اپنی حویلی میں شانی پر ظلم و ستم کی انتہا کی تھی۔ وہ اسے زمین پر بٹھاتا تھا۔ اسے جالاں جیسی سفاک نوکرانیوں سے پٹواتا تھا اور بالآخر اس نے شانی کو اپنے نوعمر بیٹے کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ شانی کی بے پناہ برداشت اور اس کے حسنِ سلوک کا اعجاز تھا کہ آج چوہدری حشام اور بابر جیسے دشمن شانی کے قریب بیٹھ کر اور اس سے بات کر کے خوشی محسوس کر رہے تھے۔

''چوہدری جی، راجو آج کل کہاں ہے؟'' شانی نے حشام سے پوچھا۔

''وہ آج کل اپنی وہٹی کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کو گیا ہوا ہے۔ ویسے وہ تم کو ہر ویلے یاد کرتا رہتا ہے۔''

''ہاں.....ایک مہینہ پہلے رنگ والی مین ہی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ کہتا تھا کہ میں کوکی کو ساتھ لے کر آؤں گا اور چاردن رنگ والی میں رہوں گا۔''

شاید چوہدری حشام اور شانی میں مزید بات ہوتی مگر اسی دوران میں پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اداکاروں کی ایک جوڑی مشہور مزاحیہ اداکار منور ظریف اور نشو کی آوازوں کی نقل کر رہی تھی۔ یہ نقل اتنی شاندار تھی کہ لوگ بے ساختہ داد دینے لگے۔ درحقیقت یہ دونوں صدا کار آوازوں کی نقل اُتارنے میں ماہر تھے۔ اگلے چار پانچ منٹ میں انہوں نے کئی مشہور اداکاروں اور سیاست دانوں کی کاپی کر کے لوگوں کو حیران کر دیا۔

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا، لوگ تالیاں پیٹ رہے تھے اور قہقہے برسا رہے تھے۔ شانی کے قریب بیٹھے ہوئے چوہدری اعجاز صاحب کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ وہ کسی اور زاویے سے سوچ رہے تھے۔ ان کی نگاہ بار بار اداکاروں کی طرف اٹھتی تھی اور پلٹ آتی تھی۔ وہ اس بات پر خود بھی حیران تھے کہ آوازوں کی نقل اتنی مکمل طریقے سے بھی کی جا سکتی ہے۔

☆======☆======☆

رستم اور ناصر جب وزیری گاؤں کے نزدیک پہنچے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ وزیری

www.pdfbooksfree.pk

گاؤں کی حویلی انہیں دور ہی سے نظر آ گئی۔ حویلی پر لائٹنگ کی گئی تھی۔ اس لائٹنگ سے اردگرد کا علاقہ بھی روشن ہو رہا تھا۔ پارکنگ میں زمینداروں اور چوہدریوں کی بڑی بڑی جیپیں اور کاریں کثیر تعداد میں موجود تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ رستم کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ اس کی نگاہیں اپنے بدترین دشمن کی تلاش میں بھٹکنے لگیں۔

وزیری گاؤں سے دو تین کلو میٹر پہلے ہی انہوں نے اپنی موٹر سائیکل درختوں کے ایک جھنڈ میں کھڑی کی تھی اور اس کی نشست کے نیچے سے اسلحہ نکال لیا تھا۔ اب پستول رستم کے لباس میں تھا اور ماؤزر ناصر کے کپڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ حویلی کی پارکنگ میں پہنچ کر رستم نے ہیلمٹ اُتار دیا..... نہ جانے کیوں اسے یقین سا ہوگیا تھا کہ اسے یہاں پہچانا نہیں جا سکتا۔ درحقیقت پولیس کی فائلوں میں تو وہ مر چکا تھا۔ ایک طویل عرصے سے اسے دیکھا گیا تھا اور نہ اس کے بارے میں کوئی اطلاع تھی..... اب وہ کافی حد تک بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ یہاں موجود تھا۔

''وہ دیکھیں، لگتا ہے کہ وہاں کوئی شور ہو رہا ہے۔'' ناصر نے حویلی کے احاطے میں موجود مجمع کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے شک ہو رہا ہے کہ شاید رنگ والی سے بھی کچھ لوگ یہاں آئے ہیں۔'' رستم نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو۔ وہ سرخ نسان گاڑی۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے یہ حویلی میں دیکھی ہے۔''

ایک موٹا سا حوالدار وقت گزاری کے لیے درخت کے ایک کٹے ہوئے تنے پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ نیم تاریکی میں اس کے سگریٹ کا شعلہ نمایاں طور پر چمک رہا تھا۔ رستم بڑے اعتماد سے اس کے پاس چلا گیا۔ حوالدار نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کہا۔

''حوالدار جی۔ سنا ہے ڈپٹی ریاض صاحب نے بھی یہاں آنا ہے؟''

حوالدار نے خشک لہجے میں کہا۔ ''تم نے ڈپٹی ریاض صاحب کے ساتھ بانہہ پھڑنی ہے؟'' (باز و پکڑنے کا مقابلہ کرنا ہے؟)

''نہیں، ویسے ہی ایک دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔ بڑی مشہوری سنی ہوئی ہے جی ان کی۔''

حوالدار نے گہرا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے آنا تھا..... پر نہیں آئے۔ سنا ہے کہ وہ کسی تفتیش پر پشاور کی طرف گئے ہیں۔''

رستم کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اسی دوران میں ایک لمبا تڑنگا ہیڈ کانسٹیبل بھی موقع پر پہنچ

گیا۔ ''کیا بات ہو رہی ہے جی؟'' اس نے خود کو گفتگو میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

''یہ ڈپٹی ریاض صاحب کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ ان کا دیدار کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''بھائی جی! وہ کوئی فلمی ایکٹر ہیں جن کا دیدار کرنا ہے؟''

''بڑا نام ہے ان کا کانسٹیبل صاحب۔ سنا ہے انہوں نے بڑے بڑے ڈاکو پھڑکائے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے اپنا گائے جیسا بڑا سا سر ہلایا۔ پھر لکڑی کے تنے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''پر وہ تو اس وقت کہیں پشاور کوہاٹ میں پھر رہے ہیں۔ ابھی انسپکٹر اسلم جٹ صاحب وائرلیس پر بات کر رہے تھے۔ وہ کسی دوسرے افسر کو بتا رہے تھے کہ ڈپٹی ریاض صیب یہاں نہیں آئے۔ وہ اپنے دورے پر چلے گئے ہیں۔''

حوالدار کی بات پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی تھی۔ ڈپٹی ریاض یہاں نہیں تھا۔ اس کی قسمت اسے وقتی طور پر موت کے اسٹیج سے دور لے گئی تھی۔

اچانک ناصر نے چپکے سے رستم کا بازو دبایا۔ وہ بڑے دھیان سے پنڈال کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رستم نے ناصر کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ شروع میں تو وہ کچھ نہ جان سکا لیکن پھر وہ بھی ایک دم چونک گیا۔ اس کی ساری حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ گئیں۔ دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی بی بی کو دیکھا۔ بی بی شاندار لباس پہنے، کندھوں پر زرتار چادر ڈالے پنڈال سے حویلی کی طرف جا رہی تھیں۔ بی بی کے اردگرد میزبان چوہدری شہاب الدین اور اس کے بیٹے تھے۔ رستم کو چوہدری اعجاز اور چوہدرانی آمنہ کی صورت بھی دکھائی دی۔ ان کے عقب میں رنگ والی کے دو تین مسلح محافظ بھی تھے۔

بی بی کو دیکھ کر رستم ششدر رہ گیا۔ وہ اور ناصر نیم تاریکی میں کھڑے تھے اس لیے بی بی کے ہمراہیوں کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ بی بی تیزی سے چلتی ہوئی حویلی کے اندرونی حصے کی طرف بڑھیں تو محافظ ایک جگہ رک گئے۔ باقی لوگ حویلی کے اندر چلے گئے۔ رستم نے اندازہ لگایا کہ شائنی اور پھوپھو آمنہ دلہن کو دیکھنے کے لیے حویلی کے زنان خانے میں گئی ہیں۔

اپنی بی بی کو خود سے اتنا قریب دیکھ کر رستم بے چین ہوگیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ کسی طور بی بی سے بات کرے۔ کم از کم ان سے یہ تو پوچھے کہ انہوں نے اسے انتظار کی سولی پر کیوں لٹکا رکھا ہے..... اس سے رابطہ کیوں نہیں کر رہیں؟ لیکن بات کیسے ہو سکتی تھی۔ یہاں بہت سے لوگ تھے اور بی بی کے اردگرد رنگ والی کے کئی بزرگ تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

''کیا کیا جائے ناصر! کیا بی بی سے بات کرنے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟''

''یہاں تو بہت مشکل ہے۔''

''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی ملازمہ کے ہاتھ بی بی کو کوئی چٹ بھیج دی جائے۔''

''ہوتو سکتا ہے.....لیکن گڑبڑ بھی ہوسکتی ہے۔''

رستم اور ناصر چلتے ہوئے حویلی کے وسیع وعریض لان کے کنارے پہنچ گئے۔ ناصر کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنا منڈا سا اُتار دیا تھا۔ وہ کئی پولیس والوں کے سامنے سے بھی گزرا مگر کسی نے اس پر ذرا سی بھی توجہ نہیں دی۔ اس صورتِ حال کے سبب رستم کا حوصلہ بھی اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وہ تو بدلے ہوئے حلیے میں تھا۔

مگر پھر اچانک ان دونوں کو بری طرح چوکنا ہونا پڑا۔ انہوں نے رنگ والی حویلی کے ایک ملازم برکات علی کو دیکھا۔ گھونگریالے بالوں والا یہ درمیانی عمر کا شخص حویلی کا مستقل ملازم تھا اور ہر طرح کی مشینری بشمول ٹریکٹر، ڈیزل انجن وغیرہ ٹھیک کرتا تھا۔ وہ حویلی کے برآمدے میں کھڑا تھا اور سیدھا ان دونوں کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر رستم اور ناصر ایک دم پریشان ہوگئے۔ وہ چوہدری اعجاز تھے۔ برکات علی کی نگاہیں تو رستم اور ناصر پر تھیں مگر وہ بات چوہدری اعجاز سے کر رہا تھا۔ ایک ہی لحظے میں رستم اور ناصر سب کچھ بھانپ گئے۔ یہ ان کے لیے مخدوش صورتِ حال تھی۔ حویلی کے خاص ملازم برکات علی نے رستم اور ناصر کو قریب سے دیکھا تھا اور غالباً ان دونوں میں سے رستم کو پہچان لیا تھا۔ اب وہ چوہدری اعجاز کو ان دونوں کی موجودگی کے بارے میں بتا رہا تھا۔ اس کے بعد وہی کچھ ہوا جس کی توقع تھی۔ چوہدری اعجاز تیزی سے رستم اور ناصر کے قریب چلے آئے۔ انہوں نے بڑے دھیان سے رستم کو دیکھا اور اس کے بدلے ہوئے حلیے کے باوجود اس کو پہچان گئے۔ رستم نے پہل کرتے ہوئے چوہدری اعجاز کو سلام کیا۔

''یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے.....اور یہاں کیسے پہنچ گئے ہو تم؟'' انہوں نے ایک ساتھ دو سوال کیے۔ ان کا لہجہ دھیما تھا..... جیسے وہ چاہ رہے ہوں کہ اردگرد موجود کوئی شخص اس گفتگو سے آگاہ نہ ہوسکے۔

''کیا میرے یہاں آنے پر کوئی پابندی ہے؟'' رستم نے نرم لہجے میں کہا۔

''پابندی لگانے والا میں کون ہوتا ہوں لیکن تمہارے یہاں آنے کا کوئی مقصد تو ہوگا؟''

''مقصد تو ایک تھا لیکن وہ پورا نہیں ہوسکا۔ اب میں نے شانی بی بی کو یہاں دیکھ لیا

www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''تم سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ شانی سے ملنے کے لیے ہی یہاں پہنچے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیوں ہمیں اس طرح ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہو۔'' چوہدری اعجاز کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''اگر میں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں تو اس میں آپ کی ذلت کا مسئلہ کہاں سے نکل آیا؟''

چوہدری کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ انہوں نے کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھا کہ کوئی ان کی طرف متوجہ تو نہیں ہے پھر پھنکار کر بولے۔ ''رستم! بندے کی عزت اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بہتر ہے کہ تم اس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔''

''اگر میں نہ جاؤں تو؟'' رستم نے چوہدری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

''پھر تمہارے جیسے بدخصلتوں کے لیے اور طریقے بھی ہوتے ہیں۔'' چوہدری کا لہجہ آتش فشانی ہوگیا مگر آواز بدستور پست تھی۔

''بدخصلت تُو خود ہوگا چوہدری۔'' رستم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''اس میں تیرا قصور نہیں۔ تیرے اندر کا گندا خون بول رہا ہے۔'' چوہدری جیسے پھٹ پڑا۔ اس نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی..... اور اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے رستم کی آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی۔ طیش کے عالم میں اس کا دایاں ہاتھ پوری قوت سے گھوما اور چوہدری اعجاز کے رخسار پر پڑا۔ وہ اپنی پگڑی سمیت ڈگمگا کر رہ گیا۔

عین اسی وقت شانی برآمدے میں موجود تھی۔ وہ رستم اور چوہدری اعجاز کی تکرار دور سے دیکھ رہی تھی۔ جب رستم نے چوہدری اعجاز کو تھپڑ مارا تو وہ دوڑتی ہوئی ان دونوں کی طرف آئی۔ یہ سارا واقعہ درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں ہوا تھا۔ دو تین افراد کے سوا یہ منظر کوئی نہیں دیکھ سکا۔ تھپڑ کھانے کے بعد چوہدری اعجاز تو اپنی جگہ کھڑا رہا مگر ملازم برکات علی جو تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھا تیزی سے رستم کی طرف بڑھا۔ تب تک شانی بھی قریب آچکی تھی۔ چوہدری اعجاز نے شانی کو دکھانے کے لیے برکات علی کو راستے میں ہی روک لیا۔

''نہیں برکات، نہیں! دیوانے کے ساتھ دیوانے نہیں ہوجاتے۔ اس کی عزت نہیں ہوگی مگر ہماری تو ہے۔''

برکات علی نے زور مار کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر چوہدری اعجاز نے اسے نہیں

چھوڑا۔ اس دوران میں شانی بھی رستم کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ چند لمحے میں اس کی خوب صورت آنکھوں کے اندر آتشیں آنسو امڈ آئے تھے۔ ''رستم! یہ تم نے کیا کیا؟'' وہ درد سے بھرپور آواز میں کراہی۔ ایک سیکنڈ کے لیے تو یوں لگا کہ وہ رستم کا گریبان پکڑ لے گی..... اور شاید وہ پکڑ بھی لیتی مگر چوہدری اعجاز نے اس کا راستہ بھی روک لیا۔ ''نہیں شانی پُتر..... ہمیں یہاں تماشا نہیں بنانا۔ تم اندر چلو.....''

چوہدری اعجاز شانی کے رستے میں پوری طرح حائل ہو گیا..... پھر اسے دھکیلتا ہوا برآمدے کی طرف بڑھا۔ شانی نے درد سے کراہ کر کہا ''چلے جاؤ یہاں سے..... میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔'' شانی نے یہ بات رستم کے لیے کہی تھی مگر رستم یہ بات سننے سے پہلے ہی واپس جا چکا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں یہاں احاطے میں ہونے والے واقعے کی خبر برآمدے تک بھی پہنچ گئی۔ چوہدری اعجاز کے مسلح محافظ دندناتے ہوئے باہر آئے۔ چوہدری کا لال بھبھوکا چہرہ دیکھ کر ان کی آنکھوں کی طیش آمیز حیرانی مزید بڑھ گئی۔

''کون تھا جی؟''

''کہاں گیا ہے جی؟''

''پھڑو اس حرامی کو۔'' دو تین آوازیں ابھریں۔

''نہیں..... بالکل نہیں..... کوئی کچھ نہیں کرے گا۔'' چوہدری نے مدھم مگر سخت تحکمانہ لہجے میں کہا۔

محافظ جہاں کے تہاں رک گئے۔ یہی وقت تھا جب کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی پھر یہ آواز تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔

شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔ رستم سے اسے ایسی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے اسے خالو اعجاز نے بتایا تھا کہ رستم نے ان سے فون پر سخت بدتمیزی کی ہے۔ ابھی شانی کے دل میں اس بات کا کانٹا چبھا ہوا تھا کہ آج انتہا ہو گئی تھی۔ یہ کوئی سنی سنائی بات نہیں تھی۔ شانی نے اپنی آنکھوں سے، رستم کو تھپڑ مارتے دیکھا تھا۔ شانی کا دماغ ہی نہیں پورا جسم سنسنا رہا تھا۔ خالو اعجاز کی آنکھوں کو نم دیکھنا ایک ایسا منظر تھا جو شانی کے دل کو اس کے سینے میں لہو کر رہا تھا۔

یہ واقعہ ایسا نہیں تھا جسے چھپایا جا سکتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی حویلی میں موجود سارے مہمانوں میں یہ خبر پھیل گئی۔ چوہدری شہاب الدین اور اس کا بڑا بیٹا بھنائے ہوئے چوہدری اعجاز کے پاس پہنچ گئے۔ چوہدری شہاب نے پوچھا۔ ''کون حرام زادہ تھا وہ۔ آپ نام بتاؤ

جی۔ ہم اسے زمین کی تہہ سے کھینچ کر لے آتے ہیں۔''

''نہیں چوہدری، میں اس معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اسے اپنی کرنی کا پھل ضرور ملے گا۔''

''لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے گھر میں آ کر ہمارے مہمان کے ساتھ برا سلوک کرے اور چلا جائے۔ میں اس کے پیچھے بندے دوڑا رہا ہوں۔ پتا چلا ہے کہ وہ دو منڈے تھے اور موٹر سائیکل پر پکی روڈ کی طرف گئے ہیں۔''

چوہدری اعجاز نے بازو تھام کر اسے روک لیا۔ ''چوہدری صاحب! میں ایک کملے (دیوانے) کے ساتھ کملا ہونا نہیں چاہتا۔ اس کے کملے پن کی وجہ سے میری بے عزتی نہیں ہوئی مگر اس معاملے کو اچھالنے میں میری بے عزتی ہے۔ اگر میں نے اس بندے سے نمٹنا ہوا تو اپنے طور پر نمٹوں گا۔''

چوہدری شہاب نے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ آپ اسے اچھی طرح جانتے ہو اور فی الحال اسے معاف کر رہے ہو؟''

چوہدری زخمی انداز میں مسکرایا اور شانی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنے کا ہنر بھی میں نے اپنی دھی رانی سے ہی سیکھا ہے۔ لوگ بڑوں سے سیکھتے ہیں ہم اس چھوٹے سے سیکھ رہے ہیں۔''

شانی اپنے آنسو چھپانے کے لیے خالو اعجاز کے گلے لگ گئی۔ کچھ دیر بعد جب چوہدری اعجاز اور شانی کمرے میں اکیلے تھے تو شانی نے پوچھا۔ ''خالو جی! کیوں ہوا ایسا؟ آپ نے کیا کہہ دیا تھا رستم کو؟''

''کچھ بھی نہیں کہا میں نے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے برکات علی نے آ کر مجھے بتایا کہ اسے دو بندوں پر شک ہو رہا ہے۔ وہ احاطے کے پاس کھڑے ہیں، ان میں سے ایک رستم سیال لگتا ہے۔ میں برکات علی کے ساتھ باہر آیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا، وہ رستم ہی تھا۔ تم نے دیکھا ہی ہے شانی کہ اس نے بال چھوٹے کرا لیے اور کلین شیو ہو گیا ہے۔ پینٹ شرٹ کی وجہ سے حلیہ اور بھی بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ ناصر تھا۔ میں ان کے پاس چلا گیا۔ میں نے بڑی نرمی کے ساتھ اس سے بات کی۔ میں نے کہا کہ اسے تم سے ملنے کے لیے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہاں اتنے زیادہ مہمان ہیں اگر ملنا ضروری ہی تھا تو وہ پہلے فون پر رابطہ کر لیتا۔ وہ تو جیسے پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا۔ کہنے لگا کہ وہ میری منکوحہ بیوی ہے۔ میں جب چاہوں گا اس سے ملوں گا۔ میں دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔ وہ سیدھا اندر تمہارے پاس

www.pdfbooksfree.pk

آنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا رستم اس طرح تماشا بنے گا۔ میں نے اسے اندر آنے سے روکنا چاہا۔ اس نے ہم سب کو گالیاں دیں..... پھر تھپڑ مار دیا۔''

''اسے کیا ہو گیا ہے خالو جی! وہ ایسا تو نہیں تھا، کہیں وہ..... پھر سے نشہ تو نہیں کرنے لگا۔''

''نہیں، نشے میں تو نہیں لگتا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں غصہ بہت ہے۔ وہ کوشش تو کرتا ہے لیکن کبھی کبھی یہ غصہ اس سے سنبھالا نہیں جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ.....''

''لیکن خالو! اس نے اتنی غلط حرکت کر دی..... اتنی زیادہ غلط۔'' شانی نے تیزی سے چوہدری اعجاز کی بات کاٹی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے چوہدری اعجاز کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''خالو جی! اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ پتا نہیں یہ سب کیوں ہوا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں، میرا دل رو رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے..... کہ..... اس نے آپ پر نہیں ابا جی پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔''

خالو اعجاز نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کا سر چومتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ میری دھی! تُو اپنے دل پر بوجھ نہ لے..... زندگی میں ایسی اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ جہاں تک رستم کی بات ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ بھی وقت گزرنے کے ساتھ بہتر ہو جائے۔ یہ تو پکی بات ہے کہ وہ تم سے پیار کرتا ہے اور اگر وہ پیار کرتا ہے تو پھر یہ پیار اس کو ضرور بدلے گا۔''

شانی خالو اعجاز کے گلے سے لگی رہی اور سسکیاں لے کر روتی رہی۔ اس کا دل خون ہو رہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ کچھ دن پہلے وہ رستم سے پوچھے بغیر اچانک لاہور سے چلی آئی تھی لیکن یہ اتنی بڑی غلطی تو نہیں تھی جس کے لیے اتنی بڑی سزا دی جاتی۔ چند روز پہلے اس نے ملازم خادم حسین کے ذریعے ساری صورتِ حال رستم کو بتا بھی دی تھی اور رستم، ناصر، اجمل وغیرہ سے معذرت بھی کی تھی۔ وہ رستم کو بہت برداشت والا سمجھتی تھی مگر جو کچھ ہو رہا تھا، یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اب تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ رستم اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہے کہ وہ کہاں جاتی ہے؟ کیا کرتی ہے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اسے کیونکر خبر ہوئی کہ وہ آج رات یہاں وزیری گاؤں میں موجود ہو گی۔ اسے خبر تھی اس لیے وہ یہاں چلا آیا۔ شانی جتنا سوچ رہی تھی اتنا ہی اس کا دکھ بڑھ رہا تھا۔

☆======☆======☆

رنگ والی واپس آ کر بھی وہ غم و غصے میں غلطاں رہی۔ اڑتالیس گھنٹے کے اندر ہی

وزیری گاؤں والے واقعے کی خبر ہر جگہ پھیل گئی۔ سکینہ، شانی کی ہم راز سہیلی تھی..... شانی نے کبھی کوئی ذاتی بات سکینہ سے نہیں چھپائی تھی۔ دیہات میں شام سے پہلے چنے مکئی وغیرہ بھٹی پر بھنوانے کا رواج بہت پرانا ہے۔ دن ڈھلتے ہی لوگ اس شغل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ سکینہ بہت خوشبودار چنے بھٹی سے بھنوا کر لائی تھی۔ یہ چنے اس کی صاف اوڑھنی میں ایک چھوٹی سی پوٹلی کی صورت بندھے ہوئے تھے۔ وہ پھسکڑا مار کر شانی کے پاس بیٹھ گئی۔ ''لے چھوٹی چوہدرانی..... چنے کھا۔'' اس نے کہا۔ وہ اکثر شانی کو ہلکے پھلکے انداز میں چھوٹی چوہدرانی کہہ کر بلاتی تھی۔

شانی جوں کی توں بیٹھی رہی تو سکینہ نے ذرا دھیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کو فوراً پتا چل گیا کہ شانی تادیر روتی رہی ہے۔ ''کیا ہوا میری بنو!'' اس نے لاڈ سے پوچھا۔ ''یہ پیاری سی ناک کیوں لال ہو رہی ہے؟''

''کک..... کچھ نہیں۔ زکام سا ہے۔''

''زکام ہے تو پھر یہ بھنے ہوئے چنے کھانا تو اور بھی اچھا ہے..... لیکن.....'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''لیکن مجھے لگتا ہے کہ بات کچھ اور ہے۔ شاید رات کو پھر میری بنو رانی تکیے کو تھروؤں (آنسوؤں) سے بھگوتی رہی ہے۔''

شانی خاموش رہی۔ سکینہ نے چنے ایک طرف چنگیر میں رکھ دیئے اور کھوجی نظروں سے شانی کا چہرہ دیکھنے لگی۔ پھر نجومیوں کے سے انداز میں بولی۔ ''یا تو پرسوں وزیری پنڈ میں ہونے والے واقعے کا افسوس ہے یا پھر..... وہ یاد آ رہے ہیں بڑے زور کے ساتھ۔''

شانی اسے کیسے بتاتی کہ یہ دونوں باتیں ایک ہی دکھ بھری رُوداد کا حصہ ہیں۔ شانی کی ہم راز سہیلی ہونے کے باوجود سکینہ کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ رستم اور شانی کی شادی ہو چکی ہے۔ وہ رستم کو شانی کا محبوب ہی سمجھتی تھی۔ کہنے لگی۔ ''اگر رستم کی وجہ سے پریشانی ہے تو اس میں تیرا اپنا قصور ہے۔ تُو نے خود اسے ناراض کیا ہوا ہے۔ وہ لاہور میں بیٹھا تیرے انتظار میں سوکھ رہا ہے اور تُو یہاں اپنے کام دھندوں میں لگی ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے کہ علاقے کے لوگوں کا دکھ درد بانٹنا بھی اچھی چیز ہے مگر جو تیرے نام کی مالا گلے میں پہنے بیٹھا ہے اس کا دکھ بھی تو بانٹنا چاہیے۔''

شانی بس ایک آہ بھر کر رہ گئی۔

سکینہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''جہاں تک چوہدری اعجاز صاحب والے واقعے کی بات ہے، یہ ہے تو دکھ والا واقعہ..... پر چوہدری صاحب نے جس طرح اس معاملے کو

www.pdfbooksfree.pk

برداشت کیا ہے، اس سے ان کی عزت بڑھی ہے۔ پنڈ میں یہی باتیں ہو رہی ہیں۔ بڑے مولوی صاحب دائرے (بیٹھک) میں لوگوں سے کہہ رہے تھے۔ پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو گرا دے، پہلوان وہ ہے جو اپنے غصے کو دبا لے۔ کوئی شخص بدلہ لینے کی طاقت رکھتا ہو پھر بھی بدلہ نہ لے تو یہ بہت بڑی بہادری ہوتی ہے۔ وہ چوہدری اعجاز کی تعریف کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے دوسروں کے لیے مثال پیدا کی ہے۔''

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' شانی نے نم ناک لہجے میں کہا۔

''مگر شانی! وہ بندہ تھا کون؟ اور چوہدری جی سے کیا دشمنی تھی اس کی؟''

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''تم نے اسے دیکھا تو ہے۔ اپنے علاقے کا لگتا تھا یا باہر کا؟''

''باہر کا ہی لگتا تھا۔'' شانی نے مختصر جواب دیا۔

کچھ دیر بعد سکینہ تندور گرم کرانے کے لیے احاطے کی طرف چلی گئی تو شانی بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں ملازم برکات علی، رستم کے حوالے سے کسی سے کچھ کہہ نہ دے۔ درحقیقت رستم کے زندہ سلامت ہونے اور لاہور میں ہونے کا علم خالو اعجاز، تایا معصوم، پھوپھی آمنہ اور بابا خادم حسین کے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ ان میں سے صرف خالو اعجاز کو یہ معلوم تھا کہ رستم اور شانی کی شادی ہو چکی ہے۔ اب ایک اور شخص اس بات سے آگاہ ہو گیا تھا کہ رستم زندہ ہے اور وہ برکات علی تھا۔ شانی اور خالو اعجاز نے کل برکات علی کو اکیلے میں بلایا تھا اور بڑی سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ یہ راز صرف اپنے تک رکھے گا۔ برکات علی نے حلفاً کہا تھا کہ یہ بات مرتے دم تک اس کے سینے میں رہے گی۔ اب شانی چاہتی تھی کہ مزید تاکید کے طور پر خالو اعجاز اور برکات علی سے ایک اور ملاقات کر لے۔

کمرے میں چکراتے چکراتے شانی کی نگاہ ان اشیاء پر پڑی جو اس نے چند دن پہلے بڑی چاہت سے رستم کی سالگرہ کے لیے خریدی تھیں۔ کپڑے، گھڑی اور پرفیوم وغیرہ۔ وہ سب کچھ یہاں دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ سالگرہ گزر گئی تھی اور وہ سہانا وقت بھی ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گیا تھا جس نے دو تین روز کے لیے ان دونوں کو مسحور کیا تھا۔ خوشیوں کی عمر اتنی تھوڑی کیوں ہوتی ہے؟ شانی نے بڑے کرب کے ساتھ سوچا۔ اس نے رستم کے لیے خریدی ہوئی قمیص پر ہاتھ پھیرا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

رستم کے لیے شدید ترین غصہ اب قدرے کم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ دکھ نے لے لی تھی..... اس کی عادت تھی کہ وہ اپنے کسی بھی دکھ اور پریشانی کی بنیاد اپنی ذات میں ڈھونڈا

کرتی تھی۔ سوچتی تھی کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔ وہ اب بھی سوچ رہی تھی۔ رستم ایسا تو نہیں تھا پھر اس نے ایسی اوچھی حرکت کیوں کی؟ کہیں نہ کہیں ضرور کوئی گڑبڑ تھی۔ اسے ایک بار پھر حویلی کی ٹیلی فون لائن پر شدید غصہ آنے لگا۔ اگر یہ لائن ہی ٹھیک ہوتی تو شاید حالات اس حد تک نہ بگڑتے۔ وہ ویسے ہی چیک کرنے کے لیے فون سیٹ کی طرف گئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ لائن پر وہی منحوس خاموشی تھی۔ وہ خالو اعجاز کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی۔ خالو اعجاز کہیں دکھائی نہیں دیئے۔

خالو اعجاز عین اس وقت حویلی کے مردانے میں موجود تھے۔ وہ ایک الگ تھلگ کمرے میں بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ دو مہمان موجود تھے۔ یہ وہی فنکار جوڑا تھا جس نے تین روز پہلے چوہدری شہاب الدین کی حویلی میں ورائٹی شو میں پرفارم کیا تھا۔ یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ پچھلے دو تین دنوں میں چوہدری اعجاز نے اپنے ذریعے سے ان میاں بیوی کے بارے میں اہم معلومات حاصل کی تھیں۔ ان معلومات کے مطابق اس فنکار جوڑے کو ان دنوں روپے کی شدید ضرورت تھی..... بلکہ اس ضرورت کو شدید تر کہنا چاہیے۔ ان کا تین سالہ بچہ دل کے عارضے میں مبتلا تھا۔ اس کے دل میں سوراخ تھا اور علاج کے لیے کم و بیش تین لاکھ روپے کی رقم درکار تھی۔ دوسری طرف فنکار جوڑے کی آمدن بہ مشکل اتنی تھی کہ پانچ افراد پر مشتمل کنبے کی روٹی پوری ہوتی تھی۔ وہ اپنے جاں بلب بچے کے علاج کے لیے اپنا آپ بیچنے تک کو تیار تھے۔

سامنے تپائی پر ایک اسٹامپ پیپر رکھا تھا۔ اس پر لکھی ہوئی تحریر کے مطابق میاں بیوی تین لاکھ روپے نقد وصول کر رہے تھے اور تین ماہ کے اندر واپس کرنے کے پابند تھے۔ بچے کے باپ اختر قصوری نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مگر چوہدری صاحب! ہمیں کرنا کیا ہوگا؟''

چوہدری اعجاز نے اختر کی جواں سال بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں نہیں..... صرف تمہاری بیوی کو کچھ کرنا ہوگا۔''

اختر قصوری چونک کر چوہدری اعجاز کی طرف دیکھنے لگا۔ شاید اس کے ذہن میں وہ کہانیاں گھوم گئی تھیں جن میں پُرشکوہ حویلیوں کے اندر رہنے والے عیاش زمینداروں کا ذکر ہوتا ہے..... جو راہ چلتی عورتوں پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں اپنی خواب گاہوں تک لانے کے لیے دھن اور دھونس کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ اختر کی خوش شکل بیوی بھی چند سیکنڈ کے لیے ہراساں نظر آئی۔ چوہدری اعجاز نے بڑے شریفانہ لہجے میں کہا۔ ''پریشان

www.pdfbooksfree.pk

ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں خدانخواستہ تم سے کوئی ناجائز کام نہیں کرواؤں گا۔ میں خود بھی بال بچے والا ہوں۔ اس حوالے سے تم بالکل بے فکر رہو۔''

وہ قدرے مطمئن نظر آنے لگے۔ اختر قصوری نے ہمت کر کے کہا۔ ''آپ ہمارے لیے عزت کے مقام پر ہیں۔ آپ بتائیں ہمارے لیے کیا حکم ہے؟''

چوہدری اعجاز بولے۔ ''میں پھر وہی بات کہوں گا۔ یہ ایک بالکل معمولی اور بے ضرر کام ہے لیکن پہلے تم دونوں کو اس سلسلے میں مکمل رازداری کا وعدہ کرنا ہوگا۔ درحقیقت میں تمہیں جو قیمت دے رہا ہوں وہ اس کام کی نہیں ہے۔ یہ کام تو آپ جیسا کوئی بھی فنکار ہزار دو ہزار میں یا شاید مفت بھی کر دے گا مگر میری پہلی اور آخر شرط رازداری ہے۔''

اختر کی بیوی نائلہ نے کہا۔ ''چوہدری جی! اگر اس کام سے ہمیں یا کسی دوسرے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو ہم یہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں اور پوری رازداری بھی برتیں گے۔''

''کیا تم بھی یہ وعدہ کرتے ہو قصوری؟''

''جی، میں بھی وعدہ کرتا ہوں۔'' اختر قصوری نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''یہ اسٹامپ پیپر میں صرف اس وعدے کی ضمانت کے طور اپنے پاس رکھوں گا۔ مجھے امید ہے کہ کبھی بھی اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

''جیسے آپ کی مرضی جناب!'' اختر قصوری نے بڑی لجاجت سے جواب دیا۔

چوہدری اعجاز گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ ''تم لوگ یوں سمجھو کہ میں اپنی ناسمجھ بیٹی کو ایک غلط بندے کے شر سے بچانا چاہتا ہوں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے، ہر شخص اپنی اولاد کا بھلا چاہتا ہے، جس طرح تم دونوں چاہ رہے ہو۔'' اختر قصوری اور اس کی بیوی نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔ چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''اس کام کے لیے مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک چھوٹا سا ڈراما کرنا پڑ رہا ہے۔ مجھے امید ہے قصوری کہ اس میں تمہاری وائف میرا ساتھ دے گی۔''

چوہدری اعجاز نے قریبی الماری میں سے ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر نکالا۔ اس میں شانی کی آواز تھی۔ یہ وہی تقریر تھی جو کچھ روز پہلے شانی نے حویلی کی بالکونی میں کھڑے ہو کر ایک بڑے مجمعے کے سامنے کی تھی۔ اس تقریر کے علاوہ اس میں دس پندرہ منٹ کی بات چیت بھی شامل تھی جو شانی، عارف کمبوہ اور میڈیا کے لوگوں کے درمیان ہوئی تھی۔

چوہدری اعجاز نے قصوری کی بیوی نائلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم کسی بھی آواز کی نقل آسانی سے کر سکتی ہو۔ تم یہ کیسٹ اپنے ساتھ لے جاؤ اور دو تین دن

میں اس آواز کی مشق کر لو۔ کوئی دشواری تو نہیں ہوگی؟''

نائلہ ٹیپ ریکارڈر سے ابھرنے والی آواز کو غور سے سن رہی تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''میں یہ آواز بنا لوں گی۔''

''ویری گڈ! میں تم دونوں کو فون کروں گا اور تمہیں یہاں حویلی میں آنا ہوگا۔ یہاں ہم ٹیلی فون پر اس بندے سے بات کریں گے۔ باقی تفصیل میں تمہیں اسی دن بتاؤں گا۔''

چند منٹ کی گفتگو میں سارے معاملے طے ہو گئے۔ چوہدری اعجاز نے اختر قصوری کو دو لاکھ روپے کا چیک دے دیا۔ باقی ایک لاکھ روپے آٹھ دس روز کے اندر دینا طے پایا۔ اسٹامپ پیپر پر سائن اور انگوٹھے ہو گئے۔

☆======☆======☆

جو کچھ ہوا اس کے لیے رستم کے دل میں بہت پچھتاوا تھا۔ چوہدری اعجاز نے بات ہی ایسی کہہ دی تھی جس کے بعد رستم کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ چند لمحوں کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے سرخ چادر سی تن گئی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا، کب اس کا ہاتھ اٹھا، کب گھوما اور چوہدری اعجاز کے رخسار پر پڑا۔ اس وقت رستم کی عجیب کیفیت تھی۔ اگر وہ شخص شانی کا خالو نہ ہوتا تو شاید رستم کے ہاتھوں اس کی موت واقع ہو جاتی۔

یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے رستم کو شانی بی بی کا ردِعمل بھی یاد آیا۔ بی بی کی آنکھوں نے اس پر شعلے برسائے تھے۔ وہ بڑے غصے سے رستم کی طرف بڑھی تھیں مگر چوہدری نے بڑی برداشت کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں روک لیا تھا۔ بی بی کے الفاظ رستم کے کانوں میں گونجے۔ انہوں نے رستم کا نام لیے بغیر کہا تھا۔ ''چلے جاؤ یہاں سے..... میں کہتی ہوں چلے جاؤ۔''

رستم نے سوچا، کاش یہ الفاظ سننے سے پہلے وہ مر گیا ہوتا۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ وہ بار بار خود سے یہ سوال پوچھ رہا تھا۔ اجمل خان چائے کے دو کپ پکڑے ہوئے رستم کے پاس آ بیٹھا۔ اس نے ایک کپ رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم نے کپ لے کر بے دلی سے تپائی پر رکھ دیا۔ اجمل نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''رستم بھائی! چوہدری اعجاز کا نیت اب کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ وہ آپ کو شانی بہن سے دور رکھنا چاہتا ہے اسی لیے وہ آپ دونوں کے درمیاں دراڑیں پیدا کرنے کا کوشش کر رہا ہے۔ امارے دادا کہا کرتے تھے کہ پانی کو لاٹھیاں مار کر دو حصوں میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ آپ اور شانی بی بی کا تعلق بھی ایسا نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کی کوششوں سے ٹوٹ سکے۔ آپ کسی طرح ایک بار شانی بہن سے براہِ راست بات

www.pdfbooksfree.pk

کرے۔"

"بات کس طرح ہو سکتی ہے؟"

"آپ کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لے۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والے کو خدا بھی ملتا ہے۔"

رستم خود بھی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح بی بی سے براہِ راست بات کرنے کا موقع مل جائے۔ اس کا عشق خام نہیں تھا۔ یہ آزمائشوں کی بھٹی میں جل جل کر کندن ہو چکا تھا۔ یہ وہ عشق تھا جس میں اپنا آپ ختم ہو جاتا ہے، بس محبوب ہی محبوب رہ جاتا ہے۔ رستم ایک سرکش باغی کا نام تھا۔ اس کی گردن کبھی کسی کے سامنے خم نہیں ہوئی تھی مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے اپنی بی بی کی خاطر چوہدری اعجاز سے دست بستہ معافی بھی مانگنا پڑی تو وہ مانگ لے گا۔ بی بی اس کے لیے کوئی سزا بھی تجویز کرتیں، وہ اسے بسر و چشم قبول تھی۔ یہاں مسئلہ صرف یہی تھا کہ بی بی سے اس کی بات نہیں ہو رہی تھی۔ کسی وقت تو رستم کو یوں لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اس سے دور رہنا چاہ رہی ہیں۔ کئی دن پہلے انہوں نے رستم سے کہا تھا کہ وہ انہیں فون نہ کرے، وہ خود ہی اس سے رابطہ کریں گی..... وہ یہ بات کہہ کر جیسے بھول ہی گئی تھیں۔

"خوآپ کس خیال میں کھو گیا؟" اجمل خان نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" رستم نے جواب دیا پھر موضوع بدل کر بولا۔ "تمہارے خوالاتی کا حال کیسا ہے؟"

"ایک دم پسٹ کلاس۔ اس کا تن فن کافی حد تک کم ہو گیا ہے لیکن پھر بھی ڈپٹی ریاض کا سر بھنبھنا رہا ہے۔ کبھی کبھی اپسری (افسری) کا غبار اس کے معدے کو چڑھ جاتا ہے۔ دھمکیاں دینے لگتا ہے۔"

"غبار معدے کو نہیں دماغ کو چڑھتا ہے۔" رستم نے کہا۔

"چھوڑیں جی، ایسے لوگوں کے کھوپڑے میں دماغ کہاں ہوتا ہے۔ بس اکڑ ہی اکڑ ہوتی ہے۔"

اس دوران میں ناصر اپنے ناخن تراشتا ہوا ادھر آ گیا۔ "یہ کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟" اس نے کہا۔

"ام تم کو راہِ راست پر لانے کی بات کر رہا تھا۔ ام رستم بھائی کو بتا رہا تھا کہ جوان لڑکے کو زیادہ دیر فارغ نہیں رہنا چاہیے۔ اس کا جلدی سے شادی کر دیں۔"

"آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے چاچا جی۔" ناصر نے طنز کیا۔

"امارا تو پاؤں قبر میں ہے بھتیجا جی۔"

"لیکن سر تو باہر ہے۔ اس لیے آتی جاتی عورتوں کو گھورتے ہو۔"

"یہ سراسر الزام ہے۔ آپ اچھی طرح جانتا ہے کہ ام کو نسوار کے سوا کسی سے عشق نہیں۔"

اسی دوران میں خانساماں ظفر کا پالا ہوا مرغا مرغی ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے ہوئے صحن میں سے گزر گئے۔ اجمل خان نے فوراً کہا۔ "دیکھیں رستم بھائی! آپ خود دیکھ لیں، سیانا لوگ سچ کہتا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ ناصر بھائی اور زری نے جانوروں کا عادتیں بھی خراب کر دیا ہے۔ یہ بھاگنے دوڑنے میں ان دونوں کا نقل کرتا ہے۔"

"یہ تو ہزار ہا سال سے ایسے ہی بھاگ دوڑ رہے ہیں۔" ناصر نے کہا۔

"تو پھر آپ دونوں ان کا نقل کر رہا ہوگا۔ دونوں صورت میں کام تو اچھا نہیں ہے نا۔"

"اچھا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے اٹھ جاؤں تو اٹھ جاتا ہوں۔" ناصر نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

"ارے..... نہیں۔" اجمل نے اس کا بازو پکڑ کر دوبارہ بٹھایا۔ "ام اس بارے میں سنجیدگی سے بات کرنا چاہ رہا ہے۔ امارے آنے والے دنوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔ سچ، امارا دل چاہتا ہے کہ جلد سے جلد زری کے ساتھ تمہارا شادی ہو جائے۔ وقت امارے لیے بہت بے رحم ہے۔ اس وقت سے ام جو خوشی بھی چھین سکتا ہے ام کو چھین لینا چاہیے۔ اگر چند دنوں میں آپ دونوں کا شادی ہو جائے تو امارے خیال میں اس سے ایک اور پائدہ بھی ہو سکتا ہے؟"

"کیا..... تمہاری عقل داڑھ نکل سکتی ہے؟" ناصر نے کہا۔

"ام مذاق نہیں کر رہا ناصر بھائی۔ ہو سکتا ہے کہ اس شادی کا سن کر امارا شائی بہن کا دل بھی پسیج جائے۔ شائی بہن اور رستم بھائی میں صلح ہو جائے..... اور پھر وہ بھی اس شادی میں شریک ہونے کے لیے یہاں پہنچ جائے۔ ایسے موقعوں پر کئی بگڑے ہوئے کام ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

"عقل کی بات تم آٹھ دس مہینے میں ایک بار ہی کرتے ہو۔ بڑا مبارک موقع ہے کہ ہم نے یہ شبھ گھڑی دیکھی ہے۔" ناصر نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

رستم نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "بی بی کا معاملہ تو علیحدہ ہے ناصر! لیکن یہ میں

www.pdfbooksfree.pk

بھی چاہتا ہوں کہ تمہاری شادی ہو جائے۔ ہم وہاں مارگہ بستی میں واس اور خانم سے وعدہ کر کے آئے ہیں کہ زری کو خوشی اور عزت دیں گے، اور واقعی اتنے دکھ برداشت کرنے کے بعد وہ اس خوشی کی حق دار بھی ہے۔''

زری کسی قریبی کمرے میں گنگنا رہی تھی۔ وہ پاؤندہ بستی کی مقامی زبان کا گیت تھا۔ الفاظ ان میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر لہجہ اور آہنگ بھی متاثر کرنے والا تھا۔ اس آہنگ میں بلند و بالا درختوں میں سرسراتی ہوئی یخ بستہ ہواؤں کی آہٹ تھی۔ برفیلے چشموں کی روانی، نیم منجمد آبشاروں کا ترنم، آبی گزرگاہ میں گرنے والے برفانی تودوں کی آواز..... بہت کچھ شامل تھا۔ اس آہنگ میں اور اس کونج کی گداز کوک بھی تھی جو اپنے جھنڈ اور اپنے دیس سے جدا ہو گئی ہو۔ زری کی گنگناہٹ نے رستم کو تھوڑی دیر کے لیے اس برفانی ٹاپو پر پہنچا دیا جہاں اس نے اور ناصر، شریف وغیرہ نے قریباً ایک برس گزارا تھا۔ وہاں پیش آنے والے سارے حیران کن واقعات ایک بار پھر رستم کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے..... مسای کا بازو کاٹے جانے کی اندوہناک سزا، برفانی کھائی میں جانسن اور ڈاکٹر مالیتا کی اندوہناک موت، خوفناک سفید ریچھوں سے پنجہ آزمائی، دھواں دھار معرکے میں شوتم خان کا برچھی پر ننگا ہوا سر..... بہت کچھ رستم کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا اور آخر میں وہ داستانی طرز کا واقعہ بھی جب وہ ایک پُل پر سے گزر کر ایک پتھریلی تختی اٹھا کر لایا تھا۔ وہ اب بھی کبھی کبھی سوچتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ اس پُل پر سے گزرنے کو اتنا دشوار کیوں سمجھ لیا گیا تھا۔ اس پل پر سے گزرنا ہرگز مشکل نہیں تھا، بس عقیدوں کی کمزوری نے اس راستے کو پل صراط بنا دیا تھا۔

اجمل، رستم اور ڈولا کچھ دیر تک زری کے بارے میں بات کرتے رہے پھر فون کی گھنٹی بجی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی رستم کے سینے میں لہری دوڑ گئی۔ مگر اس بار بھی فون بی بی کا نہیں تھا۔ یہ رستم کے لیے حاجی حیات کی کال تھی۔ رستم، حاجی حیات سے بات کرنے میں مصروف ہو گیا۔

یہ تیسرے روز کا واقعہ ہے، رستم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ از خود بی بی سے رابطے کی کوشش کرے گا اور ان سے وزیری گاؤں والے واقعے پر دلی معذرت کرے گا۔ اس حوالے سے وہ جو کچھ بھی کہیں گی وہ قبول کر لے گا۔

اس نے اجمل خان سے کہا۔ ''اجمل! تم حویلی کے فون پر رابطے کی کوشش کرو۔ جو کوئی بھی فون اٹھائے اسے بی بی کو بلانے کے لیے کہو۔''

''اپنا تعارف کرا دوں؟''

''ہاں ہاں..... لیکن میرے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔''

''اور اگر چوہدری اعجاز نے پون اٹھایا تو پھر؟''

''پھر بند کر دینا۔''

اجمل خان تو جیسے پہلے ہی کسی ایسی ہدایت کا منتظر بیٹھا تھا۔ وہ بڑی دل جمعی سے حویلی کا نمبر ملانے میں مصروف ہو گیا۔ صرف دو تین منٹ بعد ہی اس کے چہرے پر تغیر نمودار ہوا۔ رابطہ ہو گیا تھا۔ ''ہیلو..... کون..... سلاماں لیکم..... چاچا..... ام اجمل خان بول رہا ہے..... کیا حال چال ہے..... ہاں جی..... ام بھی ٹھیک ٹھاک ہے..... شانی بی بی کہاں ہیں..... اچھا اچھا..... ٹھیک ہے۔''

اجمل خان نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''چاچا خادم حسین تھا۔ کہتا ہے ام شانی بی بی کو دیکھ کر آتا ہے، اس نے ہولڈ کرایا ہے۔''

دو تین منٹ بعد اجمل نے دوبارہ خادم حسین سے بات کی۔ یہ مختصر بات تھی۔ اجمل اثبات میں سر ہلاتا رہا۔ آخر میں اس نے دو تین بار ''ٹھیک ہے'' کہا اور فون بند کر دیا۔ رستم اور ناصر تجسس سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ میکانکی انداز میں منہ کے اندر نسوار رکھتے ہوئے بولا۔ ''چاچا بتا رہا ہے کہ رات کو حویلی میں کچھ زمینداروں کا دعوت تھا۔ لاہور سے بھی دو چار خاص مہمان آیا ہوا تھا۔ بی بی کو دیر تک جاگنا پڑا ہے۔ اب وہ سو رہا ہے۔ شام چار بجے سے پہلے نہیں اٹھے گا۔ ام پانچ بجے کے قریب پون کر لے۔''

پانچ بجے تک کا وقت رستم نے کافی بے چینی میں گزارا۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب اجمل نے دوبارہ رنگ والی کی حویلی میں رابطہ کیا۔ اس مرتبہ بھی جلد ہی رابطہ ہو گیا۔ پہلے بابا خادم حسین نے بات کی پھر شانی لائن پر آ گئی۔ رستم کی نگاہیں اجمل کے تاثرات پر تھیں۔ اجمل نے خوش دلی سے رسمی کلمات کہے لیکن اس کے فوراً بعد اجمل کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ واضح طور پر پریشان نظر آیا۔ اس نے ایک دو بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر جیسے کراہ کر بولا۔ ''لیکن شانی بہن! آپ ایک منٹ رستم بھائی سے بات تو کر لیں..... میرا مطلب ہے..... خو آپ نے.....'' اجمل نے بات ادھوری چھوڑ کر رستم کو ریسیور تھامنے کا اشارہ کیا۔ رستم نے گہری سانس لی اور آگے بڑھ کر ریسیور کان سے لگا لیا۔

دوسری طرف سے شانی اپنی روانی میں کچھ اور کہتی۔ رستم نے کہا۔ ''میں رستم بول رہا ہوں شانی! پلیز فون بند نہ کرنا۔ میری بات سن لیں.....'' دوسری طرف کچھ دیر کے لیے سناٹا

www.pdfbooksfree.pk

چھا گیا۔ رستم نے پھر کہا۔ ''پلیز شانی! فون بند نہ کریں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اب کون سی بات باقی رہ گئی ہے جو کرنی ہے۔'' شانی کا لہجہ جیسے دکھ میں لتھڑا ہوا تھا۔

''میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا شانی! مگر اتنا ضرور کہوں گا.....''

''تم کچھ بھی مت کہو۔'' شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''جب میں نے سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لیا ہے تو پھر..... تم کیا بتاؤ گے مجھ کو۔''

وہ رستم کو ''آپ'' کے بجائے ''تم'' کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ رستم کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے لہجے میں لجاجت سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''شانی! میں مانتا ہوں جو کچھ ہوا بہت برا ہوا لیکن آپ ایک منٹ کے لیے میری بات تو سن لیں۔''

''مجھے کچھ نہیں سننا..... مجھے اپنے بزرگوں کی عزت سے کچھ بھی زیادہ عزیز نہیں ہے۔ میں سب کچھ سہہ سکتی ہوں مگر اپنے بڑوں اور اپنے خاندان کی بے عزتی نہیں اور تم نے تو حد کو چھوا ہے۔ کاش میں وہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے اندھی ہو گئی ہوتی.....''

''جو کچھ آنکھیں دیکھتی ہیں وہ سارا تو سچ نہیں ہوتا بی بی..... اگر آپ.....'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ بی بی نے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

درد کے نہایت شدید احساس کے ساتھ رستم نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

''کیا ہوا رستم بھائی؟'' ناصر نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' رستم نے سرد آہ بھری۔ ''وہ بہت خفا ہیں..... ہماری توقع سے بہت زیادہ۔'' رستم لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر تک وہ بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ باہر آیا اور فون کی طرف بڑھا۔ اجمل اور ناصر فون سیٹ کے قریب ہی سوگوار بیٹھے تھے۔

رستم نے اجمل سے کہا۔ ''ذرا دوبارہ نمبر ملانا۔''

اجمل نے مشینی انداز میں عمل کیا مگر اس مرتبہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ اس نے دوبارہ اور سہ بارہ ٹرائی کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ رستم اپنی بی بی سے درخواست کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایک بار اس کی بات تو سن لیں۔ بیل جا رہی تھی مگر کوئی ریسیور اٹھا نہیں رہا تھا۔ آخر وقفے وقفے سے چھٹی ساتویں بار ڈائل کرنے کے بعد رابطہ ہوا۔ دوسری طرف سے اُبھرنے والی آواز سننے کے بعد اجمل نے ریسیور جلدی سے رستم کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو کون؟'' دوسری طرف بی بی تھیں اور جھنجھلائے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''میں رستم ہوں شانی! کیا آپ ذرا دیر کے لیے میری بات نہیں سن سکتیں؟''

''میں نہیں سن سکتی۔ مجھے تمہارے خیال سے وحشت ہو رہی ہے۔''

''میں معافی مانگتا ہوں شانی..... مجھے پتا ہے.....''

''معافی تو تم مجھے دے دو۔'' شانی نے طیش کے عالم میں تیزی سے اس کی بات کاٹی..... ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے گر سکتے ہو۔''

''پلیز شانی! فون بند نہ کرنا۔'' رستم نے تیزی سے کہا۔

''میں تمہاری آواز سننا نہیں چاہتی۔ میرا لہو کھولنے لگتا ہے۔ تم نے..... جس طرح میرے بڑوں کی توہین کی ہے میں کبھی نہیں بھول سکتی اور میں یہ بھی جان گئی ہوں کہ تم کبھی بدل نہیں سکتے۔ کوئی کتنی بھی کوشش کرے، تمہارے اندر کا گھٹیا پن سامنے آ کر ہی رہے گا۔ تم گھٹیا ہو اور گھٹیا رہو گے.....'' وہ نیند کے عالم میں بولی گئی اور وہ سنتا گیا۔

کوئی اور یہ بات کہہ کر شاید زندہ نہ رہ سکتا لیکن وہ بی بی تھیں اور وہ رستم تھا۔ وہ اس سے دس گنا سخت الفاظ بھی استعمال کرتیں تو اسے سننا پڑتے۔ وہ شوہر نہیں تھا اور نہ وہ بیوی تھیں۔ وہ دیوی تھیں اور وہ عشق میں ڈوبا ہوا پرستار تھا۔ کسی گناہ گار پرستار ہی کی طرح وہ گردن ڈالے، سر جھکائے زرد رو بیٹھا تھا۔ ان لمحوں میں کون کہہ سکتا تھا کہ وہ رستم سیال ہے جو نگاہوں نگاہوں میں زندہ بندے کی جان کھینچ سکتا ہے۔

پھر ایک منحوس کھٹکے کے ساتھ فون سیٹ خاموش ہو گیا۔ وہ بیٹھا رہا۔ پتھر کی طرح ساکت! اس کے سینے میں اس کا بدنصیب دل لہولہو ہو کر اور کٹ کٹ کر گر رہا تھا۔ اپنی بی بی کے الفاظ اس کے کانوں میں مسلسل گونج رہے تھے۔ ''تم گھٹیا ہو..... اور گھٹیا ہی رہو گے..... تم گھٹیا ہو اور گھٹیا ہی رہو گے۔''

پھر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ رات بڑی تاریک اور بے رحم تھی۔ اس رات میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ رستم کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔

وہ تقریباً چوبیس گھنٹے تک کمرے سے نکلا ہی نہیں۔ اگلے روز اجمل خان نے دو تین مرتبہ دروازے پر دستک دی مگر رستم نے ہر بار کہا کہ..... آرام کر رہا ہوں۔ جب اس نے تیسری بار دستک دی تو رستم کو خدشہ ہوا کہ کہیں اجمل یا ناصر اپنے طور پر بی بی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور اجمل اور ناصر کو اندر آنے دیا۔ رستم کی حالت نے ان دونوں کو بھی پریشان کر رکھا تھا۔ رستم نے اجمل سے پوچھا۔ ''تم نے دوبارہ رنگ والی میں فون تو نہیں کیا؟''

www.pdfbooksfree.pk

اجمل ذرا گڑبڑایا پھر بولا۔ ''بس جی..... ایک مرتبہ کیا تھا پر رابطہ نہیں ہو سکا۔''

''تم سے کس نے کہا تھا فون کرنے کو؟'' رستم جیسے پھٹ پڑا۔ ''کیا تم مجھ سے زیادہ میرے خیر خواہ ہو۔ مجھے نہیں ضرورت تمہاری خیر خوائی کی۔ بس معاف کرو مجھے۔'' رستم نے طیش کے عالم میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

رستم نے کبھی ایسے انداز میں بات نہیں کی تھی۔ اجمل ہکا بکا رہ گیا۔ ''وہ..... وہ جی ام نے تو سوچا تھا کہ.....''

''کچھ بھی مت سوچو تم۔ مجھے میرے حال پر رہنے دو۔'' رستم نے بدستور اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے میرے معاملے میں دخل دینے کی۔''

وہ اٹھا اور واش روم میں چلا گیا۔ واش روم کا دروازہ زوردار آواز سے بند ہوا تھا۔ دو چار منٹ بعد جب وہ باہر آیا تو اجمل اور ناصر دونوں کمرے سے جا چکے تھے۔ خانساماں نے میز پر رات کا کھانا رکھ دیا تھا۔ اس میں رستم کے پسندیدہ سفید چاول اور چنے کا شوربا تھا۔ اس کے علاوہ سلاد اور کسٹرڈ وغیرہ تھا۔ رستم نے بس دو چار لقمے ہی لیے اور دروازہ اندر سے بند کر کے دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

وہ اگلے روز شام تک کمرے میں ہی رہا۔ تاہم اگلے روز شام کو جب وہ کمرے سے نکلا تو اپنی بے پناہ جذباتی کیفیت پر کسی حد تک قابو پا چکا تھا۔ اسے سب سے زیادہ افسوس اس بات پر ہو رہا تھا کہ اس نے کل اجمل سے بڑے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ اسے ناصر کی زبانی معلوم ہوا کہ کل سے اجمل نے بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ رستم اجمل کے پاس پہنچا اور اسے بازو سے پکڑ کر کھانے کی میز پر لایا..... راستے میں اجمل کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور وہ رستم سے لپٹ گیا۔ رستم نے بھی اسے بازوؤں میں لے لیا۔ اجمل ہچکیوں سے رو دیا۔ رستم کی آنکھوں میں خاموش آنسو تھے۔

''مجھے معاف کر دو اجمل۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

اجمل نے رستم کے گلے سے لگے لگے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایسا بات مت کہیں رستم بھائی.....''

رستم اسے لیے ہوئے کھانے کی میز پر آ گیا۔ خانساماں ظفر نے کھانا چن رکھا تھا۔ ڈولا اور زری بھی ایک طرف خاموش کھڑے تھے۔ رستم کے بیٹھتے ہی وہ سب بھی بیٹھ گئے۔ کھانا خاموشی میں کھایا گیا۔ کھانے کے بعد رستم دیر تک اکیلا ہی باغیچے میں چہل قدمی کرتا رہا۔ برآمدے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی نگاہ بار بار ایک ادھ کھلے دروازے سے اس

www.pdfbooksfree.pk

کمرے میں جا رہی تھی جہاں اس نے شانی بی بی کے ساتھ دو دن گزارے تھے۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی پڑا تھا۔ سنگھار میز، بیڈ، سائیڈ ٹیبلز، بی بی کے ہاتھ کے رکھے ہوئے گلدان، ان کے ہاتھ کی سجائی ہوئی پینٹنگ۔ یہ سب کچھ رستم کو بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے خانساماں ظفر احمد کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ اس کمرے کا سارا سامان ان جگہوں پر واپس رکھوا دے جہاں سے لایا گیا تھا اور کمرے کو تالا لگا دے۔

کمرے میں سائیڈ ٹیبل پر وہ کیمرہ بھی پڑا تھا جس سے انہوں نے بی بی کی موجودگی میں تصویریں اُتاری تھیں۔ رستم کھوئے کھوئے سے انداز میں کیمرے کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کیمرے میں سے فلم رول نکال لیا اور اسے کھول کر ضائع کر دیا۔

وہ رات گئے تک ناصر اور اجمل سے باتیں کرتا رہا اور اپنا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہا..... کیونکہ سب کچھ ہونے کے باوجود زندگی ابھی باقی تھی۔ تھوڑی تھی یا زیادہ لیکن ابھی موجود تھی، اسے گزارنا تھا۔

رات گئے اجمل سونے کے لیے چلا گیا مگر رستم اور ناصر بیٹھے رہے۔ سگریٹ پھونکتے رہے..... کھڑکیوں سے باہر ہوا چلتی رہی، سفیدے کے درخت ہولے ہولے جھومتے رہے۔

''میں جانتا ہوں آپ کے دل پر بہت بوجھ ہے رستم بھائی۔'' ناصر نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ناصر..... پتا نہیں کیا بات ہے۔ اب میں خود کو پہلے سے ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہیں یاد ہی ہے کہ اس زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ اس زندگی کے چلے جانے سے بی بی کو جتنا کم دکھ ہوگا، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''لیکن کوئی بات بھی تو یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ ایک دن آپ نے خود ہی کہا تھا کہ ہماری زندگی اور موت کے چانس ففٹی ففٹی ہیں۔''

''لیکن..... اب دل چاہتا ہے کہ کم از کم میرے چانس تو ففٹی ففٹی نہ رہیں اور ففٹی ففٹی والا بھی تو بس ایک اندازہ ہی ہے ناصر۔ ورنہ جس دلدل میں ہم پھنسے ہوئے ہیں وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہے۔ میں ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھیوں کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا اور ان سے بدلہ لینا اور بچ نکلنا بھی بس ایک خیال ہی لگتا ہے۔''

''آپ اس کام کے لیے ''میں'' کا لفظ استعمال نہ کریں۔ میں پہلے بھی کئی بار آپ سے کہہ چکا ہوں۔ یہ آپ کا نہیں ہم تینوں کا مسئلہ ہے۔ اس حوالے سے ہمارا جینا مرنا ساتھ ہو گا۔'' ناصر کے لہجے میں ہلکی سی خفگی آ گئی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر رستم نے اچانک کہا۔ ''ناصر! تم شادی کر لو۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''بس میرا دل چاہتا ہے۔ اس ویرانے میں تھوڑی سی تو رونق آئے۔''

''لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا چانس بہت کم ہے۔ پھر ایسی شادی کہاں تک ٹھیک ہے؟''

''میں اپنی زندگی کے چانس کی بات کر رہا تھا۔ تمہاری زندگی کا چانس، اللہ نے چاہا تو بہت ہے۔''

''اور میرا خیال اس کے الٹ ہے۔''

باتیں کرتے کرتے دونوں اچانک چونک سے گئے۔ انہیں یوں لگا کہ ایک سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے گزرا ہے۔ اس وقت کون ہو سکتا تھا؟ دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر پہلے رستم ہی اٹھا تھا۔ اٹھتے اٹھتے اس نے اپنا پستول تکیے کے نیچے سے نکال لیا تھا۔ احتیاط سے دروازہ کھول کر اس نے باہر دیکھا۔ وسیع لان میں سفیدے کے طویل سائے بھوتوں کی طرح رقصاں تھے۔ چہار سو خاموشی تھی۔ کہیں کوئی تنفس دکھائی نہیں دیا۔ ناصر اور رستم نے گھوم پھر کر دیکھا۔ خانساماں اور ملازمہ حمیدن اپنی جگہوں پر موجود تھے۔ زری، ڈولا اور اجمل بھی اپنے اپنے کمروں میں سوئے پڑے تھے۔ تاہم ان دونوں کی نگاہ ایک ساتھ دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ ایک سایہ کھڑکی کے سامنے سے گزرا تھا۔ یہ بڑی خطرناک صورت حال تھی۔

☆======☆======☆

اور یہ منظر رنگ والی کی حویلی کا تھا۔ مدھم اور اداس سا چاند گدلے آسمان پر کسی پریشان کن سوال کی طرح ٹھہرا ہوا تھا۔ شانی کھڑکی میں سے اسے دیکھ رہی تھی اور بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ مُنا اس کے پہلو میں سو رہا تھا۔ رستم سے شانی کی آخری ملاقات وزیری گاؤں والے اندوہناک واقعے پر ہی ہوئی تھی۔ پچھلے پانچ چھ دن میں وہ منظر سینکڑوں بار شانی کے ذہن پر یلغار کر چکا تھا اور ہر بار شانی کا دل کچھ مزید زخمی ہوا تھا۔

شانی کے دل میں امید کی کرن تھی۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ رستم کسی نہ کسی طور

اس سے رابطہ ضرور کرے گا۔ وہ اس سے معافی مانگے گا..... خالو اعجاز سے بھی غیر مشروط معافی مانگے گا۔ وہ عذر پیش کرے گا کہ وہ اس وقت اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھا۔ کیا پتا کہ کسی وجہ سے وہ اس وقت نشے میں ہو۔ شانی کے دل و دماغ میں رستم کو رعایت دینے والے اَن گنت خیالات آتے رہے تھے..... مگر اب دھیرے دھیرے سب کچھ مایوسی کے اندھیرے میں غرق ہو رہا تھا۔ حویلی کا فون ٹھیک ہوئے دو دن گزر چکے تھے۔ مگر رستم کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ہی ناصر یا اجمل نے کسی طرح شانی کی سماعت تک کوئی بات پہنچانے کی کوشش کی تھی۔

شانی نہیں جانتی تھی کہ اس کی طرف سے رستم سے بات ہو بھی چکی ہے..... اور اس انداز سے ہو چکی ہے کہ بہت کچھ ملیامیٹ ہو گیا ہے۔ وہ خالو اعجاز کی منصوبہ بندی سے بے خبر تھی۔ نہ ہی اسے اس ''اداکار'' کی حویلی میں آمد کا علم تھا جو تین دن پہلے بڑی رازداری کے ساتھ لاہور سے بلائی گئی تھی اور حویلی کے ٹیلی فون سے اس کی بات اجمل اور رستم سے کرائی گئی تھی۔ شانی کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس اس کا دل رو رہا تھا اور رستم کے لیے اس کے دل میں موجود زم گوشہ دھیرے دھیرے اپنی نرمی کھو رہا تھا۔

حویلی کا ٹیلی فون اب ٹھیک تھا مگر شانی کو یہ معلوم نہیں تھا یہ کہ ٹیلی فون اس وقت ٹھیک کیا گیا ہے جب اس پر کسی ناپسندیدہ کال کا خدشہ ہی باقی نہیں رہا۔ مزید احتیاط کے طور پر چوہدری اعجاز فون سیٹ کو اٹھا کر اپنے کمرے کے عین سامنے لے گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہر گزرنے والے دن کے ساتھ شانی کو لگ رہا تھا کہ اس کا دل ایک لاش بنتا جا رہا ہے اور یہ لاش اس کے سینے کی قبر میں دفن ہونے والی ہے۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ پھر مُنے کو سینے سے لگا کر سو گئی۔

اگلے روز نو دس بجے کے قریب جب وہ باغیچے میں پودوں کو دیکھ رہی تھی، ایک ملازمہ نے آ کر اطلاع دی کہ مہتم سردار درداج کی بیوی ماکھو آئی ہے۔ اس کے ساتھ دو مہتم لڑکیاں بھی ہیں۔ وہ آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں۔ شانی فوراً نشست گاہ میں پہنچی۔ تنومند ماکھو اور لڑکیوں نے اٹھ کر شانی کو سلام کیا۔ ماکھو کا ہر دم ہشاش بشاش نظر آنے والا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں غم کے گہرے سائے تھے۔ یہ دیور کی موت کا غم تھا اور اس موت کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا غم تھا۔ لڑکیاں سر تا پا چادروں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ تانگے کا طویل سفر کر کے یہاں پہنچے تھے۔ ان کے چہروں اور لباس پر راستے کی گرد تھی۔

''ماکھو! خیریت تو ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

''میری نکڑی بہن! کھیریت نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو آپاں کو (ہم کو) اس طرح تیرے پاس نہ آنا پڑتا۔'' ماکھو نے آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔

''کیا ہوا ہے ماکھو؟'' شانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''یہ بچھ نکڑی کہ کیا نہیں ہو رہا ہمارے ساتھ۔ بندہ بھی ہمارا مرا ہے، مجرم بھی ہم بنے ہوئے ہیں۔ جنڈری عذاب میں آئی ہوئی ہے..... لے دیکھ، میں تجھ کو دکھاتی ہوں۔'' ماکھو نے کہا پھر وہ تیزی سے دروازے کی طرف گئی اور نشست گاہ کا دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ لڑکیوں کی طرف مڑی اور دونوں کی چادریں کھینچ کر اُتار دیں۔ پھر وہ ان سے مخاطب ہو کر غصے سے بولی۔ ''اپنے گُرتے اُتار کر دکھاؤ چھوٹی چوہدرانی کو۔ ان کو تو کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ ان کو بھی پتا چلے کہ آپاں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔''

گندمی رنگ والی دونوں لڑکیاں تھوڑی دیر تک جھجکتی رہیں۔ پھر انہوں نے اپنے رخ دیوار کی طرف کر کے گُرتے اُتار دیئے۔ ان کے بالائی جسم عریاں ہو گئے۔ شانی لرز گئی۔ ان کی کمر، پیٹ اور کندھوں پر بے شمار نیل اور چھڑیوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ کچھ نشان ایسے بھی تھے جن سے خون رستا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یقیناً ان کے زیریں جسم پر بھی ایسے نشان ہوں گے۔

''یہ کس نے کیا؟'' شانی نے دل گرفتہ آواز میں پوچھا۔

''پلس نے جی..... اور کس نے؟ جنانہ پلس (زنانہ پولیس) کی ڈشکریاں تھیں۔ مار مار کر کڑیوں کی کھال ادھیڑ دی۔ تھانے کے ویہڑے میں وچاریوں کی وڈیاں لگوائیں۔ چار چار گھنٹے دھوپ میں کھڑے رکھا۔ دیکھنے والے تماشا دیکھتے رہے۔ ان کا کسور کیا تھا؟ صرف اتنا کہ ان کا چاچا اور بھائی پلس کو نہیں مل رہے تھے اور چاچے اور بھائی کا کسور بھی کیا ہے۔ سر پھر یہ کہ وہ بے کسور ہیں۔ ان کا رشتے دار مرا ہے۔ انہوں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا ہے۔ اگر وہ حرام جادہ طفیل کہیں غیب ہو گیا ہے تو اس کے لیے ہم مہتوں پر آبھت کیوں آئی ہوئی ہے۔ ہمارا جینا کیوں حرام کیا ہوا ہے پلس نے؟''

ماکھو کی سیاہ جنگلی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ دونوں لڑکیاں بھی سر جھکائے کھڑی تھیں اور سسک رہی تھیں۔

''چلو، کپڑے پہن لو تم۔'' شانی نے محبت آمیز لہجے میں کہا۔

وہ کپڑے پہننے لگیں۔ ماکھو نے رقت آمیز و لہجے میں جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ طفیل کے گم ہو جانے کے بعد سے مقامی پولیس نے مہتموں کی تینوں بستیوں کو نشانہ بنایا ہوا

www.pdfbooksfree.pk

ہے..... آئے دن جیپیں گرد اُڑاتی کسی نہ کسی بستی میں پہنچ جاتی ہیں۔ طفیل کے پیٹی بھرا، لوگوں کو ڈراتے دھمکاتے ہیں اور دو چار کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ تھانے میں بے گناہوں کو مارا پیٹا جا رہا ہے۔ ان دونوں بہنوں کا چچا اور بھائی بھی پولیس کو مطلوب ہیں۔ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے سیلاب زدہ علاقے میں لوٹ مار کی ہے اور ان کی جھگی سے چوری کی چیزیں، چاندی کی چوڑیاں اور سونے کی دو انگوٹھیاں ملی ہیں۔ ماکھو نے حلفیہ بیان دیا کہ یہ سراسر جھوٹا الزام ہے۔

شانی نے ماکھو کی پوری بات سننے کے بعد اسے تسلی دی۔ لڑکیوں سے بھی دل جوئی کی باتیں کیں اور انہیں یقین دلایا کہ وہ اب ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دے گی۔ ان کے چچا اور بھائی کو بھی پولیس کی تفتیش سے نکلوائے گی۔ اس نے تینوں عورتوں کو شربت وغیرہ پلوایا اور ان کے ساتھ آنے والے دو مردوں کے لیے بھی لسی پانی کا انتظام کروایا۔

ابھی شانی، ماکھو کے ساتھ باتیں کر ہی رہی تھی کہ خالو اعجاز تیز قدموں سے اندر داخل ہوئے۔ تایا معصوم چونکہ بیمار تھے اس لیے حویلی کے زیادہ تر معاملات آج کل خالو اعجاز کے ہاتھ میں ہی تھے۔ شانی سمیت حویلی کے تمام وفادار چوہدری اعجاز پُر اعتماد کرتے تھے۔ چوہدری اعجاز نے شانی کے پاس عورتوں کو بیٹھے دیکھا تو دروازے پر ہی رک گئے۔ انہوں نے شانی کو اشارے سے باہر بلایا۔ شانی باہر پہنچی تو چوہدری اعجاز نے پریشان لہجے میں کہا۔

''یہ عورتیں مہتم بستی سے ہی آئی ہیں ناں؟''

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔

چوہدری اعجاز بولے۔ ''مہتم بستی سے ابھی ابھی ایک پریشان کن خبر آئی ہے۔ عارف تک پتا نہیں یہ خبر کیسے پہنچی ہے، اس نے حویلی کے ٹیلی فون پر اطلاع دی ہے۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے چار سو مہتموں نے بستی کے قریبی تھانے پر حملہ کیا ہے۔ اپنے تین ساتھیوں کو حوالات سے چھڑا لیا ہے۔ تھانے کو آگ لگانے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایس ایچ او نذیر گوراہی اور دو کانسٹیبلوں کو اغوا کر کے اپنے ساتھ بستی میں لے گئے ہیں۔''

''اوہ، یہ تو بہت برا ہوا۔'' شانی نے ہونٹ سکوڑے۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے دراج کی بیوی یہی بات کہہ رہی تھی کہ مہتموں میں بڑی بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔'' شانی نے ذرا توقف کیا اور خالو اعجاز سے پوچھا۔ ''سردار دراج نے لوگوں کو روکنے کی کوشش نہیں کی؟''

خالو اعجاز نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ تو خود اُن لوگوں کے ساتھ شریک تھا۔ اس نے حملے کے دوران میں اپنی کلاشنکوف سے ہوائی فائرنگ بھی کی ہے۔''

''آپ بتا رہے ہیں کہ پکڑا جانے والا ایس ایچ او گوراہی برادری کا تھا؟''

''ہاں.....! اور یہی بات اس مسئلے کو اور زیادہ سنگین بناتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہی کچھ ہو رہا ہے جو خبیث ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھی چاہتے ہیں۔''

''ڈپٹی ریاض اس وقت قبائلی علاقے میں ہے لیکن پتا چلا ہے کہ اس نے بھتیجے کی گمشدگی کے بعد مقامی پولیس سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا ہے۔ اسی کی ہدایت پر لگاتار بہتوں کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔''

''جی ہاں، یہ عورتیں بھی یہی کہہ رہی تھیں۔ مالکو بتا رہی تھی کہ ڈپٹی کا ایک چھوٹا تھانے دار وائرلیس پر مسلسل یہاں کے تھانے سے رابطہ رکھے ہوئے ہے۔''

''اب یہ سوچنے والی بات یہ ہے کہ ہمیں اس معاملے میں کیا کرنا چاہیے۔ میں بھائی معصوم اور بابر وغیرہ سے مشورہ کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں خود موقع پر جانا پڑے۔ مہتم تمہاری بات بہت مانتے ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت تم ہی انہیں سمجھا بجھا سکتی ہو۔''

''اگر خون خرابے سے بچنے کے لیے میرا جانا ضروری ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔''

''ان عورتوں کو ابھی کچھ نہ بتانا۔ خواہ مخواہ پریشان ہوں گی۔''

''ٹھیک ہے بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ یہ لوگ ابھی یہیں رہیں۔ خاص طور سے ان لڑکیوں کی تو بری حالت ہے۔ اگر یہ کسی وجہ سے دوبارہ پکڑی گئیں تو شاید زندہ نہ بچیں۔''

''چلو، جیسے مناسب سمجھو۔''

قریباً بیس پچیس منٹ بعد ایک نہایت اہم فون آ گیا۔ لاہور سے سرفراز احمد قزلباش کا سیکرٹری تھا۔ شانی فون پر آئی تو سیکرٹری تیمور نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''میں لاہور سے تیمور حمدی بول رہا ہوں۔ سر آپ سے بات کرنا چاہیں گے۔''

''جی کروائیے بات۔'' شانی نے کہا۔

چند سیکنڈ سسک میوزک سنائی دیتا رہا پھر سرفراز صاحب کی بھاری رعب دار آواز سنائی دی۔ وہ شاید کسی تقریب میں تھے۔ پس منظر میں کسی مقرر کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔

سرفراز احمد نے بلا تمہید کہا۔ ''ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ کچھ مہتموں نے شاہ پور کے تھانے پر حملہ کر کے کچھ حوالاتیوں کو چھڑایا اور تھانے کو آگ لگا دی ہے۔''

''جی آگ تو نہیں لگائی گئی بس کوشش کی گئی تھی۔''

''اور وہ لوگ کچھ پولیس والوں کو اغوا کر کے بستی میں بھی لے گئے ہیں۔''

''ہاں جی! یہ اطلاع تو مجھ تک بھی پہنچی ہے۔''

''یہ بڑی سنگین صورت حال ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں کردار ادا کرنا چاہیے۔ مہتموں پر آپ کا کافی اثر و رسوخ ہے۔ آپ صورت حال کو کنٹرول کر سکتی ہیں۔''

''میں پوری کوشش کرتی ہوں سر! لیکن مقامی پولیس کے لوگ بھی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ میرے پاس مسلسل ان کی شکایتیں پہنچ رہی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ ڈپٹی ریاض کا مقامی پولیس سے رابطہ ہے..... اور وہاں سے لگاتار ہدایتیں آ رہی ہیں۔''

''دراصل سب انسپکٹر کے لاپتا ہونے کے بعد پولیس زیادہ مستعد ہوئی ہے۔''

''مگر سر! مہتم یہ بات حلفیہ کہہ رہے ہیں کہ سب انسپکٹر کی گمشدگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اس سلسلے میں بڑی سے بڑی ضمانت دینے کو تیار ہیں۔''

''ٹھیک ہے، میں اس بارے میں بڑے افسروں سے ذاتی طور پر بات کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس کا مثبت اثر پڑے گا مگر فوری طور پر ضرورت اس بات کی ہے کہ مہتموں کو سنبھالا جائے اور پولیس اہلکاروں کو رہائی دلائی جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سردار دراج کی طرف سے بڑی بے وقوفی کا کام ہوا ہے۔''

''جی، یہ بات تو میں بھی مانتی ہوں۔ میں خالو جان کے ساتھ ابھی دس پندرہ منٹ میں [illegible] کی طرف روانہ ہو رہی ہوں۔''

''ہاں، اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔'' سرفراز احمد نے کہا۔ پس منظر میں سرفراز صاحب کے حق میں فلک شگاف نعرہ بازی ہو رہی تھی۔ ایک دو رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔

شانی نے جیپ میں قریباً ڈیڑھ گھنٹا سفر کیا اور چالیس کلو میٹر کا کچا پکا راستہ طے کر کے ایک نالے کے کنارے آباد مہتموں کی نئی بستی میں پہنچ گئی۔ خالو اعجاز اور بابر بھی اس کے ساتھ تھے۔ راستے میں عارف کمبوہ بھی شامل ہو گیا تھا۔ خالو اعجاز نے جیپ کے اندر ایک میگا فون رکھ لیا تھا۔ اس کے علاوہ دو مارر ائفلیں اور ان کا ایمونیشن وغیرہ بھی جیپ میں موجود تھا۔ مہتم بستی نالے کے ساتھ ساتھ قریباً ڈیڑھ کلو میٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بستی کچی و نیم پختہ جھونپڑیوں پر مشتمل تھی۔ چلچلاتی دھوپ میں گرد کے بادل سے اُڑ رہے تھے۔ پولیس کی خاصی نفری یہاں پہنچ چکی تھی تاہم ابھی پولیس بستی کے قریب جانے کی ہمت نہیں کر رہی تھی۔ پولیس کا عملہ اور گاڑیاں گھوڑے وغیرہ بستی سے چار پانچ سو میٹر کے فاصلے پر موجود تھے۔ انہوں نے نکاسی کے راستوں پر ناکے لگا رکھے تھے۔ عارف کمبوہ نے بتایا تھا کہ ابھی پولیس کی

www.pdfbooksfree.pk

مزید نفری موقع پر پہنچنے والی ہے۔شانی نے دیکھا بستی پر ہُو کا عالم طاری تھا۔کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔بس کسی وقت جھونپڑیوں کی طویل قطاروں کے درمیان گھومتی ہوئی کسی بکری یا بھینس، گدھے وغیرہ کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ یہ تقریباً ڈیڑھ ہزار نفوس پر مشتمل بستی تھی اور یہ سب لوگ یہیں موجود تھے مگر نظر نہیں آرہے تھے۔

ایک انسپکٹر اپنی گاڑی کے عقب میں موجود تھا اور ٹیلی اسکوپ لگائے بستی کا جائزہ لے رہا تھا۔شانی کی گاڑی کو دیکھ کر وہ تیزی سے گاڑی کے پاس آیا۔''ہاں انسپکٹر! کیا صورتِ حال ہے؟'' چوہدری اعجاز نے پوچھا۔

''یہ لوگ مورچہ بند ہوگئے ہیں جی۔ان کے پاس کافی رائفلیں ہیں۔ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے زبردست ہوائی فائرنگ بھی کی ہے۔'' انسپکٹر نے ٹیلی اسکوپ چوہدری اعجاز کی طرف بڑھادی۔چوہدری اعجاز نے بستی کا جائزہ لینے کے بعد ٹیلی اسکوپ شانی کو تھمائی۔شانی نے بستی کا جائزہ لیا۔غور سے دیکھنے پر تین چار جگہ جھونپڑیوں کے اندر سے رائفلوں کی سیاہ نالیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں۔ایک مہتم دکھائی دیا جو رکھوالی کے دو دو بیہکل کتوں اور ایک ننگ دھڑنگ بچے کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ایک جھونپڑے کے اندر گم ہوگیا۔

''سردار دراج سے کوئی بات ہوئی ہے؟'' شانی نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''نہیں بی بی! سردار سمیت سب لوگ بہت مشتعل ہیں۔ان میں سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں۔اس بات کا ڈر ہے کہ تاخیر ہوئی تو انسپکٹر صاحب کو جان سے نہ مار دیا جائے۔وہ پہلے ہی کافی زخمی ہیں۔''

''میں آگے جا کر سردار دراج سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' شانی نے کہا۔

''میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دوں گا۔آگے جانے میں خطرہ ہوگا۔آپ کی جان کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔''

''مقتول بادل کی جان کی حفاظت بھی تو آپ لوگوں کی ذمے داری تھی۔ان باتوں کو چھوڑیں میں اپنی مرضی سے اور اپنی ذمے داری پر آگے جارہی ہوں۔''

''دیکھیں بی بی! ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی کے دوست نہیں! اگر وہ.....''

''اس کے باوجود میں آگے جا کر ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔'' شانی کا لہجہ فیصلہ کن تھا.....دو تین منٹ تک مشورہ ہوا۔پھر شانی ایک ٹریکٹر ٹرالی پر سوار ہوگئی۔عارف کمبوہ، چوہدری بابر اور حویلی کے تین چار محافظ بھی سوار ہوگئے۔میگا فون عارف کے ہاتھ میں تھا۔

ٹریکٹر ٹرالی آگے بڑھی۔شانی اونچی جگہ پر کھڑی تھی اور نمایاں نظر آرہی تھی۔

اس نے بستی کی طرف بڑھتے ہوئے میگا فون پر کہا۔''میں بی بی.....آپ سے بات کر رہی ہوں۔میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔سردار دراج سے ملنے آئی ہوں۔ہم بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکال لیں گے۔آپ لوگ پریشان نہ ہوں اور جن لوگوں نے بات کرنی ہے، وہ سردار دراج کے ساتھ باہر آجائیں۔''

اس دوران میں ٹرالی بستی کے اندر پہنچ چکی تھی۔خطرہ موجود تھا لیکن کہیں سے کوئی فائرنگ نہیں ہوئی۔شانی کا حوصلہ کچھ اور بڑھا۔اس نے ایک بار پھر میگا فون کے ذریعے سردار دراج کو مخاطب کیا اور اس سے کہا کہ وہ سامنے آئے۔اسے کسی طرح کا کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

دو چار منٹ مکمل سکوت میں گزرے۔کتوں کی آواز کے سوا مکمل سکوت تھا۔پھر شانی نے دیکھا کہ تین تنومند مہتم جھونپڑیوں کی دو طویل قطاروں کے درمیانی راستے پر ٹہلتے ہوئے۔وہ مسلح تھے۔ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ان کے بالائی جسم عریاں تھے اور چلچلاتی دھوپ میں چمک رہے تھے۔یہ لوگ ٹریکٹر ٹرالی کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔انہوں نے شانی کو جھک کر سلام کیا پھر محتاط نظروں سے ٹرالی کا جائزہ لینے کے بعد مزید قریب آگئے۔

''سردار دراج کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ آگے جھونپڑے میں ہے۔اگر آپ نے اس سے بات کرنی ہے تو آپ کو اکیلے آگے جانا ہوگا۔''

''میں بھی ساتھ جاؤں گا۔تم اچھی طرح میری تلاشی لے سکتے ہو۔'' خالو اعجاز نے کہا۔

''نہیں جی۔سردار نے منع کیا ہے۔'' ایک مہتم نے اٹل لہجے میں کہا۔

''کیا عارف بھی نہیں آسکتا؟'' شانی نے پوچھا۔

مہتم چند لمحے کے لیے تذبذب میں نظر آئے۔انہوں نے آپس میں کچھ بات کی پھر ترجمان نے کہا۔''ٹھیک ہے چھوٹی چوہدرانی.....اگر آپ جروری سمجھتی ہیں تو اس کو لے آئیں۔''

بستی کے وسط میں ایک بڑے جھونپڑے کے اندر شانی اور عارف کی ملاقات سردار دراج سے ہوئی۔وہ حسبِ معمول شلوار قمیص میں تھا۔کھلے ہوئے گریبان سے اس کا سانولا فولادی جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور کندھے سے کلاشنکوف جھول رہی تھی۔ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی اس ہنگامے کی نشاندہی کرتی تھی جو آج صبح

www.pdfbooksfree.pk

تھانے میں ہوا تھا۔ سردار دراج سرتاپا شعلہ نظر آ رہا تھا۔ سردار دراج کے اردگرد کم از کم آٹھ مسلح مہتم موجود تھے۔ وہ تین حوالاتی بھی اسی جھونپڑے میں تھے جن کو تھانے سے چھڑایا گیا تھا۔ ان کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔ ان کے جسم اور چہرے پر بڑے بڑے نیل تھے۔ ان میں سے ایک اٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ عارف نے بتایا کہ اس کے گردوں پر اثر پڑا ہے، اس کا پیشاب رکا ہوا ہے۔

سردار دراج نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔ ''نکڑی چوہدرانی! ہم نے بہت برداشت کیا، اب اور برداشت نہیں ہوتا۔ ہم نے بھیسلہ کیا ہے کہ ماریں گے یا مر جائیں گے۔ دہائی کھدا (خدا) کی، بھائی بھی ہمارا مرا ہے اور الٹا بھی ہم کو لٹکایا جا رہا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

ایک دوسرا مہتم بولا۔ ''اور جو کچھ یہ ہماری جنانیوں کے ساتھ کر رہے ہیں، وہ بھی بتانے کے قابل نہیں ہے۔ ڈشکری پلس والیوں سے ان کا حشر نشر کرایا گیا ہے اور مردوں نے ان کا تماشا دیکھا ہے۔ ان کو ایسی ایسی دھمکیاں دی ہیں کہ جن کو کان سن نہیں سکتے۔ اس سے اچھا ہے ہم کھد مر جائیں اور ان کو بھی مار دیں۔''

شانی نے کہا۔ ''دیکھو دراج! سارے پولیس والے تو ایک جیسے نہیں ہیں۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ کچھ پولیس والے ہماری مدد بھی تو کر رہے ہیں۔ اگر دو چار نے کوئی ایسا جرم کیا ہے تو ان کو کیے کی سزا ملے گی۔''

''کب ملے گی سجا؟ کب ملے گی؟'' ایک مہتم پھنکارا۔ ''ابھی تو ہم کو ہی سجا مل رہی ہے، ہماری شرلھت کی۔ اگر اس ڈپٹی ریاج کا بھتیجا لاپتا ہوا ہے تو اس میں ہمارا کیا کسور ہے۔ اس جیسے حرامی کے درجنوں دشمن ہوتے ہیں اور کیا پتا وہ کھد ہی کہیں گائب ہو گیا ہو۔ اس گئے کی کھاتر ہمارے اوپر گورا ہی برداری کا تھانے دار جیسے کھدا بن کر آ گیا ہے۔ دن رات ہم کو عجاب میں ڈالا ہوا ہے۔ اب ہم اس کو نہیں چھوڑیں گے۔ بادل بھائی کے بدلے اس کی لاش گوراہیوں کو بھیجیں گے۔''

''ہاں نہیں چھوڑیں گے۔ ماردیں گے..... کھتم کر دیں گے۔'' ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔

عارف نے ہاتھوں کے اشارے سے ان کو خاموش کرایا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زیادہ جوش اچھا نہیں ہے۔ اس سے بہت نقصان ہوگا۔ تھانے پر حملہ کرنا اور حوالاتیوں کو چھڑانا ہی کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اب تم لوگ پولیس والوں کو بھی پکڑ کر لے آئے ہو۔ یہ تو کھلے ٹکراؤ والی بات ہے۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پولیس اور انتظامیہ سے ٹکر لے کر کامیاب ہو سکتے

ہو؟''

اسی دوران میں ایک تنگ دھڑنگ مہتم، جس کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی، تیز قدموں سے اندر آیا۔ اس نے ہانپتی ہوئی آواز میں دراج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کھیا جی! پلس کی چھ سات گڈیاں اور آ گئی ہیں۔ پلس والوں نے آپاں کی بستی کو تین طرپ سے گھیر لیا ہے۔''

شانی نے اس مہتم سے تھوڑی سے مزید تفصیل پوچھی اور پھر سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ جھونپڑے میں رش کم کرنے کے لیے اس نے پانچ چھ افراد کو بھی باہر جانے کا کہا پھر وہ سردار دراج سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''دراج! اس معاملے کو جتنا طول دیں گے اتنا ہی خطرناک ہوگا۔ ہم اس مسئلے کو بات چیت کے ذریعے حل کر لیں گے تو بہتر ہے۔''

ایک مہتم نے تڑاخ سے کہا۔ ''آپاں کو کسی سے کوئی امید نہیں ہے۔ حویلی والوں نے بھی ہمارے لیے کیا کیا ہے۔ ابھی تک ہمارے بندے کے قتل کا پرچہ بھی نہیں ہو سکا۔''

''تم کھاموش ہو جاؤ۔'' سردار دراج نے اپنے ساتھی کو جھاڑا۔ ''نکی چوہدرانی کے کھلاف کوئی بات نہ کرے۔''

وہ شخص کان لپیٹ کر باہر چلا گیا۔ شانی نے کہا۔ ''دراج! تم ہمارے ساتھی ہو۔ ہمارے اپنے ہو۔ ہم تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔ جو کچھ ہوا ہے بالکل غلط ہوا ہے۔ اب اس معاملے کو سنبھالنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے تھانیدار نذیر اور اس کے دو کانسٹیبل ساتھیوں کو چھوڑنا ہوگا۔''

''نہ صرف چھوڑنا ہوگا بلکہ حوالاتی بھی ان کے حوالے کرنے ہوں گے۔'' عارف نے کہا۔

''تاکہ وہ مار مار کر ان کی بچی کھچی جان بھی ان کے پنڈے سے کھینچ لیں؟'' دراج نے کرب ناک آواز میں کہا۔

''نہیں۔ ہم پولیس سے ضمانت لیں گے کہ ان پر کسی طرح کی سختی نہیں ہوگی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ان کو تھانے کے بجائے علاج کے لیے اسپتال بھیج دیا جائے۔''

''ایسی جمانتیں ہم کو پہلے بھی ملتی رہی ہیں.....'' ایک ادھیڑ عمر مہتم نے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ دراج نے اسے گھور کر دیکھا اور وہ خاموش ہو گیا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں شانی، عارف، سردار دراج اور اس کے دو ساتھیوں میں تفصیلی بات چیت ہوئی۔ شانی نے بڑی ہمدردی اور سلیقے سے سردار دراج کو قائل کرنے کی کوشش کی اور وہ اپنی کوشش میں کافی حد تک کامیاب ہو گئی۔ سردار دراج اور اس کے ساتھی انسپکٹر اور

www.pdfbooksfree.pk

کانسٹیبلوں کو چھوڑنے پر تیار ہو گئے مگر وہ حوالاتیوں کو واپس کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں تھے۔ ان تین حوالاتیوں میں ایک سردار دراج کی بیوی کا بھائی ساجن بھی تھا۔ مار پیٹ سے اس کی حالت بھی بری ہو رہی تھی۔

شانی اور عارف نے باہر آ کر اس بارے میں پولیس کے افسروں سے بات کی۔ یہ دو مختلف تھانوں کے دو انسپکٹر تھے۔ چونکہ تینوں افراد پر باقاعدہ پرچہ نہیں ہوا تھا اور نہ وہی وہ کسی پرچے میں نامزد تھے لہٰذا ان کے لیے گنجائش نکالی جا سکتی تھی۔ پولیس والے اپنے مؤقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ وہ بضد تھے کہ حوالاتیوں کو واپس تھانے میں لے کر جائیں گے۔ ابھی وہ تھانے پر حملہ کرنے والوں کی گرفتاری کی بات نہیں کر رہے تھے مگر شانی اور عارف کو اندازہ تھا کہ یہ بات بھی جلد سامنے آ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ مقامی پولیس سردار دراج کو بھی اپنے ساتھ لے جانے کی بات کرے۔

یہ بات چیت تقریباً دو گھنٹے جاری رہی۔ شانی نے پولیس اور سردار دراج کے درمیان دو تین چکر لگائے۔ اس دوران میں سرفراز احمد قزلباش صاحب کا ایک نمائندہ بھی موقع پر پہنچ گیا اور اس نے بھی پولیس والوں سے بات کی۔ اس ساری تگ و دو کا نتیجہ یہ نکلا کہ شانی اور چوہدری اعجاز کی طرف سے پولیس کو گارنٹی دی گئی کہ تینوں حوالاتی کہیں غائب نہیں ہوں گے۔ وہ رنگ والی میں چوہدری اعجاز کی تحویل میں رہیں گے۔ پولیس نے ان سے جو بھی پوچھ گچھ کرنی ہو گی، وہ چوہدری اعجاز یا شانی کی موجودگی میں کر سکتی ہے۔ اگر کسی وجہ سے بعد ازاں ان کی گرفتاری کی ضرورت پیش آئے گی تو یہ کام باقاعدہ قانونی طریقے کے مطابق ہو گا۔ ملزموں کو چوبیس گھنٹے کے اندر عدالت میں پیش کیا جائے گا۔

بہت سے مہتم اس صورت حال پر راضی نہیں تھے مگر یہاں بھی شانی کا اثر و رسوخ کام آیا اور یوں فوری طور پر تصادم کا خطرہ ٹل گیا۔

زخمی انسپکٹر اور دیگر اہلکاروں کو واپس کر دیا گیا۔ تینوں حوالاتی شانی اور چوہدری اعجاز کی سپرداری میں دے دیئے گئے۔ ان کی طرف سے پولیس کو ضمانت دی گئی کہ وہ کہیں نہیں جائیں گے اور پوچھ گچھ کے لیے ہر وقت پولیس کو دستیاب ہوں گے۔

شام تک یہ معاملہ بہ مشکل نمٹ سکا اور شانی، عارف اور چوہدری اعجاز واپس رنگ والی پہنچے۔ تینوں حوالاتی ان کے ساتھ تھے۔ شانی اور عارف تو چاہتے تھے کہ سردار دراج بھی ان کے ساتھ ہی رنگ والی آ جائے مگر سردار نے کہا کہ اس کا اپنے لوگوں میں رہنا ضروری ہے تاکہ وہ بہ وقتِ ضرورت ان کو سنبھال سکے۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ بہرحال شانی اور

عارف کو اندیشہ تھا کہ پولیس کسی بہانے سردار دراج پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ اس کوشش کا نتیجہ سنگین تصادم کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ جو تین حوالاتی رنگ والی لائے گئے، ان میں سے ایک شدید بیمار تھا۔ اسے رنگ والی کے شفا خانے میں ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ چند گھنٹے بعد وہ بھی حویلی میں آ گیا۔ حویلی سے ملحق ایک مہمان خانے میں ان کے رہنے کا انتظام کیا گیا۔

وہ تینوں پولیس سے کافی خوف زدہ تھے۔ شانی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم جرم دار نہیں ہو تو تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو ہو گیا سو گیا لیکن اب ہم پولیس کو تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کرنے دیں گے۔''

''ہمیں بہت مارا ہے جی انہوں نے۔ بہت جلیل کیا ہے۔ تھانے دار نجیر نے ہم سے اپنی برادری کے بندے کا بدلہ لیا ہے۔ وہ ہماری عورتوں کو اٹھانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔'' دراج کے سالے ساجن نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا..... تم بالکل فکر نہ کرو۔'' چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''لیکن ہم نے تم پر جو بھروسا کیا ہے تم بھی اس پر پورے اترنا۔ یہ نہ ہو کہ پولیس کے ڈر سے تم یہاں سے دائیں بائیں ہونے کی کوشش کرو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے چوہدری جی۔'' ساجن نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''آپ کی عجت ہماری عجت ہے۔ آپ نے ہمارے سر پر ہتھ رکھا ہے۔ آپ اگر آپاں کو کھو میں چھلانگ لگانے کا کہیں گے تو آپاں اس کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے۔''

''شاباش! ہمیں تم سے یہی امید ہے۔'' چوہدری اعجاز بولے۔

شانی نے کہا۔ ''فکر مند ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اگر پولیس پوچھ گچھ کے لیے آئی بھی تو میں تمہارے ساتھ یہاں موجود ہوں گی۔''

''بکی چوہدرانی! آپاں کس جبان سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔'' ساجن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اپنا اچھی طرح خیال رکھو۔ مرہم پٹی کراؤ۔ کھانا دھیان سے کھاؤ۔ ڈاکٹر ابھی تھوڑی دیر میں پھر یہاں کا چکر لگائے گا۔''

ساجن کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو ٹپکنے لگے۔ اس کا ساتھی بھی آبدیدہ تھا۔ تیسرا ساتھی دوا کے زیر اثر سو رہا تھا۔

شانی زنان خانے میں واپس آئی تو رستم کی بہن آپو زاہدہ بے چینی سے شانی کا انتظار کر

www.pdfbooksfree.pk

رہی تھیں۔ انہوں نے آگے بڑھ کر بڑی محبت سے شانی کا ماتھا چوما۔ ''میں تو مصلے پر بیٹھی دعائیں کر رہی تھی..... کہ اللہ کرے وہاں کوئی جھگڑا شگوانہ ہو۔''

''نہیں آپا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔''

''سنا ہے کہ تُو حوالاتیوں کو اپنے ساتھ لے آئی ہے؟''

''ہاں جی۔''

''یہ بڑا اچھا کیا تُو نے۔ زور آوروں کا ساتھ تو ہر کوئی دیتا ہے۔ کمزوروں و چاروں کا ساتھ دینا ہی نیکی ہے۔ اللہ سوہنا تجھے اس کا صلہ ضرور دے گا۔''

''ماکھو اور دونوں لڑکیاں کہاں ہیں؟''

''وہ کھانا کھا کر جلدی سو گئی ہیں..... انہیں کچھ پتا نہیں کہ وہاں بستی میں کیا تماشا ہوا ہے۔''

''ان کو بتانا بھی نہیں آپا..... پریشان ہوں گی۔''

''نہیں بتاؤں گی۔ ویسے ماکھو تم کو بڑی دعائیں دے رہی تھی۔ تمہارا نام لے لے کر اس کا منہ سوکھ رہا تھا۔''

شانی نے آہ بھری۔ سب اس کو دعائیں دیتے تھے مگر پتا نہیں یہ دعائیں اسے لگ کیوں نہیں رہی تھیں؟ اس کی زندگی دن بدن اندھیرے میں ڈوبتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ کہاں تھا؟ کیا کر رہا تھا؟ وہ تو بہت حساس تھا پھر اسے اپنے کیے پر ذرا سی بھی ندامت محسوس کیوں نہیں ہوئی تھی؟

تین چار دن اسی طرح گزر گئے۔ پھر ایک دن پولیس رنگ والی آئی اور پولیس کے تفتیشی نے ساجن اور اس کے دونوں ساتھیوں سے پوچھ گچھ کی۔ جونہی شانی کو پولیس کی آمد کی اطلاع ملی، وہ فوراً مہمان خانے میں پہنچ گئی۔ پولیس والے وہاں پہلے سے بیٹھے تھے اور شربت ملا دودھ پی رہے تھے۔ شانی کو دیکھتے ہی ساجن اور اس کے دونوں ساتھیوں کے چہروں پر رونق آ گئی تھی۔ پولیس والوں نے تقریباً ایک گھنٹا پوچھ گچھ کی۔ اس دوران میں شانی وہیں موجود رہی۔ ساجن اور اس کے ساتھیوں سے پولیس والوں کا رویہ اچھا نہیں تھا، ان کی آنکھوں میں کدورت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

پولیس کے جانے کے بعد شانی خالو اعجاز کو ڈھونڈنے لگی۔ اسے آپا زاہدہ کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ تایا معصوم کے ساتھ زمینوں پر گئے ہیں۔ جس وقت شانی اور زاہدہ بات کر رہی تھیں، چوہدری اعجاز اور تایا معصوم اپنی بارانی زمین کا جائزہ لینے اور مزارعوں کو ضروری

www.pdfbooksfree.pk

ہدایات دینے کے بعد اپنی لینڈ کروزر میں واپس بیٹھ رہے تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ حسب سابق چوہدری اعجاز نے سنبھالی اور تایا معصوم ان کے پہلو میں بیٹھ گئے۔ تایا معصوم کے چہرے پر بیماری کی نقاہت صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ درحقیقت قریباً ڈیڑھ برس پہلے ڈینگی ریاض کی سفاکی کا سامنا کرنے کے بعد تایا معصوم ٹھیک ہوئے ہی نہیں تھے۔ وہ اب بھی چوہدری اعجاز کے تعاون سے زمینداری کے امور بہ مشکل انجام دیتے تھے۔ تایا معصوم کی اولاد نہیں تھی۔ ان کی ساری زندگی دنیا سے بے رغبتی اور قناعت پسندی کے ساتھ گزری تھی۔ شانی کے والد، والدہ اور بھائی کی وفات کے بعد زمینداری کی اَن چاہی ذمے داریاں چوہدری معصوم علی پر آ گئی تھیں۔ شروع شروع میں تو انہوں نے یہ ذمے داریاں بخوبی نبھائی تھیں مگر اب بیماری کی وجہ سے بہت سے اختیارات غیر محسوس طور پر چوہدری اعجاز اور شانی کے پاس چلے گئے تھے۔ خاص طور سے چوہدری اعجاز پر بہت زیادہ انحصار کیا جانے لگا تھا۔

تارکول کی تنگ لیکن طویل سڑک پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''بھائی جی! یہ حوالاتیوں والا معاملہ ہمیں کسی نہ کسی طرح حل کرنا پڑے گا۔ دھی رانی شانی ماشاء اللہ سیانی ہے لیکن پھر بھی اس کا وہ تجربہ نہیں ہے۔ اگر ہم نے واقعی الیکشن میں حصہ لینا ہے تو پھر ہمیں علاقے کی سیاست کو سمجھنا پڑے گا۔ ہم گوراہی برادری کی مخالفت کا خطرہ کسی طور مول نہیں لے سکتے۔ ان کا ووٹ مہتموں سے بہت زیادہ ہے۔ اثر و رسوخ میں بھی وہ بہت آگے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ مہتموں کو چھوڑ دیا جائے۔''

''نہیں نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا درمیانی رستہ نکل آئے جس سے گوراہی ناراض نہ ہوں۔''

''اگر تم حوالاتیوں کی بات کر رہے ہو تو یہ بات تو میرے دماغ میں بھی آتی ہے۔ اس کا کوئی مناسب حل ہونا چاہیے..... کوئی ایسا حل جس سے شانی کی بات بھی رہ جائے۔''

''چلیں، میں اس بارے میں شانی سے مشورہ کرتا ہوں۔ اگر کوئی درمیانی حل نکل سکتا ہے تو اچھا ہوگا۔ ہمیں پولیس سے خواہ مخواہ کی ٹسل پیدا نہیں کرنی چاہیے۔''

☆======☆======☆

اگلے روز صبح سات آٹھ بجے کے قریب پھوپھی آمنہ نے شانی کو جھنجوڑ کر جگایا۔ ''شانی اٹھ اٹھ۔ دیکھ یہ ادھر کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔''

شانی گھبرا کر اٹھی اور اپنے بال سمیٹے۔ ''کیا ہوا پھوپھی؟''

''وہ دیکھ کر مردانے کی طرف کتنا شور مچا ہوا ہے۔ وہ تینوں بندے مہمان خانے سے بھاگ گئے ہیں، جنہیں تُو یہاں لے کر آئی تھی۔''

''یہ کیسے ہوا؟'' شانی تیزی سے کھڑکی کی طرف گئی۔ مردانے کی طرف واقعی ہلچل محسوس ہو رہی تھی۔ ایک کھلی جیپ جس میں محافظ سوار تھے، جیپ یوٹرن لے کر تیزی سے سڑک کی طرف جا رہی تھی۔

شانی، خالو اعجاز کے کمرے کی طرف گئی۔ ان کے چہرے پر پریشانی برس رہی تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ بات ختم کر کے انہوں نے شانی کی طرف دیکھا۔ ''یہ بہت برا ہوا ہے شانی..... ہمارے لیے پہلے ہی مسئلے کم نہیں تھے۔''

''آپ خود دیکھ کر آئے ہیں؟ میرا مطلب ہے وہ تینوں واقعی کمرے میں موجود نہیں ہیں؟''

''تو کیا میں صرف سنی سنائی باتیں کر رہا ہوں۔'' خالو اعجاز نے ہلکی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ان کو یہاں سے غائب ہوئے کم از کم تین گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اس وقت ابھی جاننن (اجالا) بھی نہیں ہوا ہوگا..... اور وہ تین نہیں چار ہیں۔''

''کک..... کیا مطلب؟''

خالو اعجاز نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''کل رات نو بجے کے قریب سردار دراج یہاں آیا تھا۔ وہ تینوں مہتموں سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ دو گھنٹے ان کے پاس رہا۔ چاروں نے اکٹھے ہی کھانا وغیرہ کھایا اور چائے پی۔ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ سردار کا پروگرام بنا کہ وہ صبح سویرے نکل جائے گا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سویرے یہ تماشا ہو جائے گا۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا۔ باہر پہرا موجود تھا۔ انہوں نے دو پہرے داروں کو نشے والا سگریٹ پلایا، ان کے ہتھیار لیے اور آدھی رات کے وقت یہاں سے نکل گئے۔''

''آ..... آپ کا مطلب ہے..... سردار دراج بھی ان کے ساتھ ہے؟''

''اس میں شک والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے..... دراج تو بہت..... سوجھ بوجھ والا شخص ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے..... مگر تھانے پر حملے میں بھی تو دراج شریک تھا۔'' چوہدری اعجاز نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''اگر واقعی ایسا ہو چکا ہے تو بہت برا ہوا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، وہ لوگ اب کہاں جائیں گے؟''

''واپس بستی میں تو ہرگز نہیں جا سکتے۔ اب ان کی حیثیت مفروروں کی ہو گئی ہے..... اب سردار کی بیوی اور دونوں لڑکیوں کو بھی کہیں چھپا کر رکھنا ہوگا۔ ورنہ پولیس انہیں زبردستی اپنے ساتھ لے جائے گی۔''

شانی واقعی پریشان نظر آ رہی تھی۔ خالو اعجاز کارندوں کو ہدایات دینے کے لیے نیچے چلے گئے تو شانی سیدھی ماکھو اور دونوں لڑکیوں کے پاس پہنچی۔ ان تینوں کو ابھی تک صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ ہاں..... شانی انہیں یہ بتا چکی تھی کہ چار پانچ روز پہلے بستی میں کیا ہوا ہے۔ تھانے پر حملے اور پھر پولیس کے ساتھ راضی نامے کا سارا واقعہ بھی شانی نے ماکھو کو بتا دیا تھا۔ اب شانی نے تازہ ترین صورتِ حال ماکھو کے گوش گزار کی۔ ماکھو یہ جان کر ششدر رہ گئی کہ اس کا خاوند دراج اور بھائی ساجن و دیگر افراد کے ساتھ فرار ہو گئے ہیں۔ وہ یہ بات کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''نکی چوہدرانی! دراج ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ ایسے مشکل ویلے میں اپنے کبیلے کو چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا۔ وہ تو اپنے لوگوں کے درمیان رہنا چاہے گا۔ میری اکل میں یہ بات بالکل نہیں آتی ہے کہ وہ چپ چپاتے نکل گیا ہے۔''

''جو کچھ بھی ہے ماکھو! وہ اس وقت یہاں پنڈ میں موجود نہیں ہے۔ پولیس نے اب بہت سختی کرنی ہے۔ تمہارا سامنے آنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی بہتر ٹھکانا ہے تو وہاں جا سکتی ہو۔ اگر نہیں تو مجھے بتاؤ، میں تمہارا کوئی انتظام کرتی ہوں۔''

پولیس کے خوف سے لڑکیوں کے رنگ اُڑ گئے۔ مضبوط اعصاب کی مالک ماکھو بھی قدرے پریشان نظر آنے لگی۔ وہ بولی۔ ''نکزی! اب تو کھدا کے باد تیرا ہی آسرا نجر آ رہا ہے۔ جو کرنا ہے تُو نے ہی کرنا ہے۔ تُو جہاں کہے گی آپاں رہ لیں گے۔''

حویلی کا ایک حصہ بہت پرانا تھا۔ اسے پرانے کوٹھے کہا جاتا تھا۔ شانی نے سکینہ کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ ایک ملازمہ کو لے کر پرانے کوٹھے جائے اور ایک کمرے کی اچھی طرح صفائی کرا دے۔

ماکھو اور دونوں لڑکیوں کو تسلی تشفی دینے کے بعد شانی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ حویلی کے کارندے بھاگ دوڑ کر رہے تھے مگر جن لوگوں کو تلاش کیا جا رہا تھا ان کا کہیں پتا نہیں تھا۔ دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دوپہر کو چند پولیس اہلکار حویلی میں آئے۔ وہ تایا معصوم اور خالو اعجاز سے مل کر واپس چلے گئے۔ تایا معصوم بھی اس صورتِ حال پر پریشان تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے ایک ملازمہ سے پوچھا۔ ''مُنا کہاں ہے؟''

اس نے بتایا کہ وہ چھوٹے کمرے میں ہے۔ شانی اس کمرے میں پہنچی تو ملازمہ جمیلہ کو مُنے کے ساتھ الجھتے ہوئے پایا۔ وہ اوندھا لیٹا تھا۔ وہ اسے سیدھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ کہہ رہی تھی۔ ''بس دو تین چمچے کھالو۔ نہیں تو بی بی مجھ کو بڑا ڈانٹیں گی۔''

مُنا بار بار اس کا ہاتھ جھٹک رہا تھا۔ قریب ہی کھانے کی ٹرے میں چاول اور قورمہ وغیرہ رکھا تھا۔ ''کیا ہوا ہے جمیلہ؟'' شانی نے پوچھا۔

''مُنا جی ناراض ہیں۔ انہوں نے ناشتا بھی چنگی طرح نہیں کیا۔ بار بار آپ کو بلانے کا کہہ رہے تھے۔ میں نے ان کو بتایا بھی تھا کہ آپ مصروف ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے..... تم جاؤ۔'' شانی نے کہا۔

ملازمہ جمیلہ سلام کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔ شانی کچھ دیر تک اوندھے پڑے مُنے کو دیکھتی رہی۔ مُنے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں اپنی مرحومہ بھابی کی تصویر پھر جاتی تھی اور اس کا سینہ جیسے ممتا کے سیال جذبے سے بھر جاتا تھا۔ وہ پھیکے انداز میں مسکرائی اور مُنے کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ وہ کچھ دیر تک اس کے کان میں سرگوشیاں کرتی رہی۔ پھر اسے اپنے گلے سے لگایا، بھینچا اور دو تین بار اس کا منہ چوما۔ وہ قدرے نارمل نظر آنے لگا۔ شانی کو محسوس ہوا کہ اپنی زیادہ مصروفیت کی وجہ سے وہ پچھلے تین چار روز سے واقعی مُنے کو نظر انداز کر رہی ہے۔ وہ کل بھی دیر تک اسے حویلی کی راہداریوں میں ڈھونڈتا رہا تھا..... پھر آپا زاہدہ کے پاس پڑ کر سو گیا تھا۔

شانی نے اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلانا شروع کیا۔ وہ لاڈ پیار سے تھوڑی ہی دیر میں ٹھیک ہو گیا اور حسب عادت چہکنے لگا۔ بچے میں یہی تو خوبی ہوتی ہے کہ وہ رنج کو تادیر اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ بولا۔ ''جب میں نالاج ہوتا ہوں تو تم مجھ کو پپی کیوں کرتی ہو؟''

''جو ناراض ہوا سے پیار سے پپی کی جاتی ہے تاکہ وہ مان جائے۔''

''تو پھر انکل رستم کو پپی کیوں نہیں کرتی ہو؟'' وہ معصومیت سے بولا۔ ''وہ تم سے نالاج ہیں نا۔ تم ان کے ساتھ لیت کر ان کو زور سے پپی کرو گی..... تو وہ مان جائیں گے؟''

مُنے کے سوال پر شانی کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ مُنا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''نہیں مُنے، ان کی ناراضگی ایسی نہیں ہے۔''

''تو پھر کیسی ہے؟''

''بہت بڑی ہے۔'' شانی نے کہا اور اس کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ اسی دوران میں شانی کی نگاہ دریچے سے گزر کر زنان خانے کے صحن میں گئی۔ خالو اعجاز ڈیوڑھی کے قریب موجود تھے۔ ان کا قریبی ملازم برکات علی بھی ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی اور رازداری کے ساتھ اس سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر وہ دونوں ڈیوڑھی کی طرف چلے گئے۔

☆======☆======☆

رستم نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح ناصر، زری کے ساتھ شادی پر آمادہ ہو جائے مگر وہ نہیں مانا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ زری سے شادی کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت زری کے پیار کی جوت جلتی رہتی تھی۔ دوسری طرف زری بھی پوری طرح اس پر فدا تھی لیکن ناصر کا مؤقف تھا کہ موجودہ سنگین حالات میں وہ خوشی کا یہ شادیانہ بجانا نہیں چاہتا۔ خاص طور سے وہ رستم کے حالات سے پریشان تھا۔ رستم کی کوشش رہتی تھی کہ اس کے اندر کا دکھ اس کے ساتھیوں پر ظاہر نہ ہو مگر اس کے ساتھی اچھی طرح جانتے تھے کہ رستم کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔

صبح ناشتے کی میز پر جب رستم اور ناصر اکیلے رہ گئے تو رستم نے کہا۔ ''یار ناصر! میرے دل پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔ مجھے اب اچھا نہیں لگتا کہ آپو زاہدہ اور بھائی اکرام شانی بی بی کی حویلی میں پناہ گزین رہیں۔ میں ان کو اپنے پاس بلا لینا چاہتا ہوں۔ میں نے اس بارے میں حاجی سے بات کی ہے۔ اس کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس کوٹھی میں کافی گنجائش موجود ہے۔ وہ آسانی سے کسی کونے میں سما سکتے ہیں۔ بس چار افراد تو ہیں۔ میاں بیوی اور دو بچے۔''

''وہ آئیں گے کیسے؟''

''میں نے اس بارے میں کل اجمل سے بات کی تھی۔ اجمل نے رنگ والی کی حویلی میں فون کیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر بی بی بولیں تو فون بند کر دینا۔ دوسری طرف بابا خادم حسین بولا تھا۔ بعد میں بابا خادم حسین نے اجمل کی بات چوہدری اعجاز سے کرا دی۔ اجمل نے چوہدری اعجاز کو بتایا کہ ہم لوگ بھائی اکرام اور ان کے بیوی بچوں کو اپنے پاس لاہور میں بلانا چاہتے ہیں۔ چوہدری اعجاز نے یہ بات تحمل سے سنی اور کہا کہ وہ اس بارے میں سوچ کر کل تک بتائے گا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے..... وہ کیا کہے گا؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اسے ان کے یہاں آنے کا کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ تو خود بھی یہی چاہے گا کہ حویلی سے میرا تعلق کم سے کم ہو۔ موجودہ صورت حال میں تو لگتا ہے کہ شاید

www.pdfbooksfree.pk

شانی بھی یہی چاہتی ہوں۔"

ناصر اضطراب کے عالم میں پہلو بدل کر رہ گیا۔

قریباً دو گھنٹے بعد رستم کی ہدایت پر اجمل خان نے پھر رنگ والی کی حویلی میں رابطہ کیا۔ اس مرتبہ اتفاقاً چوہدری اعجاز سے ہی بات ہوگئی۔ اجمل خان نے دو تین منٹ چوہدری سے بات کی پھر فون بند کر دیا۔

"ہاں، کیا کہتا ہے؟" رستم نے پوچھا۔

"خود وہ کہتا ہے ام کو کوئی اعتراض نہیں۔ بے شک ان کو آج ہی لے جاؤ۔ بلکہ ابھی لے جاؤ۔ اس نے بڑا رکھائی سے بات کیا ہے۔"

"لانے کا طریقہ کیا ہوگا؟" رستم نے پوچھا۔

"وہ کہتا ہے کہ اگر ام انتظام نہیں کر سکتے تو اس کو بتا دیں۔ وہ خود ان کو حفاظت سے لاہور پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔"

"میں اس کا یہ احسان بھی لینا نہیں چاہتا۔ میں حاجی سے بات کرتا ہوں کہ ان کو یہاں لانے کا کوئی انتظام کر سکے۔"

"ہاں! آپ ابھی بات کر لے۔ ام نے چوہدری سے کہا ہے کہ ام مشورہ کر کے دس بیس منٹ میں اسے دوبارہ پون کرتا ہے۔"

رستم نے فون پر حاجی حیات سے رابطہ کیا اور پانچ چھ منٹ تک اس سے بات کی۔ اس بات چیت میں یہ طے ہو گیا کہ حاجی کے خاص آدمی پہلوان اور جیرا..... پراکیویٹ طور پر رنگ والی پہنچیں گے۔ ان کے پاس نٹڈ شیشوں والی اسٹیشن وین ہوگی۔ وہ اس وین کے ذریعے میاں بیوی اور دونوں بچوں کو رنگ والی سے لاہور منتقل کر دیں گے۔ اجمل نے دوبارہ رنگ والی فون کیا اور چوہدری اعجاز کو اس ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔

اگلے روز صبح دس بجے کے قریب رستم کا جاں گسل انتظار ختم ہو گیا۔ اسٹیشن وین میں آپو زاہدہ، اکرام اور دونوں بچے حفاظت سے کوٹھی پہنچ گئے۔ بھائی بہن کا ملاپ دیدنی تھا۔ آپو زاہدہ نے دیر تک رستم کو گلے سے لگائے رکھا اور روتی رہیں۔ بچے بھی اپنے ماموں سے لپٹ گئے..... بھائی اکرام بار بار رستم کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ درحقیقت ان سب نے رستم کو کھو کر دوبارہ پایا تھا۔ ان سب کے آنے سے اس ویران کوٹھی میں پھر سے تھوڑی سی رونق آ گئی۔ دونوں بچے سرمد اور عاشی اوٹ پٹانگ زری میں دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ بھی بڑی جلدی ان سے بے تکلف ہو گئی اور انہیں اپنی گلابی اردو سے مسکرانے پر مجبور کرنے لگی۔ اجمل

خان نے ضد کر کے دوبارہ کچن سنبھال لیا اور ان سب کے لیے ایک شاندار ڈنر کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ دنبے کا گوشت اور اس کی چکی کی چربی جو کئی روز سے فریزر میں پڑی تھی پھر سے گفتگو کا موضوع بن گئی۔ رستم..... آپو زاہدہ اور بھائی اکرام کے ساتھ کمرے میں تھا اور انہیں اپنی طویل رُوداد کے ضروری حصے سنا رہا تھا۔ یہ رُوداد اس وقت سے شروع ہوتی تھی جب رستم نادیہ اور زوار بھی پہنچ گئے تھے۔ پھر رستم ایک گاڑی پر وڈے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا تھا اور اس بات سے بے خبر رہا تھا کہ فلسٹار نادیہ گاڑی کی ڈکی میں موجود ہے۔

کوٹھی کے ماحول میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ اگلے چوبیس گھنٹے نسبتاً اچھے ماحول میں گزرے۔ آپو زاہدہ نے بھی رستم کو اپنی کہانی سنائی۔ انہوں نے مسلسل رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کے قصیدے پڑھے۔ وہ نوجوان چوہدرانی جس نے ایک رات خود کو مشکلات میں ڈال کر ان کو اور اکرام کو ایک تھانے دار کی گرفت سے نکالا تھا اور پھر مسلسل کئی ماہ تک اپنی حویلی میں پناہ دی تھی۔ آپو زاہدہ کو علم نہیں تھا کہ اس چھوٹی چوہدرانی سے رستم کا کتنا گہرا تعلق ہے اور اس کا ذکر رستم کو اندر سے کتنا دکھی کر رہا ہے۔

اس رات پھر ایک چونکا دینے والی بات ہوئی۔ رستم اپنے کمرے میں سرمد کو اپنے ساتھ لیے لیٹا ہوا تھا۔ ابھی وہ سویا نہیں تھا، سرمد سو چکا تھا۔ رستم اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اچانک اسے کھڑکی کے سامنے ایک سایہ سا لہراتا محسوس ہوا۔ جیسے کوئی چوری چھپے اس کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ ایسا ہو چکا تھا۔ رستم نے واضح طور پر ایک سایہ دیکھا تھا مگر اس کا کھوج نہیں ملا تھا۔ اس دفعہ رستم کو باقاعدہ ہلکی سی آہٹ بھی سنائی دی تھی۔ رستم اپنی جگہ بے حرکت لیٹا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ کوٹھی میں موجود تقریباً سبھی افراد سو چکے تھے لیکن اگر کوئی جاگتا بھی ہوتا تو اسے اس طرح کمرے کے اردگرد چکر لگانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب کی بار رستم نے ایک اور بات محسوس کی تھی۔ سایہ کسی عورت کا تھا۔ شاید کسی لڑکی کا..... اور یہ زری ہرگز نہیں تھی کیونکہ رستم ابھی کچھ دیر پہلے اسے آپو زاہدہ اور حمیدن کے کمرے میں سوتا ہوا چھوڑ کر آیا تھا۔

قریباً دو منٹ بعد سایہ ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے آیا..... چند سیکنڈ موجود رہا اور پھر بائیں باغ کی طرف چلا گیا۔ اس بار رستم نے اپنی جگہ سے اٹھنے اور دروازے کی طرف لپکنے میں خاطر خواہ تیزی دکھائی۔ اس نے چپل پہننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ خوش قسمتی سے دروازہ بھی لاک نہیں تھا۔ رستم کو بستر سے اٹھنے اور راہداری تک پہنچنے میں بہ مشکل دو سیکنڈ لگے ہوں گے۔ اس نے سائے کو برآمدے سے تریج دیکھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے

www.pdfbooksfree.pk

چونکایا۔ اس نے سائے کو ٹھٹکتے ہوئے دیکھا لیکن اس نے بھاگنے یا اوجھل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اپنی جگہ موجود رہا۔ وہ رستم کو راہداری میں دیکھ چکا تھا کیونکہ رستم روشنی میں تھا۔ رستم سائے کے پیچھے لپکنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ موجود ہے تو رستم نے بھی زیادہ تیزی نہیں دکھائی اور قدم اٹھاتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے دھیان سے دیکھا، یہ ایک نوجوان لڑکی ہی تھی۔ اس کے جسم پر گھریلو ملازماؤں جیسا لباس تھا۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں نظر آ رہی تھیں۔

''کون ہو تم؟'' رستم نے تیز لہجے میں سرگوشی کی۔

''آپ سے ایک گل کرنی ہے۔'' وہ دیہاتی لہجے میں بولی۔ وہ خوف زدہ نہیں تھی۔

''کیا بات ہے اور..... تم..... یہاں آئی کیسے ہو؟''

''میں بتاتی ہوں۔ آپ بس دو منٹ کے لیے میرے ساتھ آئیں۔'' اس کی آواز میں عجیب سی معصومیت اور سادگی تھی۔ وہ رستم سے رخ موڑ کر اطمینان سے باغ کی طرف چل دی..... جیسے اسے یقین ہو کہ رستم اس کے پیچھے ضرور آئے گا۔

رستم کو یہ لڑکی عجیب لگی۔ اس کے ساتھ ہی اسے خطرے کا احساس بھی ہوا۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ خانساماں ظفر احمد کی کوئی رشتے دار ہے جو اس کے پاس رہنے کے لیے آئی ہے مگر خانساماں ظفر نے تو ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اس کے علاوہ دونوں ملازموں کو نہایت سختی سے منع بھی کیا گیا تھا کہ اس کوٹھی میں باہر کا کوئی شخص نہیں آئے گا۔ پھر یہ کون تھی؟ وہ باغ کی طرف جا رہی تھی۔ ممکن تھا کہ وہاں اس کا ساتھی یا زیادہ ساتھی چھپے ہوئے ہوں۔ رستم ننگے پاؤں تھا مگر اس کی قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول ہر وقت موجود رہتا تھا۔ وہ لڑکی کے پیچھے چلتا ہوا باغیں باغ میں پہنچ گیا۔ یہاں امرود، آم اور جامن کے بہت سے درخت تھے۔ یہیں پر تھوڑی سی کھلی جگہ میں بیڈمنٹن کا کورٹ بھی بنا ہوا تھا۔ کورٹ سے ذرا آگے ساتھ والی کوٹھی کی دیوار تھی۔ یہاں کوٹھیوں کی درمیانی دیواریں اونچی نہیں تھیں۔ بہ مشکل چار پانچ فٹ اونچائی تھی۔

وہ لڑکی ایک تناور درخت کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ یہ ایک چاندنی رات تھی۔ چاند کی روشنی شاخوں سے چھن چھن کر لڑکی کے سراپا پر پڑ رہی تھی۔ رستم کے بولنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔ ''آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔ میں آپ کو جو بتاؤں گی سچ بتاؤں گی۔ کوئی بات بھی غلط نہیں کہوں گی۔ میں یہاں کوٹھیوں میں کام کرتی ہوں۔'' اس نے پہلو والی کوٹھی کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ''میں اس کوٹھی میں بھی آتی ہوں۔ اور کبھی کبھی یہاں رات بھی گزار

لیتی ہوں۔ ویسے میرا پکا ٹھکانا ایک دو جی کوٹھی میں ہے۔ وہ یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے۔ وہاں ایک اور لڑکی بھی میرے ساتھ رہتی ہے.....''

''تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں آئی کیسے ہو؟''

''میں نے کہا نا کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں یہ سامنے والی دیوار ٹپ (پھلانگ) کر آئی ہوں۔'' اس نے دونوں کوٹھیوں کی درمیانی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا..... کیا چوری شوری کا ارادہ تھا؟''

اس نے جیسے رستم کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ عجیب انداز سے رستم کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''جب آپ نئے نئے اس کوٹھی میں آئے تھے، میں نے آپ کو پہچان لیا تھا۔ اس وقت آپ کے بال لمبے تھے اور داڑھی بھی تھی۔ میں نے آپ کو اسی حلیے میں پہلے بھی دیکھ رکھا ہے۔''

رستم کے ذہن میں انجانے خدشات جاگ گئے۔ ''کہاں دیکھا ہے؟''

''آپ ناراض تو نہیں ہوں گے میری بات سے؟''

''تم بے کار باتیں مت کرو۔ مجھے بتاؤ کہاں دیکھا تھا؟''

وہ چند سیکنڈ تک جھجکتی رہی پھر بولی۔ ''میں نے آپ کو ملتان میں دیکھا تھا۔ پیر قدرت اللہ کے آستانے پر۔ میں اپنے مالکوں کے ساتھ وہاں گئی ہوئی تھی۔ ان کا پُتر سخت بیمار تھا.....''

وہاں کی مارو خاڑ کا سارا نقشہ رستم کے ذہن میں گھوم گیا۔ اس نے کڑی نظروں سے اس ملازمہ لڑکی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''وہاں..... کیا دیکھا تھا تم نے؟''

''وہ سب کچھ جو وہاں ہوا۔ آپ نے وہاں گولیاں چلائیں۔ قدرت اللہ کے کئی بندوں کو گولیاں لگیں۔ قدرت اللہ کی گھر والی گر کر زخمی ہوئی اور بے ہوش ہو گئی۔ پھر بے ہوشی میں ہی وہ مر بھی گئی۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ کون ہیں اور آپ کے ساتھی کون ہیں۔ اس وقت مجھے آپ کی مار ماری بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ جب آپ آستانے سے چلے گئے تو لوگوں کی باتوں سے مجھے پتا چلا کہ آپ کا نام رستم سیال ہے اور آپ بڑے نامی گرامی ہیں۔ بڑے بڑے بدمعاش ہی نہیں، بڑے بڑے پلس افسر بھی آپ کے نام سے کانپتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں بعد مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ آپ نے ملتان کے آستانے پر جو مار ماری کی تھی وہ غلط نہیں تھی.....''

رستم سناٹے میں تھا۔ وہ اپنے طور پر یہاں چھپ چھپا کر محفوظ بیٹھا ہوا تھا لیکن ساتھ والی کوٹھی سے دیوار پھلانگ کر آنے والی یہ لڑکی نہ صرف اسے پہچان چکی تھی بلکہ اس کے

www.pdfbooksfree.pk

بارے میں بہت کچھ جانتی بھی تھی۔ یہ نہایت خطرناک صورت حال تھی۔ اگر یہ لڑکی کسی اور کو بھی اپنی معلومات سے آگاہ کر چکی تھی تو پھر رستم اور اس کے ساتھی کسی بھی وقت کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے.....

رستم نے لڑکی کے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ''جو کچھ تم بتا رہی ہو اس کے بارے میں اور کس کس کو معلوم ہے؟''

''کسی کو نہیں۔'' لڑکی نے بے حد سادگی سے کہا۔ ''اور نہ میں نے کسی کو بتانا ہے۔ اگر میں نے بتانا ہوتا تو آج سے ایک مہینہ پہلے بتا چکی ہوتی اور میں کسی کو بتاؤں گی بھی کیوں..... آپ تو میرے لیے امید بن کر آئے ہیں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' رستم نے کہا۔

لڑکی کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت ابھر آئی۔ درختوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی تیز چاندنی میں اس کا چہرہ انوکھا لگ رہا تھا۔ رستم کو اس کی شفاف آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی محسوس ہوئی۔ وہ بولی تو اس کی معصوم آواز میں گھمبیر کرب تھا۔ اس نے کہا۔ ''مجھ پر بڑا ظلم ہوا ہے جی۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ میرے مالک اور مالکن نے مجھے کس طرح برباد کیا ہے۔ میرے دکھ کو سننے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔''

''کیا تم نے اپنی بپتا سنانے کے لیے دیوار پھاندی ہے اور گھر میں گھسی ہو؟''

''نہیں..... اس وقت تو میں آپ سے صرف یہ کہنے آئی ہوں کہ آپ مجھے تھوڑا سا ٹائم دیں..... بس آدھا پونا گھنٹا۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں اور دکھانا بھی چاہتی ہوں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران ہو جائیں گے کہ لوگوں کی نقلی شکلوں کے پیچھے کیسی کیسی اصلی شکلیں چھپی ہوئی ہیں۔ میں آپ کو سب کچھ ثبوت کے ساتھ دکھاؤں گی اور پھر ہتھ جوڑ کر آپ سے کہوں گی کہ اگر آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں تو کریں۔''

''تمہارا نام کیا ہے..... اور رہتی کہاں ہو؟'' رستم نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میرا نام ثریا ہے جی..... اسی لائن میں آپ کے ساتھ کی چھ کوٹھیاں چھوڑ کر 99 نمبر کوٹھی ہے۔ مالک تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے دو کمرے ہمارے لیے کھولے ہوئے ہیں۔ ایک میں چوکیدار عبدالرحمن ہوتا ہے۔ دوسرے میں، میں اور میرے ساتھ والی لڑکی ہوتی ہے۔ چوکیدار بھی بس نام کا چوکیدار ہے۔ آٹھ نو بجے کے بعد آرگیٹ کا چھوٹا دروازہ کھڑکائیں گے تو میں فٹافٹ کھول دوں گی.....''

لڑکی کی باتیں رستم سن تو رہا تھا مگر اس کا ذہن کسی اور رخ پر سوچ رہا تھا۔ وہ فیصلہ نہیں

www.pdfbooksfree.pk

کر پا رہا تھا کہ اس لڑکی کو چھوڑ دینا چاہیے یا نہیں۔ لڑکی تو بے ضرر لگتی تھی لیکن جو کچھ وہ جانتی تھی، وہ بے حد خطرناک تھا۔ رستم کے لیے اس پر قابو پانا اور اس کوٹھی کے اندر ہی اس کو غائب کر دینا چنداں مشکل نہیں تھا مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ لڑکی کی معلومات کیا صرف لڑکی تک ہی محدود ہیں؟

ابھی وہ اسی ادھیڑبُن میں تھا کہ برآمدے کی طرف آہٹ سنائی دے۔ کسی کے چلنے کی آواز آئی پھر ایک دم برآمدے کی لائٹ روشن ہو گئی۔ رستم کو اجمل خان کا چوڑا چکلا سراپا نظر آیا۔ وہ کھوجی نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً رستم کو احساس ہوا کہ لڑکی اپنی جگہ موجود نہیں ہے۔ رستم نے گھوم کر دیکھا، وہ واقعی غائب تھی۔ وہ درمیانی دیوار پار کر چکی تھی۔ رستم نے بس اس کی ہلکی سی پرچھائیں دیکھی جو ساتھ والی کوٹھی کے درختوں میں اوجھل ہو رہی تھی۔ کسی قریبی کوٹھی کے کتوں نے تھوڑی دیر شور مچایا پھر خاموش ہو گئے۔

اجمل خان برآمدے میں کھڑا بغور پائیں باغ کے درختوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً اس نے وہاں کسی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ ''کون ہے؟'' اس نے پکار کر پوچھا۔

''میں ہوں۔'' رستم نے جواب دیا۔ اجمل تیزی سے چل کر اس کے قریب آ گیا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' رستم نے تحکم سے پوچھا۔

''وہ..... دراصل..... چاندنی بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ ام ابھی جاگ رہا تھا اس لیے سوچا کہ چلو ذرا باہر کا نظارہ مظارہ کر لے۔''

ایک قریبی کمرے کی تاریک کھڑکی میں سے ناصر کی آواز آئی۔ ''رستم بھائی! یہ غلط کہہ رہا ہے۔ چاندنی سے اس کا کیا تعلق واسطہ۔ دراصل اس نے کل کا بچا ہوا افغانی پلاؤ آج پھر ٹھوس ٹھوس کر کھایا ہے۔ اب یہ ایک گھنٹا چہل قدمی کرے گا۔ پندرہ بیس ڈکاریں لے گا پھر کہیں بستر پر جانے کے قابل ہو گا۔''

ناصر اور اجمل میں نوک جھونک شروع ہو گئی۔ اس نوک جھونک میں وہ دونوں یہ سوال ہی بھول گئے کہ رستم اس وقت باغ میں کیا کر رہا تھا۔ رستم کے ننگے پاؤں پر بھی اجمل کی نظر نہیں پڑی تھی۔ رستم اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس محفوظ پناہ گاہ میں بھی اس طرح پہنچا جا سکتا ہے۔ اسے لگا کہ جیسے وہ اپنے ساتھیوں سمیت اچانک بیچ چوراہے پر آن کھڑا ہوا ہے..... اور کسی بھی وقت پولیس کی گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی اسے اپنے حصار میں لے سکتی ہیں۔ یہ لڑکی

اچانک ایک پریشان کن معما بن کر اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ اس کے بارے میں بات کر کے اپنے ساتھیوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے روز رات دس بجے تک کا وقت رستم نے جیسے تیسے گزارا۔ یہ ایک اَبر آلود رات تھی۔ گاہے بہ گاہے بجلی چمکتی تھی، ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی۔ رستم جلد از جلد اس ثریا نامی ملازمہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے پستول اپنی قمیص کے نیچے لگایا۔ اس کے فالتو راؤنڈ پتلون کی جیبوں میں ڈالے اور تیار ہو گیا۔ بیرونی گیٹ کی چابی عموماً اس کے پاس ہی رہتی تھی۔ اسے قریباً آدھ گھنٹا مزید انتظار کرنا پڑا۔ جب سب سو گئے تو وہ ناصر کو بتا کر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ ناصر کو اس نے صورتِ حال کے بارے میں مختصر بتا دیا تھا۔ کوٹھی سے نکل کر 99 نمبر کوٹھی تک پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ کوٹھی کی بیرونی حالت اور اس کے پیڑ پودے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے اصل مالک کئی ماہ سے یہاں موجود نہیں ہیں۔

کوٹھی کے فقط ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی یا پھر اس کے عقبی احاطے میں ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ بوندا باندی کچھ تیز ہو گئی تھی۔ رستم گیٹ کے سامنے پہنچا۔ حسبِ ہدایت اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ ہولے سے کھٹکھٹایا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی پہلی ہی دستک پر نسوانی قدموں کی آہٹ سنائی دی اور دروازہ کھل گیا۔

سامنے قبولِ صورت ملازمہ ثریا کھڑی تھی۔ ''مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔''

رستم کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔ اندر بھی گراسی لان اور پودوں کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کوٹھی کا رنگ و روغن بھی خراب ہو رہا تھا۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر شخص سویا پڑا تھا۔ اس کا حقہ بھی اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ نوجوان ملازمہ رستم کو روشن کمرے میں لے آئی۔ یہاں ایک اور ملازمہ صورت لڑکی بھی موجود تھی۔ اس نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر رستم کو سلام کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' رستم نے کہا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کمرہ شاید بچوں کے بیڈ روم کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا لیکن اب یہاں دونوں ملازماؤں کی ضرورت کا سامان بکھرا پڑا تھا۔ جستی ٹرنک، کپڑے، دو چار پائیاں..... گیس کا چولہا اور معمولی برتن۔ ثریا نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے ایک کرسی صاف کی اور رستم کو بٹھایا۔

رستم نے اپنے بالوں سے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''کل تم اچانک غائب ہو گئیں۔''

''سوری جی۔'' اس نے دیہاتی لہجے میں کہا۔ ''دراصل..... کوئی آ گیا تھا۔ اس لیے

میں جلدی نال وہاں سے نکل آئی۔''

''یہ لڑکی کون ہے؟'' رستم نے دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میرے پنڈ کی ہے جی..... بلکہ برادری کی ہے۔ اس کا نام نوری ہے۔ یہ بھی گھروں میں کام کرتی ہے۔ ہم دونوں کی کوئی بات ایک دو جے سے لکی ہوئی نہیں ہے۔''

رستم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے جو کچھ بھی کہنا ہے، جلدی کہو۔ میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔''

ثریا نے ایک لمبی سانس لی اور سر جھکا کر رستم کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کو بتدریج دکھ کے سایوں نے ڈھانپ لیا۔ رستم پہلے بار اس کے جوان چہرے کو وضاحت سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے نقوش کے گرد جیسے دکھ کا ایک نادیدہ ہالہ سا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی اور بوندا باندی جاری تھی۔ اس نے ٹرنک میں سے ایک تصویر نکالی اور رستم کے سامنے کر دی۔ یہ ایک بیس بائیس سالہ دیہاتی نوجوان کی رنگین تصویر تھی۔ وہ قبول صورت لگا۔ اس نے کوٹ پہن رکھا تھا اور گلے میں مفلر دکھائی دیتا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' رستم نے پوچھا۔

''میرا گھر والا جی۔ ہم ایک ہی پنڈ کے ہیں۔ یہ میرے ماے کا پُتر بھی ہے۔ ہم اکٹھے ہی اس گھر میں ملازم ہوئے تھے جی..... اس کا نام رشید ہے۔ پیار سے چھیدی کہتے تھے۔ یہ مجھ سے..... بڑا..... پیار کرتا تھا جی۔ مجھے ایک پل کے لیے اکھیوں سے دور نہیں ہونے دیتا تھا۔''

''اب کہاں ہے یہ؟''

''قتل ہو گیا ہے۔'' ثریا نے کرب ناک لہجے میں انکشاف کیا۔ ''اور..... ایسے قتل ہوا ہے..... جیسے شاید ہی کوئی قتل ہوا ہو۔ اگر میں ثبوت کے بغیر بات کرتی تو شاید آپ مجھ پر یقین ہی نہ کرتے..... اور آپ ہی نہیں کوئی بھی یقین نہ کر سکتا۔''

''کیوں، ایسی کیا بات ہے؟''

''بس ہے جی ایک بات ایسی۔'' ثریا کی ساتھی لڑکی نوری نے مغموم لہجے میں کہا۔ وہ پہلے بار اس گفتگو میں حصہ لے رہی تھی۔

''قتل کس نے کیا ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

ثریا گلوگیر آواز میں بولی۔ ''میرے مالکوں نے ایک بندے کے ساتھ مل کر کیا ہے۔ آپ اس بندے کا نام سن کر بھی حیران رہ جائیں گے۔ وہ انسان کے روپ میں درندہ ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

رستم کا دھیان فوراً پیر قدرت اللہ کی طرف چلا گیا۔ ثریا نے کل اپنی باتوں میں قدرت اللہ کا ذکر کیا تھا اور لگتا تھا کہ وہ بھی کسی نہ کسی طور اس شخص کی ڈسی ہوئی ہے۔

''ہر قتل کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔'' رستم نے کہا۔

''اس قتل کے پیچھے میرے مالکوں کا جوان بیٹا تھا۔ وہ دن رات شراب پیتا تھا اور ہر بری عادت اس کے اندر تھی۔''

''اس نے چھیدی کو کیوں مارا؟''

''اس نے نہیں مارا جی۔ اس کی وجہ سے اسے مالکوں نے مروا دیا۔''

''تم شروع سے بتاؤ گی تو میری سمجھ میں کچھ آئے گا۔''

ثریا نے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھے اور بولی۔ ''اس کوٹھی کے مالکوں کے دو ہی پتر تھے..... پیسے کی ریل پیل کی وجہ سے دونوں ہی بگڑے نگڑے تھے۔ وڈے کا نام سہیل اور چھوٹے کا وقار ہے، اسے وکی کہتے ہیں۔ وڈا پتر سہیل کچھ زیادہ ہی چوڑ تھا۔ وہ نشہ کرتا تھا اور ہوٹلوں میں راتیں گزارتا تھا۔ پھر وہ بیمار ہو گیا۔ وڈے مالک تاج صاحب نے ہر جگہ اس کا علاج کرایا، پر وہ ٹھیک نہیں ہوا۔ دن بدن اس کی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ پتا چلا کہ اس کے جگر میں کینسر ہے۔ تاج صاحب کی بیوی باجی دلشاد تعویذ گنڈے پر بڑا یقین رکھتی ہے۔ جب سہیل کی حالت خراب ہوتی گئی اور اس کی جان کو خطرہ ہو گیا تو یہ لوگ اسے لے کر ملتان میں پیر قدرت کے آستانے پر گئے۔ وہاں سہیل کا جھاڑ پھونک والا علاج شروع ہوا۔ وڈا مالک موٹی اسامی ہے۔ لاہور میں دو جگہ اس کے ہوٹل ہیں۔ لاکھوں کی آمدن ہے۔ پیر قدرت نے مالکوں کی ایسی مت ماری کہ وہ پتر کے علاج کے لیے دن رات اس پر نوٹ لٹانے لگے..... اور پھر وہ کام ہوا جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اپنے مطلب نے مالکوں کی آنکھوں پر ایسی پٹی باندھی کہ وہ انسان سے جانور بن گئے۔ اپنی اولاد کی جان بچانے کے لیے انہوں نے کسی اور کی اولاد مار دی..... کسی اور کے سر سے سہاگ کی چادر کھینچ لی'' وہ سسکیوں سے رونے لگی۔

''انہوں نے چھیدی کو مارا؟''

ثریا نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ ''انہوں نے اس وچارے کو اس طرح قتل کیا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ بے رحم سے بے رحم بندہ بھی اس طرح کی حرکت نہیں کر سکتا۔''

''کیا کیا انہوں نے؟''

''آئیں، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی سہیلی نوری بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوری کا چہرہ روشنی میں آیا تو رستم اسے دیکھ کر چونک سا گیا۔ اسے نوری کے چہرے پر کوئی جانی پہچانی شے نظر آئی۔ اسے لگا کہ اس نے اس چہرے کو یا چہرے کے کسی ایک نقش کو پہلے بھی بڑی توجہ سے دیکھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس بات پر مزید غور کرتا، ثریا نے بہت آہستہ سے ایک بغلی دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ رستم اور نوری بھی اس کے پیچھے گئے۔ یہ بھی ایک بیڈ روم تھا۔ غالباً یہ کسی نوجوان کا بیڈ روم تھا۔ کمرے میں میوزک کا سامان، بڑے سائز کا ٹی وی اور غیر ملکی ایکٹروں کی پورٹریٹ وغیرہ تھیں۔ ثریا نے کمرے کی ایک لائٹ آن کر دی۔ اس کمرے کے اندر بھی گرد و غبار کی ہلکی تہہ موجود تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کوئی مہینوں سے کھولا نہیں گیا۔ ثریا نے ایک آہنی میز گھسیٹ کر کمرے کے ایک کونے میں کی۔ اس کام میں نوری نے بھی اس کی مدد کی۔ اس کے بعد ثریا نے ایک کرسی میز کے اوپر رکھی اور کرسی پر چڑھ گئی۔ اس کا ہاتھ کمرے کی آرائشی چھت تک پہنچ گیا۔ یہاں ہشت پہلو خانے بنے ہوئے تھے۔ ثریا نے ایک خانے پر دباؤ ڈالا تو وہ اوپر کی طرف چلا گیا۔ ثریا کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سے چابی موجود تھی۔ وہ ہشت پہلو خلا کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ دیر تک مصروف رہی۔ اس نے ایک لاک کھولا تو اس میں چھوٹا سا خانہ نمودار ہوا۔

اس خانے میں سی ڈیز تھیں، وڈیو کیسٹس اور شراب کی خالی اور ادھ خالی بوتلیں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی موٹی کئی اشیاء موجود تھیں۔ ثریا کچھ دیر تک ٹٹولتی رہی پھر اس نے وڈیو کیسٹس میں سے ایک کیسٹ برآمد کی اور خانہ بند کر دیا۔ چھت کا ہشت پہلو ٹکڑا برابر کیا اور احتیاط سے نیچے اتر آئی۔

کچھ ہی دیر بعد وڈیو کیسٹ وی سی آر میں پہنچ چکی تھی۔ نوری نے ٹی وی آن کر دیا اور اس کی آواز کافی حد تک کم کر دی۔

ثریا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اس فلم میں قتل کا سارا ثبوت ہے۔ یہ زیادہ لمبی فلم نہیں ہے۔ دس منٹ میں ختم ہو جائے گی۔ آپ دیکھیں، میں دوسرے کمرے میں جا رہی ہوں۔''

رستم سمجھ گیا کہ وہ خود یہ فلم دیکھنا نہیں چاہتی۔ وہ دروازہ آہستہ سے بند کر کے باہر چلی گئی۔ نوری بھی اس کے ساتھ تھی۔ رستم کو یہ سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا..... عجیب اور پُراسرار۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ اس ویران کوٹھی میں بادلوں کی آواز، گونج پیدا کرتی تھی۔ بظاہر رستم کے اردگرد کوئی موجود نہیں تھا اس کے باوجود وہ اپنے اطراف

www.pdfbooksfree.pk

سے پوری طرح چوکس تھا۔ رستم نے ویڈیو کو چلے کیا۔ ٹی وی اسکرین پر ایک خالی کمرے کی تصویر ابھری۔ یہ کمرہ اسی کوٹھی کا کوئی بیڈ روم تھا۔ کمرہ خالی لگتا تھا مگر کھسر پھسر کی آوازیں آرہی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ کوئی موجود ہے لیکن وہ کیمرے کے فریم میں نہیں تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایک لڑکا لڑکی کیمرے کے سامنے آگئے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کیمرے کی موجودگی سے یکسر بے خبر ہیں۔

رستم ذرا سا چونکا۔ کم روشنی کی وجہ سے لڑکی کی صورت ٹھیک سے نظر نہیں آتی تھی مگر رستم کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ثریا ہی ہے۔ اس کا ساتھی یقیناً اس کا خاوند چھیدی ہی تھا۔ وہ گھریلو ملازموں کے لباس میں تھا۔ اس نے ثریا کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا اور اس کے سر کو چوم رہا تھا۔ ثریا کی مدھم آواز کمرے میں گونجی۔ ''چھیدی! مجھے شرم آرہی ہے۔''

جواب میں چھیدی نے اس کا گال چومتے ہوئے کچھ کہا جو قلم میں ٹھیک سے ریکارڈ نہیں ہوا۔

ثریا نے پریشان نظروں سے کمرے کو دیکھا جیسے وہ خود کو یہاں اجنبی اور بے آرام محسوس کر رہی ہو۔ ''اچھا، وہ پردہ تو کھڑکی کے آگے کرو۔'' ثریا نے خود کو چھیدی کی جذباتی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

چھیدی نے آگے جا کر پردہ اچھی طرح برابر کیا اور پھر سے ثریا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اسے اپنی بانہوں میں لیا۔ ثریا نے ہنستے ہوئے اپنا چہرہ اس کے سینے میں چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں بستر پر آگئے اور لیٹ گئے۔ ثریا بہ دستور اپنے شوہر کی بانہوں میں تھی۔ شوہر چھیدی کے جذبات میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ مرد و زن کا تعلق مرحلہ وار جن صورتوں سے گزرتا ہے، وہ سامنے آرہی تھیں۔ ثریا کے بدن پر اب نسبتاً مختصر لباس رہ گیا تھا۔ پھر اس نے بڑا سا نیلا کمبل کھینچ کر اپنے اوپر لے لیا۔ چھیدی اور وہ دونوں اس کمبل میں چھپ گئے تھے۔

کیمرہ چلتا رہا۔ متحرک کمبل کی فلم بنتی رہی۔ رستم کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ ایک انجانا خدشہ بڑی تیزی سے اس کے ذہن میں پنجے گاڑنے لگا تھا۔ اسے پیر قدرت کے سفلی عملیات کے بارے میں بڑی اچھی طرح معلوم تھا۔ وہ بہتے ہوئے تازہ خون میں سنگین بیماریوں کا علاج ڈھونڈتا تھا۔ رستم چشم دید گواہ تھا۔ اسے علم تھا کہ پیر قدرت کے عملیات کا ایک حصہ وہ ہے جس میں وہ جانوروں کو جنسی عمل کے دوران میں ہلاک کرتا ہے۔ پرندوں اور چوپایوں وغیرہ کے ساتھ وہ یہ قبیح حرکت شاید سینکڑوں مرتبہ کر چکا تھا۔ وہ عین میٹنگ کی حالت میں نر کو تیز دھار آلے سے ہلاک کرتا تھا اور پھر اس کا ابلتا ہوا خون ایک

خاص برتن میں جمع کر لیتا تھا..... طوطے، چڑیاں، کبوتر، اُلو اور چوپائے، بلیاں، مُرغے اور بکریاں وغیرہ سب اس کی ستم ظریفی کا شکار تھے۔ جن دنوں رستم مری کی نواحی روکیٹ بستی میں تھا، اسے معلوم ہوا تھا کہ قدرت اللہ کے خلاف کچھ سمجھ دار لوگوں کی طرف سے کیس کیا گیا ہے۔ اس کیس میں کہا گیا تھا کہ پیر قدرت اللہ جو کچھ کرتا ہے یہ حیوانات پر بے رحمی کے زُمرے میں آتا ہے اور قانون میں اس کے لیے قرار واقعی سزا موجود ہے لیکن آج جو کچھ رستم دیکھ رہا تھا یہ تو بالکل ناقابلِ گمان تھا۔ کیا کوئی عامل اپنی سفاکی اور جاہلیت میں اس حد تک بھی آگے پہنچ سکتا تھا؟ رستم سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا پھر وہی کچھ ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ دفعتاً متحرک کمبل کے پہلو میں ایک سفید رنگ کا چھوٹا بغلی دروازہ کھلا۔ غالباً ثریا اور چھیدی نے اس دروازے کو مقفل سمجھ رکھا تھا مگر یہ مقفل نہیں تھا۔

رستم نے پینٹ شرٹ اور ٹائی میں ملبوس قدرت اللہ کو صاف پہچانا..... اس نے اپنی دونوں آستینیں اُڑسی ہوئی تھیں۔ اس کے پہلو میں اس کی منجھلی بیوی عریسہ فراتی تھی۔ حسبِ معمول اس کا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔ اس کے ہاتھ میں نقش و نگار والا ایک بڑا پیالہ تھا۔ پیر قدرت اللہ کے ہاتھ میں رستم کو ایک تیز برچھی نما ہتھیار دکھائی دیا۔ دو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں وہ دونوں نہ صرف اندر داخل ہوئے بلکہ جوڑے کے سر پر بھی پہنچ گئے۔ اس سے پہلے کہ جوڑا دروازے کی آواز سن کر کسی نتیجے پر پہنچتا یا کمبل اپنے چہرے سے ہٹا سکتا، قدرت اللہ نے برچھی نما آلہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے سر سے بلند کیا اور پوری طاقت سے چھیدی کی کمر میں اُتار دیا۔ کچھ کی خوفناک آواز ابھری۔

یہ وزنی تیز دھار آلہ چھیدی کا بایاں پہلو پھاڑتا ہوا اس کے پیٹ کی طرف سے نکل آیا چھیدی اور ثریا کرب ناک انداز میں چلائے۔ چھیدی کے چلانے کی آواز ذبح ہوتے ہوئے بکرے سے مشابہ تھی۔ یہ سارا منظر ہی نہایت دردناک اور قابلِ ترحم تھا۔ رستم جیسے شخص کی آنکھیں بھی جیسے پتھرا گئیں۔ ایک بند کمرے کے اندر محبت میں مشغول میاں بیوی پر اچانک ایک ایسی قیامت ٹوٹی تھی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کمبل ان کے اوپر سے اُتر چکا تھا۔ ان کی آنکھیں دہشت اور تکلیف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ رستم نے دیکھا کہ نہایت تیز دھار آلے کی انی چھیدی کا پیٹ پھاڑ کر نکلی تھی اور ثریا کے پہلو کو بھی زخمی کر گئی تھی۔ وہ اذیت سے چیختی ہوئی دہری ہوئی اور بیڈ سے گر گئی۔ ''بچاؤ..... بچاؤ۔'' اس نے پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے دہائی دی۔

لیکن وہاں بچانے والا کوئی نہیں تھا..... سب مارنے والے تھے۔ ثریا کے جسم پر لباس نہ

www.pdfbooksfree.pk

ہونے کے برابر تھا۔ چھیدی کا زیریں جسم بھی بالکل عریاں تھا۔ برچھی اس کے جسم میں ترازو تھی..... اور وہ جو چند سیکنڈ پہلے زندگی کے پُر مسرت لمحوں سے بغل گیر تھا، اب ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے بھولے بھالے چہرے پر سب سے تکلیف دہ اس کی سیاہ آنکھیں تھیں، جو کچھ سمجھ ہی نہیں پا رہی تھیں۔ چھیدی کے جسم میں برچھی اترتے ہی تین ہٹے کٹے مریدقتل گاہ میں داخل ہو گئے تھے۔

''پکڑ و اسے۔'' قدرت اللہ نے مریدوں کو حکم دیا۔

مریدوں نے بڑی مہارت سے تڑپتے پھڑکتے بدنصیب چھیدی کو بازوؤں اور ٹانگوں سے جکڑ لیا۔ قدرت اللہ نے چھیدی کی کمر پر پاؤں رکھ کر ایک جھٹکے سے برچھی کھینچی۔ وہ اپنی تیسری کوشش میں کامیاب ہو سکا۔ برچھی نکلتے ہی چھیدی کے جوان جسم سے خون کا فوارہ نکلا۔ ہٹے کٹے مریدوں نے اسے پہلو کے بل کر دیا۔ عریہ فراتی نے برتن، اس کے زخم کے عین نیچے رکھ دیا۔ بھل بھل نکلتا تازہ خون برتن میں جمع ہونے لگا۔ نیلا کمبل بھی خون میں تر نظر آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ پورے کمرے میں خون کے چھینٹے تھے۔

زخمی ثریا نے اپنا زخمی پہلو دونوں ہاتھوں سے دبا رکھا تھا۔ اس نے ایک بار پھر ''بچاؤ بچاؤ'' کی کرب ناک فریاد بلند کی اور چھوٹے سفید دروازے کی طرف بڑھی۔

قدرت اللہ نے لپک کر اسے اس کے کھلے بالوں سے پکڑ لیا اور کھینچ کر دوبارہ بستر پر پٹخ دیا۔ ''خبردار..... جان سے ماردوں گا۔'' اس نے بیجانی لہجے میں دھمکی دی۔

مگر اس کی دھمکی بیکار ہی گئی۔ بستر پر گرتے گرتے ثریا دہشت اور تکلیف سے بے ہوش ہو چکی تھی۔ قدرت اللہ نے اسے دھیان سے دیکھا..... پھر صرف اتنا ترس کھایا کہ خون آلود برچھی کی مدد سے نیلے کمبل کا ایک حصہ ثریا کے بے ترتیب عریاں جسم پر ڈال دیا۔

چھیدی کا زخم نہایت کاری تھا۔ ایک نظر دیکھ کر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ جان کنی کے عالم میں ہے۔ اس کی خرخراہٹ کمرے میں گونج رہی تھی۔ دو مریدوں نے اسے ابھی تک اپنے وزن کے نیچے دبا رکھا تھا۔ کم روشنی کی وجہ سے رستم کو اس کا چہرہ تو واضح سے نظر نہیں آیا مگر اس کے ڈھیلے پڑتے ہاتھ پاؤں سے اندازہ ہوا کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔

''چلو چھوڑ دو۔'' کچھ دیر بعد قدرت اللہ کی ماہرانہ رائے سنائی دی۔

ہٹے کٹے مرید چھیدی کے مُردہ جسم کو چھوڑ کر علیحدہ ہو گئے اور اس کے جسم پر ایک خون آلود چادر ڈال دی۔ خون جمع کرنے والا برتن نہ صرف بھر چکا تھا بلکہ لبریز ہو گیا تھا۔ باقی خون فرش پر بکھرا ہوا تھا..... دو مرید نیم بے ہوش ثریا کو مقتل سے باہر لے گئے۔ ایک مرید نے

قدرت اللہ کے ساتھ مل کر لہو سے بھرا ہوا برتن اٹھا لیا اور کیمرے کے فریم سے نکل گیا۔

کیمرہ حسرت ناک منظر پر تھوڑی دیر چلتا رہا پھر اچانک ٹی وی کی اسکرین تاریک ہو گئی۔ رستم اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا رہا۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور بارش ہو رہی تھی۔ یہ اندوہناک فلم دیکھنے کے بعد رستم کے ذہن میں فوری طور پر دو سوال ابھرے تھے..... پہلا تو یہ کہ یہ فلم بنائی کس نے تھی؟ جن لوگوں نے یہ سنگین جرم کیا تھا ان سے تو یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ انہوں نے اپنے خلاف ایک ٹھوس ثبوت تیار کیا ہو گا..... پھر یہ کیا تھا؟ رستم کے ذہن میں کئی خیالات آئے۔ غور کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی تھی کہ کیمرے نے کہیں بھی اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کی اور نہ ہی ہلا ہے۔ اسے غالباً کسی جگہ فکس کر دیا گیا تھا اور یہ کوئی پوشیدہ جگہ تھی۔

دوسرا سوال ذہن میں یہ ابھرتا تھا کہ ثریا نے اپنے اندر اتنی ہمت کیسے پیدا کر لی کہ اپنی ہی ایک عریاں فلم اسے دکھا دی۔ بے شک وہ فلم چلنے کے دوران میں موقع پر نہیں رہی تھی پھر بھی اسے معلوم تو تھا کہ فلم میں کیا ہے۔ اس سوال کا ایک ہی جواب ذہن میں آتا تھا۔ ثریا دکھ اور مظلومیت کی اس نہج پر پہنچی ہوئی تھی جہاں انسان اپنا آپ بھلا دیتا ہے۔ زندگی موت، صحت، بیماری، عزت، بے عزتی..... یہ سارے فرق اس کے لیے معمولی ہو جاتے ہیں۔

رستم نے اٹھ کر بغلی دروازے کو تھوڑا سا ہلایا۔ فوراً ہی آہٹ ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔ سامنے نوری کھڑی تھی۔ ثریا اس کے عقب میں تھی۔ اچانک بجلی چمکی، بادل بہت زور سے گرجے اور لائٹ چلی گئی۔ ثریا نے ایک قرمبی دراز میں سے موم بتی نکالی اور اسے روشن کر دیا۔ اب وہ تینوں پہلے والے کمرے میں تھے۔ موم بتی کی روشنی میں ماحول پُراسرار لگ رہا تھا۔ شاید ایک طرح سے یہ ثریا کے لیے اچھا ہی ہوا تھا۔ وہ نیم تاریکی میں بیٹھی تھی اور اس کا چہرہ رستم کو بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یقیناً وہ خود بھی رستم کے سامنے نہیں آنا چاہ رہی تھی۔

رستم نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جو کچھ دیکھا ہے یہ دل ہلا دینے والا ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا ہے۔'' وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک کر اس کے گندمی ہاتھوں پر گرے۔ نوری بھی یکسر خاموش تھی۔ رستم نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''فلم میں قدرت اللہ اور اس کی بیوی صاف پہچانے جا رہے ہیں۔ یہ ایک بے حد ٹھوس ثبوت ہے۔ اس بات پر حیران ہوں کہ یہ فلم بنائی کس نے ہے؟''

ثریا چند لمحے خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مالک کے چھوٹے

www.pdfbooksfree.pk

بیٹے وقار عرف وکی نے۔ اس کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ یہاں کوٹھی میں یہ سب کچھ ہونے والا ہے۔ اس نے قتل سے تھوڑی دیر پہلے ہی یہ چھوٹا کیمرہ اس کمرے میں چھپا دیا تھا۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ کسی کی سنتا نہیں۔ باپ سے بھی اس کا ان باتوں پر جھگڑا رہتا ہے۔ اس نے بس شرارت میں یہ فلم بنائی۔"

"یہ فلم تم تک کیسے پہنچی؟"

"بس جی! مجھے کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ مالک کے چھوٹے بیٹے کے پاس قتل کی فلم ہے۔"

"بتاؤ گی نہیں کہ کیسے پتا چلا؟"

"یہ بات رہنے دیں جی۔" وہ نیم تاریکی میں سے بولی۔

رستم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "اچھا..... اس فلم کے بعد کیا ہوا؟"

"ہونا کیا تھا جی..... بس میرے گھر والے کی جان چلی گئی۔ میں بھی زخمی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اندر ہی ڈاکٹر بلا کر میرا علاج کراتے رہے۔ یہ دیکھیں یہاں ابھی تک اس برچھی کا پھٹ ہے۔" اس نے ایک طرف سے اپنا کرتہ تھوڑا سا اٹھایا اور زخم کا گہرا نشان دکھایا۔

"تمہارے گھر والے کے بارے میں مالکوں نے دوسرے لوگوں کو کیا بتایا؟"

"انہوں نے کسی کو خبر ہی نہیں ہونے دی جی۔ وہ کام کے لیے کویت جانے کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اس نے پاسپورٹ بھی بنوا رکھا تھا۔ مالکوں نے مشہور کر دیا کہ اسے کویت بھیج دیا گیا ہے۔ میرے گھر والے کا کوئی آگے پیچھے تو تھا نہیں۔ ایک بڑھا چاچا ہے، وہ بھی نابینا ہے۔ میں ہی میں تھی۔ مجھے مالکوں نے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ میں کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی تھی۔ میرے..... میرے پیٹ میں چھیدی کی نشانی تھی۔ وہ مجھے دھمکی دیتے تھے کہ اگر میں نے اس بارے میں اپنی زبان کھولی تو وہ میرے بچے کو اور مجھے مار دیں گے..... میری بڈھی ماں اور تیرہ چودہ سال کے بھرا کا بھی خون کر دیں گے۔ وہ بڑے زور والے تھے جی۔ وہ سب کچھ کرا سکتے تھے۔" وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی۔

"تمہارے بچے کا کیا ہوا؟" رستم نے پوچھا۔

وہ بس روتی رہی۔ اس کی جگہ نوری نے جواب دیا۔ "وہ بعد میں ضائع ہو گیا تھا۔"

"مالک کے بیمار بیٹے سہیل کا کیا بنا؟"

"میرے گھر والے کی جان لے کر بھی وہ بچ نہیں سکا۔ مر گیا وہ انگلینڈ جا کر۔"

"مالک اس کے علاج کے لیے ہی انگلینڈ گیا تھا؟"

ثریا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ساری فیملی کوئی چار مہینے پہلے یہاں سے گئی تھی۔ مالک کا پُتر تو انگلینڈ میں ایک مہینے بعد ختم ہو گیا تھا۔ اب باقی کے لوگ انگلینڈ میں ہی ہیں۔ مالک کا چھوٹا پُتر وکی بھی وہیں ہے۔ سنا ہے کہ ان لوگوں نے اب واپس نہیں آنا ہے۔ انہوں نے یہ کوٹھی بیچنے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ یہاں کا کاروبار بھی ختم کر رہے ہیں مگر....." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

"مگر کیا؟" رستم نے پوچھا۔

"جس شخص نے اپنے ہتھ سے میرے گھر والے کی جان لی وہ تو یہیں ہے۔ وہ پیر نہیں شیطان ہے۔ دنیا کے لالچ نے اسے اندھا کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ پتا نہیں کیا کچھ کر چکا ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ اس نے وڈے مالک تاج سے بھی لاکھوں روپے لیے ہیں۔ اسے پتا تھا کہ مالک کے پُتر کی حالت بہت خراب ہے اور وہ دنیا جہان کا علاج کرا کرا کے عاجز آیا ہوا ہے۔ اس نے مالکن اور مالک کو اپنے کالے علم اور تعویذ گنڈوں کے چکر میں ڈال دیا اور ایسا ڈالا کہ وہ باقی سب کچھ بھول گئے۔ اس کو اپنے شیطانی عمل کے لیے تازہ خون کی ضرورت تھی۔ پہلے ایک دو بار اس نے جانوروں کے خون سے عمل کیے۔ جب کچھ فائدہ نہیں ہوا تو اس نے مالک اور مالکن کو اس خطرناک چکر میں ڈال دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ ان کے بیٹے کی جان بہت مشکل میں ہے۔ اس پر بہت بڑی اور ظالم بلاؤں کا اثر ہے۔ ان بلاؤں کو اس سے دور کرنے کے لیے بہت خاص عمل کی ضرورت پڑے گی لیکن اگر کسی طرح یہ عمل ہو گیا تو پھر بچہ بھی موت کے منہ سے واپس آ جائے گا۔ اور یہ عمل وہی تھا جی جو آپ نے ابھی فلم میں دیکھا ہے۔" ثریا نے کراہتے ہوئے کہا۔

"مالکوں نے تم کو کیا بتایا تھا کہ تم..... میرا مطلب ہے کہ یہ فلم تمہارے سرونٹ کوارٹر میں تو نہیں بنی، کوٹھی کے بیڈ روم میں بنی ہے۔"

ثریا کا سر کچھ اور جھک گیا۔ نوری نے کہا۔ "مالکوں نے کچھ نہیں کہا تھا جی۔ ثریا کے خاوند چھیدی سے پیر قدرت اللہ نے ہی گل بات کی تھی۔ ثریا کی طبیعت دو چار دن ذرا خراب رہی تھی۔ پیر قدرت اللہ نے ثریا کو ایک تعویذ پانی میں گھول کر پینے کے لیے دیا۔ اس نے چھیدی کو بتایا کہ لگتا ہے تمہارے بیوی ماں بننے والی ہے۔ پر ہونے والے بچے پر بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو کم کرنے کے لیے تھوڑے سے عمل کی ضرورت ہے۔ اس عمل کے لیے تم میاں بیوی کو ایک رات اپنے کوارٹر میں گزارنے کے بجائے کوٹھی کے اندر سونا ہو گا۔ رات کے پچھلے پہر تم میاں بیوی تین کنوؤں کے پانی سے نہا کر خود کو پاک کرو گے اور سورج نکلنے تک ایک خاص

www.pdfbooksfree.pk

قسم کا جاپ کرو گے۔ اس نے چھیدی کو کنوؤں کا پانی بھی لا کر دیا تھا۔ یہ سارا ناٹک تھا جی۔ دراصل مالکوں سے قدرت اللہ کی بات ہو چکی تھی اور انہوں نے قدرت اللہ کے شیطانی عمل کے لیے ثریا کے بندے کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔" نوری کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

رستم نے ایک بار پھر وحیان سے دیکھا۔ ایک بار پھر اسے لگا کہ نوری کا چہرہ یا چہرے پر کوئی چیز اس کی جانی پہچانی ہے۔

ثریا کی آواز نے رستم کو چونکایا۔ "میں نے آپ کو ملتان میں قدرت کے آستانے پر دیکھا تھا۔ وہاں آپ نے جو کچھ قدرت کے ساتھ کیا وہ تب تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگا تھا، پر جب میں نے خود اس شیطان کا اصلی روپ دیکھا اور اس کی درندگی دیکھی تو میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ وہ انسان نہیں حیوان ہے..... شیطان ہے..... اس نے بے شمار لوگوں کو گمراہ کیا ہوا ہے۔ اگر آپ کسی طرح اس کو مار سکیں تو یہ میرے جیسے اجڑے ہوئے لوگوں پر آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا..... بہت بڑا۔" وہ ایک بار پھر سسکیوں سے رونے لگی۔

رستم خاموش رہا۔ وہ اس نہایت ڈرامائی صورتِ حال پر غور کر رہا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش میں تھا۔ ثریا کی آواز رستم کے کانوں سے ٹکرائی۔ "سنا ہے کہ وہ خبیث آج کل سیالکوٹ میں ہے۔ وہ دیہاتی علاقے کے دورے کر رہا ہے اور وہاں کے سیدھے سادے لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے میں لگا ہوا ہے....."

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بے خیالی میں نوری کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس نے نوری کی آنکھیں دیکھیں..... اسے ایسا لگا جیسے یہ نوری کی نہیں نگینہ کی آنکھیں ہیں۔ وہی نگینہ جس کا پُراسرار خیال اکثر و بیشتر رستم کی سوچ کو تہہ و بالا کرتا رہتا تھا۔ وہ ایک معما تھی اور آج تک رستم کے لیے معما ہی رہی تھی۔ وہ ایک بھٹکا ہوا خیال تھی، کوئی ناقابلِ فہم وجود تھی..... یا صرف ایک وہم تھی..... رستم کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس نے چند خاص افراد کے سوا کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح کا تذکرہ جگ ہنسائی کا سبب بن سکتا ہے۔ زندگی کے بہت سے ناقابلِ فہم سوالوں کی طرح اس نے اس سوال کو بھی لاینحل ہی رہنے دیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ اس سے پہلے اسے سفید فام گریس کی آنکھوں میں بھی نگینہ کی آنکھوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ گریس کے چہرے پر خانہ بدوش نگینہ کی آنکھیں ہیں۔ وہی نگینہ جس نے ہمیشہ رستم اور شالنی کے ارد گرد رہنے کا وعدہ کیا تھا۔

نوری کی آنکھوں میں دیکھ کر رستم کی رگوں میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ

نوری سے کچھ پوچھے۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ پھر اس کے ذہن نے خود ہی اسے ٹوکا۔ یہ تم کس چکر میں پڑ رہے ہو؟ چہروں جیسے چہرے اور آنکھوں جیسی آنکھیں ہوتی ہیں۔ تم یہاں خواہ مخواہ نگینہ کو کیوں کھسیڑ رہے ہو؟

دفعتاً برآمدے کی طرف سے آہٹیں سنائی دیں۔ کوئی کھانسا اور پھر دیسی جوتی گھسیٹتا ہوا صحن کی طرف گیا۔ ثریا نے گھبرا کر کہا۔ "بابا عبدالرحمٰن جاگ گیا ہے۔ لگتا ہے کہ پیشاب کرنے باتھ روم میں گیا ہے۔ اب یہ کچھ دیر تک جاگتا رہے گا۔ آپ یہاں سے نکل جائیں۔ اگر موقع ملا تو میں ایک بار پھر آپ سے ملوں گی۔ اگر نہ بھی مل سکی تو یہ ثبوت آپ اپنے پاس رکھ لیں۔ ہم..... مجھے آپ پر پورا یقین ہے..... آپ..... آپ اس شیطان پیر سے میرا اور میرے بے گناہ چھیدی کا بدلہ لے سکتے ہیں..... ضرور لے سکتے ہیں۔" اس نے اشک بار لہجے میں کہا اور ایک شاپر میں لپٹی ہوئی فلم رستم کو تھما دی۔

شاید وہ کچھ اور بھی کہتی مگر عبدالرحمٰن کے کھانسنے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی اور لائٹ کسی بھی وقت واپس آ سکتی تھی۔ رستم نے فلم لے لی۔ "ٹھیک ہے۔ میں جاتا ہوں۔" اس نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رکا..... واپس مڑا..... اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ ثریا سر جھکائے کھڑی تھی۔ رستم نے کہا۔ "ثریا! میں وعدہ تو نہیں کر سکتا۔ پر میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ تیرے گھر والے کا خون رائیگاں نہ جائے....."

وہ سسک پڑی۔ "خدا حافظ۔" رستم نے کہا اور احتیاط سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ بارش کی رم جھم جاری تھی۔

رستم جس طرح خاموشی سے نکلا تھا اسی طرح خاموشی سے گھر واپس پہنچ گیا۔ ناصر اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ باقی سب سوئے پڑے تھے۔ رستم سیدھا ناصر کے بیڈ روم میں پہنچا کیونکہ اس کے اپنے بیڈ روم میں دس سالہ سرد بھی اس کے ساتھ سو رہا تھا لہٰذا وہ اور ناصر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ رستم اور ناصر نے سگریٹ سلگائے۔ رستم نے آج کی اَبر آلود رات میں پیش آنے والا سارا واقعہ ناصر کے گوش گزار کر دیا۔ یہ سب کچھ واقعی سنسنی خیز اور ڈرامائی تھا۔ رستم نے ناصر کو اس شرمناک فلم کے بارے میں بھی بتایا جو وہ کوٹھی نمبر 99 سے ساتھ لے کر آیا تھا۔ ناصر نے فلم دیکھی تو نہیں مگر اس کی تفصیلات نے اس پر وہی اثر کیا جو رستم پر فلم کے دیکھنے سے ہوا تھا۔ ناصر کا لہو بھی کھولنے لگا۔ جب بھی وہ دونوں قدرت اللہ کے بارے میں بات کرتے تھے، ایک عجیب طرح کی بے چینی ان کے اندر پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک

www.pdfbooksfree.pk

اضطرابی کیفیت جو خون کو جلانے لگتی تھی۔ آخر وہ شخص لوگوں کو مسلسل دھوکا دینے میں کیوں کامیاب تھا؟ وہ اور اس کے اہم چیلے لوگوں کے سامنے بار ہا ذلیل ہو چکے تھے۔ اور سب سے بڑی ذلت وہ تھی جب اجمل خان اور اس کے ساتھی فوٹو گرافر نے اپنی جان پر کھیل کر قدرت اللہ کی خارش زدہ بیویوں کی تصویریں اُتار لی تھیں..... بے شک اس واقعے کے بعد قدرت کی مقبولیت میں بہت کمی آئی تھی مگر وہ اب بھی مسلسل اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا اور سادہ لوح لوگوں کو ورغلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی بیماری کی طرح تھا جو جڑ سے ختم نہیں ہوتی تھی۔ دیکھا جائے تو اس میں سب سے زیادہ قصور لوگوں کی کم علمی اور جاہلیت کا ہی تھا۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر لیتے تھے اور اپنے دکھوں کا علاج قدرت جیسے شیطان عاملوں میں ڈھونڈتے تھے۔

رستم کی ہٹ لسٹ پر دو ہی بڑے نام تھے..... ریاض ہٹلر اور قدرت اللہ! ریاض ہٹلر تو موقع پر موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے کسی نامعلوم مشن پر آزاد علاقے میں تھا..... رستم اور ناصر نے سوچا..... تو پھر کیوں نہ پہلے قدرت اللہ سے ہی دو دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ وہ بی بی کے دو بڑے دشمنوں میں سے ایک تھا اور اپنی بی بی کے دشمنوں کو ختم کیے بغیر تو رستم چین سے مر بھی نہیں سکتا تھا۔ رستم اور ناصر تادیر جاگتے رہے اور اس موضوع پر فیصلہ کن گفتگو کرتے رہے۔

سویرے رستم کی ملاقات آپو زاہدہ سے ہوئی۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے رستم کے لیے ناشتا تیار کر کے پرانی یادوں کو تازہ کیا تھا۔ دیسی گھی میں بنے ہوئے دو بھاری بھرکم پراٹھے تھے۔ انڈے کا آملیٹ تھا جس میں پیاز کتر کتر ڈالا گیا تھا۔ اس کے ساتھ دہی کی میٹھی لسی بھی تھی۔ بھائی اکرام اور بچے ناشتا کر چکے تھے۔ باقی لوگ ابھی سو رہے تھے۔ بہن اپنے لاڈلے اکلوتے بھائی کو اپنے سامنے ناشتا کرانے لگی۔ اس نے پہلا لقمہ اپنے ہاتھ سے رستم کے منہ میں رکھا اور آنکھوں میں آنسو بھر لیے۔ رستم نے بے ساختہ بڑی بہن کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔ پھر اس نے بھی ایک لقمہ اپنی آپو زاہدہ کو دیا۔

ناشتے کے دوران میں دونوں خاموش ہی رہے۔ برتن سمیٹنے کے بعد آپو زاہدہ پھر رستم کے پاس آ بیٹھیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ اس میں ڈر، اندیشے، محبت بھی کچھ شامل تھا۔ انہوں نے عجیب انداز میں رستم کا ہاتھ تھاما اور بولیں۔ ''رستم! وہاں تہہ خانے میں کون ہے؟''

''تت..... تہ خانے میں؟ میں سمجھا نہیں؟''

''مجھ سے کیا کیا چھپائے گا رستم؟ مجھے پتا ہے کہ وہاں ٹو نے کسی کو بند کر رکھا ہے۔

اجمل خان اس بندے کو کھانا دینے نیچے جاتا ہے۔ جاتا ہے یا نہیں؟''

رستم خاموش رہا۔ وہ اندر سے سٹپٹایا ہوا تھا۔ وہ آپو زاہدہ کو کیسے بتاتا کہ اس تہہ خانے میں ایک خطرناک ترین پولیس افسر کا بھتیجا بند ہے۔ وہ بھتیجا جس کی تلاش پورے پنجاب میں طوفانی انداز میں جاری ہے۔

رستم آپو زاہدہ کے سوال کا کوئی مناسب سا جواب ڈھونڈ رہا تھا جب آپو زاہدہ نے ایک بار پھر بے تاب ہو کر رستم کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ بے حد جذباتی لہجے میں انہوں نے کہا۔

''رستم..... میرا بھرا..... اب واپس آ جا..... بڑی دیر ہو گئی ہے سوہنے..... اب آ جا۔''

''لک..... کہاں سے آ جاؤں آپو۔'' وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔ حالانکہ آپو کا فقرہ اس کے دل میں کھب گیا تھا۔

آپو زاہدہ نے بھی سنی اَن سنی کی اور اسی لہجے میں بات جاری رکھی۔ ''یہ دنیا تجھے مجھ سے چھین لے گی رستے! یہ بڑی ظالم دنیا ہے۔ دیکھ میرے سوہنے! میں تیرے سامنے اپنی جھولی پھیلاتی ہوں، اس جھولی میں مجھے میرا چھوٹا ویر ڈال دے۔ چھڈ دے یہ سارے کم..... میں ایک بار تیرے سر پر سہرا سجا لوں۔ بس ایک بار تیری دوہتی کا منہ چوم لوں پھر مجھے مرنے کا بھی کوئی غم نہیں رہے گا۔'' وہ سسکیوں سے رونے لگیں۔ رستم انہیں کیسے بتاتا کہ وہ اس کی دوہتی کے پاس ہی سے تو آئی ہیں۔

رستم کے سینے میں لہر سی اٹھی۔ اس کے دل میں آئی کہ وہ اپنی بڑی بہن کو سب کچھ بتا دے۔ انہیں بتا دے کہ وہ دن رات جس چھوٹی چوہدرانی کے تصور سے پڑھتی رہتی ہیں، وہی اس کی دوہتی ہے۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے ایک خوبصورت دلہن کے جتنے بھی سپنے دیکھے ہیں، وہ ان سب پر پوری اترتی ہے..... بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ جب وہ زرق برق کپڑے پہن کر چڑیاں چھناکاتی ہوئی چار دیواری میں چلتی پھرتی ہے تو جیسے ہر طرف روشنی بکھیرتی چلی جاتی ہے۔

''کس خیال میں کھو گئے؟'' آپو نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

''آپو! تمہیں چھوٹی چوہدرانی اچھی لگتی ہے؟''

آپو زاہدہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''پپ..... پر تُو کیوں پوچھ رہا ہے؟''

''اگر میں کہوں کہ..... میں چھوٹی چوہدرانی سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟'' وہ زخمی انداز میں مسکرایا۔

آپو زاہدہ کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ وہ کچھ دیر اسے گھورتی رہیں..... پھر بولیں۔ ''کیا

www.pdfbooksfree.pk

بات ہے..... چھوٹی چوہدرانی کے ساتھ..... کوئی معاملہ ہے تیرا؟"

"نہیں نہیں آپو..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یونہی پوچھ رہا ہوں۔"

آپو نے ایک گہری سانس لی اور اس کا ہاتھ چومتے ہوئے بولیں۔ "میرے سوہنے! شادی بیاہ کے معاملے میں اپنے جیسے لوگوں کے بارے میں ہی سوچنا چاہیے۔ وہ چوہدری لوگ ہیں۔ بڑا اُچا خاندان ہے۔ ہمارا ان کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔"

"نہیں آپو! میں تو ویسے ہی تجھ سے پوچھ رہا ہوں، وہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟"

"تمہیں کئی بار بتایا تو ہے۔ بہت..... بہت چنگی ہے۔ بالکل نکی سی عمر میں اس کو چھوٹی چوہدرانی بنا دیا گیا ہے۔ اس پر بہت زیادہ ذمے داریاں ڈال دی گئی ہیں۔ اس وچاری کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔ یہ اس کی فرمانبرداری ہے کہ اپنے بڑوں کا کہنا نہیں ٹال رہی اور وہ سب کچھ بڑی عقل مندی سے کر رہی ہے، جو وہ کہہ رہے ہیں۔ وہ سوہنی بھی رج کے ہے۔ ہر کسی کا دل موہ لیتی ہے۔ میرے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے کہ اس کے لیے جو بھی ہو اچھا ہو۔"

"وہ تم سے کس طرح کی باتیں کیا کرتی تھی حویلی میں؟" رستم نے پوچھا۔

"بڑی پیاری پیاری باتیں..... بڑی محبت والی۔ کہنے کو وہ چھوٹی چوہدرانی ہے پر اس کے اندر تو وہی البڑ گوری ہے ناں جو اپنی سکھیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنا چاہتی ہے۔ تمہیں تو پتا ہی ہوگا، چھوٹی سی عمر میں وچاری کا ویاہ ہوا۔ بڑا سخت بندہ ملا اور تھوڑے ہی دنوں میں مر بھی گیا۔ اب اس کے دل میں تو وہی چاہیں ہیں ناں جو لڑکیوں کے دل میں ہوتی ہیں..... ایک دن پتا کیا ہوا۔ میں نے تیری وہٹی کے جو گہنے بنا رکھے ہیں، وہ شانی نے دیکھ لیے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں نے یہ رستم کی وہٹی کے لیے بنائے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے پیار سے گہنوں پر ہاتھ پھیرتی رہی پھر لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بعد میں مُنے نے مجھے بتایا کہ اس کی تائی یعنی شانی نے یہ سارے گہنے پہن کر دیکھے تھے....."

باتیں کرتے کرتے آپو زاہدہ نے ایک بار پھر چونک کر رستم کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی۔ وہ رستم کو کھوجتے والی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو آپو؟"

"مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کیسی گڑبڑ؟"

"اچھا، مجھے یہ بتا جب تُو وڈے ڈیرے پر تھا، چوہدرانی شانی دو تین بندوں کو چھڑانے

کے لیے وہاں گئی تھی۔ گئی تھی ناں؟"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"بس مجھے پتا ہے ناں۔ تُو بتا..... گئی تھی ناں؟" رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ کریدنے والے انداز میں بولیں۔ "ان بندوں کو تجھ سے چھڑوانے کے لیے شانی کو ہی کیوں بھیجا گیا تھا؟"

"تُو کیا کہنا چاہتی ہے آپو؟"

"مجھے سچ سچ بتا..... کہیں تیرا اور چوہدرانی شانی کا کوئی معاملہ تو نہیں ہے رستے..... پتا نہیں کیوں، مجھے شک ہو رہا ہے۔ جس طرح اب تُو شانی کے بارے میں کرید کرید کر باتیں پوچھ رہا ہے..... وہ بھی پوچھتی تھی تیرے بارے میں۔ نہیں رستے! دیکھ میں تیری ماں بجا بہن ہوں۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔ کیا کوئی بات ہے..... تیرے اور چوہدرانی شانی کے درمیان؟"

رستم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "نہیں آپو! کوئی بات نہیں۔ بس یہ ہے کہ میں اک بار بہت زخمی ہو کر چوہدرانی کی حویلی میں گھسا تھا۔ چھوٹی چوہدرانی اور اس کی جیٹھانی نے میری مرہم پٹی کی اور مجھے وہاں سے نکلنے میں مدد دی۔ مجھ پر چھوٹی چوہدرانی کا یہ بڑا احسان تھا۔ اس لیے جب وہ بندے چھڑانے کے لیے وڈے ڈیرے پر آئی تو میں انکار نہ کر سکا۔ ان دو بندوں کی وجہ سے وہ میری بڑی احسان مند ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس کو پتا چلا کہ تم اور بھائی اکرام تھانے میں ہو اور تمہیں خطرہ ہے تو وہ تمہیں چھڑانے کے لیے پہنچ گئی۔"

"پر ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی رستے! چوہدرانی شانی کو کیسے پتا چلا کہ میں تمہاری بہن ہوں..... میں نے اس سے بھی کئی بار پوچھا ہے پر اس نے کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں دیا۔"

"ان چوہدریوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں آپو..... ان کے اپنے مخبر ہوتے ہیں، جو دور دور کی خبریں لاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی طرح چوہدرانی کو پتا چل گیا ہو۔ ویسے یہ بات خود ابھی تک میری سمجھ میں بھی نہیں آئی ہے۔"

آپو زاہدہ نے رستم کے سر پر بڑے لاڈ سے ہاتھ پھیرا۔ "رستے! ان چوہدریوں، جاگیرداروں کی دنیا اور ہے..... ہماری اور۔ نہ یہ ہمارے ساتھ خوش رہ سکتے ہیں نہ ہم ان کے ساتھ۔ اگر..... اگر تیرے دل میں چھوٹی چوہدرانی کے بارے میں کچھ ہے بھی..... تو میرے سوہنے! اسے دل سے نکال دے۔ تُو بس ایک بار ہاں کر دے۔ میں تیرے لیے اچھی سے

www.pdfbooksfree.pk

اچھی گڑیا ڈھونڈ لوں گی۔ اگر کوئی اور تیری نظر میں ہے تو مجھے بتا دے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں..... میں اسے تیری دلہن بنا کے چھوڑوں گی۔'' پھر وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئیں۔ رستم کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگیں۔ ''جب تُو آخری بار مجھ سے گاؤں میں ملا تھا تو اس سے چند مہینے پہلے بھی تو گاؤں آیا تھا۔ اس وقت تُو بڑا خوش تھا۔ تُو نے مجھے بتایا تھا کہ ایک گڑیا تُو نے دیکھ لی ہے اور اسے بڑی جلدی اپنی دوہتی بنا کر میرے پاس لائے گا۔ وہ لڑکی کون ہے؟''

''تھی وہ بھی ایک..... تیرے چھوٹے ویر کے کرتوت دیکھ کر اس نے نظر پھیر لی۔'' رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔

''تُو مجھ سے چھپا رہا ہے۔ بہت سی باتیں چھپا رہا ہے۔'' آپو زاہدہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''دیکھ اگر تُو بتائے گا تو میں تیری مدد کر سکوں گی۔ کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دے میرے سوہنے۔ دیکھ کر میں تیری بہن ہوں اور ماں کی جگہ بھی ہوں۔ کہیں تیرے دل میں..... کہیں..... میرا مطلب ہے، سچ سچ چھوٹی چوہدرانی؟''

رستم کے دل میں آئی کہ کہہ دے..... ہاں، چھوٹی چوہدرانی..... وہی ہے..... وہی ہے جو اس کی ساری زندگی پر حاوی ہو گئی ہے۔ جس کا عشق اس کے دل میں، خون میں اور روح کی گہرائیوں میں دور تک سرایت کر گیا ہے۔ ہاں، میری آپو! وہی ہے..... لیکن پھر اس کے ذہن میں وہ زہریلے الفاظ گونجنے لگے جو دل کو تیروں کی طرح چھلنی کرتے تھے..... ''تم گھٹیا ہو اور گھٹیا ہی رہو گے..... تم گھٹیا ہی رہو گے۔''

اس نے اپنے لرزتے ہونٹوں کو مضبوطی سے بند کر لیا اور آپو کی طرف سے رخ تھوڑا سا پھیر کر اپنا سر نفی میں ہلا دیا۔ ''نہیں آپو! جو تم سوچ رہی ہو وہ نہیں ہے۔ چھوٹی چوہدرانی سے تو بس ایک احسان مندی کا رشتہ ہے۔''

آپو زاہدہ نے شہادت کی انگلی سے رستم کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور متلاشی نظروں سے رستم کی آنکھوں میں جھانکتی رہیں۔ آپو کی آنکھیں رستم کو بتا رہی تھیں کہ وہ شک میں پڑ چکی ہیں اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ آپو کا شک آسانی سے دور نہیں ہو گا۔

وہ کچھ بولا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس موقع پر نہ بولنا ہی اچھا ہے۔ اس دوران میں دونوں بچے سرمد اور عاشی بھی آ گئے۔ عاشی اپنے ماموں کی کمر سے لپٹ کر لٹک گئی۔ سرمد نے آتے ساتھ ہی لیٹ کر سر ماموں کی گود میں گھسا دیا۔ آپو زاہدہ نے بیٹھے بیٹھے رستم کو اپنے گلے سے لگا لیا اور اس کا سر بار بار چومتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولیں۔ ''سوہنے! ہم سب نے

تجھے کھو کر پایا ہے۔ تجھے پتا نہیں جب تیرے بارے میں بری خبریں آتی تھیں تو ہمارے دلوں پر کیا گزرتی تھی۔ ہم مر مر کر جیتے رہے ہیں رستم۔ اب ہم تمہیں پھر سے گم نہیں ہونے دیں گے۔ بالکل نہیں ہونے دیں گے۔'' آپو نے لمبے تڑنگے رستم کو یوں اپنی بانہوں میں بھر لیا جیسے وہ چھوٹا بچہ ہو اور وہ اسے اپنے سینے میں چھپا لینا چاہتی ہوں۔ وہ جو کچھ اپنی محبت سے مجبور ہو کر کہہ رہی تھیں، رستم اس سے کوسوں دور تھا۔

رات کو رستم، ناصر اور اجمل میں ایک اہم ترین میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں رستم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو وہ دل خراش فلم بھی دکھائی جو قدرت اللہ کے خلاف ایک نہایت ٹھوس ثبوت کی حیثیت رکھتی تھی۔ فلم میں واقعی قدرت اللہ انسان سے زیادہ ایک حیوان نظر آیا تھا۔ جب وہ بغلی دروازے سے ہاتھوں میں برچھی نما آلہ لیے نمودار ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں میں جنون کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ چھیدی کے مرنے اور ثریا کے زخمی ہونے کے مناظر بھی دل دہلا دینے والے تھے۔

فلم دیکھنے کے بعد اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر بحث ہوئی۔ ناصر اور اجمل کے ذہن میں ایک اہم خدشہ یہ بھی تھا کہ کہیں ثریا اس سارے معاملے کو افشا نہ کر دے۔ اگر یہ بات دو چار افراد تک پہنچ جاتی کہ رستم اور اس کے ساتھی یہاں اس کوٹھی میں موجود ہیں تو پھر وہ بہت جلد پولیس کے گھیرے میں آ سکتے تھے۔

رستم نے کہا۔ ''پتا نہیں کیوں، مجھے اس بارے میں کافی حد تک اطمینان ہے۔ میں نے اس بارے میں ثریا سے تفصیل کے ساتھ بات کی ہے۔ اس نے یقین دلایا ہے کہ اگر اس نے ایک مہینے تک کسی کو نہیں بتایا تو اب بھی نہیں بتائے گی۔''

اجمل نے کہا۔ ''لیکن رستم صیب! یہ تو ہو سکتا ہے ناں کہ وہ دوسری ملازمہ نوری پیٹ کا ہلکا ہو۔''

''یہی بات تو اطمینان والی ہے۔'' رستم بولا۔ ''ثریا نے ابھی اپنی ساتھی کو بھی ہماری اصلیت نہیں بتائی ہے۔ اس نے اپنی ساتھی کے سامنے ایک بار بھی مجھے میرے نام سے نہیں پکارا ہے۔''

وہ رات گئے تک جاگتے رہے..... ان کی گفتگو کا موضوع قدرت اللہ کا قتل تھا۔ جب وہ رات تین بجے کے قریب سونے کے لیے اٹھے تو قدرت اللہ ٹھکانے لگانے کا سارا پروگرام طے ہو چکا تھا۔

ایک بار پھر رستم نے حاجی حیات کو بالکل بے خبر رکھا۔ قدرت اللہ کے بارے میں

www.pdfbooksfree.pk

معلومات حاصل کرنے کے لیے ناصر بڑی خاموشی کے ساتھ کوٹھی سے نکلا اور قریباً اٹھارہ گھنٹے بعد کوٹھی واپس پہنچا۔ اس نے اپنا کام بخوبی انجام دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ قدرت اللہ آج کل پسرور روڈ کے نزدیک ایک قصبے چھانگی وال میں موجود ہے۔ وہاں اس نے بہت سے لوگوں کو اپنے چکر میں ڈالا ہوا ہے۔ وہاں کی نمبردار فیملی اس کی سپورٹ کر رہی ہے۔ بڑے نمبردار نے نہ صرف اسے رہنے کے لیے ایک شاندار گھر دیا ہوا ہے بلکہ اب اسے آستانے کے لیے دو ایکڑ مہنگی زمین بھی نذر کی ہے۔ علاقے میں دن بہ دن قدرت اللہ اور اس کے چیلوں کے پاؤں جمتے جا رہے ہیں۔ ناصر کی معلومات کے مطابق قدرت اللہ کا خصوصی چیلا شاہی بھی وہیں پر موجود تھا اور بڑی سرگرمی دکھا رہا تھا۔

شاہی کا نام آتے ہی اجمل خان بھڑک اٹھا۔ ''رستم صیب! امارا آپ سے ایک درخواست ہے اور ام کو پورا امید ہے کہ آپ یہ درخواست ضرور مانے گا۔ اگر شاہی وہاں موجود ہے تو اس کو مارنے کا پریضہ (فریضہ) آپ ام کو سونپیے۔ اگر امارے ہوتے ہوئے وہ خبیث کسی اور کے ہاتھوں سے قتل ہوا تو ام اپنی قبر میں بھی چین سے نہیں رہ سکے گا۔''

رستم جانتا تھا، شاہی کے لیے اجمل کے دل میں بے حد نفرت ہے۔ درحقیقت یہ شاہی ہی تھا جس کی وجہ سے اجمل کی زندگی کا رخ تبدیل ہوا۔ وہ پولیس کی نوکری کرتے کرتے مجرم بن گیا۔ اس کا گھر بار چھوٹا، گاؤں چھوٹا، سنگیتر کسی اور کی ہوئی اور وہ در بدر ہو گیا۔ شاہی کے بارے میں جو کچھ اجمل نے بتا رکھا تھا وہ دل ہلا دینے والا تھا۔ اس بدبخت نے ایک دور دراز علاقے میں سادہ لوح لوگوں کو حیرت انگیز طور پر مطیع کر رکھا تھا۔ وہاں کی عورتیں چھاتی کے سرطان کے شدید خوف میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ لوگ اپنی صحت مند عورتوں کو جھاڑ پھونک کے لیے اس کے پاس بھیجتے تھے اور وہ شرمناک طور پر علاج کے بہانے ان کے جسم چھوتا تھا۔ اجمل نے اس کی سنگین بداخلاقی کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور وہ در بدر ہوا تھا۔

یہ خیالات چند سیکنڈ کے مختصر وقت میں رستم کے ذہن سے گزر گئے۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے اجمل! اگر حالات ٹھیک رہے تو شاہی تمہارا شکار ہے۔''

''اوہ..... آپ کا بہت شکریہ۔'' اجمل کا چہرہ یوں سرخ ہو گیا جیسے شاہی سچ مچ اس کے نشانے پر ہو اور وہ بس انگلی کو حرکت دے کر اس کی کھوپڑی اڑا سکتا ہو۔

☆======☆======☆

بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل تو وزیری گاؤں والے واقعے کے بعد مشکوک ہو چکی تھی۔ موجودہ کارروائی میں اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کارروائی میں کار کے استعمال کا

منصوبہ تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ناصر اور اجمل رات گیارہ بجے کے بعد گئے اور ایک ٹیکسی کار چھین کر لے آئے۔ ٹیکسی کار کا نشئی ڈرائیور بھی کار کے اندر ہی مرغی کی طرح بندھا پڑا تھا۔ اجمل نے اس کے ہاتھ پشت پر جکڑ دیئے تھے اور ایک کالی پٹی اس کی آنکھوں پر باندھ رکھی تھی۔ ناصر ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ڈرائیور کا نام بھی اتفاقاً اجمل ہی تھا۔ اس کی جیبوں سے بھرے ہوئے سگریٹ نکلے تو اجمل نے کہا۔

''اوئے! تم نے تو امارا نام بدنام کر دیا..... چرس والا سگریٹ پیتا ہے۔''

ناصر نے لقمہ دیا۔ ''نسوار کھایا کرو..... بے شک کڑک مسالے والی کھالیا کرو۔''

اجمل نے ناصر کو گھور کر دیکھا۔ ڈرائیور خاصا بزدل واقع ہوا تھا۔ مسلسل کانپ رہا تھا اور منت سماجت کر رہا تھا۔ ''میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں جی۔''

اجمل نے کہا۔ ''تمہارا اپنا عمر بھی تیس سے زیادہ نہیں، تمہارا بچہ عمر رسیدہ کیسے ہو سکتا ہے۔ باقی تم گھبراؤ مت۔ ام تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ صبح ناشتے میں تم کو حلوہ پوری ملے گا۔ دوپہر کو دنبے کا نمکین گوشت ہو گا۔ رات تک تم پھر اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے پاس پہنچ جائے گا..... اور تب تمہارا جیب بھی ایک دم گرم ہو گا۔ کیوں جی؟'' اجمل نے تائیدی نظروں سے ناصر کو دیکھا۔ ناصر نے بھی تائید کی۔

ڈرائیور کو کوٹھی کے ایک وسطی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ڈولا تسلی تشفی کے لیے ڈرائیور کے پاس ہی رہ گیا۔ یہ ساری کارروائی بڑی احتیاط سے کی گئی۔ رستم ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ آپو زاہدہ یا بھائی اکرام کو خبر ہو۔ اس صورت میں آپو زاہدہ نے ایک بار پھر اس کے سامنے اپنی نصیحتوں کی گٹھڑی کھول لینا تھی۔ وہ پہلے ہی پریشان تھیں، وہ انہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اگلے روز وہ منہ اندھیرے ہی کوٹھی سے نکل کھڑے ہوئے۔ پروگرام کے مطابق ان کو دو گاڑیوں میں سفر کرنا تھا۔ ناصر اور ڈولے کو ایک پرائیویٹ کار میں پسرور روڈ تک پہنچنا تھا۔ جبکہ رستم اور اجمل کو چھینی ہوئی ٹیکسی میں ان کے پیچھے پیچھے جانا تھا۔ اگلے ایک گھنٹے میں سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا۔ ناصر اور ڈولا کرائے کی ایک کار پر روانہ ہوئے جبکہ رستم اور اجمل ٹیکسی پر ان کے پیچھے ہو لیے۔ مرید کے قصبے کے پاس ان کی معمولی چیکنگ بھی ہوئی۔ رستم ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے کاغذات دکھائے۔ گاڑی میں موجود اسلحہ بڑے اچھے طریقے سے محفوظ کیا گیا تھا۔ انہیں جانے دیا گیا۔ وہاں تقریباً نصف درجن پولیس والے موجود تھے۔ کسی کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ جس شخص کو کلیئر کر کے جانے دے رہے

www.pdfbooksfree.pk

ہیں، وہ رستم سیال ہے۔ وہ رستم جسے ڈیڑھ دو برس پہلے پوٹھوہار کی گھاٹیوں میں ایک خوفناک مقابلے کے بعد مُردہ تصور کر لیا گیا تھا۔

رستم اور ناصر کے درمیان موبائل فون پر رابطہ قائم تھا تاہم وہ ایک دوسرے کو نام لے کر مخاطب نہیں کر رہے تھے۔ جلد ہی دونوں گاڑیاں پھر آگے پیچھے چلنے لگیں۔

اجمل نے کہا۔ ''رستم بھائی، آج کے اس دن کے بارے میں ام نے سینکڑوں بار سوچا تھا۔ یہ دن اماری آنکھوں کا سب سے خوبصورت سپنا تھا۔ امارا خواہش تھا کہ ام شاہی اور قدرت اللہ سے انتقام لینے جا رہا ہو تو آپ امارے ساتھ موجود ہو۔ ام شانہ بہ شانہ ان لوگوں پر حملہ کرے اور انہیں پناپتار (فانی النار) کر دے۔''

''امید ہے، آج یہ خواہش پوری ہو گی۔'' رستم کی نگاہیں جی ٹی روڈ کی سیاہ چمکتی تارکول پر جمی ہوئی تھیں۔

''ام تو کہتا ہے رستم صیب..... قدرت اللہ کا جتنا چیلا بھی اس کے ارد گرد موجود ہو، ان سب کو ٹپکا دیں۔ یہ سب لوگ برائی کے درخت کی شاخیں ہیں۔ ان کو جتنا زیادہ نقصان پہنچے گا اتنا ہی اچھا ہو گا۔''

''خدا کرے وہاں صورتِ حال ہمارے حق میں رہے۔'' رستم نے کہا۔

''رستم بھائی! اگر اس کام میں اماری جان کا ضرورت ہے تو ام ایڈوانس میں اپنا جان آپ کے پاس جمع کرا دیتا ہے لیکن آج کا کام ایسا ہونا چاہیے کہ قدرت اللہ کا بیڑی بالکل غرق ہو جائے۔''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر چٹان کی سی سختی تھی۔ اجمل خان نے میکانکی انداز میں نسوار کی ڈبیا کھولی اور اس میں موجود ساری نسوار سمیٹ کر ہونٹ میں ڈالی مگر پھر وہ ایک دم چونک گیا۔ اس نے تھوڑی سی خشک نسوار ہونٹ سے نکال کر دوبارہ ڈبیا میں رکھی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ بہت بدشگونی ہے جی۔ ام ایک خطرناک کام کرنے جا رہا ہے۔ تھوڑا سا نسوار تو ڈبیا میں رہنا چاہیے۔''

موبائل کے ذریعے وہ آپس میں گاہے بہ گاہے رابطہ قائم کر لیتے تھے۔ ناصر نے موبائل پر فوجی انداز میں اجمل خان سے پوچھا۔ ''جوان ریڈی؟''

''بالکل جوان ریڈی۔'' اجمل نے جواب دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

''موورال اونچا؟''

''موورال اونچا..... بلکہ کچھ زیادہ ہی اونچا۔ ایک دم ہوا میں پرواز کرتا ہوا..... خوف، ایف سولہ جہاز کی طرح۔'' اجمل نے جواب دیا۔

وہ پسرور روڈ سے ایک بغلی راستے پر ہو گئے۔ کچھ آگے جا کر انہوں نے ساتھ ساتھ سفر کرنا تھا لیکن ابھی وہ اکٹھے ہونے کے مقام سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھے کہ کھیتوں کے ایک طویل سلسلے کے کنارے انہیں روک لیا گیا۔ روکنے والے قریباً نصف درجن دیہاتی تھے۔ ان میں سے دو ہٹے کٹے افراد آگے آئے۔ ایک بھاری آواز والے شخص نے پوچھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

رستم نے اجمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سواری کو چھوڑنے جا رہا ہوں، چھانگی وال تک۔'' رستم کا لہجہ ٹیکسی ڈرائیوروں والا ہی تھا۔

''ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تمہاری ٹیکسی کی ضرورت ہے۔ دو بندے پھسل ہو گئے ہیں۔ ان کو پسرور ہسپتال میں پہنچانا ہے۔''

رستم اور اجمل نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یہ کوئی ڈراما بھی ہو سکتا تھا۔ دوسرے وہ جس کام پر جا رہا تھے، اس میں وقت کی بڑی اہمیت تھی۔

رستم نے کہا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں جی۔ ان خان صیب کو بھی بہت ایمرجنسی ہے۔''

''کیا ایمرجنسی ہے۔ یہ چنگا بھلا تو بیٹھا ہے۔ ہماری ایمرجنسی زیادہ بڑی ہے۔ پنڈ میں اس وقت ایک ہی گاڑی تھی۔ وہ بھی خراب ہو گئی ہے۔ بندوں کو ہسپتال پہنچانا ضروری ہے۔''

اجمل نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی صیب! آپ کا بہت مہربانی۔ ام جلدی نہ پہنچا تو امارا بہت نقصان ہو جائے گا۔ آپ دو منٹ انتظار کر لیں۔ ابھی پیچھے سے کوئی اور گاڑی.....''

''اوئے تُو ٹرٹر بند کر۔ نیچے اُتر گڈی سے۔'' ہٹے کٹے شخص نے بدتمیزی سے کہا۔ ''بھلائی کا کوئی زمانہ ہی نہیں ہے۔ اُدھر بندے زخمی پڑے ہیں اِدھر تم کو اپنے نقصان کی پڑی ہے..... چل نیچے اتر۔'' ہٹے کٹے شخص نے ایک ہاتھ کا مُکا بنایا اور دوسرے ہاتھ سے اجمل خان کی قمیص کندھے پر سے پکڑ لی۔

رستم نے اجمل خان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوتے دیکھا۔ یہ بڑا ظالم اور سنگین رنگ تھا۔ اجمل پر مُکا تاننے والے کو خبر نہیں تھی کہ وہ کس شخص کو اُکسا رہا ہے۔ اس کا میٹر گھوم جاتا تو وہ چند سیکنڈ میں پہلوان نما شخص کی آٹھ دس ہڈیاں توڑ سکتا تھا اور اس کے ساتھی افراد بھی

رستم اور اجمل کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ بے چارے عام دیہاتی تھے۔ ہوائی فائرنگ سے ہی رفو چکر ہو سکتے تھے۔ مگر پھر اچانک رستم کی نگاہ سب سے پیچھے کھڑے ایک لڑکے پر پڑ گئی۔ اس دیہاتی لڑکے کی عمر سولہ سترہ سال رہی ہوگی۔ سادہ سے چہرے پر چھوٹی چھوٹی نرم داڑھی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور ایک آستین پر خون لگا ہوا تھا۔

اجمل خان بھڑک کر ٹیکسی کار سے باہر نکل آیا تھا۔ ان پانچ چھ افراد کو سخت مصیبت میں مبتلا کرنے سے پہلے اجمل کو رستم کے صرف ایک اشارے کی ضرورت تھی۔ رستم نے یہ اشارہ نہیں دیا اور ہاتھ کی حرکت سے اجمل کو روک لیا۔

''کون بندے زخمی ہوئے ہیں؟'' اس نے ہٹے کٹے خردماغ شخص سے پوچھا۔

اس کے بجائے ایک دوسرے دیہاتی نے پیچھے کھڑے مصیبت زدہ لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا بھائی اور باپ ہیں۔ اوپر درخت سے گر پڑے ہیں۔ ان کو ہسپتال نہ پہنچایا تو مر جائیں گے۔ تم ٹیکسی موڑو، دیر نہ کرو۔''

رستم نے ایک نظر سیدھی جاتی سڑک کی طرف دیکھا۔ یہ سڑک، چھانگی وال اُن کی منزل کی طرف جاتی تھی..... اور اس منزل تک وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔ دوسرا راستہ جو بائیں طرف نکلتا تھا، کسی قریبی پنڈ کی طرف جاتا تھا اور وہاں دو بندے زخمی پڑے تھے۔ رستم اور اجمل جس راستے پر جانا چاہتے جا سکتے تھے۔ کسی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ انہیں روک سکے۔

مگر..... رستم کی نگاہ ایک بار پھر سب سے پیچھے کھڑے ہلکی نرم داڑھی والے نوعمر لڑکے کی طرف چلی گئی۔ اس کی آنکھوں کی نمی بہت طاقتور تھی۔ رستم نے اجمل کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی دو تین دیہاتیوں کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ ان میں نم آنکھوں والا لڑکا بھی شامل تھا۔ گاڑی دوسرے راستے پر موڑتے وقت رستم نے موبائل پر ناصر کو اطلاع دے دی کہ وہ جہاں ہیں، وہیں پر رُک جائیں۔ چائے شائے پئیں۔ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔

''بھائی خیریت تو ہے؟'' فون پر ناصر کی آواز ابھری۔

''ہاں خیریت ہے۔ راستے میں چند دوست مل گئے ہیں۔ ان کے دو بندے درخت سے گر کر زخمی ہو گئے ہیں۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ان کو ہسپتال پہنچانا ہے۔''

''لیکن اپنے کام میں دیر ہو جائے گی۔'' ناصر کی آواز میں اضطراب تھا۔

''دیر تو کسی اور وجہ سے بھی ہو سکتی تھی یار۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

''لیکن..... کوئی گڑبڑ والا معاملہ تو نہیں ہے ناں؟''

''لگتا تو نہیں۔'' رستم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ یہاں پاس ہی دو چار دکانیں ہیں۔ ہم وہاں بیٹھتے ہیں لیکن آپ رابطہ رکھیں۔''

رستم نے اثبات میں جواب دیا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

باقی دیہاتی ایک ٹانگے پر سوار ان کے پیچھے آ رہے تھے۔ رستم اور اجمل کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہٹے کٹے شخص کا نام پیرو تھا۔ وہ بس اویس سا بندہ تھا۔ گاؤں کے پٹواری کا ملازم تھا۔ رستم نے اس سے پوچھا کہ بندے زخمی کس طرح ہوئے ہیں۔

وہ بولا۔ ''درخت پر چڑھ کر کپڑا الگا رہے تھے۔''

رستم نے وضاحت چاہی تو پتا چلا کہ کپڑے سے پیرو کی مراد ''بینر'' ہے۔ یہ بینرز ایک جلوس کے لیے لگائے جا رہے تھے جو ساتھ والے گاؤں مدنی پور سے یہاں پہنچنے والا تھا۔

''جلوس کس لیے ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

پیرو بولا۔ ''یہ لمبی کہانی ہے یار۔ تم فاسٹ ٹیکسی چلاؤ تاکہ بندے ہسپتال پہنچ سکیں۔ بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دیں گے۔''

وہ تھوڑا آگے گئے تو رستم اور اجمل کو اپنے آپ ہی اس معاملے کی نوعیت کا پتا چلنے لگا۔ وہ گاؤں کی طرف جانے والے نیم پختہ راستے پر آ گئے تھے۔ یہاں جگہ جگہ کپڑے کے نئے اور پرانے بینرز لگے ہوئے تھے۔ ان بینرز پر اس طرح کے نعرے تھے۔ ''گاؤں کی بیٹی برآمد کرو..... عزتوں کے لٹیروں کو پھانسی دو..... راجا نوازش مُردہ باد..... ایک کی بیٹی سب کی بیٹی۔'' اس طرح کے کئی اور نعرے اور فقرے دکھائی دے رہے تھے۔

ٹیکسی کار دھول اُڑاتی گاؤں میں داخل ہوئی۔ گاؤں سے باہر ہی چند درختوں تلے بہت سے افراد جمع تھے۔ ان میں بچے، بوڑھے، عورتیں بھی شامل تھے۔ درمیان میں دو چارپائیاں تھیں۔ ان چارپائیوں پر دو زخمی موجود تھے۔ ایک ادھیڑ عمر تھا، دوسرا جوان سال۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ بیٹا تو لوگوں کی کوششوں سے ہوش میں آ چکا تھا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور سر سے بے تحاشہ خون بہہ رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص ابھی تک بے ہوش تھا اور پھنسے پھنسے سانس لے رہا تھا۔ رستم اور اجمل کے پہنچنے سے پہلے ہی کچھ لوگ نزدیکی گاؤں سے ایک بھدا رکمپاؤنڈر کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر لے آئے تھے۔ کمپاؤنڈر کے پاس ضروری دوائیں موجود تھیں..... وہ اس شخص کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش کے دوران میں اس کا چہرہ پسینے سے تر ہو رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کی بھی دو تین ہڈیاں ٹوٹی ہوئی

www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔ رستم نے محسوس کیا کہ یہاں ڈاکٹر ناصر مدد کر سکتا ہے۔ اس نے فوراً موبائل پر ناصر سے رابطہ کیا اور اسے مذکورہ گاؤں میں پہنچنے کی ہدایت کی۔

ناصر اور ڈولا زیادہ دور نہیں تھے۔ وہ صرف دس منٹ میں موقع پر پہنچ گئے۔ ناصر نے آتے ساتھ ہی پوزیشن کو سمجھ کر اپنا کام سنبھال لیا۔ رستم نے دیکھا تھا کہ مشکل حالات میں ناصر کی صلاحیتیں زیادہ ابھر کر سامنے آتی تھیں۔ وہ بالکل ایک پیشہ ور ڈاکٹر نظر آنے لگتا تھا۔ ادھیڑ عمر کمپاؤنڈر کے ساتھ مل کر ناصر نے پانچ دس منٹ میں ہی نہ صرف زخمی کی سانس بحال کر دی بلکہ اس کی گہری بے ہوشی کو بھی نیم بے ہوشی میں بدل دیا۔ اس دوران میں کمپاؤنڈر نے ناصر کی ہدایت کے مطابق مضروب کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی اور ٹخنے کو چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کی مدد سے اس طرح باندھ دیا کہ اسے آسانی سے گاڑی میں منتقل کیا جا سکے اور ہسپتال پہنچایا جا سکے۔ جب یہ لوگ شدید زخمی کو گاڑی میں منتقل کرنے کی تیاری کر رہے تھے تو دو تین افراد ایک ویگن لے کر پہنچ گئے۔ یہ ویگن اس جلوس سے علیحدہ ہو کر آئی تھی جو تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والا تھا اس پر بھی ایک بینر لگا ہوا تھا۔ ''راجا کو گرفتار کرو۔''

دونوں زخمیوں کو فوری طور پر ویگن میں ڈال کر پسرور ہسپتال روانہ کر دیا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب رستم اور اجمل کو ہسپتال نہیں جانا پڑے گا۔

دیہاتی ان تینوں چاروں کے بہت شکر گزار نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے خاص طور سے ناصر کو گھیر لیا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ایک شخص نزدیکی گھر سے چائے کی نمکین اور شکر والی لسی لے آیا۔ نمکین لسی میں تازہ مکھن تیرتا نظر آتا تھا۔ ناصر نے ایک ادھیڑ عمر دیہاتی سے پوچھا۔ ''چاچا! یہ لڑکی والا کیا معاملہ ہے؟''

ادھیڑ عمر والے نے حقے کا طویل کش لے کر رنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''معاملہ کیا ہوتا ہے پتر! ہمارے ان دور دراز علاقوں میں زور آور لوگ جنگل کے شکاری جانوروں کی طرح ہوتے ہیں۔ جو زیادہ کمزور اور بے چارا نظر آتا ہے، اس کو پکڑ لیتے ہیں اور سب کے سامنے چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی لعنت یہ ہے کہ دیکھنے والے بھی چپ رہتے ہیں اور چیر پھاڑ دیکھ کر بھی منہ پرے کر لیتے ہیں۔ پر اب ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم منہ پرے نہیں کریں گے۔ ہم پنڈ کی دھی کو انصاف دلا کر رہیں گے۔ ہم پچھلے پورے ایک مہینے سے کوشش کر رہے ہیں اور اگر ہماری کڑی برآمد نہ ہوئی تو ہم دہائی دینے کے لیے لاہور تک جائیں گے۔''

''یہ کیا کس نے ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہاں کے زمیندار راجا نوازش نے۔''

لڑکی کون تھی؟''

''اس کے مزارعے فضلو کی دھی ہے۔ وہ راجا نوازش کے گھر میں آتی جاتی تھی۔ راجا اس کا رشتہ اپنے کسی جاننے والے کی طرف کرنا چاہتا تھا۔ ماں پیو نہیں چاہتے تھے اور نہ لڑکی خود چاہتی تھی۔ اس کا رشتہ اپنے چاچے کے پتر کی طرف ہو چکا تھا۔ بس راجا نوازش کی زبردستی تھی۔ گاؤں کے لوگوں کو سولہ آنے یقین ہے کہ فضلو کی دھی شاہدہ کو راجا نوازش نے اغوا کر لیا ہے۔ وہ اب بھی جانتا ہے کہ وہ کہاں اور کس کے پاس ہے۔''

''ہاں، وہ سب جانتا ہے۔'' ایک اور شخص نے کہا۔ ''یہ سب کیا دھرا اسی راجا نوازش کا ہے۔ اگر فضلو کی گھر والی اپنی دھی کے دکھ میں مری ہے تو اس کا قاتل بھی یہ کمینہ راجا ہی ہے۔''

وہی دکھ درد کی صدیوں پرانی کہانی..... وہی طاقتور اور کمزور کے درمیان چوہے بلی کا کھیل۔

ناصر نے پوچھا۔ ''وہ راجا نوازش اب کہاں ہے۔''

''پہلے تو وہ یہیں تھا۔ پر جب اس نے دیکھا کہ لوگوں کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے تو خاموشی سے غائب ہو گیا۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ پہاڑی علاقے کی سیر کو نکل گیا ہے۔ اس کا پتر اور نوں بھی ساتھ ہیں۔ اس کے پتر راشد کو پھانسی کی سزا ہو چکی تھی۔ پر سزا سے صرف دو ہفتے پہلے اس کو معافی مل گئی اور وہ رہا ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ یہ خبیث راجا رب کا شکر کرتا اور اللہ تو یہ کا رستہ پکڑتا، اس نے یہ چن چڑھا دیا۔ اپنی ضد پوری کرنے کے لیے غریب فضلو کی دھی کو اغوا کرا دیا۔''

''تم لوگ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ لڑکی واقعی اغوا ہوئی ہے اور یہ کام راجا کا ہی ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''یہ کام راجا کے سوا کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا جی۔'' ایک جوشیلے جوان نے حلفیہ لہجے میں کہا۔ ''راجا نوازش دن رات فضلو اور اس کے گھر والوں کو دھمکاتا تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ اس لڑکی کی شادی کہیں اور ہونے نہیں دے گا اور اگر ہو گئی تو وہ اپنے باپ کا نہیں۔''

ایک دوسرا دیہاتی بولا۔ ''اور جہاں تک دوسری بات ہے کہ کڑی واقعی اغوا ہوئی ہے یا نہیں تو اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جس رات یہ ظلم ہوا، پنڈ کے دو بندوں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ وہ چاندنی رات تھی۔ وہ یہاں سے دو تین فرلانگ دور کھیتوں کو پانی لگا رہے تھے۔ آدھی رات سے ذرا پہلے ایک ٹویوٹا گڈی کچے راستے پر سے

www.pdfbooksfree.pk

گزری..... کھیتوں کے پاس سے سوڑ کاٹتے ہوئے گڈی کا ایک طرف کا دروازہ ایک دم کھلا اور ایک گڑی شور مچاتی ہوئی گڈی سے باہر گری۔ وہ منہ بھار گری تھی اور صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے چھلانگ ماری ہے۔ گڈی بھی ایک دم رک گئی۔ گرنے کے بعد گڑی لنگڑاتی ہوئی بھاگی پر ابھی مشکل سے چار چھ قدم ہی بھاگی تھی کہ گڈی سے نکلنے والے دو تین ڈشکروں نے اسے پکڑ لیا اور کھینچ کھانچ کر واپس گڈی میں لے گئے۔ گرنے سے اس وچاری کے دونوں ہاتھ سخت زخمی ہو گئے تھے۔"

"دیکھنے والوں نے کچھ نہیں کیا؟" ناصر نے پوچھا۔

"وہ دونوں بالکل نہتے تھے ڈاکٹر صیب..... اور گڈی والوں کے پاس اسلحہ تھا۔ انہوں نے دونوں دیکھنے والوں کو دھمکی دی کہ وہ ایک سیکنڈ میں بھون کر رکھ دیں گے۔"

"ان میں کوئی جانا پہچانا چہرہ نہیں تھا؟" رستم نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ وہ بالکل باہر کے بندے لگتے تھے۔ دیکھنے والے بے چارے ہماری طرح چنے اَن پڑھ تھے۔ نہیں تو گڈی کا نمبر دیکھ لیتے۔"

ایک ادھیڑ عمر کے، عینک والے دیہاتی نے کہا۔ "ایسے لوگوں نے نمبر بھی تو جعلی لگائے ہوتے ہیں۔"

لوگوں میں زمیندار راجا کے بارے میں سخت غصہ پایا جاتا تھا۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ گاؤں کے برائے نام چوہدری سے زیادہ طاقتور اور اثر و رسوخ والا ہے۔ اس کے پتر شراب کی بھٹیاں بھی چلاتے تھے۔ شراب کے کاروبار میں ہی ایک دوسری پارٹی سے ان کا جھگڑا ہوا تھا اور کوئی چار سال پہلے راجے کے پتر کے ہاتھوں ایک بندہ قتل ہو گیا تھا۔ اس قتل میں اس کے پتر کو بھی کسی کی سزا بھی پر آخر میں وہ بچ گیا۔

ان دیہی علاقوں اور دور دراز بستیوں میں نہ جانے کتنے راجے اور کتنے مظلوم فضلو چھپے ہوئے تھے۔ رستم اور ناصر کس کس کے گریبان تک اپنا ہاتھ پہنچا سکتے تھے لیکن جو منظر نظر آ جائے اس کا دکھ تو ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر شخص آگے آیا۔ وہ انوھا ہونے والی لڑکی شاہدہ کا بدنصیب باپ فضلو تھا۔ اس کا گھر اُجڑ گیا تھا۔ لاڈلی بیٹی کو ظالم اچک کر لے گئے تھے اور بیوی کو موت نے چھین لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ اس نے لوگوں کو وہ چپل دکھائی جو اس کی بیٹی نے وقوعہ کے وقت پہن رکھی تھی اور جو اس کے پاؤں سے نکل گئی تھی۔ اس نے وہ دوپٹا دکھایا جو راستے میں گر گیا تھا۔ وہ دیوانوں کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ موقع پر موجود لوگ ایک بار پھر راجا کے خلاف نعرے بازی کرنے لگے۔

اجمل سرگوشی میں بولا۔ "رستم بھائی! اس وقت تو ام سب ایک ارجنٹ کام پر ہیں لیکن امارا دل چاہتا ہے کہ یہ کام ختم ہو جائے تو آپ ام کو تھوڑا سا اجازت دے کہ ام پھر کسی دن اس گاؤں میں آئے اور یہاں کے راجے کا بابا بجائے۔ ام سچ کہتا ہے، ایسے لوگوں کو مارتے ہوئے اگر امارا جان چلا جائے تو ام کو موت کا ذرا غم نہیں۔"

"خیر، یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔" رستم نے کہا۔ "ابھی تو یہاں سے چلنا چاہیے۔ ہم اور لیٹ ہو گئے تو اصل کام دھرا رہ جائے گا۔"

"ہاں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جلوس کے پہنچنے کی وجہ سے راستہ بلاک ہو جائے۔" ناصر نے کہا۔

اب یہاں ان کے کرنے کے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ درخت سے گرنے والے دونوں زخمی ہسپتال روانہ ہو چکے تھے۔ ناصر نے فضلو اور دیگر لوگوں سے اجازت طلب کی۔ دیہاتیوں نے ناصر کا بہت شکریہ ادا کیا۔ ایک سادہ لوح شخص ناصر کو مسلسل "ڈاکٹر جی" کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ وقتِ رخصت اس نے کچھ روپے ناصر کی جیب میں بطور فیس ڈالنے کی کوشش کی۔ ناصر نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ جس پہلوان نما شخص نے شروع میں بدتمیزی کی تھی، وہ بھی شرمندہ شرمندہ نظر آ رہا تھا۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک بار پھر پسرور روڈ کی طرف روانہ ہوئیں۔ اس مرتبہ رستم، ناصر، اجمل اور ڈولا چاروں ایک ہی گاڑی یعنی ٹیکسی کار میں تھے۔ دوسری کار عقب میں آ رہی تھی۔ اس مرتبہ اسٹیئرنگ وہیل اجمل کے ہاتھ میں تھا۔ ڈولا گم صم تھا۔ اس کے حساس کان جیسے کچھ سننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اجمل نے کہا۔ "خیریت تو ہے ڈولے؟ تمہارے کانور کا دور بین شاید کچھ سننے کی کوشش رہا ہے۔"

"یہ کانوں کی دوربین کیا ہوتی ہے؟" ناصر نے برا سا منہ بنایا۔

"دراصل ناصر بھائی! جب ام تمہاری شکل پر سو سو بل دیکھنا چاہتا ہے تو جان بوجھ کر اس طرح کا لپڈ بولتا ہے۔ ورنہ یہ ام کو بھی پتا ہے کہ کانوں کو نظر نہیں آتا۔"

"مجھ کو تو لگتا ہے کہ تمہاری آنکھوں کو بھی نظر نہیں آتا..... وہ دیکھو سامنے کھڑا ہے۔" ناصر نے آخری الفاظ تقریباً چلا کر کہے۔

اجمل نے تیزی سے اسٹیئرنگ وہیل گھمایا اور گاڑی کھڈے کے کنارے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اجمل مسکرایا۔ "ناصر بھائی! دراصل ام تمہارا..... ہاں ہاں تمہارا امتحان لے رہا تھا،

www.pdfbooksfree.pk

دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہیں کچھ نظر آتا ہے یا نہیں۔ دراصل تم نے جس طرح کی لڑکی کو بیوی بنانے کے لیے چنا ہے، شک ہوتا ہے کہ تمہارا نظر....." اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ناصر نے کوئی مناسب جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر پھر اسے خاموش رہنا زیادہ مناسب لگا۔ وہ جس سچویشن میں جا رہے تھے، وہ خاصی سنگین تھی..... اور ضرورت تھی کہ آنے والی گھڑیوں کے بارے میں ذرا سنجیدگی سے سوچا جائے۔

ڈولے کے کان مسلسل غیر مرئی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد وہ بولا۔ ''وہ لوگ ٹھیک کہہ رہے تھے جی..... جلوس اِدھر دائیں طرف ہے۔ وہ سامنے جو ذخیرے کے درخت نظر آ رہے ہیں ان کی دوسری طرف۔ کافی لوگ ہیں۔ وہ نعرے لگا رہے ہیں۔''

رستم اور ناصر وغیرہ نے گاڑی کی کھڑکیاں پوری کھول کر پوری کوشش کی مگر انہیں کوئی ہلکی سے ہلکی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ تاہم انہیں یقین تھا کہ ڈولا جو کہہ رہا ہے وہ درست ہے۔

''رفتار ذرا تیز رکھو۔'' رستم نے ایک بار پھر اجمل خان سے کہا۔

کچے پکے راستے پر گاڑی پہلے ہی چالیس پچاس کی اسپیڈ پر بھاگ رہی تھی۔ اجمل نے ایکسیلریٹر پر پاؤں کا دباؤ کچھ اور بڑھا دیا۔ اجمل نے پوچھا۔ ''رستم بھائی! آپ نے بتایا نہیں کہ امارا بارہ بجے سے پہلے پہنچنا کیوں ضروری تھا؟''

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بے گناہ لوگ نہ مارے جائیں اور صرف قدرت اللہ اور اس کے قریبی چیلے ہی نشانہ بنیں تو پھر ہمارا بارہ بجے کے لگ بھگ چھاؤنی وال پہنچنا ضروری ہے۔ بارہ سے ڈیڑھ بجے کے درمیان منگل اور جمعرات کے روز ایک بیٹھک ہوتی ہے جس میں صرف قدرت اللہ اور اس کے قریبی ساتھی بات چیت کرتے ہیں۔ اس وقت بھی یہ بیٹھک شروع ہونے والی ہے یا ہو چکی ہے۔'' رستم نے اپنی خستہ حال گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ یہ گھڑی اس ڈرائیور ہی کی تھی جسے وہ کوٹھی میں پابند چھوڑ آئے تھے۔ رستم کے جسم پر لباس بھی ڈرائیور ہی کا تھا۔ تھوڑا تنگ تھا مگر گزارہ ہو رہا تھا۔ ناصر اور اجمل بھی عام لباس میں تھے۔ درحقیقت وہ عام عقیدت مندوں کے روپ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے وہ ایک چھوٹے سے پنجرے میں کاک ٹیل طوطوں کا ایک جوڑا بھی اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ ایسے نر، مادہ پرندوں کو قدرت اللہ اپنے عملیات میں استعمال کرتا تھا۔

ان عام سے عقیدت مندوں کے پاس قدرت اللہ سے ملاقات کے لیے جو اصل سامان تھا وہ کافی خوفناک تھا۔ یہ ایک عدد اے 52 رائفل..... ایک ایل ایم جی..... دو کولٹ پسٹل اور چھ عدد دستی بم تھے۔ بم یو ایس اے میڈ تھے۔ ان کو "M67" کہا جاتا ہے۔ یہ بم ایک بوسیدہ سے تھیلے میں تھے۔ یہ سارا اسلحہ ٹیکسی کی پچھلی نشست کے اندر بڑی مہارت سے چھپایا گیا تھا۔ ایل ایم جی کے قریباً پانچ سو راؤنڈ بھی اس اسلحے میں شامل تھے۔

ٹیکسی کار اینٹوں کی سڑک پر ہچکولے کھاتی قریباً ساڑھے بارہ بجے چھاؤنی وال میں قدرت اللہ کے آستانے کے عین سامنے پہنچی۔ گرمی کے باوجود یہاں زائرین اور ضرورت مندوں کا ہجوم تھا۔ عارضی طور پر ایک سکول کی خالی عمارت کو قدرت اللہ کے آستانے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ چھت پر بہت سے رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ایک طرف لنگر پک رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے اسٹالوں پر قدرت اللہ کے چھاپے ہوئے کتابچے اور اس کی آواز کی کیسٹیں وغیرہ فروخت ہو رہی تھیں۔ یہاں رستم کو گاڑیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں، تانگے اور بیل گاڑیاں وغیرہ دکھائی دیں۔ یہ سب قدرت اللہ کے سادہ لوح عقیدت مندوں کی سواریاں تھیں۔

اجمل نے ٹیکسی کار کو چند گاڑیوں کے درمیان روک دیا۔ یہ جگہ قدرت اللہ کے اس عارضی آستانے کے صدر دروازے سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اگر وہ لوگ چاہتے تو ایک جھپٹ میں صدر دروازے تک پہنچ سکتے تھے۔ صدر دروازے پر مسلح محافظ موجود تھے اور وہ چیکنگ کے بعد ہی لوگوں کو اندر جانے دیتے تھے۔ ناصر نے بتایا تھا کہ اس چیکنگ کے بعد آگے ایک اور چیکنگ ہے۔ وہاں پر عورتوں اور مردوں کو علیحدہ علیحدہ بھی کیا جاتا ہے۔ عورتوں کی تلاشی کے لیے وہاں مریدنیاں موجود تھیں اور عریسہ فراتی ان کی نگرانی کرتی تھی۔

ٹیکسی پارک کرنے کے بعد ان چاروں نے اچھی طرح قرب و جوار کا جائزہ لے لیا تو وہ ایکشن کے لیے تیار ہو گئے۔ ڈولا اچھلی سیٹ پر لیٹا تھا اور اس نے اپنا سر کسی بچے کی طرح ناصر کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ ناصر نے اس پر ایک چادر ڈال دی تھی۔

رستم نے ناصر اور اجمل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یاد دہانی کے لیے ہم ایک بار پھر اہم باتیں دہرا لیں۔ اجمل یہاں ٹیکسی میں رہے گا۔ میں اور ناصر اندر جائیں گے..... بالکل خالی ہاتھ جائیں گے۔ ڈولے کو چادر میں لپیٹ کر ناصر، بیمار بچے کی طرح اپنے کندھے سے لگائے رکھے گا۔ اندر پہنچ کر ہم تصدیق کریں گے کہ قدرت اللہ اور اس کے خاص چیلے بیٹھک کر رہے ہیں اور اگر کر رہے ہیں تو کس جگہ پر؟ اگر پوری تصدیق ہو گئی تو میں بیمار بچے کے

www.pdfbooksfree.pk

لیے شربت وغیرہ لینے کے بہانے باہر آ جاؤں گا.....اس دوران میں تم کیا کرو گے اجمل؟'' رستم نے اپنا بیان روک کر پوچھا۔

''ام سیٹ کے نیچے سے بندوق اور ہینڈ گرینیڈ وغیرہ نکال کر سیٹ کے اوپر رکھ دے گا اور اوپر چادر ڈال دے گا۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔ اس کے بعد ہم گاڑی کو بڑے دروازے سے سیدھا اندر گھسا لے جائیں گے اور ایسی جگہ پہنچ جائیں گے جو بیٹھک سے قریب تر ہو۔ ہم صرف قدرت اللہ اور اس کے خاص چیلوں کو نشانہ بنائیں گے یا ان لوگوں کو جو ہم پر جوابی فائر کریں گے۔ کام مکمل ہونے کے بعد ہم اسی ٹیکسی کار پر واپس نکلنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ٹیکسی استعمال کے قابل نہ ہوئی تو پھر دوسری کار کو استعمال کیا جائے گا۔ یہاں سے نکلتے وقت جو احتیاط کرنی ہے وہ ذہن میں ہے ناں؟'' رستم نے ناصر اور اجمل سے بیک وقت پوچھا۔

''بالکل جی۔'' اجمل نے جوش سے کہا۔ ''ام یہاں موجود ایسی گاڑیوں کا ٹائر برسٹ کرنے کی کوشش کرے گا جو ہمارا پیچھا کر سکتی ہیں اور ہمارے خیال میں یہ کام زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ ام دیکھ رہا ہے کہ یہاں ٹوٹل چار پانچ گاڑیاں ہی ایسا ہے جو ہمارے پیچھے آ سکتا ہے۔ ان گاڑیوں پر دو تین برسٹ چل گیا تو ان شاءاللہ یہ سب لنگڑا ہو جائے گا۔''

ناصر نے کہا۔ ''اگر صورت حال دوسری ہوتی ہے..... میرا مطلب ہے کہ ہم کچھ لیٹ ہو چکے ہیں۔ اگر ہمارے ایکشن میں آتے آتے بیٹھک ختم ہو گئی کوئی اور صورت حال پیش آئی تو پھر؟''

''اگر کوئی ایسا معاملہ ہوا تو پھر ہم چاروں، دوبارہ ٹیکسی میں آ جائیں گے اور نیا پروگرام بنائیں گے۔''

اجمل بولا۔ ''آپ نے کہا تھا کہ اگر پیکنگ کے دوران میں پہرے داروں کو آپ پر شک ہو گیا تو آپ میرے موبائل پر مس کال دے گا۔ ایسے میں ام مزید انتظار نہیں کرے گا اور پائرنگ کرتا ہوا اندر آ جائے گا۔ مگر ہمارا اسلحہ تو ابھی سیٹ کے نیچے ہے۔ کیا یہ ٹھیک نہیں ہے کہ آپ کے باہر نکلنے سے پہلے ام بندوق وغیرہ نکال لے؟''

''تمہیں بندوق وغیرہ نکالنے کا پورا وقت ملے گا۔'' رستم نے کہا۔ ''ہم یہاں سے نکلتے ہی آستانے میں نہیں چلے جائیں گے۔ دو چار منٹ اِدھر اُدھر گھومیں گے اور جائزہ لیں گے۔''

''بس یہ ٹھیک ہے جی۔'' اجمل نے جوش سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور

چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

رستم نے اپنے موبائل پر اجمل کا نمبر پہلے سے ہی ڈائل کر لیا۔ اب خطرے کی صورت میں صرف بٹن دبانے کی ضرورت تھی۔

رستم اور ناصر باہر نکل آئے۔ ڈولا چادر میں لپٹا ہوا ناصر کے کندھے سے لگا تھا۔ کاک ٹیل طوطوں والا چھوٹا سا پنجرہ رستم کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دونوں چار پانچ منٹ تک دائیں بائیں گھومتے رہے۔ کرائے کی کار بھی مناسب جگہ پر پارک ہو چکی تھی۔ کار کا ڈرائیور ذرا خاموش نظر آتا تھا۔ شاید اسے رستم، ناصر اور اجمل وغیرہ کی حرکات وسکنات پر تھوڑا بہت شک تھا۔ رستم نے احتیاطاً اس سے گاڑی کی چابی لے لی۔ آستانے کے دائیں طرف کچھ فاصلے پر زمین کے ایک وسیع رقبے پر تعمیر کا ابتدائی کام ہو رہا تھا۔ ایک شخص نے تصدیق کی کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں حضرت قدرت اللہ کا نیا آستانہ بنے گا۔ ناصر نے شکر کولا بیچنے والے ایک ریڑھی بان سے پوچھا۔ ''حضرت پیر صاحب آستانے میں ہی ہیں؟''

''آہو بھائی! اندر ہی ہیں۔'' ریڑھی بان نے جواب دیا۔ ''پر اب عام لوگوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ اب تین بجے کے بعد ملاقات دوبارہ شروع ہو گی لیکن رش بہت ہے۔ باری مشکل سے ہی آئے گی۔ جن لوگوں کو پتا ہوتا ہے وہ صبح سویرے ہی آ جاتے ہیں۔''

''اس وقت کیا کر رہے ہیں حضرت صاحب؟'' ناصر نے پوچھا اس کے ساتھ ہی ریڑھی والے کو دو گلاس شربت کا آرڈر بھی دے دیا۔

وہ بڑے سائز کے میلے کچیلے گلاسوں میں شربت انڈیلتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک سے تو پتا نہیں، مگر آج منگل ہے۔ اس وقت بیٹھک ہوتی ہے۔ حضرت صاحب اور ان کے خاص مرید علیحدہ کمرے میں گل بات کرتے ہیں۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''ہوا کیا ہے تمہارے بچے کو؟''

''چھپاکی نکلی ہوئی ہے۔ تیز بخار بھی ہے۔'' ناصر نے سیدھے سادے دیہاتی لہجے میں کہا۔

''یہ تو بہت مشکل ہے کہ آج حضرت صاحب سے تمہاری ملاقات ہو جائے۔ اگر تم کہیں دور سے آئے ہو تو پھر تمہیں رات یہیں گزارنا پڑے گی۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہوا تو میں تمہاری رہائش کا انتظام کر سکتا ہوں۔ زیادہ کرایہ نہیں ہو گا۔ صرف چار سو روپیہ رات کا۔ کھانے کا بندوبست بھی ہو جائے گا.....'' ریڑھی بان اپنے فائدے کی باتیں کرنے لگا۔

پانچ چھ منٹ نکل گئے تو رستم اور ناصر آستانے کے صدر دروازے کی طرف روانہ

www.pdfbooksfree.pk

ہوئے۔ یہ درحقیقت ایک وسیع حویلی کا پھاٹک تھا۔ ان کی کارروائی کا مشکل مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ صدر دروازے پر محافظوں نے ان کے نام پوچھے اور آنے کی غرض دریافت کی۔ رستم اور ناصر نے اپنے فرضی نام بتائے۔ ان کے نام پتے ایک رجسٹر میں درج کر لیے گئے۔ اس کے بعد تلاشی ہوئی اور انہیں اندر روانہ کر دیا گیا۔ حویلی میں خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ سادہ لوح عقیدت مند مختلف جگہوں کو بوسے دے رہے تھے اور ماتھا ٹیک رہے تھے۔ عقیدت مندوں میں عورتیں زیادہ تھیں۔ اکثر کے ساتھ چھوٹی اور بڑی عمر کے بچے بھی تھے۔

رستم اور ناصر مستحکم قدموں سے چلتے ہوئے اگلی چیکنگ پر پہنچے۔ یہاں بہت اچھی طرح ان کی تلاشی لی گئی..... اور گتے کا بنا ہوا ایک ٹوکن تھما دیا گیا۔ ٹوکن پر نمبر لکھا تھا۔ رستم اور ناصر ایک چھوٹے سے دروازے سے گزر کر ایک ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ وہ فرش پر بیٹھے تھے۔ حالانکہ جنریٹر کے ذریعے پنکھے چل رہے تھے، اس کے باوجود لوگ پسینے سے شرابور ہو رہے تھے۔ اسی طرح کا ایک اور ہال سامنے بھی نظر آ رہا تھا، یہاں صرف عورتیں تھیں۔ بچوں کے بولنے اور رونے چلانے کی آوازیں در و دیوار میں گونج رہی تھیں۔ رستم اور ناصر آخری کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ رستم نے ساتھ بیٹھے ایک بیمار صورت شخص سے پوچھا۔ ''حضرت صاحب کہاں ہیں؟''

اس نے دائیں طرف ایک بند دروازے کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور نحیف آواز میں بولا۔ ''وہاں بیٹھک ہو رہی ہے۔''

یہ سفید دروازہ اس ہال کمرے سے تھوڑا ہٹ کر دائیں جانب تھا۔ ایک تنومند گارڈ دروازے کے سامنے چوکس کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بھاری بھرکم لٹھ اور دوسرے میں تسبیح تھی۔ تاہم وہ کلین شیو تھا اور اس نے آنکھوں پر سیاہ شیشوں کی عینک چڑھا رکھی تھی۔

رستم اور ناصر نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ صورتِ حال موافق تھی۔

رستم نے حددرجہ ذہین [illegible] اس نے ٹوکن ناصر سے لے لیا۔ یہ باہر جانے کے لیے ضروری تھا۔ ابھی رستم اٹھنے اور واپس [illegible] کے پاس پہنچنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک سفید دروازہ کھلا۔ دروازے پر موجود تنومند محافظ نے رکوع کے بل جھک کر تعظیم پیش کی۔ قدرت اللہ تیز قدموں سے باہر نکلا۔ اس کے کان سے موبائل لگا ہوا تھا۔ وہ حسبِ معمول پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس کے پیچھے اس کے دو چیلے تھے۔ ان میں سے لمبے بالوں والے شاہی کو رستم نے صاف پہچانا۔ قدرت اللہ کو دیکھتے ہی اردگرد موجود بہت سے عقیدت مند اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ پیشانیوں تک لے جا کر سلام کیا۔ قدرت اللہ فون پر بات کرتا ہوا

اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا عمارت کے اندرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ اس کے باقی چیلے کمرے کے اندر ہی موجود رہے۔

رستم اور ناصر دل مسوس کر رہ گئے۔ رستم نے سرگوشی کی۔ ''میرا خیال ہے کہ خبیث نکل گیا ہے۔ اب کمرے میں واپس نہیں آئے گا۔''

''جی ہاں۔ ہم دس پندرہ منٹ تک لیٹ ہو گئے ہیں۔'' ناصر نے جوابی سرگوشی کی۔

''پھر اب کیا کرنا ہے؟ باقی سارے شیطان تو کمرے میں ہیں۔''

''لیکن جب سرغنہ ابلیس ہی نہیں تو فائدہ؟'' ناصر نے کہا۔

''اچھا میں باہر جا کر اصل کو صورتِ حال بتاتا ہوں۔ اس بات کی اُمید تو ہے کہ شاید وہ دوبارہ کمرے میں آئے..... کیونکہ بیٹھک ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ اگر وہ دوبارہ آتا ہے تو یہ ہماری خوش قسمتی ہو گی۔ ایسے میں تم فوراً مجھے موبائل پر اطلاع دو گے۔''

ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔ رستم باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے اندر جھنجلاہٹ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا، کیا قدرت اللہ بھی آج اسی طرح بچ جائے گا جس طرح چند دن پہلے ڈپٹی ریاض بچا ہے؟

پہلی چیکنگ کے مرحلے سے گزرنے کے بعد وہ صدر دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا جب اس نے چند مرد و زن کو بائیں طرف ایک راستے پر مڑتے دیکھا۔ ایک دو افراد کے ہاتھ میں اسے لوٹے بھی نظر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اس طرف پیشاب اور طہارت وغیرہ کی جگہ ہے۔ رستم بھی صدر دروازے کی طرف جاتے جاتے اس راستے پر مڑ گیا۔ یہاں آگے جا کر ایک قطار میں بہت سے باتھ روم بنے ہوئے تھے۔ اگلی قطار کے پیچھے دو قطاریں اور تھیں۔ وہ سب سے پچھلی قطار کے ایک خالی باتھ روم میں چلا گیا۔ یہ سب باتھ روم لوہا فلش تھے اور یہاں ہلکی سی بُو بھی تھی۔ ہر باتھ روم کی عقبی دیوار میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے ایک چوکور کھڑکی تھی جس میں جالی لگائی گئی تھی۔ رستم نے اس جالی میں سے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہاں حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ اسے چھوٹے بڑے درخت دکھائی دیئے۔ یہاں آمد و رفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کوئی پہرے دار بھی دکھائی نہیں دیا۔ رستم کے اندر ترنگ سی پیدا ہوئی۔ اس نے جھک کر اپنی جوتی اتاری۔ جوتی کے موٹے تلوے میں ایک تیز دھار چاقو کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ اس چاقو کا دستہ پتلا لیکن مضبوط تھا۔ چاقو کا پھل دو دھاری تھا اور ایک دھار کی طرف چھوٹے چھوٹے دندانے تھے۔

اگلے دو تین منٹ کے اندر رستم نے اس چاقو کی مدد سے کھڑکی کی بوسیدہ جالی پھاڑ دی

www.pdfbooksfree.pk

اور ہاتھ رومزکی عقبی جانب نکلنے کے لیے راستہ بنالیا۔ وہ تھوڑی دیر تک احتیاط سے اردگرد کا جائزہ لیتا رہا پھر بڑی مہارت سے اپنے جسم کو چوکور خلا میں سے گزار کر دوسری طرف لے گیا..... قسمت نے یاوری کی، آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔ وہ عام سے انداز میں چلتا ہوا ان گھنے درختوں میں آ گیا جو بیرونی دیوار کو اپنے عقب میں چھپائے ہوئے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ کھڑکی کی پھٹی ہوئی جالی کسی بھی وقت کسی کی نگاہ میں آ سکتی تھی۔ درختوں کے اندر ہی اندر چلتا ہوا وہ عمارت کے رہائشی حصے کی طرف آیا۔ وہ جانتا تھا کہ قدرت اللہ دوپہر کے کھانے اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے اسی رہائشی حصے میں آیا ہو گا..... اچانک رستم کو ایک الگ تھلگ اور تنگ سا زینہ نظر آیا۔ وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اس زینے کی طرف بڑھا۔ ابھی وہ زینے میں داخل ہوا ہی تھا کہ اوپر سے آنے والی ایک آواز نے اسے ٹھٹکا دیا۔

''کون ہے بھئی؟'' ایک شخص پکارا۔ رستم نے دیکھا یہ قدرت اللہ کا چیلا شاہی تھا۔ اس کے تیل میں چپڑے ہوئے بال اور سرمہ لگی آنکھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک دم چوکنا سا ہو گیا تھا۔ رستم کو محسوس ہوا کہ اگر اسے کسی طرح کا شک پڑ گیا تو وہ ایک دم چلانا شروع کر دے گا اور ارد گرد موجود محافظ متوجہ ہو جائیں گے۔

رستم نے مسکین آواز میں کہا۔ ''چھوٹے حضرت صاحب! میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' یہ آٹھ دس الفاظ کہتے ہوئے رستم زینے طے کر کے شاہی کے بالکل قریب پہنچ گیا پھر اچانک ہی شاہی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ رستم نے دفعتاً جھپٹا مار کر شاہی کو جکڑ لیا۔ اس کا دایاں بازو شاہی کی گردن سے یوں لپٹا کہ اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل سکی۔ رستم کے بائیں بازو نے شاہی کو کمر سے یوں جکڑا کہ اس کے دونوں بازو بھی اس شکنجے میں آ گئے۔ شاہی کے چربیلے جسم میں جنگلی بھینسے کی سی طاقت تھی۔ وہ جوان تھا، اس کے باوجود مرغن خوراکوں کی وجہ سے اس کی توند نکلی ہوئی تھی۔ اگلے پانچ چھ سیکنڈ میں اس نے اپنی گردن بازو کے خوفناک شکنجے سے آزاد کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ یہ اپنی جان بچانے کا ایک فطری عمل تھا مگر..... وہ اپنے حصے کی تمام بھنی ہوئی مرغیاں اور مچھلیاں کھا چکا تھا۔ وہ تمام سادہ لوح عورتیں بھی اس کے ہاتھوں خراب ہو چکی تھیں جن کی قسمت میں خراب ہونا لکھا تھا۔ آج اس حویلی کے ان نیم تاریک زینوں میں اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ اس کی موٹی گردن پر رستم کی گرفت نہایت مہلک اور ناقابلِ شکست تھی۔ وہ اصل میں اجمل خان کا شکار تھا لیکن زندگی موت کے کھیل میں کبھی شکار اور شکاری بدل بھی جاتے ہیں۔

وہ رستم کی گرفت میں پھڑکتا رہا۔ اس کا منہ کھل گیا۔ آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ اس نے قے کی، جو اس کے گلے تک آ کر پھر اس کے پیٹ میں واپس چلی گئی۔ اس کی مزاحمت کمزور ہوتی گئی اور ختم ہو گئی۔ رستم اس کے چربی دار جسم کو گھسیٹتا ہوا بالائی زینے تک لے آیا۔ شاہی کے سر پر لگے ہوئے سرسوں کے تیل اور گھٹیا عطر کی خوشبو رستم کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ بالائی زینے پر پہنچ کر رستم نے احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا۔ ایک خالی برآمدہ دکھائی دیا۔ زینوں کے بالکل پاس ایک کمرے کا ادھ کھلا دروازہ تھا۔ یہاں کا ٹھ کباڑ نظر آیا۔ رستم شاہی کی لاش کو گھسیٹتا ہوا اس کمرے میں لے گیا۔ یہاں ایک پھٹا پرانا شامیانہ پڑا تھا۔ رستم نے شاہی کی تلاشی لی کہ شاید کوئی ہتھیار مل جائے مگر کوئی ہتھیار نہ مل سکا۔ رستم نے لاش کو شامیانے کے کپڑے کے نیچے کر دیا اور محتاط قدموں سے باہر نکل آیا۔ تیز دھار چاقو اس کی بغل جیب میں تھا اور کسی بھی وقت اس کے ہاتھ میں آ سکتا تھا۔

یہ حویلی کی بالائی منزل تھی اور قدرے سنسان محسوس ہو رہی تھی۔ رستم ایک اندرونی راہداری میں چلا گیا۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ ایک کھڑکی میں سے اس نے نیچے دیکھا۔ لنگر کھل گیا تھا۔ لنگر لینے والوں کی دو طویل قطاریں نظر آ رہی تھیں یکایک قریب سے ابھرنے والی کچھ آوازوں نے رستم کو چونکایا۔ یہ آوازیں ایک اندرونی کمرے میں سے آ رہی تھیں۔ رستم نے چاقو ہاتھ میں لے لیا اور بند دروازے کی طرف بڑھا۔ اندازہ ہوا کہ دو عورتیں بول رہی ہیں۔ ایک جوان عورت بڑے تند لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ رستم نے ایک کھڑکی سے کان لگائے۔ یہ ایک لڑکی تھی۔ وہ چیخ کر بولی۔ ''میں نے کہا ہے ناں ماسی! میں نے نہیں نہانا..... نہیں نہانا۔''

''اچھا..... چل خیر سر ہی دھو لے۔ دیکھ، بال کس طرح رتے بن گئے ہیں۔''

''نہیں، بالکل ٹھیک ہیں۔'' روہانسی آواز میں کہا گیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بڑی عمر کی عورت بولی۔ ''اچھا پھر کپڑے بدل لے۔ بالکل میلے ہو رہے ہیں۔ حضرت جی تیرے پاس آئیں گے تو انہیں بُو آئے گی۔''

''تو آئے ان کو بُو..... میں تو کہتی ہوں، اس بُو سے..... مر جائیں وہ۔''

عورت گھبرا کر بولی۔ ''ہائے میں مرگئی۔ کیسی باتیں کرتی ہے تُو۔ خدا سے ڈر..... اللہ والوں کے بارے میں اس طرح کی باتیں نہیں کرتے، وہاں ہے۔ اور وہ تو تیرے سر کے سائیں بھی ہیں۔''

''کوئی نہیں میرے سر کا سائیں..... کوئی نہیں۔'' لڑکی چلا کر بولی۔ ''میرے ساتھ جو

www.pdfbooksfree.pk

کچھ کیا گیا زبردستی کیا گیا۔ مجبور کر کے کیا گیا۔ میں کسی کو نہیں مانتی۔''

''تیرے نہ ماننے سے کیا فرق پڑ جائے گا۔ جو ہے وہ تو ہے ہی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ تُو ناقدری کر رہی ہے۔ حضرت صاحب نے تجھے عزت دی ہے۔ پھولوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔''

''اللہ کرے وہ تیری دھی کو بھی اسی طرح عزت دیں اور پھولوں کی طرح رکھیں۔ تُو چلی جا یہاں سے..... میں کہتی ہوں چلی جا۔'' لڑکی کرب ناک آواز میں بولی۔ اس نے شاید عورت کو دھکا دیا تھا۔ بہرحال عورت اندر ہی موجود تھی۔

رستم نے دروازے کے کی ہول میں سے جھانکنے کی کوشش کی۔ اسے ایک لڑکی پہلو کی طرف سے دکھائی دی۔ اس کے دونوں بازوؤں پر کہنیوں سے لے کر کلائیوں تک پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ پھر لڑکی کی تلخ آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔ وہ بڑی عمر کی عورت سے کہہ رہی تھی۔ ''ایک مہینہ ہو گیا ہے، مجھے یہاں روتے کرلاتے ہوئے۔ کوئی میری فریاد نہیں سنتا اور تم کہتی ہو مجھے پھولوں کی طرح رکھا گیا ہے۔ خدا کے لیے..... خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ مجھے جانے دو میرے گھر والوں کے پاس۔''

رستم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ لڑکی کہہ رہی تھی کہ وہ ایک مہینے سے یہاں بند ہے۔ اس کے دونوں بازو بھی زخمی تھے۔ وہاں گاؤں میں بھی لوگوں نے یہی بتایا تھا کہ فضلو کی لڑکی اغوا ہوئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ اس نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگائی تھی اور اس کے دونوں بازو بھی زخمی ہوئے تھے..... کہیں..... یہ وہی لڑکی شاہدہ تو نہیں تھی؟

لیکن پھر فوراً دوسرا خیال رستم کے ذہن میں آیا۔ شاہدہ والے معاملے میں تو راجا نواز ش نامی زمیندار کا نام آ رہا تھا۔ پھر ایک دوسری بات بھی تھی۔ قدرت اللہ کے لیے عورتوں کی کیا کمی ہو سکتی تھی۔ وہ ایک عرصے تک تین بیویوں کا بلاشرکت غیرے مالک رہا تھا۔ اب بھی اس کی سینکڑوں مریدنیوں میں سے کوئی بھی اس کے اشارے پر مسز حضرت صاحب بن سکتی تھی۔ اسے ایک مزارسے کی لڑکی کو زبردستی اپنے بیڈروم میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس نے دائیں بائیں دیکھا اور ایک بار پھر رکوع کے انداز میں جھک کر کی ہول سے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ کی ہول کے سامنے تھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں رستم نے لڑکی کو دیکھا اور اس کی صورت ذرا جانی پہچانی سی لگی۔ اسی دوران میں رستم کو اندازہ ہوا کہ بڑی عمر کی عورت کمرے سے باہر آ رہی ہے۔ اس کی فقط ٹانگیں ہی رستم کو دکھائی دے رہی تھیں۔

رستم جلدی سے ایک چوکور ستون کی اوٹ میں چلا گیا۔ چالیس پینتالیس سال کی فربہ اندام عورت کمرے سے نکلی اور راہداری میں گم ہو گئی۔ رستم نے دائیں بائیں دیکھا اور دروازے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے دروازے کو دو تین بار ہولے سے ہلایا، دروازہ کھلا تھا مگر رستم نے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ چند سیکنڈ بعد لڑکی نے دروازہ کھولا اور تعجب سے رستم کو دیکھا۔ ''کون ہو تم؟'' اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

''میں تمہاری مدد کے لیے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے گاؤں سے۔''

وہ ایک دم خوف زدہ ہو گئی۔ ''مم..... میں تمہیں نہیں جانتی۔''

''لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم راجا نوازش کو جانتی ہو ناں؟'' رستم نے اندھیرے میں تیر چھوڑا۔

اندازہ ہوا کہ یہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ لڑکی کا خوف قدرے کم ہوا۔ ''کہاں ہے راجا نوازش؟'' وہ ہکلائی۔

''اس کو بھی تمہارے سامنے لے آؤں گا۔ فی الحال میں تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے آیا ہوں۔ میرے کچھ ساتھی بھی ہیں یہاں۔ تم چاچا فضلو کی بیٹی ہو ناں؟''

اس نے اپنا سر بے ساختہ اثبات میں ہلا دیا۔ یہ دوسرا تیر بھی عین نشانے پر پہنچا تھا۔ یہ فضلو ہی کی بیٹی تھی۔ رستم نے سوچا بھی نہ تھا کہ قدرت اللہ کے آستانے میں اس طرح اس لڑکی سے ملاقات ہو جائے گی۔ ''اندر آنے کا نہیں کہو گی؟'' رستم نے پوچھا۔

اس مرتبہ وہ جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کے دونوں بازو پلاستر میں جکڑے ہوئے تھے اور وہ قابلِ رحم دکھائی دے رہی تھی۔ روشنی میں رستم نے ذرا غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور اس کے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ رستم کو محسوس ہوا کہ اس لڑکی کی شکل کافی حد تک قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی صدف سے ملتی ہے۔ اگر زیادہ نہیں تو ستر اسی فیصد مشابہت ضرور موجود تھی۔ صدف ملتان کے آستانے میں ہلاک ہو چکی تھی۔ رستم کو معلوم تھا کہ قدرت اللہ نے اس کا بہت سوگ منایا ہے۔

''تم صدف کی رشتے دار ہو؟'' رستم نے اس کے چہرے کی طرف انگلی اٹھائی۔

''شاید تم قدرت اللہ کی چھوٹی بیوی کی بات کر رہے ہو؟''

رستم نے اقرار میں سر ہلایا۔

''نہیں، میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں۔''

''مگر تمہاری شکل اور قد کاٹھ کافی حد تک اس سے ملتا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''یہی تو میری بدقسمتی ہے۔'' لڑکی کراہی۔ ''اپنے اسی ناکردہ گناہ کی سزا میں، مَیں یہاں ہوں۔ قدرت اللہ کو اس کی مری ہوئی بیوی تو نہیں مل سکتی مگر میں کرماں ماری اس کے ہتھ آ گئی ہوں۔'' وہ سسک پڑی۔

ایک دم بات رستم کی سمجھ میں آنا شروع ہوگئی۔ اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ''راجا نوازش اس بہروپیے قدرت اللہ کا مرید ہے؟''

''ہاں۔ جب سے راجا کا بیٹا پھانسی سے جھولا ہے، راجا، قدرت اللہ کے پاؤں میں بیٹھنے لگا ہے۔ قدرت اللہ کی ہر جائز ناجائز خواہش پوری کرنا وہ اپنا دین ایمان سمجھتا ہے..... اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے ہی اس کُتے نے مجھے اس دوزخ میں ڈالا ہے۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ پہلے وہ اپنے کسی جاننے والے کے لیے میرا رشتہ مانگتا رہا پھر مجھے زبردستی یہاں لے آیا۔ اس کا جاننے والا یہی قدرت اللہ تھا۔'' وہ آنسوؤں سے رونے لگی۔

رستم نے کہا۔ ''دیکھو..... یہ سب باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ ابھی ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ میں تمہیں جیسے بتاتا ہوں تم نے ویسے ہی کرتے جانا ہے۔'' رستم نے اپنا چہرہ اس کے کان کے قریب کرلیا اور اسے جلدی جلدی سمجھانے لگ گیا۔

اچانک لڑکی شاہدہ بری طرح بدک گئی۔ اس کے بدکنے کی وجہ قدموں کی وہ چاپ تھی جو راہداری سے سنائی دے رہی تھی۔

''قدرت اللہ آ رہا ہے۔'' وہ ہکلائی۔

''گھبراؤ مت، وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' رستم نے ایسے لہجے میں تسلی دی کہ ایک ہی لمحے میں شاہدہ کے خوف میں نمایاں کمی واقع ہوگئی۔ وہ سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھ رہی تھی۔ رستم بڑی تیزی سے ایک الماری کے پیچھے چلا گیا۔

چند سیکنڈ بعد دروازے پر شائستہ دستک ہوئی اور قدرت اللہ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سنہری ڈبا تھا۔ اس نے شاہدہ کو سرتاپا دیکھا اور قدرے ناراضگی سے بولا۔ ''تم نے آج بھی کپڑے نہیں بدلے۔''

''بب..... بس..... یونہی..... شام کو بدل لوں گی۔'' لگتا تھا کہ وہ قدرت اللہ کی آسیبی شخصیت کے سامنے کافی مرعوب رہتی ہے۔

پہلے تو یوں لگا کہ قدرت اللہ کوئی سخت بات کہے گا مگر پھر وہ ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے سنہری ڈبا کھولا۔ اندر سفید موتیوں کا ہار تھا۔ قدرت اللہ بولا۔ ''یہ کراچی کے ایک میمن صاحب تحفے کے طور پر لائے ہیں۔ بالکل اصلی موتی ہیں..... میمن والے۔ آج کل

ایسے موتی کہاں ملتے ہیں.....''

وہ گردن جھکائے بیٹھی تھی۔ قدرت اللہ ہار اس کے گلے میں ڈالنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ جو غیب دانی کے دعوے رکھتا تھا اور بڑی اعلیٰ قسم کی پیشین گوئیاں کرتا تھا، اس بات سے بے خبر تھا کہ اس سے صرف چند فٹ کے فاصلے پر اس کا خطرناک ترین دشمن موجود ہے۔ وہ دشمن جسے ڈیڑھ دو سال پہلے مُردہ سمجھ لیا گیا تھا، اب اجل بکف اس کی پشت پر کھڑا تھا۔ جب وہ ہار پہنانے میں مصروف تھا، رستم الماری کی اوٹ سے نکلا۔ اس نے شکاری چیتے کی طرح چند قدم احتیاط سے اٹھائے پھر ایکا ایکی اس پر جھپٹ پڑا۔ رستم کی پکڑ میں آنے سے ایک سیکنڈ پہلے شاید قدرت اللہ کو خطرے کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنا اور گھومنا چاہا تھا مگر تب تک رستم کے بازو کا شکنجہ اس کی گردن میں فٹ ہوگیا۔ قدرت اللہ نے دہشت کے عالم میں اپنے گلے سے گھٹی گھٹی آواز نکالی مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ ویسے اس نے رستم کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ اس جھلک کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں گہری حیرت چمکی تھی۔ غالباً اس کی نہایت تیز نظروں نے رستم کو پہچان لیا تھا۔ اس پہچان کے ساتھ ہی اس نے سوچا تھا کہ وڈے ڈیرے پر فنا ہو جانے والا شخص کس کلیے کے تحت دوبارہ زندہ ہوا ہے اور اس کی گردن تک پہنچا ہے؟ رستم نے بڑی بے رحمی سے اس کا سر دو مرتبہ کمرے کی پختہ دیوار سے ٹکرایا۔ دوسری ٹکر کچھ زیادہ ہی شدید تھی۔ قدرت اللہ مُردہ چھپکلی کی طرح رستم کے بازوؤں میں جھول گیا۔ رستم نے اس عزت مآب کو کسی حقیر شے کی طرح شاہدہ کے قدموں میں لٹا دیا۔ شاہدہ کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور اس نے اپنا منہ اپنے دونوں زخمی ہاتھوں میں دبا رکھا تھا۔

رستم نے اس کا شانہ سہلا کر اسے تسلی دی۔ وہ فرش پر ہی بیٹھ گئی اور اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

رستم نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگا دی اور اپنا موبائل فون نکال لیا۔ کام شروع ہو چکا تھا۔ اب وہ ہر خطرے سے بے نیاز تھا۔ اس نے پہلے ناصر کو فون کیا۔ ناصر ابھی تک اپنے بچے کے ساتھ انتظار گاہ میں ہی تھا۔ فون پر لوگوں کے بولنے اور بچوں کے رونے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ رستم نے پوچھا۔ ''چیلے بیٹھک میں ہی ہیں۔''

''ہاں جی، ابھی تک تو بیٹھک میں ہیں لیکن قدرت اللہ واپس نہیں آیا۔''

''وہ اب نہیں آئے گا..... تم چوکس ہو جاؤ..... ابھی تھوڑی دیر میں اجمل گاڑی لے کر اندر گھسنے والا ہے۔ عام لوگوں کو بھگا دو۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے لیکن بیٹھک والوں

www.pdfbooksfree.pk

میں سے کوئی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ اُڑا دو سب حرامیوں کو۔'' رستم کے لہجے میں درندگی تھی۔

''مگر قدرت اللہ اور شاہی۔''

''سمجھو وہ اب نہیں ہیں۔'' رستم نے اسی لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔

اس کے بعد رستم نے اجمل کو فون ملایا۔ وہ رستم کی ہدایت کے مطابق صدر دروازے سے باہر ٹیکسی کار میں ہی تھا۔ ''ہاں جوان..... ریڈی؟'' رستم نے جوشیلے لہجے میں کہا۔

''ایک سو دس پی صدر ریڈی۔''

''اسلحہ سیٹ پر؟''

''جی ہاں اسلحہ سیٹ پر۔''

''ہینڈ گرینیڈ جیبوں میں؟''

''ہاں جی۔ واسکٹ کی جیبوں میں۔''

''ٹھیک ہے، گاڑی ڈرائیو کر کے سیدھی اندر گھسا دو۔ ناصر تمہیں بتائے گا کہ بیٹھک کہاں ہے۔ بیٹھک میں سے کوئی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں جی۔ ایک دم صپایا ہو گا۔ چوہے کا بچہ بھی زندہ نہیں نکلے گا۔'' اجمل کی آواز سنسنی کے سبب کانپ رہی تھی۔ پھر جیسے اسے ایک دم یاد آیا۔ وہ رستم کو مخاطب کر کے بولا۔ ''لیکن آپ ام کو کہاں ملے گا۔''

''مجھ کو چھوڑو۔ میں اپنے حساب سے پہنچ جاؤں گا۔ تم بس کام کر کے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔'' رستم کے لہجے میں ہلکا سا تحکم تھا۔

''ٹھیک ہے رستم بھائی! اگر زندہ بچ گئے تو اس موقع کے حوالے سے ام آپ کو ایک بڑا اچھا شعر سنائے گا۔''

اجمل سے سلسلہ منقطع کرنے کے بعد رستم شاہدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم ایک بڑی چادر میں خود کو اچھی طرح لپیٹ لو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں فائرنگ شروع ہو جائے گی اور ایک دو دھماکے ہوں گے۔ ڈرنا نہیں..... دھماکے ہونے کے فوراً بعد آس پاس کے لوگ نیچے بھاگیں گے۔ اس وقت ہم بھی یہاں سے نکلیں گے اور نیچے پہنچ جائیں گے۔ وہاں ایک گاڑی کھڑی ہے۔ ہم اس میں سوار ہوں گے اور نکل جائیں گے۔''

شاہدہ نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اثبات میں سر ہلایا۔ وہ شاداب جسم اور جاذب نظر چہرے والی لڑکی تھی لیکن یہاں کی قید اور سنگدلی نے اسے مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی دونوں کلائیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور وہ اسی حالت میں قدرت اللہ کی محبت یعنی دست

درازی کا شکار تھی۔

اچانک رستم کے ذہن میں ایک بات آئی۔ اس نے فرش پر بے ہوش پڑے قدرت اللہ کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک جیب میں سے اسے مطلوبہ شے مل گئی۔ یہ ایک بھرا ہوا نائن ایم ایم پسٹل تھا۔ رستم نے پسٹل اپنی جیب میں منتقل کر لیا۔ لڑکی نے چادر لے لی اور اپنا تین چوتھائی چہرہ چادر میں چھپا لیا۔ وہ دونوں اب بالکل تیار تھے۔ قریباً ڈیڑھ دو منٹ سخت تناؤ میں گزرے۔ پھر نیچے کہیں سے شور سنائی دیا۔ ایک ساتھ بہت سے لوگوں کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ آستانے کے وسط میں کارروائی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد پہلے فائر ہوئے۔ رستم نے پہچان لیا۔ یہ کولٹ پسٹل کے فائر تھے۔ کولٹ پسٹل یقیناً اجمل خان کے ہاتھ میں تھا اور اجمل کا نشانہ چوکتا نہیں تھا۔ وہ یقیناً مسلح پہرے داروں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ آستانے کی بالائی منزل پر بھی بھگدڑ مچ گئی تھی۔ رستم اور شاہدہ بھی بھاگنے کے لیے تیار ہو گئے۔

☆=======☆=======☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

جب رستم کا فون آیا تو اجمل کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو تھا۔ وہ اسلحہ نکال کر سیٹ پر رکھ چکا تھا اور چھ میں سے تین دستی بم اس کی جیبوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ باقی تین بم گولیوں والے بیگ میں گولیوں کے ساتھ ہی موجود تھے۔ کینوس کا یہ بیگ اجمل کے گلے سے جھول رہا تھا۔ اجمل جانتا تھا کہ یہ "M67" بم ہیں۔ ان پر ایم 67 فریگ مینیشن لکھا ہوا تھا۔ عام دستی بموں کی طرح ان کی بیرونی سطح خانے دار اور غیر ہموار نہیں بلکہ ملائم تھی۔ کسی کمرے میں لڑھکانے یا دور تک پھینکنے کے لیے یہ بڑے کارگر تھے۔ رستم نے اسے بتایا تھا کہ یہ پانچ میٹر کے قطر میں بندے کی جان لے لیتے ہیں اور ان کے زخمی کرنے کی حد پندرہ میٹر قطر کا دائرہ ہے۔ اجمل کو یقین تھا کہ آج یہ بم مہلک ترین ثابت ہوں گے۔

اور پھر موبائل فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف رستم بھائی تھے۔ ''ہاں جوان ریڈی؟'' رستم نے پوچھا۔

''ایک سو دس پی صدر یڈی جی۔''

''اسلحہ سیٹ پر؟''

''جی ہاں، اسلحہ سیٹ پر۔''

''ہینڈ گرینیڈ جیبوں میں؟''

''ہاں جی، واسکٹ کی جیبوں میں۔''

اس کے بعد رستم نے اجمل کو ٹیک کی ہدایت کی۔

اجمل کے سینے میں دھڑکن کا نقارہ بجنے لگا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اٹھیں۔ وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے اس نے چند مرتبہ ایکسلریٹر دبا دیا۔ ٹیکسی کا رخ موڑ کر آستانے کے پھاٹک کی طرف کیا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے

www.pdfbooksfree.pk

ٹیکسی کو پھاٹک کی طرف روانہ کر دیا۔ طاقتور کولٹ پسٹل اجمل کے دائیں ہاتھ میں تھا اور یہ دایاں ہاتھ پسٹل سمیت اسٹیئرنگ پر تھا۔ گیٹ پر موجود محافظوں نے خوف کے عالم میں کار کو گیٹ کی طرف بڑھتے دیکھا۔ ان میں سے ایک جو زیادہ پھرتیلا تھا۔ چلایا۔ ''اوئے۔''

شاید وہ کچھ اور بھی کہتا مگر اجمل کے کولٹ پسٹل کی گولی بالکل نشانے پر یعنی محافظ کے کھلے ہوئے منہ میں لگی۔ وہ جھٹکے سے پیچھے کی طرف گیا۔ دوسرے محافظ نے اپنا دایاں ہاتھ رائفل کی طرف بڑھایا مگر اگلے ہی لمحے وہ بھی اپنی پیشانی پر سرخ بندیا لگوا کر گیٹ کے پٹوں بیچ گرا۔ کار اس کے جسم کو کچلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ دوسری چیکنگ تک پچیس تیس میٹر کا فاصلہ کار نے پلک جھپکتے میں طے کیا اور ٹوکن دینے والے دو افراد سے ٹکرائی۔ وہ چلاتے اور ہوا میں اچھلے ہوئے نظر آئے۔ ٹیکسی کار نے دھکے کے ساتھ ایک کشادہ دروازے کو توڑا۔ دروازہ چکنا چور ہوا اور اس کے ساتھ ہی ٹیکسی کار کی ونڈ اسکرین بھی ٹوٹ گئی۔

رستم کی ہدایت کے عین مطابق اجمل نے کار ایک سفید دروازے سے چند میٹر کے فاصلے پر ایک سنہری رنگ کے بڑے فانوس کے نیچے روکی۔ ناصر اور ڈولا دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچے۔ اجمل نے اے کے 52 رائفل ناصر کی طرف اچھالی اور ایل ایم جی خود سنبھال لی۔

''وہ سامنے سفید دروازہ ہے۔'' ناصر نے پکار کر کہا۔

''سب اندر ہی ہیں؟''

''ہاں، ابھی اندر ہی ہیں۔'' ناصر نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی رائفل سے تین سنگل شاٹ چلائے۔ ایک مسلح محافظ تڑپ کر گرا اور بھاگتے ہوئے زائرین کے قدموں تلے روندا گیا۔ اسی دوران میں اجمل نے بھی زائرین کو مزید خوف زدہ کرنے کے لیے ایک طویل برسٹ چلا دیا تھا اور پھر سفید دروازہ دھماکے سے کھلا۔ اطلاع کے مطابق اندر قدرت اللہ کے قریباً پندرہ عدد خصوصی چیلے موجود تھے۔ سب سے پہلے لمبے سیاہ بالوں والا ایک دراز قد چیلا نظر آیا۔ اس کے گلے میں مالائیں تھیں اور چہرہ حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے نکل بھاگتا، اجمل نے ایک چھوٹا برسٹ چلایا۔ چیلا چلا کر دائیں طرف گرا، ایک دو گولیاں پچھلے شخص کو بھی لگیں۔ دروازہ زوردار آواز سے بند کر دیا گیا۔

''ان حرامیوں میں سے کسی کو باہر نہیں نکلنا چاہیے۔'' ناصر پکار کر بولا۔

''نہیں نکلے گا۔'' اجمل نے بھی پکار کر جواب دیا اور سامنے زینوں سے اترتے ہوئے ایک گارڈ پر جوابی فائر کیا۔ گارڈ نے گردن میں گولی کھائی اور سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا سر کے

بل فرش پر گرا۔

ڈولا ایک بڑے ستون کی اوٹ میں تھا۔ وہ مار دھاڑ والا شخص نہیں تھا لیکن ایسے موقعوں پر اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا تھا۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس کا رخ انتظار گاہ کی طرف کر کے ہوائی فائرنگ کر رہا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ یہ جگہ عام لوگوں سے بالکل خالی ہو جائے۔ سفید دروازہ بند ہو گیا تھا اور بینچک میں مصروف چیلوں نے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ اجمل نے دروازے پر چند فائر کیے پھر ٹیکسی کار کی اوٹ میں ہو کر دستی بم نکال لیا۔ دائیں ہاتھ میں دستی بم لے کر اس نے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت سے بم کی پن کھینچی اس کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے نے بڑی احتیاط سے بم کے سیفٹی لیور کو دبا رکھا تھا..... وہ جانتا تھا کہ اس لیور کو دبا کر رکھنا ہی بم پھینکنے والے کی زندگی کی ضمانت ہوتا ہے۔ اس نے ہاتھ گھما کر بم سفید دروازے پر پھینکا۔ چند سیکنڈ بعد سماعت شکن دھماکا تھا۔ دھواں پھیلا اور دروازے کے پرخچے اُڑتے نظر آئے۔ اس دوران میں اجمل اور ناصر دو مزید بموں کی سیفٹی پنیں کھینچ چکے تھے۔ فوراً ہی یہ دونوں بم بھی کمرے کے اندر لڑھکا دیئے گئے۔ یہ مہلک ترین حملہ تھا۔ چیلوں سے بھرے ہوئے اس مختصر کمرے میں "M67" بموں کی مار نے تہلکہ مچا دیا۔ کربناک..... اذیت میں ڈوبی ہوئی چیخیں ابھریں۔

''ایک اور پھینکو۔'' ناصر نے پکار کر اجمل سے کہا۔

اجمل نے ایک اور پھینکا۔ یوں لگا جیسے آستانے کا یہ حصہ منہدم ہو جائے گا۔ دو تین لہو لہان چیلے تباہ حال کمرے کے اندر سے نکل کر بھاگے۔ ناصر نے صاف دیکھا، ان میں سے ایک کا بازو کندھے سے غائب تھا۔ دوسرے کی شلوار بس چند چیتھڑوں کی شکل میں باقی رہ گئی تھی۔ اجمل اور ناصر نے بے دریغ فائرنگ کی اور ان کو بھی سفید دروازے کے عین سامنے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

اسی دوران میں دائیں طرف زینوں سے فائرنگ ہوئی۔ دو گولیاں ناصر کے سر کو چھوتی ہوئی گزر گئیں۔ ایک گولی اجمل کے سینے میں بائیں طرف لگی۔ وہ جھٹکے سے فرش پر گرا انگرایل ایم جی بدستور اس کے ہاتھ میں رہی۔

''اجمل.....! اجمل۔'' ناصر اس کی طرف بڑھا۔

گولی اس کے سینے پر ذرا اوپر کندھے کی طرف لگی تھی۔ اس کی قمیص خون سے سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں بھی اس نے دو جوابی فائر کیے اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ناصر کو یہ دیکھ کر قدرے تسلی ہوئی کہ گولی کا اینگل زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ اجمل نے بڑے دھیان

سے بینچک والے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں اب قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ دھوئیں کے پس منظر میں بس جسموں اور کپڑوں کے چیتھڑے دکھائی دیتے تھے۔

''ہمارا خیال ہے، اب نکلنا چاہیے۔'' وہ بولا۔

اجمل کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی ناصر نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اجمل اور ڈولا پھرتی سے پچھلی سیٹ پر چلے گئے۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی تھی اور ڈکی کھلی ہوئی تھی۔ کھلی ڈکی کی وجہ سے اسے ریورس کرنا مشکل تھا۔ ناصر نے اسے یوٹرن دیا اور برق رفتاری سے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں اجمل نے پچھلی نشست سے چند فائر بھی کیے۔ کارکم از کم دو لاشوں کو کچلتی ہوئی صدر دروازے سے نکلتی چلی گئی۔ صدر دروازے سے باہر بھی قیامت برپا تھی۔ عورتیں اور بچے چلاتے شور مچاتے چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ یہاں ان کا راستہ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ احتیاطاً انہوں نے پارکنگ میں کھڑی تین چار گاڑیوں پر چند فائر کیے اور کچھ ٹائروں کو ناکارہ بنا دیا۔

ناصر نے موبائل پر رستم سے رابطہ کیا۔ ''آپ کہاں ہیں رستم بھائی؟''

''میں پاس ہی ہوں..... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔ تم نکل جاؤ..... میں بھی نکل رہا ہوں۔'' رستم کی ہانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

ٹیکسی کار کچے راستے پر دو دو فٹ اچھلتی ہوئی پکی سڑک کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ جھٹکوں کے ساتھ اس کی ڈکی خود بخود ہی بند ہو گئی تھی۔ ونڈ اسکرین کے ٹکڑے جھڑ جھڑ کر گاڑی کے اندر گر رہے تھے۔ اجمل اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا پہلو خون آلود تھا۔

''اجمل، کیسے ہو؟'' ناصر نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''ام کو لگتا ہے کہ ہمارا آخری وقت آ گیا ہے۔'' وہ کراہ کر بولا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟'' ناصر سرتاپا کانپ گیا۔

''ہاں ناصر بھائی، ہمارے پڑدادا کو جنگ آزادی میں ٹھیک اسی جگہ گولی لگا تھا اور وہ ٹھیک چار سال بعد مر گیا تھا..... شوگر کی وجہ سے۔''

ناصر نے چونک کر اجمل کی طرف دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔ اجمل سیریس نہیں تھا۔ اجمل نے اسی لہجے میں کراہتے ہوئے کہا۔ ''ام کو یقین ہے، ام بھی اب چار پانچ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔ ام سوچتا ہے، ہمارے بعد ہمارے بچوں کا کیا ہوگا۔''

''جو بچے ابھی پیدا نہیں ہوئے ان کے لیے پریشان ہو رہے ہو؟'' ناصر نے تیزی سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

''اوہو.....ان کو پیدا کرنے کا پریشانی تو ہے ناں۔''

ناصر نے گاڑی چلاتے چلاتے مڑ کر اجمل کا زخم دیکھا۔ گولی نیچے سے اوپر کو گئی تھی اور کندھے میں کہیں اٹک گئی تھی۔ زخم تکلیف دہ ضرور تھا مگر خطرناک نہیں تھا۔ اپنی تکلیف سے توجہ ہٹانے کے لیے ہی اجمل اِدھر اُدھر کی ہانک رہا تھا۔ ایک ہولناک ہنگامے کے بعد خود کو اعصابی طور پر پُرسکون کرنے کا بھی یہ ایک کارگر طریقہ تھا۔

تب ناصر کی نگاہ ڈولے کے بائیں ہاتھ پر پڑی۔ اس کے ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی جڑ سے غائب تھی۔ یہاں کوئی آوارہ گولی لگی تھی۔ ہاتھ خون آلود ہو رہا تھا۔ ڈولے نے اپنا رومال کس کر زخم پر باندھ دیا تھا۔ ''زیادہ تکلیف تو نہیں؟'' ناصر نے فکرمند لہجے میں پوچھا۔

''نہیں جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' ڈولے نے حوصلے سے کہا۔ گرم نال والا پستول اس کی گود میں رکھا تھا۔

ناصر کی نگاہ بار بار عقب نما آئینے کی طرف اٹھ رہی تھی۔ یہ خدشہ ابھی موجود تھا کہ ان کا تعاقب کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اور اس تعاقب سے نمٹنے کے لیے وہ پوری طرح تیار بھی تھے۔

گاڑی چھانگی دال سے پانچ چھ کلومیٹر آگے آ گئی تو انہیں قدرے اطمینان ہو گیا۔ ناصر نے گاڑی ایک بغلی راستے پر موڑ دی۔ ڈولا کچھ خاموش سا ہو گیا تھا..... خاموش اور مضطرب! پہلے تو ناصر نے سمجھا کہ شاید یہ زخم کی وجہ سے ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ بات کچھ اور تھی۔ اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے اور اس کی غیر معمولی حسیات اسے کوئی وارننگ دے رہی تھیں۔

''کیا بات ہے ڈولے؟ تم پریشان ہو؟'

''نن..... نہیں۔'' اس نے رسمی انداز میں کہا اور چاروں طرف دیکھنا جاری رکھا۔

''کوئی شک ہو رہا ہے تمہیں؟'' اجمل نے پوچھا۔

''ہاں..... لگتا ہے..... لگتا ہے کہ.....'' اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور زیادہ مضطرب نظر آنے لگا۔

''کیوں الجھن میں ڈال رہے ہو؟'' ناصر نے ذرا تلخی سے کہا۔

''لگتا ہے کہ..... کوئی..... اور بھی ہمارے ساتھ..... موجود ہے۔'' ڈولے نے عجیب لہجے میں کہا۔

''کہاں موجود ہے؟'' ناصر ششدر تھا۔

''یہاں..... آ..... آپ ذرا گاڑی روکیں۔''

ناصر نے سٹپٹائے ہوئے انداز میں گاڑی ایک طرف کھیت کے کنارے روک دی۔ دور فاصلے پر دو تین کھیت مزدور اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ کسی ڈیزل انجن کی ''ٹو ٹو'' کے سوا چہار سُو خاموشی تھی۔ ڈولا جلدی سے باہر نکل آیا۔ اس کے ساتھ ہی اجمل اور ناصر بھی آ گئے۔ ڈولے کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت تھی جیسے وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ پا رہا ہو۔ وہ گاڑی کی ڈکی کی طرف بڑھا۔ لگتا تھا کہ ڈکی پوری طرح بند نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ ڈولا ڈکی کی طرف ہاتھ بڑھاتا، وہ ایک جھٹکے سے کھل گئی۔ تڑتڑ کی خوفناک آواز سے خود کار رائفل کا برسٹ چلا۔ ناصر نے ڈولے کو اچھل کر دور گرتے دیکھا۔ ڈکی میں قدرت اللہ کا ایک جنونی مرید موجود تھا۔ وہ ایک دل ہلا دینے والی چنگھاڑ کے ساتھ باہر آیا۔ خوش قسمتی سے اہل ایم جی ابھی تک اجمل کے ہاتھوں میں تھی۔ اس نے جوابی فائر کیا۔ وہ ماہر ترین نشانہ باز تھا مگر جو کچھ ہوا اتنا اچانک اور حواس باختہ کر دینے والا تھا کہ اجمل کا پہلا نشانہ خطا گیا۔ حملہ آور نے دوسرا برسٹ چلانے کے لیے خود کار رائفل سیدھی کی مگر اس سے پہلے کہ وہ لبلبی دبا سکتا، ناصر کے کولٹ پسٹل کی گولی کام کر گئی۔ یہ گولی حملہ آور کے جبڑے میں لگی اور وہ اپنے پہلو پر گرا۔ اس کا چلایا ہوا برسٹ ہوا میں پرواز کر گیا۔ ناصر کی دوسری گولی دوبارہ اس کے چہرے پر لگی مگر وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جنون کی کیفیت میں تھا۔ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ رائفل اس کے ہاتھ سے گر گئی تھی۔ وہ خالی ہاتھ ناصر اور اجمل کی طرف بڑھا۔ ناصر نے پسٹل دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کا رخ جنونی حملہ آور کی طرف تھا مگر ناصر نے تیسری گولی نہیں چلائی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور لمبے بالوں والے حملہ آور نے ناصر اور اجمل کی طرف بس پانچ چھ قدم ہی اٹھائے پھر تیورا کر پانی کے کھال کے پاس گر گیا۔

ناصر اور اجمل لپک کر ڈولے کی طرف گئے۔ اس کے چھوٹے سے سینے میں کم از کم تین گولیاں لگی تھیں۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اجمل خود بھی زخمی تھا مگر وہ اپنا زخم بھول گیا۔ اس نے تڑپ کر ڈولے کو کسی ننھے بچے کی طرح اپنی گود میں بھر لیا۔

''چھوٹو بھائی..... چھوٹو بھائی۔'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں ڈولے کو پکارا اور جھنجوڑا۔

ڈولے نے کھینچ کر سانس لیا اور دھندلائی ہوئی نظروں سے اجمل کو دیکھا۔ اجمل نے پکار کر کہا۔

''ناصر بھائی۔ اس کو ہسپتال لے چلتے ہیں۔ یہ بچ جائے گا..... ام کو یقین ہے، یہ بچ جائے گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

ناصر کی آنکھوں میں مایوسی نظر آ رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ دیکھ چکا تھا کہ ڈولے کی زندگی بچنے کا چانس نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر بھی وہ دونوں اسے کار تک لائے۔ اجمل کی گود میں ڈولے نے ہچکی لی اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں

''چھوٹو..... چھوٹو۔'' اجمل خان پکارتا رہا مگر ڈولا دیکھتے ہی دیکھتے جواب دینے کے مرحلے سے گزر گیا تھا..... ناصر نے نم آنکھوں کے ساتھ ڈولے کی پیشانی چومی اور اجمل نے اسے کسی بچے ہی کی طرح اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔

دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے مزدور ڈرے ڈرے انداز میں موقعہ واردات کی طرف آ رہے تھے..... جیسے وہ قریب آنا چاہ رہے ہوں اور ڈر بھی رہے ہوں۔ اجمل نے ایک شعلہ بار نظر مُڑ کر پڑے جنونی حملہ آور پر ڈالی۔ یہ حملہ آور انہی لوگوں میں سے تھا جو اس سے پہلے دو تین بار شانی بی بی پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ اجمل کے بس میں ہوتا تو وہ اپنی گن کی باقی ساری گولیاں اس شخص کی لاش میں اتار دیتا مگر وقت بہت کم تھا۔ انہیں جلد از جلد یہاں سے آگے بڑھنا تھا۔ ناصر نے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار کو آگے بڑھا دیا۔

ابھی وہ تھوڑا آگے ہی گئے تھے کہ موبائل کی بیل ہوئی۔ ناصر نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف رستم تھا۔

''کہاں ہو ناصر؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ کہاں ہیں؟'' ناصر نے جوابی سوال کیا۔

''میں نہر کے پل کے پاس پہنچ چکا ہوں۔''

''ہم بھی پل کی طرف ہی آ رہے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈھائی تین کلو میٹر دور ہوں گے۔''

''کیا بات ہے ناصر۔ تم پریشان لگ رہے ہو..... اجمل اور ڈولا تو خیریت سے ہیں؟''

ناصر چند سیکنڈ خاموش رہا۔ پھر وہ ہولے سے بولا۔ ''اجمل خیریت سے ہے۔''

''کیا مطلب؟ ڈولے کو کیا ہوا؟''

''اسے گولی لگ گئی ہے۔''

''وہ..... زخمی ہے؟''

''نہیں رستم بھائی..... وہ ختم ہو گیا ہے۔'' ناصر کی آواز بھرا گئی۔

دوسری طرف کئی لمحوں تک سناٹا رہا پھر رستم کی بوجھل آواز ابھری۔ ''کیسے ہوا یہ؟''

''میں ابھی آ کر آپ کو بتاتا ہوں..... ڈولا ہمارے ساتھ ہی آ رہا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

مختصر الوجود ڈولا اجمل کی گود میں یکسر ساکت پڑا تھا۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون اجمل کے کپڑوں اور گاڑی کی نشست کو سرخ کر چکا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی انگلی والا ہاتھ اس کے سینے پر دھرا تھا۔ یہاں اس نے کس کر اپنا رومال باندھا ہوا تھا۔ مگر یہ زخم اب بالکل بے معنی ہو چکا تھا۔

اجمل خان نے آستین سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''ام کو تم پر فخر (فخر) ہے چھوٹو بھائی۔ تم نے دوستی کا حق ادا کیا۔ اپنا آپ ام پر قربان کیا۔'' اس نے ڈولے کو ایک بار پھر سینے سے لگا لیا۔

☆=======☆=======☆

ڈولے کی موت کی خبر رستم پر بجلی بن کر گری تھی۔ مگر وہ چاروں حالتِ جنگ میں تھے..... اور حالتِ جنگ میں اپنے بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا افسوس تا دیر نہیں کیا جا سکتا۔ اور بعض دفعہ تو ایسے بھی ہوتا ہے کہ میدانِ کارزار میں اپنے ہی پیاروں کی لاشوں کو آڑ کے طور پر استعمال کر کے جنگ جاری رکھی جاتی ہے۔ جنگ اور محبت کے اپنے ہی اصول ہوتے ہیں۔

رستم اس وقت کار میں تھا۔ وہ بے ہوش قدرت اللہ کو ایک بیڈ شیٹ میں لپیٹ کر اور اپنے کندھے پر لاد کر آستانے سے باہر لایا تھا۔ چادر میں لپٹی ہوئی شاہدہ بھی اس کے ساتھ تھی..... ان کے کار تک پہنچتے پہنچتے آستانے کے اندر ناصر اور اجمل نے ہنگامہ عروج تک پہنچا دیا تھا۔ دستی بموں کے ہولناک دھماکے ہو رہے تھے۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ گاڑی کا ڈرائیور یہ صورتِ حال دیکھ کر ہلدی ہو چکا تھا۔ رستم کے ہاتھ میں ٹی ٹی پسٹل تھا اور چہرہ آتش فشاں ہو رہا تھا [illegible] بے چارے کو کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ رستم نے اسے چابی تھمائی تھی اور [illegible] معمول کی طرح ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا تھا..... اور اب وہ برق رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے چھوٹی نہر کا پل پار کر چکے تھے۔ رستم کے کہنے پر ہانپتے کانپتے ڈرائیور نے گاڑی چند گھنے درختوں کے درمیان روک دی۔ رستم پچھلی نشست پر تھا۔ عزت مآب قدرت اللہ اگلی اور پچھلی نشستوں کے درمیانی خلا میں آڑا ترچھا پھنسا ہوا تھا۔ اس کے زخمی سر سے خون رِس رہا تھا۔ اس کی بے ہوشی اب نیم بے ہوشی میں بدل رہی تھی۔ وہ کسمسانا شروع ہو گیا تھا۔ رستم نے اس کی پتلون میں سے بیلٹ نکالی اور اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ پھر ایک کپڑے سے اس کے ٹخنے بھی اچھی طرح جکڑ دیئے۔ اب وہ ایک بندھی ہوئی مرغی کی طرح اس کے پاؤں کے نیچے بے بس تھا۔

شاہدہ چادر میں لپٹی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو

www.pdfbooksfree.pk

رہا ہے۔ وہ قدرت اللہ جیسے جن کو ایک حقیر کیچوے کی شکل میں دیکھ رہی تھی اور یہ عبرتناک منظر تھا۔

وہ رستم سے مخاطب ہو کر منمنائی۔ ''آپ نے یہ بہت خطرناک کام کیا ہے۔ قدرت اللہ کے پہرے دار اور چیلے بڑے دراچھے ہیں۔ وہ اس کو چھڑانے پیچھے آئیں گے۔''

رستم نے اطمینان سے کہا۔ ''جو اسے آستانے میں نہیں بچا سکے یہاں آ کر بھی نہیں بچا سکیں گے۔ تم بے فکر رہو۔''

''یہ آوازیں کیسی ہیں؟'' لڑکی نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

آوازیں رستم کو بھی آ رہی تھیں۔ یہ دور افتادہ آوازیں تھیں۔ لگتا تھا کہ بہت سے لوگ ایک ساتھ بول رہے ہوں۔

رستم نے ڈرائیور سے کہا۔ ''تم جوکس ہو کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں دیکھتا ہوں۔''

ڈرائیور بے دام کا غلام نظر آ رہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ غالباً اس کا گلا اتنا خشک تھا کہ وہ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف جم کر رہ گیا تھا۔

رستم ٹی ٹی سمیت باہر نکلا۔ اس نے چند قدم آگے جا کر ذرا نشیب میں دیکھا۔ اسے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر گرد اُڑتی نظر آئی۔ یہ درجنوں گاڑیاں، ٹریکٹر ٹرالیاں اور دیگر سواریاں تھیں۔ اس کے علاوہ بے شمار لوگ تھے۔ ٹھیک سے نظر تو نہیں آ رہا تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ لوگوں کے ہاتھوں میں بیسز اور کتے وغیرہ ہیں۔ یقیناً یہ وہی جلوس تھا جس کے بارے میں رستم، ناصر اور اجمل کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے قریبی گاؤں میں سن کر آئے تھے۔ رستم کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک نمودار ہو گئی۔

اسی دوران میں رستم کو پل کی دوسری جانب ڈائیوو کی ٹیکسی کار نظر آ گئی۔ وہ دھول اُڑاتی ہوئی تیزی سے نہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی ونڈ اسکرین ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کے بونٹ پر کئی بڑے ڈینٹ تھے۔ رستم نے موبائل پر ناصر کو اپنی لوکیشن بتائی۔ تقریباً دو منٹ بعد ٹیکسی کار دختوں کے اس جھنڈ میں پہنچ گئی۔

ڈھلے کا مُہ دہ چہرہ دیکھنا رستم کے لیے بھی ایک تکلیف دہ تجربہ تھا۔ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے ہنستا بولتا اس سے جدا ہوا تھا اور اب یکسر خاموش پڑا تھا۔ رستم نے محبت سے اس کے چھوٹے سے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اسے چادر سے ڈھک دیا۔ اجمل بھی ہولناک تھا مگر اس کا زخم دیکھتے ہی رستم پہچان گیا کہ اس کی حالت خطرناک نہیں۔

''قدرت اللہ کہاں ہے؟'' اجمل نے آتشیں لہجے میں کہا۔

''میرے ساتھ ہے۔''

''مر گیا یا زندہ ہے؟''

''ابھی زندہ ہے۔''

''ام اس کو اپنے ہاتھ سے مارے گا رستم بھائی۔ آپ نے ام سے وعدہ کیا تھا۔'' اجمل کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

وہ کار کی طرف بڑھے۔ قدرت اللہ دونوں سیٹوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی اور اس رال میں خون کی سرخی بھی شامل تھی۔

اجمل نے اپنی گن سے نیا میگزین اینچ کر لیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوئی جا رہی تھیں۔ یوں لگا جیسے وہ کار کے اندر ہی قدرت اللہ کو بھون کر رکھ دے گا۔

رستم نے اجمل کی گن پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا بیرل نیچے جھکا دیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''تمھیں پتا ہے، شانی بی بی اس خبیث کے بارے میں کیا کہتی رہی ہیں؟'' پھر وہ خود ہی جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''وہ کہتی تھیں کہ قدرت اللہ کا قتل کوئی کارنامہ نہیں۔ اگر قدرت اللہ کو مارنا ہی ہے تو ایسے طریقے سے مارنا ہو گا کہ اس کے ساتھ اس کی سوچ بھی مرے۔ وہ جاہلیت بھی مرے جس نے بے شمار لوگوں کو گمراہ کیا ہوا ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں رستم بھائی؟'' اجمل کراہ کر بولا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ تقدیر نے ہمیں ایک بڑا اچھا موقع دیا ہے۔ ہم قدرت اللہ کے گندے خون سے ہاتھ رنگے بغیر بھی اسے اس کے انجام سے دوچار کر سکتے ہیں۔ اور میرے خیال میں یہ وہی راستہ ہے جس کے بارے میں شانی بی بی بھی سوچا کرتی تھیں۔''

''آپ کا مطلب ہے، ام اس کو چھوڑ دیں گے۔''

''ہاں اجمل خان! لیکن مجھے یقین ہے، اس کا انجام اسے نہیں چھوڑے گا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں رستم بھائی؟'' اجمل کے چہرے پر انتہا درجے کی بے چینی تھی۔

رستم نے اگلی سیٹ پر کٹی سمٹائی شاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں جانتے ہو یہ لڑکی کون ہے؟''

''کون ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ فضلو کی بیٹی ہے جسے ایک مہینہ پہلے پاس کے گاؤں سے اٹھایا گیا تھا۔ اور تمھیں پتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے یہ کہاں سے برآمد ہوئی ہے؟'' اجمل اور ناصر سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگے۔ ''یہ اس قدرت اللہ کے بیڈ روم سے برآمد ہوئی ہے۔ اس حرامی نے اسے زبردستی اپنے گھر میں ڈالا ہوا تھا۔''

یہ انکشاف اجمل اور ناصر کے لیے سنسنی خیز تھا۔

رستم نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا چہرہ دھوپ میں دہک رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب زہرناک کیفیت تھی۔ اس نے دور کیکر اور نیم کے خودرَو درختوں کے پاران لوگوں کی طرف دیکھا جو ایک مشتعل جلوس کی صورت میں پسرور روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ غالباً وہ اپنا شدید احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے روڈ کو بلاک کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ رستم نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ قدرت اللہ کو ایک اچھے انجام سے دوچار کرنے کے لیے قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔''

اس نے اجمل اور ناصر کو ساری صورتِ حال بتائی۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کاریں بڑی تیزی سے آگے پیچھے جلوس کی طرف جا رہی تھیں۔

دور سے صورتِ حال واضح نظر نہیں آئی تھی۔ قریب پہنچ کر ان تینوں نے دیکھا تو انسانوں کا ایک جم غفیر نظر آتا۔ یوں لگتا تھا کہ اردگرد کا پورا علاقہ اس احتجاجی جلوس میں امڈ آیا ہے۔ لوگ راجا نوازش اور انتظامیہ کے خلاف فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے راجا نوازش اور ایک بڑے سرکاری افسر کے پتلے اٹھا رکھے تھے اور انہیں بڑی سڑک پر نذرِ آتش کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بوڑھے فضلو کی طرف سے اعلان تھا کہ اگر ایک ہفتے کے اندر اس کی بچی برآمد نہ ہوئی تو وہ اور اس کے بیٹے لاہور جا کر خود کو زندہ جلا لیں گے۔ رستم نے بڑے ڈرامائی انداز میں دونوں کاریں جلوس کے عین سامنے رکوائی تھیں۔ مشتعل لوگوں کا لہریں لیتا ہوا دریا گاڑیوں کے سامنے رک گیا۔ رستم، ناصر اور زخمی اجمل گاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ چند لمحے تک سنسنی خیز سکوت طاری رہا..... پھر کسی نے دھاڑ کر پوچھا۔ ''اوئے کون ہو تم؟''

اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی جواب دیتا، جلوس میں موجود کچھ افراد نے انہیں پہچان لیا۔ کچھ چہ میگوئیاں ہوئیں پھر دو افراد ہجوم میں سے تیزی سے راستہ بناتے آگے بڑھ آئے۔ ان میں سے ایک وہی پٹواری کا ملازم پہلوان نما شخص تھا جس سے شروع میں ناصر اور اجمل کی تو تکرار ہوئی تھی۔ اس نے بڑے تعجب سے زخمی اجمل اور ٹوٹی پھوٹی ٹیکسی کار کو دیکھا۔

''یہ کیا ہوا بھائی؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت کچھ ہوا ہے۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔ ''فضلو کی بیٹی برآمد ہو گئی ہے۔''

آخری الفاظ پہلوان نما شخص پیرو کے لیے بے حد تحیر خیز ثابت ہوئے۔ اس نے ہونقوں کی طرح رستم کا چہرہ دیکھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کہاں ہے کڑی؟''

''وہ سامنے گاڑی میں جو لڑکی بیٹھی ہے، شاہدہ ہی ہے۔'' رستم نے کہا۔

دونوں افراد کو پہلے تو یقین ہی نہیں آیا۔ پھر ان کی نگاہیں ٹیکسی کار میں موجود شاہدہ پر مرکوز ہو گئیں۔ رستم نے کہا۔ ''آپ دونوں یہیں ٹھہرو۔ میں لڑکی کو آپ کے پاس لاتا ہوں۔''

وہ گیا اور چادر میں لپٹی لپٹائی، لرزتی کانپتی شاہدہ کو لے کر جلوس کے سامنے آ گیا۔ جلوس کے سینکڑوں شرکاء میں یہ خبر بڑی تیزی سے پھیل گئی کہ فضلو کی بیٹی برآمد ہو گئی ہے۔ وہ ابھی تک پرے میں تھی۔ فضلو اور اس کے چند قریبی رشتہ دار آگے آئے اور انہوں نے شاہدہ کو پہچان لیا۔ فضلو نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اردگرد موجود لوگوں کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ جلوس میں خوشی اور تحیر کی لہر دوڑ گئی۔

جلوس کے سرکردہ افراد آگے آ گئے۔ انہوں نے رستم اور ناصر وغیرہ سے تفصیل پوچھی۔ رستم نے کہا۔ ''یہ سب کچھ آسانی سے نہیں ہوا ہے بھائیو۔ میرے ایک دوست کی جان گئی ہے۔ اس کی لاش سامنے ٹیکسی میں پڑی ہے۔ یہ دوسرا دوست سخت زخمی حالت میں آپ کے سامنے کھڑا ہے۔''

''کہاں تھی ہماری دھی رانی؟'' ایک معزز بوڑھے نے شاہدہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''یہ ایک ایسی جگہ پر تھی جس کے بارے میں آپ لوگوں کو ذرا مشکل سے یقین آئے گا۔ اس کو اغوا کرانے اور اس کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے کا نام اگر آپ اس کی زبان سے ہی سنیں تو اچھا ہے۔''

راستے میں رستم شاہدہ کو زبان کھولنے کے لیے پوری طرح آمادہ کر چکا تھا۔

معزز افراد نے شاہدہ سے پوچھا کہ اس کو گاؤں سے لے جا کر اپنے پاس رکھنے والا شخص کون تھا۔ شاہدہ پہلے تو اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی رہی..... پھر اس نے کربناک لہجے میں کہا۔ ''وہ پیر قدرت اللہ ہے۔ وہ بہروپیا ہے..... شیطان ہے وہ..... اس نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' وہ ایک بار پھر ہچکیوں سے رونے لگی۔

معزز افراد جو شاہدہ کے اردگرد کھڑے تھے، سناٹے میں تھے۔ اس کا باپ فضلو بھی

www.pdfbooksfree.pk

سناٹے میں تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اُجڑی بچری بیٹی کو دوبارہ گلے سے لگایا۔ وہ بلند آواز سے رونے لگی اور جیسے پھٹ پڑی۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ اوڑھنی میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ اوڑھنی کے اندر سے ہی بولتی چلی گئی۔ اس نے سب کچھ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے گوش گزار کر دیا۔ اس کی آواز میں کرب تھا، تلخی سچائی تھی اور گہرے زخم تھے۔ اس کی گواہی کو جھٹلانا ممکن ہی نہیں تھا۔

سننے والوں کے تیور بدلنے چلے گئے۔ ان کے چہرے تمتمانے لگے۔ آنکھیں سرخ تر ہوگئیں۔ سب سے پہلے ایک جواں سال شخص ہی چلا کر بولا۔ ''ہم پہلے ہی کہتے تھے، آستانے کے اندر چکر چل رہے ہیں۔ یہ عامل ڈرامے باز ہے.....''

ایک ساتھ بہت سے افراد بولنے لگے۔ ایک شخص چنگھاڑا۔ ''پولیس کچھ نہیں کرے گی۔ میں تو کہتا ہوں ابھی اس حرامی کو پکڑ لو اور پھانسی دے دو۔''

ایک اونچے لمبے جٹ نے اپنا دیسی ساخت کا پستول ہوا میں لہرایا اور گرجا۔ ''موقع اچھا ہے۔ سب بھرا جمع ہیں۔ حملہ کر دو آستانے پر اور اینٹ سے اینٹ بجا دو۔''

''ہاں، حملہ کر دو۔'' دو تین آوازوں نے کہا۔

لوگوں کا غیض و غضب بڑھتا جا رہا تھا۔ ٹوٹی کلائیوں والی نوچی کھسوٹی ہوئی لڑکی ان کے سامنے بھی۔ اس سے بڑا ثبوت اور اس سے معتبر گواہی اور کیا ہو سکتی تھی۔ ایک لیڈر ٹائپ شخص ایک ٹریکٹر کے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے میگا فون ہونٹوں سے لگایا اور پکار کر بولا.....

''بھائیو! ہم نے بات کر لی ہے۔ یہ لڑکی فضلو کی بیٹی اور ہم سب کی بہن ہے.....اور اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ سنائے جانے کے قابل نہیں ہے۔ اس کا مجرم پیر قدرت اللہ ہے.....اس کا مجرم پیر قدرت اللہ ہے۔''

جلوس کے اشتعال میں اضافہ ہو گیا۔ لوگوں نے مختلف نعرے لگائے اور جلوس کے اگلے حصے میں ہلچل نظر آنے لگی۔ مقرر نے جوش سے اپنا مکا ہوا میں لہرایا اور بولا۔ ''میرے بھائیو! اس فراڈیے عامل کی بدمعاشی کا اس سے بڑا ثبوت اور کوئی نہیں ملے گا۔ کیا ہم کو کسی اور ثبوت کی ضرورت ہے؟''

''نہیں.....نہیں۔'' اَن گنت آوازیں ابھریں۔ کچھ لوگوں نے ہوائی فائر کیے۔

گزرنے والے ہر لمحے کے ساتھ ہجوم سرکش ہو رہا تھا۔

مقرر نے ایک بار پھر مکا ہوا میں لہرایا اور بولا۔ ''تو چلو پھر چھانگا وال کی طرف۔ اس شیطان عامل کو پکڑ لو اور اس کی تکا بوٹی کر ڈالو۔''

''ہاں پکڑ لو..... پکڑ لو۔'' اَن گنت مشتعل آوازیں ابھریں۔

ہجوم کے اندر سرکش سیلابی ریلے کی سی لہر پیدا ہوئی۔ رستم جست لگا کر ٹریکٹر کے اوپر چڑھا۔ اس نے مقرر کے قریب پہنچ کر مدھم آواز میں کہا۔ ''آپ لوگوں کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ساتھی کی قربانی دے کر ہم نے آپ کا بہت سا کام کر دیا ہے۔ آستانے پر بہت کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی خبر ابھی تھوڑی دیر میں آپ لوگوں تک پہنچ جائے گی۔ باقی رہی قدرت اللہ کی بات.....تو وہ حرامی اس وقت ہمارے ساتھ موجود ہے۔''

''کک.....کیا کہہ رہے ہو؟'' مقرر کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

''وہ دوسری کار کے اندر بندھا پڑا ہے۔'' رستم نے اطمینان سے کہا۔ ''آپ لوگوں نے اسے پولیس کے حوالے کرنا ہے تو پولیس کے حوالے کر دیں۔ خود سزا دینی ہے تو بھی آپ کی مرضی۔''

اس صورتِ حال نے اردگرد موجود افراد کو چکرا کر رکھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ خبر دیگر افراد میں پھیلنا شروع ہوئی۔ چند جوشیلے لوگ دوڑتے ہوئے کار کی طرف گئے جہاں قدرت اللہ دو نشستوں کے درمیانی خلا میں موجود تھا۔ رستم نے اس کے اوپر ایک کپڑا ڈال دیا تھا۔ لوگوں نے گاڑی کے عقبی دروازے کھولے اور چند ہی سیکنڈ میں قدرت اللہ کو پہچان لیا۔ اسے ٹانگوں سے پکڑا گیا اور جھٹکے سے کھینچ کر باہر نکال لیا گیا۔ اس کے جسم میں حرکت تھی۔ وہ ہوش میں آ چکا تھا لیکن بندھا ہوا تھا۔ رستم کے ہاتھ میں اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی۔ یہ چیز اس نے تقریر کرنے والے لیڈر نما شخص کو تھما دی اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

ہجوم کی اپنی ہی نفسیات ہوتی ہے۔ عام حالات میں لوگ جس شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کرتے..... جب وہ ہجوم کی زد میں آتا ہے تو زیادہ بُرے سلوک کا حق دار ٹھہرتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اگر قدرت اللہ کے جرائم پر نظر ڈالی جاتی تو اس کے کھاتے میں شاہدہ کی بربادی سے بھی بڑے اور سنگین جرم موجود تھے۔ مگر آج یہی جرم اس کے یوم حساب کو کھینچ کر اس کے سر پر لے آیا تھا۔ رستم اور ناصر جانتے تھے کہ اب کیا ہوگا..... اور پھر اس لشکارے مارتی دوپہر میں، اس شعلہ بار سورج کے نیچے، اس گرد آلود میدان میں قدرت اللہ کے ساتھ وہی کچھ ہوا۔ اپنے گاؤں کی بیٹی کو تاراج کرنے کی پاداش میں لوگ اس پر ٹوٹ پڑے۔ رستم اور ناصر نے دیکھا کہ وہ اسے مار رہے تھے..... گھسیٹ رہے تھے، روند رہے تھے۔ لاٹھیاں، بھالے، کلہاڑیاں بہت کچھ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ہجوم کے تیور بتاتے تھے کہ لوگ اب اس شیطان عامل کی موت تک رکنے والے نہیں ہیں۔ رستم کی نگاہ ایک

www.pdfbooksfree.pk

کھلے کے لیے اجمل خان پر پڑی۔ وہ قدرت اللہ کو انجام تک پہنچانے والے ہجوم کا حصہ تھا..... جلوس میں شریک سینکڑوں لوگ ایسے تھے جو قدرت اللہ کی موت تو چاہتے تھے مگر ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس عمل میں شریک ہو سکتے۔ وہ بہ ظاہر غیر جانبدار ہو کر دور دور کھڑے تھے۔ معدودے چند بڑے بوڑھے ایسے ہوں گے جو اس عمل کو روکنا چاہتے تھے لیکن یہاں ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ نہ ہی ان کی کوئی پیش چل سکتی تھی۔

دفعتاً رستم اور ناصر کو اندازہ ہوا کہ قدرت اللہ اپنی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ انہیں کوئی رسی جیسی شے خونخوار لوگوں کے پاؤں میں گھسٹتی نظر آئی..... لیکن یہ رسی نہیں تھی۔ یہ مقتول کی انتڑیاں تھیں۔ ''چلو ناصر چلیں۔'' رستم نے چٹان جیسے پتھریلے لہجے میں کہا۔

''ہاں، اب چلنا چاہیے۔''

ناصر گیا اور مشتعل لوگوں کے اندر سے اجمل خان کو گھسیٹ کر باہر لے آیا۔ اجمل کا جسم اپنے ہی زخم سے لہولہان تھا۔ مگر یوں لگتا تھا کہ وہ اپنی تکلیف بھول چکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں فتح مندی کا ایک ایسا نشہ تھا جو بڑی سے بڑی اذیت کو اپنے اندر غرق کر سکتا ہے۔

ناصر اسے سہارا دیتا ہوا کرائے کی گاڑی تک لے آیا۔ کار کے ڈرائیور کے لیے حالات اب برداشت سے باہر ہو چکے تھے۔ وہ کہیں رفو چکر ہو گیا تھا۔ رستم کی یہ احتیاط کام آ گئی کہ اس نے چابی ایک بار پھر اپنے پاس رکھی تھی۔ رستم ڈولے کی مختصر لاش کو ٹیکسی کار میں سے اٹھا لایا اور کار میں ڈال دیا۔ ان کے اردگرد شدید ترین افراتفری کا عالم تھا۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ وہاں سے نکل آئے۔

انہیں لاہور تک پہنچنے میں قریباً دو گھنٹے لگے۔ رستم نے انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کی تھی۔ جی ٹی روڈ کے ایک ناکے پر انہیں روکا بھی گیا تھا مگر وہ رکے نہیں تھے۔ ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ رائفلوں کے منہ کھول سکتے تھے۔ بہرحال عام راہ گیروں سے پیسے بٹورنے میں مصروف پولیس اہلکاروں نے اس قسم کی مہم جوئی نہیں کی تھی۔ اجمل کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ اسے ہسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ مگر وہ اسے ہسپتال نہیں لے جا سکتے تھے۔

ناصر نے راستے میں زخم کا اچھی طرح معائنہ کر لیا تھا۔ وہ بولا۔ ''رستم بھائی! آپ سیدھے کوٹھی چلیں۔ مجھے لگتا ہے کہ گولی کندھے کے اوپر والے حصے سے زیادہ دور نہیں۔ میں اسے نکال لوں گا۔''

''دیکھ لو، خون کافی نکل چکا ہے۔'' رستم نے کہا۔

''ضرورت پڑی تو خون کا انتظام بھی کر لیں گے۔ آپ کوٹھی چلیں۔'' ناصر کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

رستم نے گاڑی کوٹھی کی طرف موڑ دی۔ وہ عقب نما آئینے پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اگر اس کو تعاقب کا ہلکا سا شک بھی ہوتا تو وہ گاڑی کو کوٹھی کی طرف نہیں لے جا سکتا تھا۔

کوٹھی پر پہنچتے ہی ناصر، اجمل کو سنبھالنے میں لگ گیا۔ اس نے خانساماں ظفر کو دواؤں اور دیگر چھوٹی موٹی اشیا کی ایک فہرست دی۔ خانساماں آدھ پون گھنٹے میں یہ اشیا لے آیا۔ ناصر اور رستم قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اپنے زخمی ساتھی کے ساتھ مصروف رہے۔ اس دوران میں ظفر نے مطلوبہ خون کی دو تھیلیوں کا انتظام بھی کر لیا۔ ایک جاں گسل کوشش کے بعد ناصر، اجمل کے جسم میں پیوست گولی نکالنے میں کامیاب رہا۔ اجمل نے بھی کمال برداشت کا ثبوت دیا۔ خون نچڑنے کے سبب اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

ٹی وی پر چھانگی وال کے خوں ریز ہنگامے کی خبر چلنا شروع ہو گئی تھی۔ آستانے پر ہونے والی فائرنگ اور دھماکوں میں چوبیس افراد کی ہلاکت کی اطلاع تھی۔ دو افراد آستانے سے باہر ہلاک ہوئے تھے۔ ان میں قدرت اللہ کا جنونی مرید اور قدرت اللہ خود شامل تھا۔ قدرت اللہ کی ناقابلِ شناخت لاش کی جھلک بھی نیوز چینل پر دکھائی جا رہی تھی۔ وہ مٹی اور خون میں لتھڑے ہوئے ایک چیتھڑے کی طرح زمین پر پڑا تھا۔ اس کے قریب کھڑے چند افراد کے صرف پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔

ڈولے کی لاش ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھ دی گئی تھی۔ رستم نے اس کے سرد رخساروں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''اس کے گھر والوں کو اطلاع دینی ہو گی۔''

''لیکن کیسے؟ اس نے تو اس بارے میں زیادہ کچھ بتایا ہی نہیں۔ ماں باپ تو دونوں اب دنیا میں نہیں ہیں۔ شاید کوئی بھائی وغیرہ ہو۔ جہاں تک مجھے پتا ہے، یہ کوکی اور اس کے گھر والوں کو ہی اپنا سب کچھ سمجھتا تھا۔ کوکی کی بڑی بہن اسے اچھی لگتی تھی اور اس کے لیے یہ سب کچھ کر گزرنے کو تیار رہتا تھا۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں، یہ بات تو بی بی نے بھی بتائی تھی۔ درحقیقت چوہدری بشیر تک ڈولے کے پہنچنے کی وجہ بھی وہ لڑکی ہی تھی۔''

ناصر کی آنکھوں میں آنسو چمک گئے۔ وہ ڈولے کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ دل بھی کیا شے ہوتا ہے رستم بھائی۔ جان بوجھ کر اپنے لیے ایسے راستے چنتا ہے جن پر اسے نہیں چلنا چاہیے۔ اس دل کو پتا بھی ہوتا ہے کہ وہ نہ ہونے والا کام کر رہا ہے، پھر بھی کرتا چلا جاتا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

ایسی امیدیں پالتا ہے جو زندگی کی آخری سانس تک بس امیدیں ہی رہتی ہیں۔''

ناصر نے جھک کر ڈولے کی سرد پیشانی چومی اور بولا۔''اس لڑکی کو پتا بھی نہیں ہوگا کہ اس کے ساتھ چپ چاپ پیار کرنے والا آج ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا ہے۔اب وہ بھی اپنی زبان نہیں کھولے گا۔''

رستم نے ڈولے کی جیبیں دیکھیں۔ایک جیب میں بس ڈیڑھ دو سو روپے کی کرنسی تھی.....فرضی شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ تھی جس پر پلاسٹک چڑھایا گیا تھا۔ایک عام سا بال پوائنٹ اور گلا صاف کرنے والی دو گولیاں تھیں جن میں سے ایک گولی آدھی کھا کر آدھی دوبارہ ریپر میں لپیٹ دی گئی تھی۔

ایک معمولی شخص کی جیب سے برآمد ہونے والی یہ معمولی اشیا تھیں مگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو یہ شخص معمولی نہیں تھا۔اس کی سب سے اہم بڑائی تو یہ تھی کہ اس نے کسی سے خاموش محبت کی تھی اور اس محبت کو خاموشی کے سارے تقاضوں کے ساتھ نبھایا تھا۔اس کے علاوہ وہ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی معمولی نہیں تھا۔اوپر والے نے اگر اس کی جسمانی ساخت میں اس سے کچھ چھینا تھا تو بدلے میں اسے بہت کچھ دیا بھی تھا۔اس کی غیر معمولی حسیات نے ثابت کیا تھا کہ وہ معمولی نہیں ہے۔

ناصر نے کہا۔''رستم بھائی! اس کے گھر والوں کو تو بس شانی بی بی کے ذریعے ہی اطلاع پہنچ سکتی ہے۔شانی کو ہی پتا ہوگا کہ کوکی اور راجو وغیرہ کہاں ہیں۔کوکی اور راجو دوسروں کو بتا سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔اگر تم چاہتے ہو تو فون کر کے شانی تک یہ اطلاع پہنچا دو۔''رستم نے آزردہ لہجے میں کہا۔

''ان سے کیا کہا جائے؟''

''فون پر کسی بھی طرح کی تفصیل ٹھیک نہیں۔بس یہ کہہ دو کہ ڈولا اب نہیں ہے اور اس کی میت ہمارے پاس کوٹھی میں ہے۔مناسب تو یہی ہوگا کہ اس میت کو بڑی راز داری سے اس کے وارثوں تک پہنچا دیا جائے۔اگر شانی نے بھی چہرہ دیکھنا ہوگا تو وہیں پر دیکھ لیں گی۔''

ٹی وی پر ایک بار پھر چھانگی وال کے واقعات کی خبر چل رہی تھی۔اس سارے واقعے کو انجام دہ لڑکی شاہدہ کے ساتھ ہی منسوب کر دیا گیا تھا۔نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔''معتبر ذرائع کے مطابق پیر قدرت اللہ کی اندوہناک موت کا سبب مغویہ شاہدہ والا معاملہ ہی بنا ہے۔شاہدہ کا انتقام لینے والوں نے نہ صرف چھانگی وال میں قدرت اللہ کے ٹھکانے کو تاراج کر دیا بلکہ

www.pdfbooksfree.pk

علاقے کی سب سے متنازعہ شخصیت قدرت اللہ کو بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔بہر حال دیگر عوامل کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔رنگ والی گاؤں کی بااثر شخصیت شانی بی بی اور قدرت اللہ کے درمیان بھی عرصے سے سنگین چپقلش چلی آ رہی تھی۔کچھ عرصہ پہلے شانی بی بی ہی کے ساتھی کچھ تصویریں منظرِ عام پر لائے تھے جن کی وجہ سے پیر قدرت اللہ کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا تھا۔اس واقعے کے بعد رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی یعنی شانی بی بی پر قاتلانہ حملے بھی ہوئے تھے۔ابتدائی اطلاعات کے بعد اب آہستہ آہستہ تفصیلی خبریں آنا شروع ہوئی ہیں۔ان خبروں کو دیکھا جائے تو پھر یہ پہلی تھیوری غلط محسوس ہونے لگتی ہے کہ یہ خوں ریز واقعہ صرف مغویہ لڑکی کی وجہ سے ہوا ہے۔معلوم ہوا ہے کہ اس واقعے میں استعمال ہونے والی ایک ٹیکسی کار پر اہور کا نمبر ہے۔اس کے علاوہ ایک نامعلوم شخص نے گوجرانوالہ کے تھانے میں اطلاع دی ہے کہ واردات میں استعمال ہونے والی دوسری کار اس کی ہے۔یہ کار ایک شخص نے لاہور سے ڈرائیور سمیت کرائے پر حاصل کی تھی۔وہ اس کار پر اپنے بیمار بچے کو پیر صاحب کے آستانے پر لے جانا چاہتا تھا۔بعد میں پتا چلا کہ اس شخص کے دو دیگر ساتھی بھی آستانے جا رہے ہیں۔مگر وہ ایک دوسری ٹیکسی کار پر تھے.....اس حوالے سے مزید تفصیلات آ رہی ہیں۔امید ہے کہ یہ شخص اہم انکشاف کرے گا۔''

دفعتاً ناصر کو یاد آیا۔وہ بولا۔''رستم بھائی! جب قدرت کو لوگ گاڑی میں سے نکال رہے تھے،آپ نے اخباری کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی شے ایک بندے کو دی تھی۔وہ کیا تھا؟''

رستم نے اطمینان سے کہا۔''قدرت اللہ کی درندگی کی وہ فلم جو تم نے دیکھی تھی۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔''ناصر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

''چلو پھر فون کر لو۔''رستم نے غمزدہ نظروں سے ڈولے کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

ناصر فون کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

رستم وہاں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ اس اندوہناک خبر پر شانی کا ردِعمل کیا ہوگا۔شانی کو ڈولے سے بہت پیار تھا۔وہ بھی انہیں بڑی محبت سے باجی جی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور ان کے ایک اشارے پر خود کو بڑے سے بڑے خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار رہتا تھا۔کیا ڈولے کی موت کی خبر سن کر شانی یہاں آئیں گی؟ کیا اس گھر کی دہلیز پر دوبارہ ان کے قدم پڑیں گے؟ وہ سوچتا رہا اور ڈولے کی طرف دیکھتا رہا۔

☆=======☆=======☆

شانی رنگ والی کی حویلی میں تھی۔برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔آسموں کے پیڑوں

پر آم پک چکے تھے۔ حویلی کے باغ میں لڑکیوں نے سن کے رسوں سے بڑے بڑے جھولے تیار کر لیے تھے۔ امرود، آڑو، جامن، رنگ والی کے باغوں سے بہت سے پھل تیار ہو کر حویلی میں آ رہے تھے۔ یہ گیت گانے اور تابڑ توڑ برستی بارشوں میں اودھم مچانے کے دن تھے مگر اصل موسم تو دل کا موسم ہوتا ہے۔ اور شانی کے دل میں ایک بے کنار خزاں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کوئی منظر کوئی آواز..... کچھ بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ خاص طور سے جب سے رستم کی بہن بہنوئی اور بچے خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے گئے تھے۔ شانی کو لگتا تھا کہ اپنے جیون ساتھی سے اس کا رہا سہا ناتا ٹوٹ چکا ہے۔ وہ حیران ہوئی تھی کہ رستم اتنا کٹھور کیسے ہو گیا۔ اس نے ایک نہایت غلط حرکت کی۔ خالو اعجاز کو تھپڑ مارا..... اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ اس نے اپنے منہ سے معذرت کا ایک لفظ تک ادا نہیں کیا۔

گزرنے والے ہر دن کے ساتھ شانی کے سینے میں جیسے کوئی شے مرتی جا رہی تھی۔ سردار دراج اور اس کے ساتھ لاپتا ہو جانے والے تین بہتھوں کا بھی ابھی تک کوئی کھوج کھرا نہیں ملا تھا۔ دراج کی بیوی ماکھو دونوں مظلوم لڑکیوں کے ساتھ ابھی تک حویلی میں ہی پناہ گزین تھی۔ پتا نہیں کیوں شانی کا دل نہیں مانتا تھا کہ دراج اپنے ساتھیوں سمیت فرار ہوا ہے۔

شانی حویلی کی وسیع نشست گاہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ بادل گھر کر آئے ہوئے تھے مگر بارش شروع نہیں ہوئی تھی۔ مُنا باہر لان میں ملازمہ جمیلہ کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جاؤ۔'' شانی نے اپنی اوڑھنی درست کرتے ہوئے کہا۔

عارف کمبوہ تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی.....

''شانی بہن! آپ نے ٹی وی دیکھا ہے؟'' اس نے مُنھ سے ہی پوچھا۔

''کیوں، کیا ہوا؟''

عارف نے دائیں بائیں دیکھا اور پست لیکن جذباتی لہجے میں بولا۔ ''قدرت اللہ قتل ہو گیا۔''

شانی سکتے میں رہ گئی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا مگر جو کچھ عارف بتا رہا تھا وہ بڑا تفصیلی اور مدلل تھا۔ عارف کہہ رہا تھا۔ ''ابتدائی خبروں کے مطابق چھانگی وال کے آستانے میں کم از کم چوبیس بندے مارے گئے ہیں اور درجنوں زخمی ہوئے ہیں۔ مرنے والوں میں زیادہ تعداد قدرت کے خاص چیلوں کی ہے۔ یہ سب لوگ ایک ہی بیٹھک میں موجود تھے۔ ان

میں قدرت کا سب سے قریبی چیلا شاہی بھی شامل ہے۔''

''قدرت کے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''اس کے ساتھ جو ہوا ہے، وہ اسی کے لائق تھا۔ اسے کسی ایک شخص نے نہیں مارا، سینکڑوں لوگوں نے مارا۔ یہ علاقے کے لوگوں کا ایک بہت بڑا جلوس تھا جو ایک کنواری لڑکی کے اغوا کی وجہ سے نکالا گیا تھا۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ لڑکی کے اغوا کا ذمے دار یہی قدرت اللہ ہے تو ان کا طیش اپنی آخری حد تک پہنچ گیا۔ وہ اس دھوکے باز عامل پر ٹوٹ پڑے۔ اسے کھیتوں میں گھسیٹتے رہے اور مار مار کر اس کی لاش کا بھی قیمہ کر ڈالا۔''

''اور اس کی بیویاں؟''

''ان کے بارے میں ابھی کچھ پتا نہیں۔''

اس خوفناک واقعے کی تفصیل جاننے کے بعد شانی کی آنکھوں میں غم اور تاسف کے تاثرات ابھر آئے۔ وہ ان خاص لوگوں میں سے تھی جو اپنے بدترین دشمن کی تکلیف پر بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ عارف نے قدرت کی موت کا جو نقشہ کھینچا تھا اگر وہ درست تھا تو یہ شانی کے لیے دکھ کی بات تھی۔

عارف نے اٹھ کر نشست گاہ کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی بند کی اور شانی کے سامنے بیٹھ کر دھیمے لہجے میں بولا۔ ''ابھی تک جو کچھ خبروں میں آیا ہے، اس سے شک ہو رہا ہے کہ اس ساری کارروائی میں اجمل خان، ناصر اور ہو سکتا ہے کہ رستم بھائی بھی شریک ہوں۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''اس کارروائی میں استعمال ہونے والی دونوں گاڑیاں لاہور سے گئی تھیں۔ کرائے کی کار کے ڈرائیور نے پولیس کے رُوبرو جو بیان دیا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کُل تین افراد تھے جو ایک بیمار بچے کو لے کر قدرت اللہ کے آستانے پر جا رہے تھے۔ اس نے ان لوگوں کے حلیے بھی بتائے ہیں۔ ایک حلیہ ناصر سے ملتا ہے۔ ایک شخص کے بارے میں اس نے بتایا ہے کہ وہ پٹھان تھا اور پشتو کے لہجے میں اُردو بولتا تھا۔''

''لیکن تم تو کہہ رہے ہو کہ قدرت اللہ کو عام لوگوں نے مارا ہے؟''

''مارا تو عام لوگوں نے ہی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے اس انجام تک پہنچانے میں اجمل، ناصر اور شاید رستم بھائی نے بھی پورا کردار ادا کیا ہے۔''

اس کے بعد عارف شانی کو اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کرنے لگا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''ابھی مزید تفصیلات آ رہی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ لاہور سے آنے والے بندوں نے

www.pdfbooksfree.pk

مقامی لوگوں تک ایک ویڈیو کیسٹ بھی پہنچائی ہے۔ اس کیسٹ میں بھی قدرت اللہ یا اس کے چیلوں کے خلاف کوئی خاص ثبوت موجود ہے۔"

شانی کا دماغ سنسنانے لگا۔ اسے رستم کی طرف سے اس قسم کے رویے کی توقع بھی تھی۔ پچھلے پندرہ بیس روز میں کئی بار اس کے ذہن میں آ چکا تھا کہ رستم اور اس کے دوست قدرت اللہ یا ڈپٹی ریاض پر وار کرنے کی کوشش کریں گے۔

عارف نے کہا۔ "شانی بہن! آپ سب کو اور خاص طور سے آپ کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس واقعے کے بعد قدرت اللہ کے جنونی مرید کوئی کارروائی کر سکتے ہیں..... میں چاہتا ہوں کہ چوہدری اعجاز کے ساتھ بیٹھ کر ہم یہاں کی سیکورٹی کا مناسب انتظام کر لیں۔"

"زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔" شانی نے عجیب جذب کے عالم میں کہا۔

شانی نے اٹھ کر ٹی وی آن کیا۔ چند اشتہارات کے بعد خبریں آنے لگیں۔ پہلی خبر ہی چھانگی وال کے حوالے سے تھی۔ مرنے والوں کی تعداد ستائیس ہو گئی تھی۔ دیگر تفصیل کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا کہ تین ملزمان کے ساتھ جو بیمار بچہ تھا، وہ بھی اس خونی واقعے میں جاں بحق ہوا۔ اس کی لاش جلوس کے کچھ شرکاء نے واردات میں استعمال ہونے والی ٹیکسی کے اندر دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ اور جسم لہولہان تھا۔ نیوز کاسٹر نے مزید بتایا کہ اس واردات میں قدرت اللہ کے دیرینہ دشمن اجمل خان کے ملوث ہونے کا شبہ یقین میں بدلتا جا رہا ہے اور آئندہ ایک دو گھنٹوں میں اعلیٰ پولیس حکام کی طرف سے میڈیا کو بریفنگ دی جا رہی ہے۔

خبریں جاری تھیں کہ خالو اعجاز کے کمرے کے سامنے رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اتفاقاً خالو اعجاز حویلی میں موجود نہیں تھے۔ شانی اٹھ کر گئی اور اس نے کال ریسیو کی۔

دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز نے اسے ہلا دیا۔ "ہیلو شانی بھابی! میں ڈاکٹر ناصر بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے نہایت گمبھیر آواز میں کہا گیا۔

شانی چند لمحے خاموش رہی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ ناصر سے بات کرے یا نہیں۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہیلو ناصر! کیا بات ہے؟"

"بھابی! ایک حادثہ ہو گیا ہے۔"

"کیا؟" شانی کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا۔

"ایک ساتھی ہم سے جدا ہو گیا ہے....." ناصر نے کہا۔ پھر ذرا رک کر بولا۔ "ڈولا اب ہم میں نہیں ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔" شانی کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں مسل دیا۔ وہ کئی سیکنڈ تک کچھ بھی نہ بول سکی۔ پھر اس نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا تھا ڈولے کو؟"

"گولی لگی ہے۔" ناصر نے مختصر جواب دیا۔

ایک دم شانی کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس کے ذہن نے کئی بکھری ہوئی کڑیاں ایک ساتھ جوڑ دیں..... ابھی عارف نے بتایا تھا کہ لاہور سے جو تین افراد قدرت کے ڈیرے تک پہنچے تھے، ان کے ساتھ ایک بیمار بچہ بھی تھا۔ پھر نیوز میں بتایا گیا کہ وہ بچہ بھی ہلاک ہونے والوں میں شامل تھا۔ گاؤں کے لوگوں نے ایک گاڑی میں اس کا مُردہ جسم دیکھا تھا۔ کہیں وہ بچہ ڈولا ہی تو نہیں تھا؟

ڈولے کی موت کی اطلاع نے شانی کا دل غم سے بھر دیا۔ دوسری طرف ناصر کہہ رہا تھا۔ "بھابی! ڈولے کی میت اس وقت یہاں کوٹھی میں ہے۔ اس کے وارثوں کو بھی اطلاع دینی ہے۔ اب آپ جیسے سمجھیں کر لیں۔"

"کتنے بجے یہ واقعہ ہوا ہے؟" شانی کا لہجہ اَشک بار تھا۔

"قریباً چار گھنٹے تو ہو چکے ہیں۔ ہم نے میت ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں رکھی ہوئی ہے۔"

"کیسے ہوا ہے یہ سب؟ کیا یہ وہی معاملہ ہے جس کی خبریں بھی آ رہی ہیں؟" شانی نے اشارے کنایے میں پوچھا۔

"اس بارے میں تو رستم بھائی ہی بتا سکتے ہیں۔ کیا آپ یہاں آئیں گی؟" ناصر نے پوچھا۔

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتی۔" شانی کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔

عارف پُرتشویش نظروں سے شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ کوئی بری خبر ہے۔ شانی نے آنسوؤں کے درمیان اسے اس بری خبر سے آگاہ کیا۔ ڈولے کی موت نے عارف کو بھی افسردہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ "شانی بہن! باقی سب تو خیریت سے ہیں؟"

شانی نے کہا۔ "مجھے اجمل کے بارے میں شک پڑ رہا ہے۔ شاید وہ زخمی ہے یا پھر کہیں چلا گیا ہے۔ اس سے پہلے وہی فون پر رابطہ کرتا تھا۔"

عارف نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "گویا یہ بات تو اب طے ہے کہ چھانگی وال گاؤں میں جو خونی کارروائی ہوئی ہے اس میں ناصر، اجمل اور رستم بھائی شامل ہیں۔"

شانی خاموشی سے آنسو پونچھتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈولے کی معصوم شکل گھومتی رہی۔ اسے لگا جیسے وہ ابھی کسی طرف سے "باجی جی" کہتا ہوا آئے گا اور اس کے

www.pdfbooksfree.pk

سامنے آن کھڑا ہوگا۔ اجمل کے حوالے سے بھی شانی کی تشویش گہری ہوتی جارہی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ خود لاہور چلی جائے۔ وہ اپنے ساتھ عارف کو بھی لے جاسکتی تھی۔ اس نے عارف سے مشورہ کیا۔ اس نے بھی تائید کی اور کہا کہ انہیں لاہور میں جانا چاہیے۔ ڈولے کے اصل وارثوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کوکی، سنبل اور ان دونوں کے گھر والے ہی ڈولے کے وارث شمار ہوسکتے تھے۔ شانی کی معلومات کے مطابق کوکی اور راجو آج کل ایبٹ آباد میں گرمیاں گزار رہے تھے..... راجو ایک گڑیا سی بچی کا باپ بن چکا تھا۔ کوکی کے گھر والے بھی راجو کے ساتھ ایبٹ آباد میں ہی تھے۔ موجودہ حالات میں ڈولے کی میت کو ایبٹ آباد پہنچانا ممکن نہیں تھا۔ نہ ہی کوکی اور اس کے گھر والے لاہور کی کوٹھی میں آسکتے تھے۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ ڈولے کو لاہور ہی میں سپردِ خاک کردیا جائے..... شانی کا دل لاہور جانے کو بے قرار ہوگیا۔

جب شانی لاہور روانہ ہونے کے لیے ایک برقعے اور ایک پرانی پک اَپ کا انتظام کر چکی تھی، خالو اعجاز بھی حویلی پہنچ گئے۔ وہ اب تک کے سارے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے۔ ان کے چہرے پر زلزلے کی کیفیت تھی۔ انہوں نے شانی کو علیحدہ کمرے میں لے جا کر کہا۔

''شانی! یہ سب رستم اور اس کے ساتھیوں نے کیا ہے۔ چلو قدرت اللہ کی موت پر تو کسی کو اعتراض نہیں لیکن ان لوگوں نے درجنوں بے گناہ بھی مار دیئے ہیں۔ ستائیس اٹھائیس ہلاکتوں کا ذکر تو خبروں میں آرہا ہے، اصل تعداد زیادہ ہوگی۔''

''مگر خالو میں نے سنا ہے کہ صرف اس خاص کمرے میں ہلاکتیں ہوئی ہیں جہاں قدرت کے قریبی ساتھی بیٹھک کررہے تھے۔''

''یہ غلط ہے۔ وہاں دستی بموں کے کئی دھماکے ہوئے ہیں اور ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی ہیں۔ ان لوگوں نے اس کارروائی کے ذریعے ہمیں بھی سخت خطرے میں ڈال دیا ہے..... قدرت اللہ کے حمایتی تو ہمیشہ اور رستم، اجمل وغیرہ کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ قدرت اللہ کی موت کی وجہ سے کئی جگہوں پر ہنگامے بھی شروع ہوگئے ہیں۔''

''خبروں میں تو صرف ملتان کے ایک علاقے میں ہنگامے کا ذکر کیا گیا ہے۔'' شانی نے کہا۔

اچانک خالو اعجاز کی نظر تپائی پر رکھے ہوئے برقعے اور شولڈر بیگ پر پڑ گئی۔ ''یہ برقع یہاں رکھا ہے۔ کیا تم کہیں جارہی ہو؟'' انہوں نے چونک کر پوچھا۔

شانی نے کہا۔ ''خالو! شاید آپ کو پتا نہیں۔ ڈولے کو گولی لگ گئی ہے..... وہ بچ نہیں سکا۔''

''اوہ۔'' خالو اعجاز نے ہونٹ سکوڑے۔ ''مجھے بھی شک ہو رہا تھا کہ خبروں میں جس بیمار بچے کا ذکر ہو رہا ہے وہ کہیں ڈولا ہی نہ ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ ڈولے کو اِدھر لاہور میں ہی دفن کیا جائے گا۔ میں..... اس کا منہ دیکھنا چاہتی ہوں۔'' شانی کا لہجہ اَشک بار تھا۔

خالو اعجاز نے آنکھیں پھاڑ کر شانی کو دیکھا پھر برہم لہجے میں بولے۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ تم رستم وغیرہ کے ٹھکانے پر جاؤ گی ڈولے کو دیکھنے؟'' شانی خاموش رہی۔ وہ مزید بلند آواز سے بولے۔ ''شانی! تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ ان حالات میں تو ہم حویلی کے اندر بھی خطرہ محسوس کررہے ہیں اور تم باہر نکلنے کی بات کررہی ہو۔ نہیں شانی بیٹی! میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ یہ تو سراسر مصیبت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ قدرت اللہ کے حمایتی بڑے طیش میں ہیں اور ہر جگہ پھٹکارتے پھر رہے ہیں۔ اور پھر لاہور میں رستم اور ناصر وغیرہ کا ٹھکانا بھی کون سا محفوظ ہے۔ ان لوگوں نے ایک بہت بڑی کارروائی کی ہے اور وہ کسی بھی وقت پولیس کی زد میں آسکتے ہیں۔''

''اللہ نہ کرے ایسا ہو۔'' شانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ لاہور میں دبکنے کے بجائے اب کسی طرف نکل جائیں تو بہتر ہے۔''

اسی دوران میں شانی کے تایا معصوم بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے آتے ساتھ ہی کہا۔ ''اعجاز! حویلی کا پہرا سخت کرادو۔ رنگ والی کی طرف آنے والے راستوں پر بھی دو تین ناکے لگوا دو۔ ہمیں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔'' پھر وہ شانی کی طرف متوجہ ہو کر بولے۔ ''دھی رانی! تم بھی بہت احتیاط کرو۔ احاطے کی طرف جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''

شانی خاموش کھڑی رہی۔ خالو اعجاز نے معنی خیز نظروں سے شانی کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں..... ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا ناں؟''

شانی کا دل یہ پابندی قبول نہیں کررہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ برقعے یا چادر کے پردے میں یہاں سے نکلے گی تو آسانی سے لاہور پہنچ جائے گی اور واپس بھی آجائے گی۔

تایا معصوم تو مردانے کی طرف چلے گئے، خالو اعجاز وہیں رہے۔ انہوں نے اگلے آٹھ دس منٹ تک شانی سے بحث کی اور اسے قائل کرکے چھوڑا کہ وہ لاہور نہیں جائے گی۔

ان کے جانے کے بعد شانی بے دم سی ہو کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں اذیت

www.pdfbooksfree.pk

ناک خیالات ابھر رہے تھے۔ ڈولا زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ ناصر نے اس سے فون پر بات کی تھی مگر اجمل خان اور رستم کے بارے میں شانی کو کچھ پتا نہیں تھا۔ رستم کے رویے سے اسے لاکھ اختلاف سہی مگر اس وقت وہ خود کو رستم کے لیے دکھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ قدرت اللہ سے رستم اور اجمل وغیرہ کی کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔ اس دشمنی کی وجہ بھی وہ خود تھی اور اس کے حالات تھے۔ کیا رستم صرف اس کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہا تھا؟ اگر وہ رستم کے لیے واقعی اتنی اہمیت رکھتی تھی تو پھر رستم کا رویہ اس کے ساتھ اور اس کے بزرگوں کے ساتھ ایسا کیوں تھا؟ وہ اتنی سنگین غلطیاں کر چکا تھا اور ان غلطیوں پر ذرا سا بھی شرمندہ نہیں تھا.....

وہ سوچتی رہی..... ڈولے کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہا اور اس کی آنکھیں آنسو گراتی رہیں۔ باہر کالے بادلوں میں سے بھی موٹے موٹے آنسو گرنے شروع ہو گئے تھے۔ رنگ والی کی کسی گلی سے تنک دھڑنگ بچے شور مچاتے ہوئے گزر گئے۔

کالیاں اٹاں کالے روڑ

مینہ وسا دے زور وزور

اور پھر واقعی مینہ زور وزور برسنے لگا۔ ''ڈولے خدا حافظ!'' شانی نے دل ہی دل میں کہا اور چہرہ گھٹنوں پر جھکا کر سسک اٹھی۔

کچھ دیر تک دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد وہ اٹھی۔ وہ ناصر کو فون کر کے بتانا چاہتی تھی کہ وہ نہیں آ سکے گی اور وہ لوگ ڈولے کی تدفین وہیں لاہور میں ہی کر دیں۔

وہ فون سیٹ کی طرف بڑھی۔ ریسیور اٹھایا تو وہ خاموش تھا۔ لائن پھر خراب تھی۔ وہ پٹپٹا کر رہ گئی۔ خالو اعجاز اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ ''کیا بات ہے شانی بیٹی؟''

''میں لاہور فون کر کے ناصر کو بتانا چاہتی تھی کہ میں نہیں آ سکوں گی..... مگر فون پھر خراب پڑا ہے۔''

''لگتا ہے بارش کی وجہ سے لائن میں پھر گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' خالو اعجاز نے شانی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''پھر کیا کیا جائے؟ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''میں خادم حسین کو بلاتا ہوں۔ تم نے جو کہنا ہے اسے بتا دو۔ وہ جھنڈے شاہ جا کر لاہور فون کر دے گا۔''

شانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

شانی نہیں جانتی تھی کہ بابا خادم حسین پہلے کی طرح اب بھی اس کا پیغام وہیں پہنچائے گا۔ وہ شانی سے ہمدردی رکھنے کے باوجود چوہدری اعجاز کے اشاروں پر چلتا تھا۔

شانی کی بات سننے کے بعد خادم حسین چوہدری اعجاز کے پاس ہی آیا اور اسے ساری بات بتائی۔ ''ٹھیک ہے۔'' چوہدری اعجاز نے اپنا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم حویلی سے چلے جاؤ اور دو گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آنا۔ شانی بی بی سے یہی کہنا ہے کہ پیغام پہنچ گیا ہے۔''

''جو آپ کا حکم مالک۔'' خادم حسین نے کہا اور باہر چلا گیا۔

چوہدری اعجاز نے بے قراری سے کمرے کے اندر ہی دو تین چکر لگائے۔ وہ صدا کار لڑکی نائیلہ اور اس کا شوہر اختر تصوری آج کل رنگ والی میں ہی موجود تھے اور چوہدری کے مہمانوں کی حیثیت سے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا بیمار بچہ اب کافی بہتر تھا اور وہ اسے چند دن کے لیے تبدیلی آب و ہوا کی خاطر یہاں لائے ہوئے تھے۔ چوہدری اعجاز حویلی کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں یہ لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ آج پھر آوازوں کی ماہر نقالہ سے چوہدری کو تھوڑا سا کام لینا تھا۔

☆=======☆=======☆

رستم اور ناصر بے قراری کے ساتھ رنگ والی سے آنے والی کال کا انتظار کر رہے تھے۔ اجمل مسلسل نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ خانساماں ظفر احمد، ملازمہ حمیداں اور زری سوگواروں کی حیثیت سے ڈولے کے سرہانے بیٹھے تھے۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ناصر نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا۔ رستم نے کوئی خاص ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کال ناصر کو ہی ریسیو کرنا ہو گی۔

ناصر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شانی ہی تھی۔ ''ہیلو! میں شانی بول رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں بھابی! پھر آ رہی ہیں آپ؟''

''میں کیسے آ سکتی ہوں۔ سارے علاقے میں قدرت اللہ کے بندے شکاری کتوں کی طرح پھر رہے ہوں گے۔ ہمیں تو حویلی کے اندر بھی خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔'' شانی کی طرف سے قدرے سخت لہجے میں کہا گیا۔

ناصر کی امید..... مایوسی میں بدل گئی۔ اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔''

''میری مرضی کو کون پوچھتا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اور یہ بات بھی اب ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ وہاں چھانگی وال میں جو کچھ ہوا ہے اس میں کس کا ہاتھ ہے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ قدرت اللہ کے ساتھ درجنوں بے گناہ بھی مارے گئے ہیں۔ ان کا خون کس کی گردن پر ہے، ان کا کیا قصور تھا کہ ان کو ہموں سے اُڑا دیا گیا.....''

''بھابی! میرے خیال میں تو ایسا نہیں ہوا۔ ہم دیدہ لوگوں کا تو یہی کہنا ہے کہ قدرت کے خاص چیلے ہی نشانہ بنے ہیں کیونکہ وہ ایک ہی جگہ جمع تھے اور.....''

''یہاں ہر ایک کا اپنا اپنا سچ ہوتا ہے۔'' شانی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ''آنکھوں میں مرچیں ڈالنا ہم لوگوں کا دیرینہ بن گیا ہے۔ بہرحال کام کرنے والے تو کام کر کے فارغ ہوئے ہیں، اب بھگتنا ہمیں پڑے گا۔''

شانی کے لب و لہجے نے ناصر کو سخت مایوس کیا مگر رستم کی خاطر اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''بھابی! اب آپ کیا کہتی ہیں؟ ڈولے کی تدفین وغیرہ.....''

''جہاں جی چاہے تدفین کر دو۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اور جو ہیں وہ ان حالات میں یہاں پہنچ نہیں سکتے۔'' شانی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ناصر نے چند سیکنڈ تک ریسیور کان سے لگائے رکھا اور پھر یونہی۔ ''خدا حافظ۔'' کہہ کر ریسیور نیچے کریڈل پر رکھ دیا۔

رستم بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس کی جہاندیدہ نگاہیں جیسے ناصر کے اندر تک جھانک رہی تھیں۔ ''ہاں، کیا کہتی ہیں شانی بی بی؟'' اس نے پوچھا۔

''انہوں نے معذرت کی ہے۔ اس کا دل تو یہاں آنے کو زور مار رہا ہے مگر گھر والوں نے سختی سے منع کیا ہے۔ انہیں سکیورٹی کا خطرہ ہے۔ انہوں نے تدفین کے بارے میں کہا ہے کہ وہ یہیں کہیں آس پاس ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔''

رستم ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اسی دوران میں حاجی حیات ''ٹنٹنڈ'' شیشوں والی ایک پرائیویٹ کار میں کوٹھی پہنچ گئے۔ رستم فون پر انہیں ساری صورتِ حال سے آگاہ کر چکا تھا۔ انہیں کئی باتوں پر اختلاف تھا اور وہ ناراض بھی تھے لیکن اس موقع پر انہوں نے اپنی ناراضگی کا اظہار مناسب نہیں سمجھا تھا۔ گاڑی میں ان کے ساتھ پہلوان اور جیرا بھی تھے۔ اس کے علاوہ ان کا معتمد ساتھی انسپکٹر حفیظ بھی تھا۔ روکیٹ بستی میں سخت زخمی ہونے کے بعد اب وہ صحت یاب تھا۔

کوٹھی میں پہنچ کر صورتِ حال سے آگاہ ہوتے ہی پہلوان نے ایک قبر ہی قبرستان میں قبر کا انتظام کرا دیا۔ خانساماں ظفر احمد چوہدری سے تدفین کا سامان لے آیا۔ ایک دو گھنٹے میں سارا کام کیا۔ کوٹھی کے اندر ہی حاجی حیات نے خود ڈولے کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ کوٹھی میں موجود افراد نے ہی نماز پڑھی۔ بارش کی رم جھم میں ڈولے کی میت کو گاڑی میں رکھ کر قبرستان پہنچایا گیا اور سپردِ خاک کیا گیا۔ اجمل خان رسوم میں شریک نہیں ہو سکا۔

اگلے روز اجمل کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی۔ اس نے ڈولے کے بارے میں پوچھا۔ یہ جان کر اس کی آنکھوں میں دکھ امڈ آیا کہ ڈولے کے وارثوں میں سے کسی کو اطلاع نہیں دی جا سکی.....اور اسے خاموشی سے قریبی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا ہے۔

''کیا بات ہے۔ تم چپ ہو گئے ہو اجمل؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ڈولے کا جنازہ پڑھنے والے بس چھ سات لوگ ہی تھے؟'' اجمل نے سوال کیا۔

''ہاں! مگر یہ دکھی کرنے والی بات نہیں ہے اجمل۔ جنازے کے بڑے یا چھوٹے ہونے سے مرنے والے کی حیثیت اور نیک نامی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ سچ جھوٹ کی جنگ میں ایسے ایسے نامور اپنی جان دیتے ہیں جن کی لاشوں کو کندھا دینے والا کوئی نہیں ہوتا..... مگر اس سے ان کا مرتبہ کم نہیں ہو جاتا۔''

''وہ چھوٹا تھا ناصر بھائی مگر اس کے اندر ایک بڑا اور بہت انوکھا بندہ چھپا ہوا تھا۔'' اجمل نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

رستم بھی ان کے پاس آ بیٹھا۔ وہ تینوں کچھ دیر تک صورتِ حال پر تبصرہ کرتے رہے۔ پھر خانساماں ظفر احمد نے آ کر رستم کو بتایا کہ آپو زاہدہ اسے یاد کر رہی ہیں۔

رستم آپو زاہدہ کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا مگر وہ تادیر تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بھائی اکرام چند روز پہلے اپنے بھائی کے پاس ساہیوال چلے گئے تھے۔ عاشی بھی ان کے ساتھ تھی۔ اب یہاں بس آپو زاہدہ اور چھوٹا سرمد ہی تھے۔ رستم کمرے میں پہنچا تو آپو زاہدہ اپنی اشک بار آنکھیں سرخ کیے بیٹھی تھیں۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے رستے؟ تم وہی کچھ کر رہے ہو جس سے میں ہر وقت ڈرتی ہوں اور تمہیں منع کرتی ہوں۔''

''آپو! یہ مجبوری تھی۔''

''یہ کیسی مجبوری تھی جس نے دیکھتے ہی دیکھتے تمہارے ہنستے کھیلتے ساتھی کی جان لے لی۔ دوسرا زخمی ہو کر بستر پر پڑا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

رستم نے اپنی کلین شیو ٹھوڑی کو ہاتھ کی پشت سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ”آپو! اگر کوئی جنگلی جانور ہمارے سامنے کمزور لوگوں پر حملے کر رہا ہو، انہیں چیر پھاڑ رہا ہو..... ہمارے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفل ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا خاموش کھڑے ہو کر تماشا دیکھنا چاہیے؟“

”لیکن تم نے پوری دنیا کا ٹھیکا تو نہیں لیا ہوا رستم۔ تم کب تک خود کو جنگلی جانوروں سے لڑاتے رہو گے..... خود بھی مرتے رہو گے اور ہمیں بھی مارتے رہو گے۔ ہم تمہیں جیتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے دل میں تیری خوشیاں دیکھنے کی حسرت ہے۔ کیا میں یہ حسرت لیے قبر میں چلی جاؤں گی؟“

وہ بولتی رہیں، رستم خاموشی سے سنتا رہا۔ جب ان کے دل کی بھڑاس کسی حد تک نکل گئی تو انہوں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو دو بندے تُو نے کوٹھی میں بند کر رکھے ہیں، ان کو چھوڑتا کیوں نہیں؟ کیوں ان کے بچوں کی بددعائیں لے رہا ہے؟“

آپو زاہدہ کا اشارہ ڈپٹی ریاض کے بھتیجے طفیل اور اس ٹیکسی ڈرائیور کی طرف تھا جسے دو دن پہلے اجمل خان ٹیکسی سمیت پکڑ کر لایا تھا۔

رستم نے کہا۔ ”آپو ان میں سے ایک کو تو ابھی تھوڑی دیر میں چھوڑ دوں گا۔ دوسرا ایسا ہے جس کو بند رکھنے سے بددعائیں نہیں ملیں گی، چھوڑ دینے سے ملیں گی۔“

”مجھے ہر وقت پولیس کا ڈر لگا رہتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جس طرح کے کام تم لوگ کر رہے ہو، پولیس کسی بھی ٹائم یہاں آ سکتی ہے۔“

”بے فکر رہو آپو۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں، پولیس یہاں نہیں آئے گی۔“

آپو زاہدہ کھوئی کھوئی نظروں سے بڑے والہانہ انداز میں رستم کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر اس کے دونوں ہاتھ تھام کر بولیں۔ ”رستے! اب میں اور انتظار نہیں کر سکتی۔ میں نے تیری بڑی منت سماجت کر کے دیکھ لی ہے۔ اب میں تجھے بڑی بہن بن کے دکھاؤں گی۔ میں تیری ایک نہیں سنوں گی رستے۔ میں وہی کروں گی جو مجھے کرنا چاہیے۔“

”کیا کرو گی؟“ رستم اُداسی سے بولا۔

”مجھے اب تیری کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تیرے دل کے اندر ایک چور بکل مار کر بیٹھا ہوا ہے۔ جس دن یہ بکل اُتر گئی، تیرے چہرے پر سہرا بھی سج جائے گا۔“

”تُو کس کی بات کر رہی ہے آپو؟“ رستم بے زاری سے بولا۔

آپو زاہدہ نے رستم کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور عجیب

لہجے میں بولیں۔ ”تُو رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کا غم دل سے لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔“

رستم نے آپو زاہدہ کے ہاتھ چہرے سے ہٹائے اور ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گہری بے زاری تھی۔ ”نہیں آپو! تُو کچھ نہیں جانتی..... کچھ نہیں۔“

وہ مڑا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ آپو نے رعب سے کہا۔ ”میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں رستے۔ تجھ سے کئی سال پہلے پیدا ہوئی تھی میں۔“

رستم سٹپٹایا ہوا تھا۔ ایک وقت تھا جب آپو زاہدہ کو شانی کے بارے میں بتانے کے لیے رستم کا دل مچل مچل جایا کرتا تھا۔ یہ سوچ کر ہی اس کا دل سرشار ہو جاتا تھا کہ آپو اس کی وہٹی کے بارے میں جان کر کتنا خوش ہوں گی لیکن اب سب کچھ برعکس ہو چکا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ آپو کی سوچ شانی تک کیسے جا پہنچی ہے؟

”کیا بات ہوئی رستم بھائی؟“ ناصر نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ آپو کو ہم تینوں کے حوالے سے پریشانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اس کمرے سے ٹیلی ویژن ہٹا دینا چاہیے۔ آپو کسی وقت دیکھنے بیٹھ جاتی ہیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔“

”اور اس ٹیکسی ڈرائیور کا کیا کرنا ہے؟“ رستم نے پوچھا۔

”رات کے وقت اُسے کہیں دور چھوڑ آتے ہیں۔“

رستم نے کچھ دیر سوچا پھر ایک الماری کی دراز میں سے کچھ نوٹ نکال کر ناصر کو تھما دیئے۔ ”یہ تیس ہزار روپے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس سے ٹیکسی کا کچھ نہ کچھ نقصان پورا ہو جائے گا۔“

ناصر نے روپے جیب میں رکھ لیے اور ٹی وی کے تار اتار کر ٹی وی ٹرالی دھکیلتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ رستم کا ذہن ملازمہ ثریا کے بارے میں سوچنے لگا۔ ثریا کے شوہر چھیدی کا قاتل اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ ٹی وی کے ذریعے ثریا بھی اس کے انجام سے باخبر ہو چکی ہو۔ رستم تصور کرنے لگا کہ اس خبر کو جاننے کے بعد ثریا کے احساسات کیا ہوں گے وہ ثریا سے ملنا بھی چاہتا تھا مگر ابھی اس کا موقع نہیں تھا۔ اسی دوران میں رستم کی نگاہ صوفے پر پڑی۔ وہاں تازہ اخبار پڑا تھا۔ ایک دو کالمی سرخی پر اس کی نگاہ جم گئی۔ یہ خبر چھانگی وال کے حوالے سے ہی تھی۔ خبر میں جہاں اس خونی واقعے کی کچھ دیگر تفصیلات بتائی گئی تھیں، وہاں اس ویڈیو فلم کا ذکر بھی تھا جو رستم موقع پر ایک شخص کے حوالے کر آیا تھا۔ نیوز رپورٹر نے لکھا تھا..... معتبر ذرائع کے مطابق ویڈیو فلم میں موجود مواد نے اعلیٰ حکام میں تہلکہ

www.pdfbooksfree.pk

مچا دیا ہے۔ فلم کی ریکارڈنگ کو بند کمرے میں دیکھا گیا ہے۔ فلم کے مناظر لرزہ خیز ہیں۔ ان مناظر میں قدرت اللہ کے عملیات دکھائے گئے ہیں۔ ماضی میں بھی لوگ قدرت کے خاص قسم کے عملیات کا ذکر کرتے رہے ہیں اور اس پر تنقید بھی ہوتی رہی ہے۔ قدرت اللہ کے عملیات اور جھاڑ پھونک کا ایک حصہ وہ ہے جس میں وہ جانوروں کو ملاپ کے دوران میں ہلاک کرتا ہے اور ان کے خون سے جادو کرتا ہے یا جادو کا توڑ کرتا ہے۔ معتبر ذرائع کے مطابق مذکورہ فلم میں بھی اسی عمل کو فلمایا گیا ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس میں جانوروں کے بجائے ایک انسانی جوڑے کو سفاکی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس فلم سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قدرت اللہ اور اس کے ساتھی گاہے بہ گاہے نہایت خفیہ طور پر اپنے جادو ٹونے کے لیے انسانی جانیں بھی لیتے رہے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ زر کثیر خرچ کرنے والے سائلوں کے لیے قدرت اللہ اور اس کے ساتھی یہ قبیح حرکت کرتے تھے.....

خبر کے آخر میں لکھا گیا تھا..... اس فلم کے بارے میں خبریں آنے کے بعد لوگوں کے غم و غصے میں اضافہ ہوا ہے۔ کئی اداروں اور تنظیموں کی طرف سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ سادہ لوح لوگوں کے جان و مال سے کھیلنے والے ایسے بے رحم شعبدہ بازوں کے خلاف سخت ترین کارروائی کی جائے۔ خاص طور سے قدرت اللہ کے بچے کھچے پیروکاروں کو پکڑا جائے اور انصاف کے کٹہرے میں لایا جائے۔ آخری سطروں میں قدرت اللہ کے عقیدت مند راجا نوازش کے گرفتار ہونے کی اطلاع بھی تھی۔ ساتھ ہی اس امر کا تذکرہ بھی تھا کہ راجا نوازش نے قدرت اللہ کی خوشنودی کے لیے جس غریب لڑکی کو اغوا کیا، اس کی شکل قدرت اللہ کی مرحومہ بیوی ڈاکٹر صدف سے ملتی جلتی ہے اور یہ اس نہایت سنگین معاملے کا ایک توجہ طلب پہلو ہے۔

رستم نے یہ تفصیلی خبر ناصر کو بھی دکھائی۔ یہ سب کچھ ان کی توقع اور خواہش کے عین مطابق تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اوپر والے نے ان کی مدد کی ہے۔ قدرت اللہ نہ صرف ہلاک ہوا تھا بلکہ ایسے طریقے سے ہلاک ہوا تھا کہ بے شمار سادہ لوح لوگوں کے دلوں میں موجود اس کا بت بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔

ناصر نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ ڈولے کی قربانی اور اجمل کے زخموں سے بہنے والا خون رائیگاں نہیں گیا۔''

''شانی کیا کہتی تھیں؟'' رستم نے اچانک پوچھا۔

''ششش..... شانی بھابی؟'' ناصر ایک دم گڑبڑا گیا۔ ''انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میرا

مطلب ہے کوئی خاص ردِعمل نہیں تھا۔''

''میرے خیال میں تو انہیں خوش ہونا چاہیے تھا، وہ قدرت اللہ کے لیے اسی قسم کا انجام چاہتی تھیں.....''

ناصر نے کچھ نہیں بتایا..... اور وہ شانی کے تلخ ردِعمل کے بارے میں بتا بھی کیسے سکتا تھا؟ مگر وہ جانتا تھا، رستم کی جہاندیدہ نظریں اسے تٹول رہی ہیں اور وہ اس کے اندر تک دیکھ سکتی ہیں۔ اس نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''رستم بھائی! حاجی حیات صاحب نے کل یا آج آپ سے سردار دراج کے بارے میں کوئی بات کی ہے؟''

''نہیں۔'' رستم نے نفی میں سر ہلایا۔

ناصر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''کل شام سے ایک بات میرے ذہن میں چکرا رہی ہے۔ آپ پہلے ہی پریشان ہیں، میں آپ کو اور پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا مگر بات کہے بغیر چارہ بھی نہیں کیونکہ اس میں نقصان کا اندیشہ ہے۔''

''چلو جہاں اتنی پریشانیاں ہیں، ایک پریشانی اور سہی۔'' رستم زخمی انداز میں مسکرایا۔

''سردار دراج کے بارے میں ہمیں پتا چلا تھا کہ اس کے تین ساتھیوں کو شانی بھابی اور چوہدری اعجاز اپنی ضمانت پر پولیس سے چھڑا کر رنگ والی لے گئے تھے مگر بعد میں سردار دراج وہاں آیا اور ان تینوں کو لے کر غائب ہو گیا۔ یہ بات ہمیں ہضم نہیں ہوئی تھی اور یہ واقعی غلط بھی ہے۔''

''کوئی ثبوت ملا ہے تمہیں؟''

''بہت ٹھوس ثبوت جی۔'' ناصر نے سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے کہا۔ پھر راز داری کے لہجے میں کہا۔ ''کل جب حاجی صاحب ڈولے کے جنازے میں شریک ہونے آئے تھے، ان کے موبائل پر ایک خاص کال آئی تھی۔ حاجی صاحب اس وقت باتھ روم میں وضو کر رہے تھے، میں اتفاقاً کمرے میں چلا گیا۔ حاجی صاحب کو آنے والی کال ان کے خاص مخبر امجد کی طرف سے تھی۔ حاجی صاحب پہلے تو تھوڑا ناراض ہوئے کہ اس نے بے وقت فون کیوں کیا ہے پھر انہوں نے مخبر امجد کی بات سنی اور دھیمے لہجے میں دو چار سوال بھی پوچھے۔ اس گفتگو سے پتا چلا کہ سردار دراج اور اس کے تینوں مہتم ساتھی پولیس کی تحویل میں ہیں۔ انہیں گوجرانوالہ کے انڈسٹریل ایریا کی ایک کوٹھی میں رکھا گیا ہے۔ ہم اس کو پرائیویٹ ٹارچر سیل بھی کہہ سکتے ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ کوٹھی شانی کے خالو اعجاز کے چھوٹے بھائی کی ہے۔ اور خالو اعجاز خود بھی اکثر وہاں پائے جاتے ہیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

یہ انکشاف رستم کے لیے سنسنی خیز تھا۔ چوہدری اعجاز کا نام ایک بار پھر ابھر کر سامنے آ رہا تھا۔ ''یہ تو بہت اہم اطلاع ہے۔'' رستم پژمردہ لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں حاجی حیات صاحب نے یہ اطلاع جان بوجھ کر ہم سے چھپائی ہے اور وہ ہم سے چھپائے ہی رکھیں گے۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم پہلے ہی خطرے پر خطرہ مول رہے ہیں اور ان کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں۔''

رستم کی پیشانی پر پسینے کی نمی چمک گئی۔ وہ بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ سردار دراج اور اس کے ساتھی سخت مصیبت میں ہوں گے۔ ان پر ڈپٹی ریاض کے بھتیجے طفیل کے اغوا کا شبہ تھا۔ طفیل کے بارے میں دراج اور اس کے ساتھیوں کی زبانیں کھلوانے کے لیے پولیس ان پر سخت ترین تشدد کر سکتی تھی۔ ظاہر تھا کہ یہ کسی عام شخص کی گمشدگی کا معاملہ نہیں ہے۔

رستم نے بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''سردار دراج کا قصور اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اس نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ اس کے ساتھ پہلے بھی بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بھائی کو بے رحمی سے مارا گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ قاتلوں کا کھوج لگایا جاتا، پولیس اور گواہی برادری نے پہلے دن سے مدعی پارٹی کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا تھا۔''

''یہ سب کچھ ڈپٹی ریاض کے ایما پر ہو رہا ہے جی۔ مجھے تو ڈر ہے کہ بادل کی طرح دراج کو بھی ختم نہ کر دیا جائے۔''

''پھر کیا ارادہ ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

ناصر نے سگریٹ کے چند طویل کش لے کر ٹکڑا پاؤں تلے مسلا اور بولا۔ ''ہم خاموش نہیں رہ سکتے رستم بھائی۔ دراج کو ایک ایسی کارروائی کی سزا مل رہی ہے جو اس نے کی ہی نہیں..... بلکہ ہم نے کی ہے۔''

''تمہارا کیا مطلب ہے..... ہم سردار اور اس کے ساتھیوں کو چھڑانے کی کوشش کریں؟''

''بالکل..... جس شخص نے ناروپریوں سے آپ کی جان بچائی تھی، اس کی جان بچانا ہمارا فرض ہے..... اور اگر آپ کسی وجہ سے خود جانا نہیں چاہتے تو مجھے اجازت دیں..... میں سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو بچانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاؤں گا۔'' ناصر کے لہجے میں جوش تھا اور نیلی آگ تھی۔

''کسی وجہ سے میرے نہ جانے کی بات تم کیوں کر رہے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''میں چوہدری اعجاز کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ اگر آپ شانی بھابی کی وجہ سے

چوہدری اعجاز کا سامنا کرنا نہیں چاہتے تو یہ کام مجھے سونپ دیجیے رستم بھائی۔''

ناصر، رستم کا مزاج شناس ہو چکا تھا۔ وہ رستم کے ذہن کے دور دراز گوشوں میں موجود خیالات کو بھی بھانپ لیتا تھا۔

رستم نے سگریٹ سلگایا اور اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں پھیل گئیں۔ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ وہ بی بی کے مخالف رخ پر چلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسے سوچنا تھا تو اس کا دماغ سن ہونے لگتا تھا۔ ہاتھ پاؤں جواب دینے لگتے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ برسات کے حبس نے ماحول کو جکڑا ہوا تھا۔ اس نے کھڑکیاں بند کر دیں اور ایئر کنڈیشنر چلا دیا لیکن حبس پھر بھی کم نہیں ہوا۔ دل میں دھواں سا بھر رہا تھا۔ وہ شانی کا شوہر نہیں تھا، سچا عاشق تھا اور اس کا عشق ایسے درجے پر تھا جہاں من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ محبوب کی مرضی کے سوا کوئی مرضی ہوتی ہی نہیں ہے۔ وہ اپنے کسی عمل سے اپنے محبوب کو ناراض کیسے کر سکتا تھا، وہ تو اپنے پہلے عمل پر ہی حد درجہ پچھتا رہا تھا۔ اس نے بارہا سوچا تھا کہ کاش چوہدری اعجاز والا واقعہ نہ ہوا ہوتا۔

اب یہ بات بالکل سامنے کی تھی کہ وہ دراج اور اس کے ساتھیوں کو مصیبت سے نکالنے کے لیے کوئی کارروائی کرتا تو اس کا ٹکراؤ چوہدری اعجاز اور اس کے بھائی سے ہوتا اور چوہدری اعجاز شانی بی بی کے خالو تھے۔ وہ انہیں پورا اعتماد اور احترام دیتی تھیں۔ وہ بڑی دیر تک فیصلے کی صلیب پر لٹکتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنی شانی بی بی کی منشا کے خلاف چلنا چاہتا ہے تو اس کے سارے بال و پر جل جاتے ہیں۔ وہ کٹے ہوئے پالوں والے داستانی کردار سیمسن کی طرح اپنی ساری توانائیاں کھو بیٹھتا ہے۔ پتا نہیں کہ یہ دو دلوں کے درمیان کیسا ناتا تھا..... ؟ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ ناصر سے کہے تو وہ دیوانہ وار کارروائی کرے گا۔ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر وہ گوجرانوالہ انڈسٹریل ایریا پہنچ جائے گا اور چوہدری اعجاز کو دن میں تارے دکھا دے گا لیکن وہاں جو کچھ بھی ہو گا، کیا وہ خود اس کی ذمے داری سے بچ سکے گا؟ چوہدری اعجاز اور رنگ والی کے دیگر چوہدری ناصر کو اس کا دستِ راست ہی سمجھیں گے۔ وہ شانی کو بتائیں گے کہ یہ سارا کچھ بھی رستم کے ایما پر ہوا ہے۔

وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا۔ اگر ایک طرف شانی تھی تو دوسری طرف مصیبت زدہ سردار دراج تھا۔ وہ سردار دراج کی مصیبت سے بھی نگاہ نہیں چرا سکتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اپنی ہی نگاہوں سے گر جاتا۔ وہ دیر تک پریشان رہا پھر اس نے فیصلہ کیا کہ کچھ بھی کرنے سے پہلے وہ سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے

www.pdfbooksfree.pk

کہ وہ کس جگہ اور کس حال میں ہیں۔ اس کے لیے وہ ناصر کو استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اجمل ویسے ہی زخمی تھا۔ رستم کے ذہن میں زوار کا خیال آیا۔ زوار اس کے ان دوستوں میں سے تھا جو اس کے لیے کسی بھی وقت کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ موبائل کے ذریعے زوار کے ایک دو پرانے نمبرز پر رابطے کی کوشش کرتا رہا مگر ناکامی ہوئی۔ پھر اس نے دریبنہ ملتانی دوست جہانگیر کا نمبر ٹرائی کیا۔ یہاں پہلی کوشش میں ہی اسے کامیابی ہوگئی۔ دوسری طرف سے جہانگیر کی گونج دار آواز آئی۔ ''کون ہے بھئی، کیا گل ہے؟''

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے ریسٹورنٹ میں بیٹھا کڑاہی گوشت یا اس قسم کی کوئی اور شے کھا رہا تھا۔ بے دریغ پیسہ خرچ کرنا اور زندگی کے ہر لمحے سے لطف حاصل کرنا جہانگیر کا وتیرہ تھا۔

رستم نے کہا۔ ''بڑی جلدی بھول گیا ہے جہانگیرے! تُو تو کہتا تھا، میں تیری آواز لاکھوں میں پہچان سکتا ہوں۔''

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر جہانگیر کی چلائی ہوئی آواز آئی۔ ''اوئے رستم..... تم؟ کہیں میرے کان اندھے تو نہیں ہوگئے، میرا مطلب ہے بہرے تو نہیں ہوگئے؟ یار! تم نے تو اتنی لمبی جدائی ڈالی ہے کہ بس جیتے جی مار دیا ہے۔ کہاں تھے تم؟ اتنی دیر کہاں رہے..... ویری دشمنوں نے تو بڑی بری بری خبریں پھیلا رکھی تھیں..... تم نے فون کیوں نہیں کیا؟ نہ کوئی خط پتر، نہ کوئی پیغام؟'' اس نے ایک ہی سانس میں درجن بھر سوالات کر ڈالے۔

جہانگیر سے رستم کی آخری ملاقات ملتان میں ہی ہوئی تھی۔ قدرت کے ملتان والے آستانے پر تڑکھلی مچانے کے بعد رستم اور گوہر انے چند روز جہانگیر کے پاس ہی گزارے تھے۔ یہاں جہانگیر نے رستم کو وہ 25 لاکھ روپے پیش کیے تھے جو ایک زمین کا قبضہ چھڑانے کے بدلے رستم کے حصے میں آئے تھے۔ اس 25 لاکھ میں سے کچھ رقم رستم نے اپنے اخراجات کے لیے رکھی تھی۔ باقی رقم میں سے کچھ رقم اس نے ڈھوک شاہاں کی اس مہربان لڑکی مہراں کو بھجوائی تھی جس نے رستم کی خاطر خود کو سراجے نام کے کریہہ صورت بندے کے سپرد کیا تھا۔ باقی رقم اس نے شانی بی بی ہسپتال کے لیے بھجوادی تھی۔

آج ایک عرصے بعد رستم کے کانوں میں پھر اپنے اس بے تکلف دوست جہانگیر کی آواز پڑ رہی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''جگر! ہم جیسے مفروروں کی زندگی تو کھلی جگہ پر رکھی ہوئی موم بتی کی طرح ہوتی ہے۔ قانون کی آندھی کسی بھی وقت اسے بجھا سکتی ہے پھر تم جدائیوں کے تیتنے لمبے لمبے دھاگے کیوں ڈال دیتے ہو؟''

''بس کچھ مجبوریاں تھیں..... تم بتاؤ تم نے میرے کام کیے تھے؟''

''جانِ جگر! یہ بھی کوئی پوچھنے والی گل ہے۔ میں نے پورا ایک ہفتہ لگا کر ڈھوک شاہاں کی اس لڑکی مہراں کو ڈھونڈا۔ اس کا کمینہ شوہر سخت بیمار پڑا تھا۔ پورے گھر میں غریبی ناچ رہی تھی۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ اتنی بڑی رقم پا کر ان لوگوں کو کتنی خوشی ہوئی۔ تیرے کہنے کے مطابق میں نے یہ سب کچھ تیرا نام لیے بغیر کیا تھا۔ شانی بی بی ہسپتال کو بھی رقم اسی طرح چپ چپاتے پہنچائی تھی۔''

''اچھا، یہ باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی۔ اب تُو کیا کر رہا ہے؟''

''بس مرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ پیسے خرچ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن یہ پیسہ ایسی کمینی شے ہے کہ جب اسے کھلے دل سے خرچ کرنے کا ارادہ کرلو تو پھر خرچ ہی نہیں ہوتا۔ اب دیکھ..... ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں میں نے اپنے تین یاروں کے ساتھ کوئی ساڑھے تین ہزار کا کھانا کھایا ہے۔ قریباً دس ہزار کی..... بلیک کی شراب پی ہے لیکن ہوٹل کا منیجر ایسا کھوجی ولیکر ہے کہ مجھے پہچان گیا ہے۔ کہتا ہے کہ کھانے کا ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ اب ایسے سستے دور میں بندہ زہر کھا کر نہ مرے تو کیا کرے۔''

''میری ساری ہمدردیاں تیرے ساتھ ہیں۔'' رستم نے کہا۔ ''مگر اس وقت تجھے ایک بڑے خاص کام کے لیے فون کیا ہے۔''

''تیرا بتایا ہوا کوئی کام بھی میرے لیے عام نہیں ہوتا یار..... ہر کام کے لیے تیار ہوں لیکن شرط یہی ہے کہ اس کام کے بعد تجھ سے ملاقات ہونی چاہیے۔''

''ملاقات بھی ہو جائے گی۔ پہلے کام سن لے۔'' رستم نے کہا۔ پھر وہ اسے بتانے میں مصروف ہوگیا کہ اسے گوجرانوالہ پہنچ کر کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔

جہانگیر نے رستم کی توقع سے زیادہ تیز رفتاری سے کام کیا۔ صرف بارہ گھنٹے بعد اس نے وہ تقریباً ساری معلومات رستم تک پہنچا دیں جو اسے درکار تھیں۔ اس نے رستم کے موبائل فون پر جو کچھ بتایا اس سے چوہدری اعجاز کے بھائی کی کوٹھی کا مکمل ایڈریس معلوم ہوگیا۔ یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ اس کوٹھی میں کتنے افراد موجود ہو سکتے ہیں۔ چوہدری اعجاز کے بھائی کا نام شاداب تھا۔ اسے شابی بھی کہا جاتا تھا۔ اس نے انڈسٹریل ایریا میں چاول صاف کرنے والے دو تین شیلر لگا رکھے تھے۔ جہانگیر نے یہاں تک معلوم کرلیا تھا کہ چوہدری اعجاز ہر بدھ اور اتوار کو رنگ روڈ والی سے سفر کر کے اپنے بھائی شاداب کے پاس آتا ہے اور تقریباً سارا دن وہیں گزارتا ہے۔ چاولوں کے کاروبار میں چھوٹے بھائی کے ساتھ اس کی پارٹنرشپ بھی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

یہ ساری معلومات رستم کے لیے مفید تھیں۔ اس نے جہانگیر کا شکریہ ادا کیا۔

وہ تڑپ کر بولا۔ ''نہیں نہیں..... اس شکریے کے بجائے میرے سر پر اینٹ مار دو تو زیادہ اچھا ہے۔ یاروں کے درمیان کوئی شکریہ نہیں ہوتا۔ اگر میرے لیے کچھ کرنا ہی چاہتے ہو تو پھر مجھے ملاقات کا ٹائم دو۔ ڈھیروں باتیں ہیں جو تمہارے ساتھ کرنی ہیں۔ سمجھو کہ میری باتوں والی ٹینکی فل ہوئی پڑی ہے۔''

''باتیں تو میں نے بھی بہت سی کرنی ہیں مگر مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ یہ مہلت ہم دونوں کے لیے اچھی ہوگی۔''

جہانگیر کو بہ مشکل قائل کر کے رستم نے فون بند کر دیا۔ اب اسے اس کوٹھی میں پہنچنے کی تیاری کرنا تھی جو چوہدری اعجاز کے بھائی کی ملکیت تھی..... اور جہاں مصدقہ اطلاعات کے مطابق دراج اور اس کے ساتھی بند تھے۔ جو کچھ رستم کے ذہن میں تھا، وہ بس اپنے تک ہی رکھنا چاہتا تھا۔ ناصر اور اجمل کو بھی کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ کل اتوار کا دن تھا اور وہ کل ہی وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ جب وہ وہاں پہنچے تو چوہدری اعجاز بھی وہاں موجود ہو۔

اگلے روز دس بجے تک کا وقت اس نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ بی ایم ڈبلیو موٹر سائیکل کے لیے ایک نئی نمبر پلیٹ اور ہیلمٹ کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔ حاجی حیات پہلے ہی اس بات سے ناراض تھا کہ رستم کوٹھی سے نکل کر کارروائیاں کر رہا تھا۔ اب اسے پتا چلتا تو اس نے مزید ناراض ہونا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ رستم اب حاجی کی ہر طرح کی ناراضگی جھیلنے کو تیار ہو چکا ہے۔ اجمل کی حالت بہتر تھی۔ ناصر مسلسل اس کی تیمارداری اور علاج میں لگا ہوا تھا۔ گاہے بہ گاہے زری بھی اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ بتدریج سنبھل رہی تھی۔ حلیہ بھی بہتر ہو رہا تھا مگر اوٹ پٹانگ حرکتیں وہ اب بھی کرتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔ اچانک گیراج کی طرف سے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گونج دار آواز آئی۔ پھر موٹر سائیکل گری اور اس کی ریس بڑھتی چلی گئی۔ گیراج کی طرف جیسے بھونچال سا آ گیا تھا۔ رستم بھاگا ہوا موقع پر پہنچا۔ موٹر سائیکل گری ہوئی تھی اس کا پچھلا پہیہ اسپیڈ سے گھوم رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ موٹر سائیکل بھی گھوم رہی تھی۔ خانساماں ظفر احمد موٹر سائیکل کو سنبھالنے کی کوشش میں موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ ہی چکریاں کھا رہا تھا۔ پھر اس نے غلطی کی، موٹر سائیکل کو بند کیے بغیر اسے کھڑا کرنا چاہا۔ تیزی سے گھومتے ہوئے پہیے نے پانچ ہارس پاور بی ایم ڈبلیو کو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی سی رفتار دے دی۔ وہ تیزی سے آگے کو گئی اور ٹی وی لاؤنج کا بلوری دروازہ توڑتی ہوئی ایک صوفے پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔

اسے بند کر کے بہ مشکل صوفے سے جدا کیا گیا۔ اس تصادم کا سارا نقصان صوفے نے برداشت کیا تھا۔ خانساماں ظفر نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یہ بی بی زری نے کیا ہے۔ بڑی دیر سے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی.....''

''لیکن وہ گئی کہاں؟'' رستم نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''زری..... زری!'' ناصر نے اسے آوازیں دیں۔

زری کا جواب نہیں آیا..... نہ ہی وہ کہیں دکھائی دی۔ رستم، ناصر اور ظفر وغیرہ اسے ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ نیا ہیلمٹ جو رستم نے موٹر سائیکل کی سیٹ پر رکھا ہوا تھا، وہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رستم نے خانساماں ظفر سے پوچھا۔ ''ہیلمٹ کہاں ہے؟''

''وہ زری بی بی نے پہنا ہوا تھا جی..... کہہ رہی تھی میں موٹر سائیکل پر بیٹھ کر شانا باجی (شانی) کو ڈھونڈنے جا رہی ہوں۔ بس مذاق مذاق میں موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو گئی۔''

''لیکن وہ گئی کہاں ہے؟'' ناصر نے ماتھے سے پسینا پونچھتے ہوئے کہا۔

رستم بھی پریشان تھا۔ وہ تقریباً ہر جگہ دیکھ چکے تھے۔ وہ کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف آئے۔ دفعتاً رستم کی نگاہ باغیچے کے ایک اونچے درخت پر پڑی اور وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ وہ جامن کی ایک اونچی شاخ پر چڑھی بیٹھی تھی۔

رستم نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ ناصر بھی سٹپٹا کر رہ گیا۔ ہیلمٹ بہ دستور زری کے سر پر تھا اور وہ مضحکہ خیز نظر آ رہی تھی۔

''چلو نیچے اترو۔'' ناصر نے حکم سے کہا اور ساتھ ہی انگلی سے نیچے آنے کا اشارہ کیا۔

''میں نہیں اترتا۔ تم ہم کو مارے گا۔''

''وہ تو ضرور ماروں گا۔ اگر تم نیچے نہیں آؤ گی تو اوپر چڑھ کر ماروں گا۔''

''نہیں نہیں، مذاق کر رہا ہے۔ چلو نیچے آ جاؤ، کچھ نہیں کہے گا۔'' رستم نے کہا۔

''وہ ایک دم چل پڑا۔ مجھ کو پتا ہی نہیں چلا۔'' زری کا اشارہ موٹر سائیکل کی طرف تھا۔

ناصر بولا۔ ''تمہارے ہاتھ میں آنے والی ہر شے ایک دم چل پڑتی ہے اور تم کو پتا ہی نہیں چلتا۔ کسی دن ایسے ہی پستول چلا کر شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو جاؤ گی اور تمہیں پتا ہی نہیں چلے گا۔''

اس نے معصومیت سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''مجھ سے غلطی ہوا۔ میں معافی مانگتا ہوں۔''

''اب ایک اور غلطی..... معافی مانگتا نہیں..... معافی مانگتی ہوں۔ بولو معافی مانگتی

www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں..... مانگتی ہوں۔'' وہ ہولے سے مسکرائی۔

''کیا مانگتی ہوں۔ پورا فقرہ بولو۔''

''میں معافا مانگتی ہوں۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''چلو جی۔ اب معافی کا معافا ہو گیا۔ تم نہیں سنور سکو گی۔'' ناصر نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''یہ ہمارا ہی ''غلطا'' تھا کہ تمہیں ان برفوں سے اٹھا کر یہاں لے آئے۔''

رستم نے کہہ سن کر زری کو بہ مشکل جامن کی کچی شاخوں سے نیچے اتارا۔ نیچے اُتر کر زری نے ہیلمٹ اُتارا اور ایک بار پھر بڑی معصومیت سے اپنے کان پکڑ کر کھینچے۔ اس کی یہ ادا اتنی معصومیت بھری ہوتی تھی کہ ناصر کا سارا غصہ کافور ہو جاتا تھا۔

وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو..... ہم نے تمہیں، اپنے کان خود ہی کھینچنے کی رعایت دی ہوئی ہے۔ یہ رعایت کسی بھی وقت واپس لی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں تمہارے کان اتنے لمبے نہیں رہیں گے جتنے اب ہیں۔''

پتا نہیں کہ ناصر کی بات زری کی سمجھ میں آئی یا نہیں مگر اس نے اثبات میں سر ضرور ہلایا۔ کمرے میں جا کر وہ رستم سے بولی۔ ''میں شانا باجی کے لیے بہت اداس..... وہ مجھ کو بہت اچھا لگتا۔ وہ واپس کیوں نہیں آتا؟ اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے ہوتا.....''

رستم نے لمبی سانس لی اور جواب دینے کی ذمے داری ناصر پر ڈال کر باہر آ گیا۔ گیراج میں جا کر رستم نے موٹر سائیکل کا معائنہ کیا۔ وہ کسی بڑے نقصان سے محفوظ رہی تھی، بس چھوٹی موٹی خراشیں آئی تھیں۔

رستم دوپہر بارہ بجے کے لگ بھگ کوٹھی سے نکلا اور گوجرانوالہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ جی ٹی روڈ پر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر نے اسے اس کی منزل تک پہنچا دیا۔ وہ انڈسٹریل ایریا میں داخل ہوا اور پھر اس شاندار کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا جو ایک نسبتاً سنسان سڑک پر واقع تھی۔ کوٹھی کے عقب میں بسوں کی باڈیاں وغیرہ بنانے کی ایک بڑی فیکٹری تھی۔ دائیں طرف بھی ایک کارخانہ موجود تھا۔

گیٹ پر موجود گارڈز نے رستم سے آمد کی وجہ پوچھی۔ گارڈ سے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی رستم نے سرخ رنگ کی وہ نئی مگر کیچڑ آلود جیپ دیکھ لی جس پر چوہدری اعجاز عموماً سفر کرتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوٹھی میں موجود ہے۔

رستم نے گارڈ سے کہا۔ ''چوہدری اعجاز صاحب سے ملنے آیا ہوں۔''

''آپ نے ٹائم مقرر کیا ہوا ہے؟'' گارڈ نے ترشی سے پوچھا۔

''بس ان سے اتنا کہہ دو، وڈے ڈیرے والا آیا ہے۔ نام بتانے کی بھی ضرورت نہیں یا پھر فون پر بات کرا دو۔''

گارڈ نے دوسری تجویز پر عمل کیا۔ لکڑی کے کیبن میں انٹر کام موجود تھا۔ اس نے پہلے سرگوشیوں میں خود بات کی پھر ریسیور رستم کی طرف بڑھا دیا۔ دوسری جانب چوہدری اعجاز ہی تھا۔ ''ہیلو!'' رستم نے کہا۔

''کون ہو تم؟'' دوسری طرف سے نہایت پریشان لہجے میں پوچھا گیا۔

''میرا خیال تھا کہ آپ وڈے ڈیرے کے اشارے سے پہچان لیں گے۔''

''اوہ!'' چوہدری نے متعجب انداز میں کہا۔ اس نے رستم کی آواز پہچان لی تھی۔ چند لمحے گمبھیر خاموشی رہی پھر چوہدری کی آواز ابھری۔ ''مجھے تمہارے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''میں حلفیہ کہتا ہوں۔ میرا کوئی ساتھی میرے ساتھ نہیں ہے، میں خود بھی خالی ہاتھ ہوں۔ آپ کے بندے میری تلاشی لے سکتے ہیں۔''

چوہدری خاموش رہا۔ وہ سخت ڈرا ہوا لگتا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا..... تم اکیلے اور خالی ہاتھ بھی کم خطرناک نہیں ہو۔ رستم نے کہا۔ ''میں قسمیں نہیں کھاتا، ہاں اپنی زبان کا پاس مجھے اپنی جان سے بھی عزیز رہتا ہے۔ اور میں اسی زبان سے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا ارادہ لڑائی جھگڑے کا نہیں ہے۔ میں آپ سے بس چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد چلا جاؤں گا۔''

''لیکن ان باتوں کے لیے تم نے یہی جگہ کیوں چنی ہے؟'' چوہدری کے لہجے میں اب بھی شک بول رہا تھا اور اس شک کی وجہ بھی رستم جانتا تھا۔

''میں رنگ والی نہیں آ سکتا تھا..... نہ میرے بلاوے پر آپ لاہور پہنچ سکتے تھے، اس لیے مجھے یہی جگہ مناسب معلوم ہوئی لیکن اگر آپ کہیں اور بیٹھ کر بات کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔''

چوہدری اور رستم کے درمیان کچھ دیر سوال جواب ہوئے۔ پھر چوہدری اعجاز نے گارڈز کو انٹر کام پر ہدایات کیں کہ وہ رستم کو کوٹھی کے ساتھ ہی واقع مل کے آفس میں لے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی چوہدری نے گارڈز کو رستم کی تلاشی کی ہدایت بھی کی۔

گارڈز نے رستم کو کڑی نظروں سے گھورا اور جوتے اتروا کر مکمل تلاشی لی۔ اس کا

www.pdfbooksfree.pk

ہیلسٹ بھی اپنے پاس رکھ لیا گیا۔

مل کا دفتر تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ بے حد سجا سجایا اور وسیع آفس تھا۔ امپورٹڈ فرنیچر، امپورٹڈ ڈیکوریشن۔ آفس کے دو حصے تھے۔ ایک حصے میں تھوڑی سی گہما گہمی نظر آئی۔ چھٹی کے روز یہ گہما گہمی غیر متوقع تھی۔ رستم نے ایک فیشن ایبل نوجوان کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار کی ملوثی تھی۔ گلے میں ہیرے کا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی قیافہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ وہسکی پی کر رات بھر کسی حسینہ کے پہلو میں موجود رہا ہوگا۔ اس کی شکل و شباہت نے ایک لمحے میں رستم کو سمجھا دیا کہ وہ چوہدری اعجاز کا چھوٹا بھائی شاداب عرف شابی ہے۔

چار عدد خوبرو لڑکیاں اور گنجے سروں والے دو منیجر نما افراد بھی آفس کے اس حصے میں موجود تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ آفس میں موجود چاروں لڑکیوں کے بال غیر معمولی طور پر لمبے اور سلکی تھے۔ وہ اپنے بالوں کو بڑے ناز سے گاہے بہ گاہے دائیں بائیں جھلاتی تھیں۔ ان میں سے دو تو خاصی خوبصورت تھیں۔

رستم صوفے پر بیٹھا رہا اور آفس کے دوسرے حصے میں ہونے والی نقل و حرکت کو دیکھتا رہا۔ لڑکیاں نخرے دکھا رہی تھیں اور گنجے سر والا درمیانی عمر کا شخص ایک جدید کیمرے سے ان کی تصویریں اتار رہا تھا۔ شاداب عرف شابی کی بھرائی ہوئی آواز رستم کے کانوں میں پہنچی۔ وہ ایک لڑکی سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ”دیکھو مس شاہینہ! شیمپو کی فیلڈ میں بڑا سخت کمپی ٹیشن ہے۔ ایک نئے بڑھ کر ایک سپر ماڈل اسکرین پر نظر آ رہی ہے۔ ہم کچھ نیا اور بہتر کر کے دکھائیں گے تو لوگ توجہ دیں گے ناں۔“

لڑکی جو پہلے ہی مختصر لباس میں تھی، اٹھلا کر بولی۔ ”تو پھر ہمارے سارے کپڑے ہی اتار لیجیے۔ ایک دم نیا ہو جائے گا۔“

ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ شابی نے بڑی بے تکلفی سے ایک لڑکی کے بالوں کو اس کی پشت کی طرف سے اٹھا کر دو حصوں میں تقسیم کیا اور ایک حصہ سامنے کی طرف ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اس طرح کچھ اچھا لگ رہا ہے لیکن یہ مس شرماتی بہت ہے۔“ وہ واقعی شرما گئی۔

ایک دوسری لڑکی شوخی سے بولی۔ ”اس کی شرم دور کرنے کے لیے اس کے ساتھ ایک چکر کسی اچھے ریسٹورنٹ کا لگائیں اور رات کا کھانا ہو تو زیادہ اچھا ہے۔“

لڑکیاں پھر کھلکھلا کر ہنسیں۔ شابی نے کمال بے تکلفی سے فقرہ کہنے والی لڑکی کی گال پر چٹکی لی اور بولا۔ ”تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم بولتی بہت ہو۔“

وہ رستم کی پرواہ کیے بغیر اٹھکیلیاں کر رہے تھے۔ اگر ان لڑکیوں کو اور ان کے ساتھیوں کو

رستم کی پہچان ہو جاتی تو وہ شاید ایک لمحہ بھی وہاں رکنا پسند نہ کرتے۔

رستم نے اندازہ لگایا کہ چوہدری اعجاز کا صنعت کار بھائی کاروبار میں کوئی نئی مہم جوئی کر رہا ہے۔ وہ غالباً کاسمیٹکس کی طرف آ رہا تھا اور شیمپو وغیرہ بنانا چاہ رہا تھا۔ دراز بالوں والی ماڈلز کا اجتماع بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ یعنی کاروبار کا کاروبار، تفریح کی تفریح! رستم جانتا تھا کہ رنگین مزاج صنعت کار اور کاروباری لوگ اس قسم کے راستے اپناتے رہتے ہیں۔ دونوں گنجے افراد اشتہاری کمپنی سے تعلق رکھتے تھے۔

اس دوران میں آفس کے دونوں حصوں کو ملانے والا دروازہ بند کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی چوہدری اعجاز اندر داخل ہو گیا۔ وہ بہت چوکس اور کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا۔ وہ اکیلا اندر آیا تھا۔ تاہم رستم جانتا تھا کہ اس کے اردگرد مسلح افراد موجود ہیں اور وہ یقیناً کمرے کے اندر کی صورتِ حال بھی دیکھ رہے ہیں۔ چوہدری اعجاز نے اندر آتے ہی ان دو گارڈز کو باہر بھیج دیا جو حساب کتاب کے فرشتوں کی طرح رستم کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔

چوہدری اعجاز نے خشک لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہمیں فوراً کام کی بات پر آ جانا چاہیے..... سب سے پہلے تو میری یہ الجھن رفع کرو کہ تم نے اس ملاقات کے لیے یہ جگہ ہی کیوں چنی ہے؟“ چوہدری کے لہجے میں شک لہریں لے رہا تھا۔

رستم بولا۔ ”آپ کی طرح میں بھی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے یہاں سردار دراج کے موجود ہونے کا پتا ہے۔“

چوہدری کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے اپنی اندرونی کیفیت پر بہ مشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”اب کیا چاہتے ہو تم؟“

”اپنے ساتھی کی رہائی لیکن آپ سے لڑ کر نہیں..... بات چیت کے ذریعے۔“

چوہدری نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔ ”دیکھو رستم! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں۔ میں بس اپنی بھانجی کو..... جو مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر پیاری ہے..... غلط حالات سے بچانا چاہتا ہوں۔ اگر میں تم سے ہیر کھانا چاہتا تو تم اور تمہارے ساتھی یوں آزادانہ نہ پھر رہے ہوتے۔ لاہور کی کوٹھی پر پولیس چڑھائی کر چکی ہوتی اور بہت خون خرابا ہو چکا تھا لیکن یہ سب کچھ میرے سینے میں دفن ہے اور دفن رہے گا۔“

”اگر آپ کی طرف سے برداشت دکھائی جا رہی ہے تو میں نے بھی کوئی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھایا۔ مجھے کئی دن سے معلوم ہے کہ سردار دراج اور اس کے ساتھی یہاں موجود ہیں۔

www.pdfbooksfree.pk

مہتم ہر جگہ انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور بہت بپھرے ہوئے ہیں لیکن کوئی مہتم یہاں نہیں پہنچا اور نہ ہی پہنچے گا۔"

"اگر میں کہوں کہ سردار دراج یہاں نہیں ہے..... وہ پولیس کی تحویل میں ہے تو پھر؟"

"پھر ایک لمبی بحث چھڑ جائے گی اور ہم دونوں کا، خاص طور سے آپ کا ٹائم ضائع ہو گا۔"

چوہدری اعجاز نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے دو طویل کش لیے اور بولا۔ "تم اپنے دل کی بات بتاؤ، تمہاری مرضی کیا ہے؟"

رستم کی آنکھوں کے سامنے ایک دم اپنی شانی بی بی کا چہرہ آ گیا۔ ان کی اشک بار آنکھیں، ان کے خاموش لب..... رستم نے خود کو بہت گناہ گار محسوس کیا۔ اس کے سینے میں موجود فولادی دل..... فولادی نہ رہا۔ وہ جس نے جھکنا نہیں سیکھا تھا، جس کو پشیمان ہونا نہیں آتا تھا، جس نے اپنی ترنگ میں کبھی کسی کو پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، ایک دم خود کو بدلا ہوا محسوس کرنے لگا۔

اس نے دل کی گہرائی سے کہا۔ "چوہدری صاحب! غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی ہوئی۔ ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے آپ پر ہاتھ اٹھایا۔ میں اس کے لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

چوہدری اعجاز اپنی جگہ ساکت اور خاموش بیٹھا رہا۔ کتنے ہی گمبھیر لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ آخر چوہدری کی بھاری آواز نے اس خاموشی کو توڑا۔ "اگر تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو تو میں بھی پچھلی ساری باتوں کو بھول جانا چاہتا ہوں۔ اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں پچھلی باتوں کو بھولنا ہو گا۔" چند لمحے توقف کر کے اس نے پوچھا۔ "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"آپ شانی بی بی کے لیے عزت کی جگہ پر ہیں تو میرے لیے بھی ہیں۔ میں آپ سے سردار دراج کے بارے میں درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیں۔"

"یہ آسان کام نہیں ہے۔ وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ سردار کے ساتھی حوالات توڑ کر بھاگے ہوئے ہیں۔"

"آپ چاہیں گے تو یہ سب کچھ ہو جائے گا۔" رستم نے یقین سے کہا۔

چوہدری بغور رستم کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "ٹھیک ہے رستم! میں یہ کام کرا دیتا ہوں۔ تمہارے چھوٹے موٹے اور مسئلے ہیں وہ بھی حل ہو

جائیں گے..... لیکن اس کے بدلے؟"

"آپ بتائیں۔"

چوہدری کے چہرے پر پتھریلی سختی ابھر آئی۔ وہ کش لے کر بولا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تمہارا ساتھ شانی کے لیے مصیبت اور دکھ کے سوا اور کچھ نہیں لائے گا۔ وہ اب خود بھی اس چیز کو سمجھ گئی ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم بڑے دل کے مالک ہو اور مشکل فیصلے کر سکتے ہو..... میں چاہتا ہوں کہ تم شانی کی زندگی سے الگ ہو جاؤ۔"

رستم کے دل پر جیسے کسی نے بہت زور دار گھونسہ رسید کیا تھا۔ اسے اپنا آپ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر بولا۔ "میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا چوہدری صاحب کہ کچھ ہی دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں اس وعدے پر قائم ہوں۔ بس ایک دو ضروری کام ہیں..... وہ ہو جائیں تو یہاں سے دور چلا جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ ملک ہی چھوڑ جاؤں۔"

"نہیں رستم۔ میں ٹھوس حل چاہتا ہوں..... اور مجھے یقین ہے، اب شانی بھی یہی چاہتی ہے..... تمہیں شانی سے اپنا رشتہ ختم کرنا ہو گا..... اسے طلاق دینی ہو گی۔" چوہدری کے آخری الفاظ رستم پر بجلی کی طرح گرے۔ اسے لگا جیسے وہ اپنی جگہ بیٹھا بیٹھا بھسم ہو گیا ہے۔ کیا بی بی کے بغیر بھی کوئی زندگی ہو سکتی ہے؟ اس نے بے حد کرب اور تعجب سے سوچا۔ جواب نفی میں تھا..... یکسر نفی میں تھا.....

"اسے طلاق دینی ہو گی۔" چوہدری اعجاز کے الفاظ رستم کی سماعت میں گونج رہے تھے اور وہ سکتہ زدہ بیٹھا تھا۔

چوہدری سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھتا رہا پھر گہرا کش لے کر بولا۔ "اگر تم راضی ہو تو میں ایک دو دن میں کاغذات تیار کروا سکتا ہوں۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں چوہدری صاحب! ہم وقتی طور پر ایک دوسرے سے دور ہیں مگر..... ہمارے درمیان اتنی زیادہ دوری نہیں ہوئی کہ خدانخواستہ اس قسم کے فیصلے کی نوبت آ جائے..... آپ نے....."

"نہیں رستم! تم غلط سوچ رہے ہو۔" چوہدری نے تیزی سے رستم کی بات کاٹی۔ "میں نے تمہیں یہی کہا ہے کہ میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں مگر حالات بہت بدل چکے ہیں..... جو کام کچھ عرصے بعد خراب طریقے سے ہونا ہے، وہ ابھی اچھی طرح سے ہو جائے تو بہتر ہے۔"

www.pdfbooksfree.pk

''نہیں چوہدری صاحب! میں یہ نہیں کرسکتا۔ یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' رستم نے کراہ کر کہا۔ ''میں آپ سے یہ وعدہ تو کرسکتا ہوں کہ کبھی شانی کو اور آپ کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا مگر.....''

''تم اسے کس گناہ کی سزا دینا چاہتے ہو؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ ساری زندگی تمہاری باندھی ہوئی بندش میں جکڑی رہے؟''

''نہیں چوہدری صاحب! یہ بندش زیادہ دیر نہیں رہے گی۔ مجھے پتا ہے کہ بہت جلد یہ بندش میرے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔ جو خود بخود مر رہا ہے، آپ اس کا خون اپنے سر کیوں لینا چاہتے ہیں؟''

دفعتاً چوہدری اعجاز کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ چوہدری نے فون ریسیو کیا۔ چوہدری کے موبائل کا اسپیکر آن تھا یا شاید اس نے اب آن کیا تھا۔ دوسری طرف سے ابھرنے والی آواز رستم کے کانوں میں پڑی اور رستم کا جسم سنسنا اٹھا۔ وہ اس کی شانی بی بی تھی۔ وہی کھنکتی ہوئی آواز، وہی جلترنگ بجاتا ہوا لہجہ۔ ''کیا بات ہے دمی رانی؟'' چوہدری نے پوچھا۔

''خالو جی! لاہور سے مہمان کس دن آرہے ہیں؟''

''تمہیں بتایا تو تھا جمعے کو۔ سرفراز صاحب کے سیکرٹری شاید جمعرات کو ہی آجائیں گے۔''

شانی کی آواز ابھری۔ ''خالو! جمعے کو ہی آپ کے زمیندار مہمانوں نے بھی آنا ہے..... تو پھر کیوں نہ ایک جلسے کا انتظام کرلیا جائے۔''

''تجویز تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن کیا اتنی جلدی بندوبست ہو جائے گا؟''

''کوئی مسئلہ نہیں۔'' وہ جوشیلے لہجے میں بولی۔ ''اب اتنا تجربہ تو ہو ہی چکا ہے۔''

دو تین منٹ تک خالو بھانجی میں بات ہوئی پھر چوہدری اعجاز نے ذرا گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''شانی پتر! ایک خبر سناؤں تجھے؟''

''کیا بات ہے خالو جی؟'' وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔

''رستم سے ملاقات ہوئی ہے۔''

''کہاں؟''

''یہ بعد میں بتاؤں گا۔ کیا تم اس سے بات کرنا چاہتی ہو؟'' دوسری طرف چند سیکنڈ تک خاموشی رہی پھر شانی کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''خالو جی! آپ نے جو بات بھی کرنی ہے خود کرلیں۔''

''مگر پتر.....''

''نہیں خالو..... مجھے اب ان کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔'' شانی نے تیزی سے کہا اور فون بند کردیا۔

رستم اپنی جگہ پتھر کی طرح ساکت بیٹھا رہ گیا۔ اس کی رگوں میں ایک سرد اندھیرا اُترتا جا رہا تھا۔ شانی کے الفاظ نہیں زہریلے نشتر تھے جو اس کی سماعت کے ساتھ ساتھ اس کے دل کو بھی لہولہان کر رہے تھے۔ کتنی رُکھائی، کتنی لاتعلقی تھی اس کے جملے میں..... ''خالو جی! آپ نے جو بات بھی کرنی ہے خود ہی کرلیں۔''

کیا یہ شانی بی بی تھیں؟ کیا یہ ان کے الفاظ تھے؟ جو اس کے سینے میں منہ چھپا کر ہولے سے کہا کرتی تھیں، اب ہمیں موت بھی جدا نہیں کرسکتی۔

خالو اعجاز نے بڑی نرمی سے رستم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''رستم! زندگی کی کڑوی سچائیوں کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے اور سچ یہ ہے کہ تم اور شانی ایک راستے پر چل ہی نہیں سکتے تھے۔ جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ یہ معاملہ مزید خرابی اور جگ ہنسائی کی طرف نہ بڑھے تو ٹھنڈے دل کے ساتھ دو چار دن کے اندر کوئی فیصلہ کرلو۔ تم سمجھ دار ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ تمہارا فیصلہ میری رائے سے الگ نہیں ہوگا۔''

رستم خاموش رہا۔ وہ جیسے قوت گویائی کھو چکا تھا۔

چوہدری اعجاز نے ایک بار پھر نرمی سے اس کا کندھا دبایا۔ ''رستم! میں کوشش کرتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میں ایک دو گھنٹے میں سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو رہا کرالوں گا۔ یہ بات ذہن میں نہ رکھنا کہ وہ میرے پاس ہیں۔ وہ پولیس کی تحویل میں ہیں۔ بہرحال، ایک ایسی مٹھی سفارش میرے پاس ہے کہ کام بن جائے گا..... بلکہ سمجھو بن گیا۔ اگر تم ابھی انہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہو تو لے جاسکتے ہو، ورنہ وہ تمہارے بتائے ہوئے پتے پر پہنچ جائیں گے۔''

''نہیں۔ میں انہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم ادھر ہی بیٹھو۔ تھوڑی دیر آرام کرو۔ میں ان کا بندوبست کرتا ہوں۔''

رستم کا کلیجا کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کے کانوں میں مسلسل شانی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ شانی کے الفاظ نہیں ہیں..... نہ وہ شانی کی آواز تھی۔ وہ تو اس صدا کارہ کی آواز تھی جو آج کل بڑی کامیابی سے شانی کی آواز اور لب و لہجے کی نقل کر رہی تھی۔ آواز اور انداز کی نقالی فنونِ لطیفہ کی ایک خوبصورت شاخ ہے مگر یہاں اس فن کو یوں استعمال

www.pdfbooksfree.pk

کیا جارہا تھا کہ دو زندگیاں بڑی تیزی سے بربادی کی طرف بڑھتی چلی جارہی تھیں۔

قریباً ایک گھنٹے کے اندر ہی چوہدری اعجاز نے سردار دراج اور اس کے تینوں ساتھیوں کو رستم کے حوالے کر دیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ ان چاروں کی اس کوٹھی میں موجودگی مکمل طور پر راز رہے گی۔ رستم ان چاروں کو بھی یہ نہیں بتائے گا کہ وہ اصل میں کہاں اور کس کی حراست میں تھے۔ ان چاروں کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور ہاتھ جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے جسموں اور چہروں پر تشدد کے نشانات بھی واضح دکھائی دیتے تھے۔

رستم نے اپنی موٹر سائیکل چوہدری اعجاز کی تحویل میں دے دی۔ چوہدری اعجاز نے پورا تعاون کرتے ہوئے رستم کو ایک سیکنڈ ہینڈ اسٹیشن وین فراہم کر دی۔ اس وین پر بھی نمبر پلیٹ موجود تھی۔ رستم نے اس نمبر پلیٹ کو موٹر سائیکل کی جعلی پلیٹ سے تبدیل کر کے گزارا کر لیا۔

کچھ ہی دیر بعد رستم، سردار دراج اور اس کے ساتھیوں کو لے کر انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی سے روانہ ہو رہا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے رستم نے موٹر سائیکل کی نشست کے نیچے چھپایا ہوا ماؤزر نکال کر وین میں رکھ لیا تھا۔

رستم وین کو ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی سے قریباً ایک کلو میٹر دور آ گیا تو سردار دراج نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''کیا کھیال ہے رستم! آنکھیوں سے یہ پٹیاں ہٹا لیں؟''

''نہیں، ابھی تھوڑی دیر ٹھہرو۔'' رستم نے کہا۔

وہ چوہدری کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کا پاس کرنا چاہتا تھا۔ چوہدری کے ساتھ جو باتیں طے ہوئی تھیں، ان میں یہ بات بھی شامل تھی کہ رستم اس کوٹھی سے نکلنے کے بعد دس کلو میٹر تک ہمتھوں کی آنکھوں سے پٹیاں نہیں ہٹائے گا اور نہ ہی ہاتھ کھولے گا۔

رستم کے اندر کی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ سینے میں ایک جلتا ہوا صحرا اُتر گیا۔ مرنے اور مارنے کے لیے تو وہ پہلے ہی تیار تھا مگر اب اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ جو کچھ بھی ہونا ہے جلد سے جلد ہو جائے۔ آتی جاتی سانس ایک آری کی طرح اس کے سینے کو کاٹ رہی تھی۔ وفعتاً اس کی نگاہ عقب نما آئینے پر پڑی اور وہ چونک گیا۔ ایک بڑی سیاہ جیپ پیچھے آ رہی تھی۔ بغور دیکھنے سے رستم کو اندازہ ہوا کہ جیپ میں تین چار افراد موجود ہیں۔ یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ مسلح ہیں۔ رستم کو یاد آیا کہ یہ جیپ اس نے کوٹھی کے سامنے سڑک پر دیکھی تھی۔ تو کیا کوٹھی میں سے ہی کوئی اس کے پیچھے لگ گیا تھا؟

اس نے اپنی رفتار کچھ دھیمی کی تو جیپ اور اسٹیشن وین کا فاصلہ کم ہو گیا۔ رستم نے جیپ کے اندر چوہدری اعجاز کے بھائی شاداب عرف شابی کو پہچان لیا۔ وہ بھنا کر رہ گیا۔ پیچھے آنے

والوں کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ وہ یونہی نہیں آ رہے۔ وہ تعاقب کر رہے ہیں۔

رستم نے موبائل پر چوہدری اعجاز کا نمبر پریس کیا مگر رابطہ نہیں ہو سکا۔ رستم کے اندر طیش کی لہر بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سردار دراج کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی ہٹا دی اور پشت پر سے اس کے ہاتھ کھول دیے۔ سردار دراج نے اپنے ساتھیوں کی بندشیں کھول دیں۔ رستم نے دوبارہ چوہدری کا نمبر ڈائل کیا۔ اس مرتبہ رابطہ ہو گیا۔ چوہدری کی قدرے گھبراہٹ آمیز ''ہیلو'' سنائی دی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے چوہدری؟ تمہارا بھائی پیچھے آ رہا ہے۔'' رستم پھنکارا۔

''وہ من مانی کر رہا ہے رستم۔ میں نے اسے بڑا سمجھایا ہے لیکن وہ نکل گیا ہے۔ بڑا بے وقوف ہے وہ..... تم نے اسے کچھ نہیں کہنا۔ میں اسے سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''سنبھالو اسے..... نہیں تو مارا جائے گا۔'' رستم کے لہجے میں وحشت تھی۔

''سنبھالتا ہوں..... سنبھالتا ہوں۔ تم نے کچھ نہیں کہنا۔ میں گاڑی نکال رہا ہوں، اس کے پیچھے آ رہا ہوں۔'' چوہدری کی آواز ہانپی ہوئی تھی۔

''اسے میرے بارے میں بتا دیا ہے؟''

''نہیں بتایا۔ میں حلفیہ کہتا ہوں..... نہیں بتایا۔ اسی بات پر اس سے جھگڑا ہوا ہے۔ وہ تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتا، اسے کچھ نہیں کہنا۔'' چوہدری کے لہجے میں طیش، خوف، التجا سب کچھ شامل تھا۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

برق رفتار جیپ آندھی کی طرح اُڑتی ہوئی اسٹیشن وین کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔ اب اس میں شاداب اور اس کے مسلح گارڈز صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ بار بار رستم کو گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ پھر وہ اسٹیشن وین کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کرنے لگے..... کبھی دائیں سے کبھی بائیں سے۔ جب رستم نے راستہ نہیں دیا تو انہوں نے خطرناک انداز میں اسٹیشن وین کو ٹکریں مارنا شروع کر دیں۔ رستم کے اندر سلگتی ہوئی آگ بھک سے بھڑک اٹھی۔ اس نے جیپ کو جوابی ٹکریں رسید کیں۔ دونوں گاڑیاں اب پہلو بہ پہلو بھاگ رہی تھیں۔ اسٹیشن وین کی ایک کھڑکی چکنا چور ہو گئی۔ مسلح گارڈز کے ہاتھوں میں خودکار رائفلیں نظر آ رہی تھیں۔ شابی غلیظ گالیاں بک رہا تھا اور چنگھاڑ چنگھاڑ کر رستم کو گاڑی روکنے کا حکم دے رہا تھا۔

رستم کے موبائل پر ایک بار پھر چوہدری اعجاز نے رابطہ کیا۔ رستم دہاڑا۔ ''چوہدری! تمہارا بھائی باز نہیں آ رہا۔ اپنی مصیبت کو آواز دے رہا ہے۔ میرا راستہ روکے گا تو مارا جائے گا۔ میرا راستہ روکے گا تو مارا جائے گا۔

www.pdfbooksfree.pk

گا۔"

"نہیں رستم! اسے کچھ پتا نہیں۔ اس کی طرف سے میں تم سے معافی مانگتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ رستم جواب میں کچھ کہتا۔ اسٹیشن وین کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ موبائل فون رستم کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ طاقتور جیپ نے اسٹیشن وین کو اتنے زور سے سائیڈ ماری کہ رستم اس پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔ وین پہلے اپنے دو پہیوں پر اٹھی پھر لہراتی ہوئی سڑک سے اُتری اور درختوں میں گھستی چلی گئی۔ جنتر کے بہت سے چھوٹے بڑے پودوں اور جھاڑیوں کو توڑنے کے بعد وہ ایک بڑے درخت سے ٹکرائی اور اُلٹ گئی۔ اس کے سارے شیشے چکنا چُور ہو گئے۔ ریڈی ایٹر پھٹ گیا اور بھاپ بڑے پریشر کے ساتھ اوپر کی طرف جانے لگی۔

"رستم! تم ٹھیک ہو؟" سردار دراج کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ہاں، میں ٹھیک ہوں۔ گاڑی سے باہر نکلو۔"

رستم نے دیکھا ایک مہتم کا سر بری طرح پھٹ گیا تھا۔ اس کے لہولہان چہرے میں سے اس کی ناک کا ٹوٹا ہوا بانسہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ رستم تے وین کے اندر سے نکلنے میں اس کی مدد کی۔ سردار دراج پہلے ہی نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوند رہی تھیں لیکن جو کچھ رستم کے اندر چل رہا تھا، وہ سردار دراج کی کیفیت سے بڑھ کر تھا۔ وہ ڈیش بورڈ میں سے اپنا بھرا ہوا ماؤزر نکال چکا تھا۔ جیپ دندناتی ہوئی درختوں میں گھسی تھی اور ان سے قریباً بیس میٹر کے فاصلے پر رک گئی تھی۔ سب سے پہلے اس میں سے ایک قد آور کتا نکلا۔ رستم کی چلائی ہوئی سب سے پہلی گولی بھی کتے کو ہی لگی۔ گولی اس کے کھلے ہوئے منہ میں گئی تھی اور مغز توڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ رستم کے قہر کا دوسرا شکار وہ گارڈ بنا جو خونخوار کتے کی زنجیر پکڑے جیپ میں سے برآمد ہو رہا تھا۔ شاید اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ یوں آناً فاناً داعی اجل کو لبیک کہے گا۔ گولی اس کے سینے میں دل کے مقام پر پیوست ہوئی۔ اگلے بیس پچیس سیکنڈ میں جو کچھ ہوا اس نے سردار دراج جیسے شخص کو بھی ہلا کر رکھ دیا۔ رستم جنونی کیفیت میں تھا اور اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ بڑی دہشت سے اس نے تین افراد کو جیپ کے اندر ہی چھلنی کر ڈالا۔ انہیں اتنی مہلت ہی نہیں مل سکی تھی کہ وہ اپنے ہتھیار استعمال کر سکتے۔ جیپ کے شیشے چکنا چُور ہو گئے اور ہر طرف خون کے چھینٹے نظر آئے۔ شابی، رستم پر صرف ایک گولی چلا سکا۔ وہ بھی خطا گئی۔ رستم کی چلائی ہوئی گولی نے اس کی کلائی میں سوراخ کر دیا اور پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اپنی زخمی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے دباتا ہوا جیپ کے کھلے دروازے سے باہر گرا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔ شاید اس کے

سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ ہو گا اور اتنی تیزی سے ہو گا۔

رستم اس کے سر پر کھڑا تھا۔ ماؤزر اس کے دونوں ہاتھوں میں اور انگلی لبلبی پر..... آناً فاناً شابی کے چہرے پر موت کی زردی چھا گئی۔

"مگ..... گولی نہ چلانا۔" وہ گھگھیائی ہوئی آواز میں کراہا۔

"کیوں نہ چلاؤں؟"

"مم..... میں معافی مانگتا ہوں۔" وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا کچھ ہی دیر پہلے ماڈل گرلز کے درمیان سیل مرغ کی طرح اکڑ کر پھرنے والا جواں سال ہیرو، موت کو سامنے دیکھ کر ایک دم چوہا بن گیا تھا۔ مزاج کی ایسی تیز رفتار تبدیلیاں رستم پہلے بھی بارہا دیکھ چکا تھا۔ اس کی یہ "معافی" رستم کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی انگلی لبلبی پر مستحکم تھی۔ وہ اسے بھی شوٹ کر دینا چاہتا تھا مگر کوئی چیز آڑے آ رہی تھی۔ کوئی چہرہ..... جو رستم کے ماؤزر اور شابی کی کھوپڑی کے درمیان آ گیا تھا۔ رستم کی گرفت ماؤزر پر بے حد سخت رہی مگر وہ لبلبی نہیں دبا سکا۔ آخر کشمکش کے وہ چند جاں گسل لمحے گزر گئے۔ رستم نے فائر کیا۔ گولی شابی کے کان کو چھوتی ہوئی زمین میں پیوست ہو گئی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چلایا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس کی ڈینم کی قیمتی پتلون گیلی ہو چکی ہو۔ رستم نے ماؤزر اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔ "جا..... اکسی کے صدقے تجھے معاف کیا۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اپنی بی بی کا چہرہ تھا۔

صرف پانچ منٹ بعد شابی کسی لاچار مرغی کی طرح بندھا ہوا درختوں میں پڑا تھا۔ اسے باندھنے کے لیے سردار دراج نے وہی رسیاں استعمال کی تھیں۔ جن سے کچھ دیر پہلے وہ خود جکڑا ہوا تھا۔ شاداب عرف شابی کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا گیا تھا۔ اب وہ دو تین گھنٹے سے پہلے خود کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا۔ اسی دوران میں شابی کی جیب سے نکلنے والے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ رستم نے کال اٹینڈ کی۔ دوسری طرف سے چوہدری اعجاز کی سخت ہراساں آواز سنائی دی۔ "شابی! کہاں ہو تم..... مجھے کچھ پتا نہیں چل رہا۔ دیکھو، میری بات سنو۔ میں نے وہ چاروں بندے سوچ سمجھ کر چھوڑے ہیں۔ اس میں ہمارا فائدہ ہے۔ تم اس معاملے سے پیچھے ہٹ جاؤ۔ تم نہیں جانتے، وہ بہت خطرناک بندہ ہے..... وہ بہت خطرناک ہے..... میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا سب کچھ....." چوہدری اعجاز ایک ہی سانس میں اور ہیجانی لہجے میں بولتا چلا جا رہا تھا۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ گاڑی میں ہے۔ رستم نے موبائل آف کر دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ شابی کی لگژری جیپ پر سوار درختوں کے اس ویران جھنڈ سے نکل

www.pdfbooksfree.pk

رہے تھے۔ جھنڈ میں چار لاشیں تھیں۔ خونخوار کتے کی لاش ان کے علاوہ تھی۔

مرید کے، کے بارونق قصبے سے کچھ فاصلے پر انہوں نے شابی کی جیپ چھوڑ دی اور ایک ٹیکسی کار کے ذریعے لاہور پہنچ گئے۔ ٹیکسی کار کو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر چھوڑنے کے بعد وہ پیدل ہی کوٹھی میں داخل ہوئے۔ سیراج میں حاجی حیات کی پرائیویٹ کار دیکھ کر رستم چونک گیا۔ حاجی حیات نے دو دن پہلے ہی رستم کو کسی سے منع کیا تھا کہ وہ اب کوٹھی سے باہر نہ نکلے اور چند دن بکھن سے گزارے.....

حاجی حیات سے رستم کی ملاقات کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں ہوئی۔ ان دونوں کی دوستی کو پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ آج پہلی بار رستم کو حاجی حیات کے چہرے پر قدرے بیگانگی کے آثار نظر آئے۔

اس نے کہا۔ ''رستم! اب یہ سب کچھ میرے بس سے باہر ہو چکا ہے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''

''اب کوئی اور جھوٹ نہ بولنا۔ تمہارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے تمہارے تازہ کارنامے کی اطلاع مل چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی دو گھنٹے پہلے گوجرانوالہ بائی پاس کے قریب جو چار بندے قتل ہوئے ہیں، ان کا خون تمہارے ہاتھوں پر ہے۔'' حاجی حیات کا لہجہ خشک اور طیش بھرا تھا۔

''یار! بغیر ثبوت کے تو بات نہ کرو۔''

''سب کچھ ثبوت کے ساتھ نہیں ہوتا۔'' حاجی حیات اچانک بلند آواز سے بولا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ ''کیا اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ تم زندہ ہو؟ اس کے باوجود بہت سے لوگوں کو شبہ ہو چکا ہے کہ تم زندہ ہو اور پچھلے دنوں اوپر نیچے جو کارروائیاں ہوئی ہیں ان میں تمہارا ہاتھ ہے۔ یہ دیکھو!'' حاجی حیات نے تازہ اخبار رستم کے سامنے پھینک دیا۔

رستم نے دو چھوٹی چھوٹی سرخیاں دیکھیں۔ لکھا تھا..... ''لالہ فرید کے ڈکیت گروپ کا اہم ترین رکن رستم سیال ابھی زندہ ہے؟''

دوسری سرخی تھی۔ ''کیا چھانگی وال کی خونی واردات میں بھی رستم شریک تھا؟''

نیچے ان سرخیوں کا متن تھا۔ رستم نے متن پڑھے بغیر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ حاجی حیات نے کہا۔ ''رستم! میں نے اپنی اور تمہاری دوستی میں ہر حد کو پھاندا ہے لیکن اب میں مجبور ہو گیا ہوں۔ میں اس سے آگے جانا چاہتا ہوں تو پھر مجھے اپنی وردی اتار کر پھینکنی ہو گی اور تمہاری طرح اشتہاری بننا ہو گا۔ اگر تم چاہتے ہو تو پھر میں یہ بھی کر گزرتا ہوں.....''

رستم نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اپنے دوست کا چہرہ تکتا رہا۔ حاجی حیات نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں بار بار سمجھایا مگر تم باز نہیں آئے اور حق بات تو یہ ہے کہ تم نے میری عزت کا بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ اور اب صورتِ حال یہ ہے کہ کسی بھی وقت میری پیٹی اُتر سکتی ہے اور میں تمہارے لیے بالکل بے کار ہو سکتا ہوں۔ یہ دیکھو.....! ہیڈ کوارٹر سے کیا محبت نامہ آیا ہے میرے لیے۔''

حاجی حیات نے ایک دفتری لیٹر رستم کی طرف بڑھایا۔ رستم نے لیٹر کی طرف دیکھے بغیر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اور میرے دوست یہ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔''

''تمہاری کھوپڑی الٹی ہے۔ تم ہر بات کو الٹ لیتے ہو۔ میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہوا کا رخ دیکھو۔ میرے اور اپنے لیے مصیبتیں پیدا نہ کرو۔ چند مہینے خاموشی سے گزار لو پھر جو جی چاہے کرتے رہنا۔''

''میں نے ڈیڑھ سال سے زیادہ خاموشی سے گزارا ہے۔ اس سے کیا ہو گیا ہے؟ سب کچھ ایسا ہی ہے۔ میں اور خاموش رہوں گا تو اپنی نظروں میں آپ گر جاؤں گا..... اور اپنی نظروں سے گر کر زندہ رہنا مرنے سے بدتر ہے۔''

''تم اپنی ہٹ دھرمی اور جلد بازی سے بہت کچھ خراب کر رہے ہو رستم۔ تمہارا یہی رویہ رہا تو تمہارے اپنے بھی تم سے دور ہو جائیں گے۔ اب شانی کو ہی دیکھ لو..... وہ تم سے دن بہ دن بدظن ہو رہی ہے۔ چوہدری اعجاز کا رویہ وہ نہیں رہا جو اس سے پہلے تھا۔ یہی معاملہ تایا معصوم کے ساتھ ہے۔ تمہاری جلد بازی کی وجہ سے ڈولے کی جان جا چکی ہے اور خان بے کار ہو کر بستر پر پڑا ہے۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت جلد تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہونے والا۔''

''تم جو کچھ بھی کہو حاجی..... مگر میں اپنے دوستوں کی پکار سے اپنے کان بند نہیں کر سکتا۔ ان کے لہولہان چہرے دن رات میری آنکھوں میں گھومتے ہیں۔ ان کی آخری آوازیں، ان کی ہچکیاں میرا پیچھا کرتی ہیں۔ حاجی! میرے وہ یار مرتے مرتے اپنا سارا درد میرے حوالے کر گئے ہیں۔ یہ بہت بڑا بوجھ ہے..... بہت بڑا! میں اس بوجھ کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم مجھے معاف کر دو اور جس جس کا دل بھی میرے رویے کی وجہ سے دُکھا ہے، میں اس سے بھی معافی مانگتا ہوں۔''

''تم معافی مت مانگو۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تمہاری منت کرتا ہوں کہ اپنے خیر خواہوں کا اتنا سخت امتحان مت لو۔ دیکھو، میری بات سنو۔ اگر لمبی چھلانگ لگانی

www.pdfbooksfree.pk

ہوتو پہلے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ ریاض ہٹلر سے ٹکر لینا بھی لمبی چھلانگ کی طرح ہی ہے۔ پہلے تیاری کرلو، کوئی پلاننگ بنالو۔''

رستم نے بے قراری سے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ''حاجی! یہاں آگ لگی ہوئی ہے اور جب آگ لگی ہوئی ہوتو اس کو بجھانے کے لیے بیٹھ کر پلاننگ نہیں کی جاتی..... جو فوری طور پر سمجھ میں آئے، کیا جاتا ہے۔''

''تو کیا آرہا ہے تمہاری سمجھ میں؟ یہی ناں کہ ڈپٹی ریاض کو ڈھونڈو اور جہاں وہ خبیث نظر آئے اس کے سامنے اپنے یاروں کے نام کی بھڑک مارو اور اسے گولیوں سے چھلنی کردو یا پھر کسی کلہاڑی سے اس کے پندرہ بیس ٹوٹے کردو.....'' رستم خاموش رہا۔ اس کا چہرہ پتھر تھا۔ حاجی حیات بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے رستم کہ ڈپٹی ریاض ایک بہت خرانٹ اور ہوشیار بندے کا نام ہے۔ وہ آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا اور اگر آ بھی گیا کسی طرح..... تو پھر کیا ہوگا۔ جس جس کے ساتھ تمہارا تھوڑا بہت بھی تعلق واسطہ ہے، پولیس اس کو عبرت کا نشان بنادے گی۔ وہ مرسکے گا نہ جی سکے گا۔ وہ روئے گا تمہاری جان کو۔''

''میرا کسی سے تعلق واسطہ نہیں ہے..... کسی سے نہیں ہے۔'' دفعتاً رستم اتنی بلند آواز سے بولا کہ پوری کوٹھی جیسے گونج اٹھی۔ اس کا چہرہ اندرونی درد کی تصویر تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے دہاڑا۔ ''میں مرگیا ہوں سب کے لیے..... کوئی نہیں ہے میرا۔ نہ میں کسی کا ہوں۔ کوئی میری ہمدردی نہ کرے..... کوئی میری موت کا راستہ نہ روکے.....'' وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

☆=======☆==========☆

شانی بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر تھا۔ زندگی اس کے لیے بے کار ہوکر رہ گئی تھی۔ یہ آموں، جھولوں، پھولوں اور بارشوں کا موسم تھا مگر شانی کے سینے میں تو ایک بے کراں صحرا پھیلا ہوا تھا جہاں ہر وقت دم گھونٹ دینے والی آندھیاں چلتی تھیں۔ وہ کسی کی طوفانی محبت کے سامنے مجبور ہوئی تھی۔ کسی کے ناقابلِ مزاحمت عشق نے اسے ایک خطرناک راستہ چننے پر مجبور کیا تھا..... اور پھر روکیٹ کی اس پُرفضا بستی میں شانی نے رستم سے شادی کر لی تھی۔ اس وقت شانی کا خیال تھا کہ وہ دونوں باقی دنیا سے کٹ کر اپنی ایک علیحدہ دنیا بسائیں گے۔ کسی ایسی دور دراز جگہ پر جا رہیں گے جہاں کوئی انہیں جانتا نہ ہوگا۔ بس وہ ہوں گے اور ان کا لافانی پیار ہوگا۔ شانی جانتی تھی کہ رستم کے سینے میں ہمہ وقت ایک آتش بھڑکتی رہتی ہے۔ اس آتش کا تعلق اس قتلِ عام سے تھا جو ڈپٹی ریاض اور اس کے چند ساتھی افسروں نے

وڈے ڈیرے پر کیا تھا۔ انہوں نے اجرالی سرداروں سے ملی بھگت کی تھی اور ان بھوکے پیاسے لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگے تھے جو ہتھیار پھینکنے کے لیے تیار تھے، بلکہ پھینک چکے تھے۔ شانی کو اس آتش سے خوف آتا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ اُمید بھی تھی کہ وہ آہستہ آہستہ رستم کے جذبۂ انتقام کو ٹھنڈا کردے گی..... یا اس کا رُخ کسی اچھی جانب موڑ دے گی۔ مگر حالات کے بہاؤ نے سارے ارادے غلط ثابت کردیئے تھے۔ شانی ایک بار پھر اپنی جانی پہچانی دنیا میں آگئی تھی۔ یہاں اس کے اردگرد اس کے اونچے شملوں والے بزرگ تھے اور ان کے اصول تھے۔ دوسری طرف رستم بھی ایک تند بگولے کی طرح انتقام کے منطقی راستے پر چل پڑا تھا۔ کبھی کبھی شانی کو محسوس ہوتا تھا کہ کچھ نادیدہ ہاتھ ہیں جو اسے اور رستم کو ایک دوسرے سے دور کرتے چلے جارہے ہیں۔

اتنے میں شانی کی ہم راز سکینہ اس کے پاس آن بیٹھی۔ اس نے حسبِ عادت شانی کے دونوں پہلوؤں کو اپنی انگلیوں سے گدگدایا۔ ''کون یاد آرہا ہے میری رانی کو!'' اس نے اپنے شوخ لہجے سے شانی کا موڈ بحال کرنے کی کوشش کی مگر جب اس نے دیکھا کہ شانی بہت سنجیدہ ہے تو وہ خود بھی سنجیدہ ہوگئی۔

شانی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''سکینہ! مجھے بتاؤ، میں کیا کروں۔ میرا دل روتا رہتا ہے۔ ڈولا مرگیا مگر میں اس کا منہ بھی نہ دیکھ سکی۔ مجھے لگتا ہے کہ اجمل بھی خیریت سے نہیں ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ہوچکا ہے۔''

''تُو اتنی زیادہ دکھی ہے تو پھر رستم کو فون کیوں نہیں کرلیتی۔ دو چار دفعہ کوشش کر، ہو سکتا ہے کہ بات ہوجائے۔''

''نہیں سکینہ! وہ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے۔ شاید میری آواز سننا بھی نہیں چاہتے۔ اگر انہوں نے بات کرنی ہوتی تو اس وقت کرتے جب خالو اعجاز والا واقعہ ہوا تھا۔ معافی نہ مانگتے لیکن میری تسلی کے لیے ایک دو لفظ ہی بول دیتے..... مگر لگتا ہے کہ وہ اپنے دل کو پتھر کر چکے ہیں۔''

''شانی! یہ خط..... ٹیلی فون، موبائل شوبائل مجھے تو جچتے ہی نہیں لگتے۔ بات تو وہی ہوتی ہے جو آمنے سامنے ہو۔ تُو ایک دفعہ کوشش کر کے رستم سے مل کیوں نہیں لیتی؟''

شانی نے مایوسی کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں سکینہ! بات بہت بگڑ چکی ہے۔ آمنے سامنے سے اور بگڑ جائے گی۔''

اتنے میں شانی کی نگاہ سامنے رکھے اخبار پر پڑی۔ پچھلے صفحے کی ایک خبر پر اس کی نگاہ

www.pdfbooksfree.pk

جم گئی۔ لکھا تھا۔ ''گوجرانوالہ میں چار مزید افراد قتل۔'' ذیلی سرخی تھی۔ ''کیا یہ واردات بھی انہی لوگوں نے کی جنہوں نے قدرت اللہ کو قتل کیا؟''

تفصیل میں اجمل کے ساتھ رستم کا نام بھی واضح طور پر لکھا گیا تھا۔ اس شے کا اظہار کیا گیا تھا کہ شاید اوپر تلے ہونے والی ان وارداتوں میں رستم سیال بہ نفسِ نفیس ملوث ہے۔ چھانگی وال کی خوں ریز وارادات میں جو تین ملزم دیکھے گئے تھے ان میں سے ایک کے حلیے کو بیان کیا گیا تھا۔ اس حلیے کو حوالہ بنا کر لکھا گیا تھا کہ رستم سیال زندہ ہے اور سرگرم ہے۔ رستم کی ایک بہت پرانی تصویر بھی شائع کی گئی تھی جس میں اس کی داڑھی نہیں تھی اور سر کے بال چھوٹے تھے۔ اسے اس خبر میں دہشت کی علامت بنا کر پیش کیا گیا تھا اور لکھا گیا تھا کہ اگر موجودہ وارداتوں میں بھی رستم شریک ہے تو پھر اس کے جرائم کی کتاب میں ایک اور خونی باب کا اضافہ ہو گیا ہے۔ خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ یہ چاروں مقتول موضع رنگ والی کے صنعت کار چوہدری شاداب کے گارڈز تھے۔

''یہ دیکھو شانی! یہ ایک اور تصویر ہے۔'' سکینہ نے اخبار پر ایک اور جگہ انگلی رکھی۔

یہ تازہ وارادات کی تصویر تھی۔ ایک الٹی ہوئی وین کے پاس چار میں سے دو افراد کی لاشیں گھاس پر پڑی نظر آ رہی تھیں۔ قریب ہی ایک کتا بھی مرا پڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ شانی کچھ کہتی، بھاری قدموں کی آواز سنائی دی اور خالو اعجاز اندر داخل ہوئے۔ سکینہ نے اٹھ کر ادب سے سلام کیا اور باہر چلی گئی۔ خالو اعجاز صوفے پر بیٹھ گئے۔

یہ نے کہا۔ ''خالو! یہ خبر دیکھی ہے آپ نے؟'' اس نے اخبار خالو کی طرف بڑھایا۔

انہوں نے خبر پر ایک سرسری نظر ڈالی اور گہری سانس لے کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ واردات بھی.....'' شانی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

چوہدری اعجاز نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے کل ہی پتا چل گیا تھا شانی! میں تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب تم نے خود ہی دیکھ لیا ہے۔''

''کیا رستم بھی شامل تھا؟'' خالو اعجاز نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ شانی غمزدہ بیٹھی رہی۔ پھر کراہتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''رستم کیوں کر رہا ہے ایسا..... اسے کیا ہو گیا ہے؟ ان بندوں کو کیوں مارا اس نے؟''

''بس چھوڑو ان باتوں کو شانی پتر! جتنا تفصیل میں جائیں گے اتنا ہی دل دکھے گا۔ میرے خیال میں تو ان بندوں کا سب سے بڑا قصور یہی تھا کہ یہ ہمارے بندے تھے۔ رستم نے انہیں دیکھا اور مار دیا۔ اس کے سر پر خون سوار ہے۔''

''شاداب تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہاں، وہ بچ گیا ہے مگر زخمی ہوا ہے۔ اس کی کلائی میں گولی لگی ہے۔ شکر ہے کہ ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا۔ تمہارے لیے اس کا پیغام بھی ہے۔ وہ تمہاری طرف سے بہت فکر مند ہے۔ کہتا تھا کہ رستم کے سر پر خون سوار ہے۔ وہ اپنے جنون میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔ شانی اور تایا معصوم کو اس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے۔''

شانی کے سینے میں ہونکتی ہوئی اداسی کچھ اور بھی گہری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ابھی کچھ دیر پہلے سکینہ سے باتیں کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ خود کو اس بات کے لیے تیار کر سکتی ہے کہ ایک بار براہِ راست رستم سے رابطہ کرے..... لیکن اب اس تازہ خبر کے بعد اسے اپنا وہ خیال عبث محسوس ہونے لگا۔ حالات اتنی تیزی سے بگڑتے چلے جائیں گے، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

کہاں گیا وہ رستم جسے وہ ٹوٹ کر چاہتی تھی؟

کہاں گیا وہ رستم جو اسے دیوانوں کی طرح چاہتا تھا؟

کیا اس کے عشق کی منزل بس جسم کا حصول تھا؟

نہیں..... نہیں..... ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ہمیشہ کہتا تھا، اصل عشق وہی ہوتا ہے جو جدائی سے کم ہوتا ہے نہ ملاپ سے دھندلا پڑتا ہے..... نہیں..... نہیں..... وہ اپنے اندر تڑپ کر رہ گئی۔

خالو اعجاز کی درد بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ بولے۔ ''شانی پتر! مجھے یہ بات کہتے ہوئے دکھ محسوس ہو رہا ہے لیکن جو حقیقت ہے وہ دیوار پر لکھی نظر آ رہی ہے۔ تم اور رستم کسی صورت ساتھ نہیں چل سکتے ہو۔ مجھے تو کبھی کبھی ڈر محسوس ہوتا ہے کہ کہیں وہ کاغذ کے اس ٹکڑے کا جسے وہ نکاح نامہ کہتا ہے، غلط استعمال نہ کرے۔ میں تو کہتا ہوں، ہمیں اس کا سدِباب کر لینا چاہیے۔''

شانی نے چونک کر خالو کی طرف دیکھا۔ سدِباب کا لفظ اس کے سر پر وزنی ہتھوڑے کی طرح لگا تھا۔ سدِباب سے کیا مطلب تھا خالو اعجاز کا؟ کیا وہ طلاق کی بات کر رہے تھے؟ شانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسے لگا کوئی اس کے سینے میں سے اس کا دل کھینچ رہا ہے۔

''دیکھو شانی پتر.....'' خالو اعجاز نے اپنی بات جاری رکھنا چاہی۔

شانی نے تیزی سے نفی میں سر ہلا کر ان کی بات کاٹ دی۔ ''نہیں خالو..... آپ ایسی بات نہ کریں۔ پلیز! اس بارے میں خاموش رہیں..... پلیز!''

اس نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپایا اور سسکنے لگی۔ خالو اعجاز کچھ دیر تک اس کی طرف

www.pdfbooksfree.pk

دیکھتے رہے پھر اٹھتے ہوئے بولے۔ ''میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری باتوں سے دکھ ہوا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم ٹھنڈے دل سے غور کرو گی تو یہ باتیں تمہیں بری نہیں لگیں گی۔''

شانی سے رخصت ہونے کے بعد چوہدری اعجاز حویلی کے مہمان خانے میں آ گئے۔ صدا کارہ نائلہ اور اس کا شوہر، چوہدری کے خاص مہمانوں کی حیثیت سے ابھی تک یہیں مقیم تھے۔ چوہدری نے میاں بیوی پر نوازشات کی بارش کر رکھی تھی۔ وجہ ظاہر تھی..... نائلہ کی کوشش سے چوہدری اعجاز اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ رستم سے فون پر بات کرنے کے لیے کسی بھی وقت نائلہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کوشش کر کے فنکار جوڑے کو مستقل اپنا مہمان بنا رکھا تھا۔

اختر قصوری اور نائلہ سے چند رسمی باتیں کرنے اور ان کے بچے کا احوال پوچھنے کے بعد چوہدری اعجاز مہمان خانے کی چھت پر چلے گئے۔ انہوں نے موبائل پر اپنے چھوٹے بھائی شاداب سے رابطہ کیا۔ وہ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد اب گھر میں تھا۔ چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''ہاں شابی! اب کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہوں بھائی جان۔'' شابی کی کمزور آواز ابھری۔ تھوڑے سے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''لیکن آپ نے مجھ سے یہ سب کچھ چھپایا کیوں؟''

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''میں اخباروں میں چھپنے والی خبر کی بات کر رہا ہوں۔ کہا جا رہا ہے کہ رستم سیال ابھی زندہ ہے اور کل ہم پر حملہ کرنے والا بھی رستم سیال ہی تھا۔''

''ہاں، یہ سچ ہے۔'' چوہدری اعجاز چند سیکنڈ تک خاموش رہنے کے بعد بولے۔ ''اور اسی لیے میں نے تمہیں کل بار بار اس کے پیچھے جانے سے منع کیا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا تمہاری جلد بازی سے ہوا۔''

''اور بھائی جان! میں سمجھتا ہوں کہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا کہ آپ مجھ سے حقیقت چھپاتے رہے اور اب بھی چھپا رہے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اگر رستم زندہ ہے تو پھر ہم بہت خطرناک کام کر رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ اور شانی ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ ہم شانی کو اس سے چھیننے کی کوشش کریں گے تو اسے بالکل آگ بگولا کر دیں گے۔ وہ بہت کچھ برباد کر دے گا۔'' شابی کی آواز میں لرزش صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

''کیسی بے وقوفی کی بات کر رہے ہو شابی۔ ہم شانی کو اس سے چھیننے کی کوشش نہیں کر رہے، اپنے گھر کی بیٹی کو اس بدمعاش کے چنگل سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور ہم یہ ضرور کریں گے اور تم دیکھنا چند دن تک شانی بھی اس بات کو بہت اچھی طرح سمجھ جائے گی۔ وہ خود اس سے چھٹکارا پانے کی بات کرے گی۔''

''لل..... لیکن کچھ بھی ہے بھائی جان! شانی بیوہ ہے۔ اس کے نام کے ساتھ رستم کے نام کا دھبا لگا ہوا ہے اور مجھے تو کبھی کبھی یہ شک ہوتا ہے کہ کہیں وہ خفیہ طور پر شادی ہی نہ کر چکے ہوں۔ میں ایسی لڑکی کو بیوی کے طور پر کیسے قبول کروں گا؟''

''تم ایک عرصہ ملک سے باہر رہے ہو۔ تم نے شانی کو ٹھیک سے دیکھا اور جانا نہیں۔ وہ اتنی پیاری لڑکی ہے کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ چوہدری بابر کو تو جانتے ہی ہو ناں تم؟ کیا کمی ہے اس میں؟ اونچا لمبا گبھرو جوان ہے۔ لمبی چوڑی جائیداد ہے۔ وہ شانی سے شادی کے لیے تڑپ رہا ہے اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ہماری برادری میں درجنوں ایسے لڑکے ہوں گے جو شانی کو اپنانے کے لیے دل و جان سے تیار ہوں گے۔ باقی رہی رستم والی بات تو اب وہ زیادہ دیر چلنے والا نہیں۔ اس کا دانہ پانی ختم ہے۔ جلد ہی وہ پولیس مقابلے میں پار ہو گا یا پھانسی کی کوٹھڑی میں پہنچ جائے گا۔''

''لیکن.....''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' چوہدری نے تحکم سے کہا۔ ''تم کوئی کلرک پیشہ نہیں ہو..... زمیندار بچے ہو۔ ہمارے گھروں میں دو تین شادیاں تو عام بات ہے۔ بعد میں دل کیا تو تم بھی ایک دو اور کر لینا لیکن فی الحال اپنا ارادہ مضبوط رکھو۔ ہمیں اپنے خاندان کی عزت بچانی ہے۔ بھائی ارشاد کی بیٹی پر چادر ڈالنی ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے..... وہ الیکشن لڑے گی؟''

''ہم کوشش تو پوری کر رہے ہیں کیونکہ اگر وہ کھڑی ہو گئی تو لازمی جیت بھی جائے گی۔''

''سنا ہے کہ اسے اس معاملے میں بالکل دلچسپی نہیں ہے۔''

''ہاں، یہ تو ہے مگر اس میں پریشانی کی بات نہیں۔ وہ الیکشن جیت کر انمول ہے تو الیکشن کے بغیر بھی انمول ہے۔'' چوہدری کا لہجہ معنی خیز تھا۔

''اندازاً کتنی زمین ہو گی؟''

''جو شانی بیٹی کے نام انتقال ہو چکی ہے وہ تقریباً تین سو مربع ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے.....''

www.pdfbooksfree.pk

فون لائن پر معنی خیز خاموشی طاری رہی۔ پھر چوہدری اعجاز نے کہا۔ ''میں نے اسے تمہارے زخمی ہونے کے بارے میں بتایا ہے۔ فکر مند ہوگئی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ فون پر تمہاری خیر خیریت دریافت کرے۔ اچھے طریقے سے بات کرنا..... اور یہ بوتل شوتل لگانا بھی کم کرو۔ ہر وقت آنکھیں لال کیے رہتے ہو۔''

''کل سے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔'' وہ روکھے لہجے میں بولا۔

''اور ان ماڈلنگ والی لڑکیوں کو بھی ان دنوں دائیں بائیں ہی رکھو۔ ہر وقت گھسے رہتے ہو ان کے اندر۔ تمہارے آگے دوالے کا ماحول خراب ہو رہا ہے اس سے۔''

''کوئی اور نصیحت؟''

''بس!''

''میں آپ کو نصیحت تو نہیں کرسکتا پر ایک گزارش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ اس رستم والے ٹینٹے کو جلدی ختم کیوں نہیں کرا دیتے؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس کے ٹھکانے کا پتا ہے۔ آپ چاہیں تو ڈپٹی ریاض کے ذریعے اس ڈرامے کا ڈراپ سین بڑی جلدی ہوسکتا ہے۔''

''نہیں..... مجھے نہیں پتا لیکن اگر مجھے پتا بھی ہوتا تو میں اس معاملے میں نہ آتا..... سمجھنے کی کوشش کرو، جو کام خود بخود ہو رہا ہے ہمیں اس میں فریق بننے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ شانی بیٹی کے دل میں ہمارے لیے ذرا سا بھی بال پیدا ہو۔ ہمیں اس معاملے میں اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنے چاہئیں۔''

''کسی وقت مجھے لگتا ہے کہ آپ رستم سے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں۔''

''خوف زدہ نہیں..... محتاط ہوں۔ اسی لیے کل تمہیں بھی احتیاط کا مشورہ دیتا رہا۔''

دونوں بھائیوں کے درمیان اس معاملے میں کچھ دیر مزید بات ہوئی پھر چوہدری اعجاز نے شاداب کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد فون بند کردیا۔

☆=======☆=======☆

رستم اقبال ٹاؤن کی یہ کوٹھی چھوڑنے کا پختہ فیصلہ کر چکا تھا لیکن حاجی حیات سے ہونے والی جھڑپ کے بعد اس کا دل ان در و دیوار سے بالکل اچاٹ ہوگیا تھا۔ ویسے بھی یہ سوچنے کی بات تھی کہ وہ حاجی حیات کو کب تک آزمائش میں ڈالے رکھے گا۔ اگلے روز حاجی حیات کے جانے کے بعد اس نے جہانگیر کو پھر فون کیا۔ رستم کی آواز سن کر جہانگیر ایک دم کھل اٹھا۔ ''کیا حکم ہے میرے جگر؟'' وہ جوش سے بولا۔

''دو چار ہفتے کے لیے ایک ٹھکانا چاہیے، سر چھپانے کے لیے۔''

''ایک ٹھکانا؟ یار تُو بس ایک بار آنکھ سے اشارہ کردے۔ آٹھ دس ٹھکانے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر حاضر کردیتا ہوں۔''

''نہیں، بس ایک ہی کافی ہے۔ لاہور کے کسی اچھے علاقے میں ہو جائے۔ زیادہ گنجان آبادی نہ ہو۔''

''گلبرگ میں ہو جائے؟ تین کینال کی کوٹھی ہے۔ پرانی بنی ہوئی مگر اندر سے زبردست ہے۔ ٹھیک ٹھاک باغ بھی ہے۔ اپنا ایک جاننے والا ہے۔ آج کل دبئی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اس سے چابی لے لیتے ہیں۔''

''بھروسے کا بندہ ہے؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے یار۔ ہم جیسوں کے لیے تو سب سے پہلا سوال ہی بھروسے کا ہوتا ہے۔''

''ایک بھروسے کے ڈاکٹر کا انتظام بھی کرنا ہوگا جو کوٹھی میں آکر اجمل کا علاج کرسکے۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہو رہی۔''

جہانگیر کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ''تُو پریشان نہ ہو۔ یہ بھی ہو جائے گا۔ سب سے بڑا روپیہ..... اور روپیہ اپنے پاس بہت ہے۔ اپنا تو وڈا پرابلم ہی یہ ہے کہ زندگی کم اور روپیہ زیادہ۔ کسی ضرورت مند ڈاکٹر صاحب کی جیب میں جب ایک وزٹ کا بیس تیس ہزار روپڑا جائے گا تو وہ سر کے بل چل کر آئیں گے۔''

پانچ دس منٹ کی گفتگو میں سارے معاملات طے ہوگئے۔ جہانگیر نے رستم کو بتایا کہ کل رات نو بجے کے بعد کسی بھی وقت وہ اور اس کے ساتھی گلبرگ نمبر ایک کی کوٹھی میں شفٹ ہوسکیں گے۔

وہ اَبر آلود رات تھی۔ ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے بوندا باندی بند ہو جاتی تھی۔ رستم کے دل کا موسم عجیب ہو رہا تھا۔ کوئی رہ رہ کر یاد آتا تھا اور دل سینے میں خون ہونے لگتا تھا۔ تو کیا وہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جائے گی؟ نہیں..... ایسا نہیں ہوگا..... اس کے جانے سے پہلے وہ خود چلا جائے گا۔ شاید ایسی جگہ جہاں سے واپس آنا ہی ممکن نہیں ہوگا۔ جہاں سے کوئی واپس آتا ہی نہیں ہے۔

کمرے کی بند کھڑکی اور ہلکی بارش کے درمیان سے گزر کر اس کی نگاہیں احاطے میں اشوکا کے پودوں پر پڑیں۔ ان پودوں کے پیچھے وہ چار ساڑھے چار فٹ اونچی باؤنڈری وال تھی جو دو کوٹھیوں کی درمیانی حد مقرر کرتی تھی۔ اس باؤنڈری وال کو دیکھتے ہی ثریا کا خیال بھی

www.pdfbooksfree.pk

رستم کے ذہن میں آ گیا۔ پڑوس کی وہ ملازمہ لڑکی جس نے خود پر ہونے والے ستم کی رُوداد رستم تک پہنچائی تھی۔ اس رُوداد کے سبب ہی اتنی جلدی قدرت اللہ اور قدرت اللہ کے انجام کا ملاپ ہوا تھا۔ قدرت اللہ کے قتل کو بیس پچیس دن گزر چکے تھے مگر ابھی تک ثریا سے رستم کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ سوچنے لگا، پتا نہیں ثریا تک قدرت اللہ والی خوشخبری پہنچی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے بڑی ہمت کی تھی اور بڑے ڈرامائی انداز میں رستم تک اپنی بپتا پہنچائی تھی۔ اسے اپنی کوشش کا صلہ معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس لحاظ سے بھی قابلِ تعریف تھی کہ وہ رستم کے اعتماد پر پوری اُتری تھی۔ وہ اس اہم ترین راز سے آگاہ تھی کہ رستم اور اس کے ساتھی یہاں اس کوٹھی میں موجود ہیں۔ وہ بڑے ظرف سے اس راز کو اپنے سینے میں چھپائے رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی قریبی سہیلی کو بھی بے خبر رکھا تھا۔

رستم اور اس کے ساتھی کل یہاں سے جا رہے تھے۔ رستم کو مناسب محسوس ہوا کہ وہ یہاں سے جانے سے پہلے ایک بار ثریا سے مل لے۔ تاریک رات میں تیز ہوا نے ایک بار پھر سائیں سائیں کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہوا کے ساتھ ہی بارش میں وقفہ آ گیا تھا..... یہ قریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ رستم نے شال لی اور ناصر کو بتا کر کوٹھی سے نکل آیا۔ وہ پیدل ہی چلتا ہوا کوٹھی نمبر 99 کے گیٹ پر پہنچ گیا۔ بارش اور تیز ہوا کے سبب علاقے کی لائٹ گئی ہوئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس بھی بند تھیں۔ گہری تاریکی میں بلند قامت درختوں کے سائے مسلسل جھوم رہے تھے۔ اس سے پہلے جب وہ ثریا اور اس کی سہیلی نوری سے ملا تھا تو تب بھی ایسا ہی اَبر آلود موسم تھا۔

رستم نے گیٹ کی ایک درز سے اندر جھانکا۔ احاطے کا جھاڑ جھنکاڑ چغلی کھاتا تھا کہ کوٹھی کے مالک کئی ماہ سے یہاں مقیم نہیں ہیں۔ رستم نے اپنی نگاہ برآمدے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آج بھی بابا عبدالرحمٰن اور اس کا حقہ برآمدے میں موجود ہیں یا نہیں۔ اس کی نگاہ برآمدے تک نہیں پہنچ سکی۔ بہرحال، رستم کو اُمید تھی کہ بابا عبدالرحمٰن آسانی سے نہیں جاگے گا اور کال بیل کی آواز پر ثریا یا نوری ہی باہر آئیں گی۔

اس نے کال بیل بجائی مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ بیل نہیں بج رہی۔ پھر اسے یاد آیا کہ بجلی تو گئی ہوئی ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے گیٹ پر دستک دی۔ قریباً ایک منٹ بعد قدموں کی چاپ اور کھانسی کی آواز سنائی دی۔ یہ جان کر رستم کو سخت مایوسی ہوئی کہ ثریا یا نوری کے بجائے بابا عبدالرحمٰن خود گیٹ کی طرف آ رہا ہے۔ چرچرانا دروازہ کھلا۔ عبدالرحمٰن کے ہاتھ میں پورٹ ایبل لائٹ تھی۔ وہ حویلیوں اور کوٹھیوں کی رکھوالی کرنے والا روایتی بوڑھا نظر آتا

تھا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ مجسم سوال تھا۔

''کیا بات ہے پُتر؟'' اس نے قدرے بھرائی ہوئی پریشان آواز میں پوچھا۔

''میں ثریا سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کا پنڈ ہمارے پنڈ راس پور کے ساتھ ہی ہے۔''

بوڑھے عبدالرحمٰن نے رستم کو سرتاپا گھورا۔ پورٹ ایبل لائٹ اونچی کر کے درمیان سے اس کا چہرہ دیکھا۔ بارش ایک دم پھر سے برسنے لگی تھی۔ بوڑھا الجھے ہوئے انداز میں دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ یہ ایک طرح سے اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ بارش سے بچنے کے لیے اندر آ سکتا ہے۔ رستم شکریہ کہتا ہوا اندر چلا گیا اور احاطہ پار کر کے عبدالرحمٰن کے حقے اور چارپائی کے پاس ایک کرسی پر جا بیٹھا۔

عبدالرحمٰن نے رستم کا نام پوچھا..... ایک دو رسمی سوالات کیے پھر بولا۔ ''لگتا ہے کہ تم ثریا اور چھیدی سے ملنے کافی دیر بعد آئے ہو؟''

''ہاں، یہ بات تو ہے جی۔ ثریا بہن نے کئی بار کہا تھا کہ لاہور آؤ تو ملنے ضرور آنا۔''

عبدالرحمٰن نے ٹھنڈی سانس لے کر بجھے ہوئے حقے کا کش لینے کی ناکام کوشش کی اور بولا۔ ''ثریا تو فوت ہو گئی ہے پُتر۔''

رستم سناٹے میں رہ گیا۔ ''کب..... کیسے؟'' وہ بے ساختہ کراہ اٹھا۔

''اسے گزرے تو چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے ہیں۔''

اس بار رستم بالکل چکرا کر رہ گیا۔ اس نے عبدالرحمٰن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کسی دیوانے کو دیکھا جاتا ہے۔ عبدالرحمٰن ایک دم سنجیدہ اور رنجور بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں دکھ رینگ رہا تھا۔ ''بابا! یہ کیا کہہ رہے ہو۔ مم..... میں..... میرا مطلب ہے.....'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔

عبدالرحمٰن نے ایک مزا تر اسگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لمبی کہانی ہے پُتر! ابھی تک ہماری سمجھ میں بھی نہیں آئی۔ تمہاری سمجھ میں کیا آئے گی۔ بس جو اللہ کو منظور تھا وہ ہوا۔ ثریا کے خصم چھیدی کے بارے میں تو کہتے ہیں کہ وہ کویت گیا تھا اور وہیں کہیں غائب ہو گیا ہے۔ ثریا اس کوٹھی میں تھی۔ پتا نہیں کیسے اس کی دکھی (پہلو) میں ایک بڑا پھٹ (زخم) لگ گیا تھا۔ ٹھیک بات تو مالکوں کو ہی پتا تھا۔ وہ بتاتے تھے کہ وہ باورچی خانے میں ساگ کاٹنے والی درانتی پر گری تھی۔ آگے اللہ بہتر جانے..... اس وچاری کے پیٹ میں چھیدی کا بچہ بھی تھا۔ پتا نہیں کیوں مالک اسے ہسپتال لے کر نہیں گئے۔ انہوں نے دو چار روز کوٹھی میں ہی اس کا علاج شلاج کرایا..... پر وہ مر گئی۔''

www.pdfbooksfree.pk

''یہ..... یہ تم کب کی بات کر رہے ہو عبدالرحمٰن؟'' رستم کا لہجہ لرزاں تھا۔

''میں نے بتایا ہے ناں کہ کوئی چھ مہینے پہلے کی بات ہے۔''

رستم کے مساموں سے پسینہ بہہ نکلا۔ تو چند دن پہلے وہ جس لڑکی سے ملا تھا وہ کون تھی؟ اچانک ہی اس کی نگاہوں میں ثریا اور اس کی سہیلی نوری کے چہرے گھومے۔ پھر اسے نوری کی آنکھیں یاد آئیں..... وہ آنکھیں..... ہاں وہ آنکھیں..... یہ وہ آنکھیں تھیں جو وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ یہ نگینہ کی آنکھیں تھیں۔ یہ سب کیا تھا؟ کیا گورکھ دھندا تھا؟ وہ اپنے پورے ہوش وحواس میں تھا۔ بابا عبدالرحمٰن بھی حواس میں ہی نظر آتا تھا لیکن ابھی یہاں جو گفتگو ہوئی تھی وہ سمجھ سے بالاتر تھی۔

اس نے گھوم کر اس بند دروازے کی طرف نگاہ دوڑائی جس میں سے گزر کر وہ ثریا اور نوری کے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور اس کے سامنے کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ کمرہ بالکل تاریک تھا اور جیسے گواہی دے رہا تھا کہ یہاں مدت سے کوئی نہیں رہتا۔

ایک دم رستم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ ''اچھا بابا، میں چلتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا بات ہے۔ ایک دم اٹھ گئے ہو؟ میں تمہارے لیے چائے بنانے لگا تھا۔''

''نہیں، پھر کبھی سہی۔''

عبدالرحمٰن حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ رستم رسمی کلمات ادا کر کے بوجھل قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک بار زور سے بجلی چمکی۔ یہ اجڑی پجڑی بے رنگ کوٹھی اسے پہلے سے زیادہ ویران محسوس ہوئی۔ دروازے کے قریب رک کر رستم نے بابا عبدالرحمٰن سے پوچھا۔ ''ثریا کی کوئی سہیلی نوری بھی ہے؟''

''نوری!'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''یہاں تو اس نام کی کوئی نہیں تھی۔ ہوسکتا ہے کہ پنڈ میں ہو..... پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''بس یونہی۔'' رستم نے گول مول جواب دیا اور عبدالرحمٰن کو حیران پریشان چھوڑ کر کوٹھی نمبر 99 سے باہر نکل آیا۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ اس کے ساتھ یہ انہونا واقعہ ہوا تھا اور بقائمی ہوش وحواس ہوا تھا..... وہ پہلے واقعات کو بھی ابھی پوری طرح بھول نہیں پایا تھا اور اس دفعہ تو سب کچھ زیادہ واضح اور تحیر خیز تھا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی رہائش گاہ کے قریب پہنچا۔ اسے معلوم تھا کہ ناصر ابھی

جاگ رہا ہوگا۔ وہ اس سے ثریا کے بارے میں اور اس سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں پوچھے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی روش پر قائم رہے گا۔ جس طرح اس نے پہلے ان واقعات کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا، اب بھی نہیں بتائے گا۔ پتا نہیں کیوں، یہ باتیں دوسروں سے کرتے ہوئے اسے بڑا عجیب لگتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ دوسروں کو خواہ مخواہ شدید ترین الجھن میں مبتلا کر دے گا یا پھر وہ اس کی پریشان حالی پر ہنسنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ خیالوں اور واہموں کی دنیا میں رہنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ صرف ٹھوس حقیقتوں کو ہی مانتا تھا لیکن جو کچھ گا ہے یہ گا ہے اس کے ساتھ ہوا تھا، اس سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔

حسبِ توقع ناصر جاگ رہا تھا۔ اس نے ثریا کے بارے میں اس سے وہی سوال کیے جن کی اسے امید تھی۔ اس نے گول مول جواب دیے اور سونے کے بہانے لیٹ گیا۔ دل و دماغ میں عجیب سی سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ جس رات ثریا اور نوری سے اس کی ملاقات ہوئی کہیں وہ نشے میں تو نہیں تھا..... پھر وہ اپنی خام خیالی پر خود ہی سٹپٹا گیا۔ مدت ہوئی اس نے شراب کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور ویسے بھی ثریا سے اس کی ملاقات ایک نہیں دو بار ہوئی تھی۔ اور سب سے ٹھوس حقیقت..... وہ لرزہ خیز ڈیوکیسٹ؟ وہ دیر تک عجیب وغریب خیالوں کے نرغے میں رہا پھر سو گیا.....

اگلے روز رات کو رستم اور اس کے ساتھی بڑی خاموشی سے گلبرگ میں شفٹ ہو گئے۔ ان کو روانگی کے لیے تیار دیکھ کر خانساماں ظفر احمد دکھی ہو گیا تھا۔ اس نے حاجی حیات کو فون کرنے کی کوشش کی مگر رستم نے سختی کے ساتھ اسے روک دیا۔ جہانگیر نے ٹنڈ شیشوں والی ایک اسٹیشن ویگن بھیج دی تھی۔ زخمی اجمل کو اس میں احتیاط سے نیم دراز کر دیا گیا۔ سردار دراج اور اس کے تینوں ساتھی پچھلی نشستوں پر چلے گئے۔ رستم نے آپو زاہدہ اور زری کو سرمد سمیت سب سے اگلی نشست پر بٹھا دیا۔ ناصر اور رستم درمیانی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ مرغی کی طرح بندھا ہوا طفیل دو نشستوں کے درمیان خلا میں ٹھونس دیا گیا۔ چند روز قید و بند کے بعد اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آنے لگے تھے اور اس کی ساری تن فن ختم ہو چکی تھی۔

گلبرگ کی کوٹھی واقعی بہت پرانی تھی مگر اندر سے اسے جدید انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ یہاں جہانگیر نے بڑی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔ اس کے پاؤں جیسے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اجمل خان کو ایک وہیل چیئر پر بٹھا کر آرام کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ بیماری کے باوجود اجمل نے کسی نہ کسی طرح اپنی خوش دلی برقرار رکھی ہوئی تھی۔ اس نے جہانگیر کو اپنے دو خود ساختہ شعر سنائے۔ ان کا مطلب کچھ اس طرح تھا۔ ''جس طرح گرمی کے سارے

www.pdfbooksfree.pk

دن گرم نہیں ہوتے اسی طرح پولیس کے سارے لوگ بھی برے نہیں۔ ان میں اکثریت اچھوں کی ہے۔ اس کا ایک ثبوت ایک سابقہ پولیس والا اس وہیل چیئر پر ہے۔'' یہ رات دس بجے کا وقت تھا۔ درودیوار میں کھانے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

کھانے میں کیا ہے جہانگیر؟'' رستم نے پوچھا۔

''تمہیں تو پتا ہی ہے، میں کھانے میں بس دو چیزوں کا خیال رکھتا ہوں۔ نمبر ایک، کھانا اچھا ہو اور نمبر دو..... بہت زیادہ ہو۔''

''پھر تو آپ اپنا ام خیال ہے۔'' اجمل نے کراہ کر کہا۔

''لیکن آپ تو بیمار ہیں۔ کیا آپ کے لیے کوئی خاص چیز پکانی ہوگی؟''

''نہیں نہیں۔ کوئی احتیاط نہیں۔ جتنی بھی خاص خاص چیزیں ہیں، وہ سب ام کھائے گا۔''

''اور پھر رات بھر ہائے ہائے کرتا رہے گا۔'' ناصر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''نہیں جہانگیر بھائی! اس کو جو بھی دینا ہے میرے مشورے سے دینا ہے۔''

''لگتا ہے، تم ام سے اگلے پچھلے بدلے چکانا چاہتا ہے۔ اللہ کسی کو بیمار نہ کرے اور اگر کرے تو پھر کسی دشمن ڈاکٹر کے ہتھے نہ چڑھائے۔ کل رات ام نے دو شعر بنائے ہیں اس بارے میں بھی۔

کبھی اماری کھانے پینے پر انگلی اٹھاتے ہیں
کبھی اماری دوسری عادتوں کو نشانہ بناتے ہیں
لوگ کہنے کو تو اماری بیمار پُرسی کرتے ہیں
لیکن اصل میں اپنے پرانے بدلے چکاتے ہیں

''دیکھو اجمل! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زخم گہرا ہے اور انفیکشن بھی ہے۔ تم اپنی تکلیف کو سنجیدگی سے لو۔''

''تو ٹھیک ہے۔ ام آج ہی قبرستان کی طرف منہ کر کے لیٹ جاتا ہے اور کھانا پینا بند کر دیتا ہے۔ یار ناصر! تم کیسی باتیں کرتا ہے۔ اگر ام کو اس معمولی زخم کی وجہ سے ہی مرنا ہے تو ام یہ کام تمہاری مدد کے بغیر بھی آسانی سے کر سکتا ہے۔ ایک اور کتا (قطعہ) ہے۔

ام لالچی دکاندار سے پان کیوں لے
گندے نانبائی سے نان کیوں لے
ام جب مرنے میں خود کفیل (خود کفیل) ہے
تو ڈھگر ڈاکٹر کا احسان کیوں لے''

''تم زیادہ شوخے نہ بنو اجمل۔'' رستم نے نرمی سے کہا۔ ''ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے، تمہارا زخم معمولی نہیں ہے۔'' اجمل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

رات کو اجمل کو بہت تیز بخار ہو گیا اور الٹی بھی ہوتی رہی۔ وہ ہلکی غنودگی کے عالم میں بولتا رہا۔ ''جب وہ حرامی شاہی مر گیا تو پھر ام کو بھی مرنے کا کوئی غم نہیں..... کوئی غم نہیں۔'' اگلے روز جہانگیر نے بھاگ دوڑ کر کے اچھے ڈاکٹر کا انتظام کر لیا۔ ظاہر ہے کہ جہانگیر نے ڈاکٹر کو منہ مانگا معاوضہ دیا تھا اور اس ڈیل میں سب سے بڑی شرط راز داری ہی کی تھی۔ ایسے معاملوں میں رستم کو جہانگیر پر مکمل اعتماد تھا۔

ڈاکٹر نے تقریباً آدھ گھنٹے تک اجمل کا تفصیلی معائنہ کیا۔ آخر میں وہ کمرے سے باہر آ کر ناصر اور رستم سے بولا۔ ''معاملہ آسان نہیں ہے۔ مریض کو ہسپتال کی شدید ضرورت تھی مگر اسے گھر میں رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے انفیکشن بڑھ گیا ہے۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ کسی طرح ان کو ہسپتال داخل کر دیا جائے۔ بایاں پھیپھڑا ابھی متاثر ہو رہا ہے جس کی وجہ سے سانس میں دقت ہو رہی ہے۔''

جہانگیر نے سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھا پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''آپ نے جو بھی کرنا ہے یہیں کریں۔ کوئی حل نکال لیں اس کا۔''

''لیکن کچھ ٹیسٹ وغیرہ صرف ہسپتال میں ہو سکتے ہیں۔''

''آپ ہسپتال کو اٹھا کر یہاں لے آئیں۔ ٹیسٹوں کی دو چار مشینیں ہی ہوں گی ناں۔ خرچے کی بالکل پرواہ نہ کریں۔'' جہانگیر نے کہا۔

ڈاکٹر طارق جز بز نظر آنے لگا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''اچھا..... ابھی میں نے کچھ دوائیں دی ہیں۔ ان کا اثر دیکھتے ہیں۔ اس دوران میں مسئلے کا کوئی حل ڈھونڈتے ہیں۔''

سردار دراج کے دو زخمی ساتھیوں کی مرہم پٹی بھی ڈاکٹر سے کروائی گئی۔ دونوں زخمی مہتموں کے یہ گہرے زخم پولیس تشدد کا نتیجہ تھے۔ دو چار گہری چوٹیں سردار دراج کی پشت اور کندھوں پر بھی تھیں۔ ایک مہتم کی ناک کی ہڈی شاہی کے گارڈز کے ساتھ لڑائی میں ٹوٹی تھی۔

سردار دراج نے بلا جھجک رستم کو بتایا کہ پولیس اسے ساتھیوں کے سامنے ہی ننگا کر کے بے دریغ پیٹتی رہی ہے۔

وہ نم آنکھوں کے ساتھ بولا۔ ''اپنی یہ بے عزتی میں مرتے دم تک بھول نہیں سکتا۔ میں

www.pdfbooksfree.pk

بدلہ لوں گا..... چاہے، مجھے اس کے لیے جنم ہی کیوں نہ دینی پڑے۔"

رستم نے پوچھا۔ "تم ان پولیس والوں کو پہچانتے ہو؟"

"ان کی شکلیں میرے دماغ (دماغ) پر نقش ہوگئی ہیں۔ انہوں نے بہت برا سلوک کیا آپاں سے اور اس سے پہلے آپاں کی (ہماری) عورتوں سے بھی۔ ان میں سے ایک ڈپٹی ریاج کا حرامی یار ہے۔ وہ پلس میں تو نہیں پر پلس والوں کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس کو تہور..... تہور کہتے ہیں۔ میں اس کو معاف کردوں تو اپنے پیو کا تخم نہیں ہوں۔" دراج کے لہجے میں آگ کی پھنکار تھی۔

وہ کچھ دیر چپ رہا پھر رستم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "رستم بھائی! مجھے یقین ہے کہ آپاں کو پکڑوانے میں حویلی والوں کا ہتھ ہے۔ حویلی والوں کی طرپھ تو آپاں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے کیونکہ وہ آپاں کے لیے عجت کی جگہ پر ہیں۔ پر ڈپٹی ریاج اور اس کے رشتے داروں سے ہتھ جوڑی جرور کریں گے ہم۔"

سردار کے انداز میں طیش تھا اور خودسری تھی۔ وہ بس رستم کو اطلاع دے رہا تھا، اس سے کسی رائے کا طلب گار نہیں تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ اس میں حویلی والوں کا ہاتھ ہے؟" رستم نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"بس جی، آپاں کی جنگلی عقل تو یہی کہتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے آپاں کو چا پلائی گئی تھی۔ ضرور اس چا کے اندر کوئی نشے والی شے تھی۔ چا پینے کے بعد آپاں چاروں کو اپنی سدھ بدھ نہیں رہی۔ ہوش آئی تو آپاں ایک گڈی میں تھے اور ہتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ انکھیوں پر بھی پٹیاں باندھی گئی تھیں۔ پھر آپاں کو اس کوٹھی میں لے جایا گیا اور رات دن مار اپیٹ گیا۔ اور آپ سچ پچھیں تو مار کٹ کی وہ تکلیف نہیں ہوئی جو بے عجتی کی ہوئی ہے۔ ہم گریبوں کے پاس آن عجت کے سوا اور ہوتا بھی کیا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں، اس بے عجتی کا بدلہ لوں گا یا اپنی جندگی ہار دوں گا۔"

سردار دراج واقعی کسی قدیم قبیلے کا جنگجو سردار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا سانولا چہرہ خون کے دباؤ سے مزید سانولا ہوگیا تھا اور آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔

رات کو رستم کی ایک دلی تمنا پوری ہوگئی۔ جہانگیر کے چھوڑے ہوئے ایک ہرکارے نے اسے موبائل پر اطلاع دی کہ ڈپٹی ریاض ہٹلر کا رابطہ نمبر معلوم ہوگیا ہے۔ یہ قبائلی علاقے میں کرم ایجنسی کی ایک لینڈ لائن تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

نمبر معلوم ہوتے ہی رستم ڈپٹی ریاض سے بات کرنے کے لیے بے چین ہوگیا۔ رات کے پُر تکلف کھانے میں سے بس چند لقمے لینے کے بعد رستم چھت پر چلا گیا اور اس نے موبائل فون کے ذریعے ڈپٹی ریاض سے رابطے کی کوشش شروع کردی۔ پانچویں چھٹی ٹرائی میں لائن مل گئی۔ ایک خاں صاحب پہلے پشتو میں بولے پھر انہوں نے اردو میں بات کی۔ رستم نے خان کو بتایا کہ وہ جناب ریاض صاحب سے بات کرنا چاہتا ہے۔

قریباً دو منٹ بعد وہ نہایت منحوس و کرخت آواز رستم کے کانوں سے ٹکرائی جو شاید اس کے لیے دنیا کی کریہہ ترین آواز تھی۔ یہ ریاض تھا۔ "ہیلو! کون ہے؟" وہ بھنائے ہوئے لہجے میں بولا۔

رستم نے گہری سانس لی۔ "اتنی جلدی بھول گئے ہو ڈپٹی ریاض! مجھے مرے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔"

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر ریاض پھنکارا۔ "کیا بک بک ہے..... کون بول رہا ہے؟"

"فون بند نہ کرنا ڈپٹی ریاض۔ میری آواز پر تھوڑا سا غور کرلو۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے، تمہارے جیسے ظالموں کے حافظے اتنے کمزور نہیں ہوتے۔"

اس مرتبہ خاموشی کا وقفہ طویل تھا۔ ریاض کی بھاری بھرکم آواز دوبارہ ابھری تو اس میں ہکی سی کپکپاہٹ نمودار ہوچکی تھی۔ اس کپکپاہٹ کے باوجود یہ آواز نہایت زہریلی اور کرخت تھی۔ "تو ہمارا شک درست تھا..... تم زندہ ہو۔"

"تم نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی لیکن شاید میرے کچھ سانس باقی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سانسیں پوری ہونے سے پہلے تیرا میرا حساب بے باق ہوجائے۔"

"تیرا میرا کیا حساب ہے؟"

"تیرا میرا ہی تو حساب ہے۔ وڈے ڈیرے پر جو کچھ ہوا اسے میں بھول سکتا ہوں اور نہ تُو بھولا ہوگا۔"

"اچھا..... تو بدلہ لینا چاہتے ہو لالے اور حسنے گجراتی وغیرہ کا؟"

"لالے اور حسنے گجراتی کا اور خون کے اس ایک ایک قطرے کا جو تُو نے سرکاری ہتھیاروں سے وہاں گرایا..... ایک ایک قطرے کا!"

"میں سمجھا تھا گئے کہ تیری جان چھوٹ گئی ہے لیکن ابھی تیری قسمت میں اور تڑپنا پھڑکنا باقی ہے۔ چلو، ایسے ہی سہی۔"

"تو پھر مجھے تڑپانے پھڑکانے کے لیے سامنے آجا۔"

''سامنے تو تجھے آتا ہے۔'' ریاض ہنٹر کے لہجے میں بلا کا زہر تھا۔

''تو پھر جگہ طے کر لے۔ میں آجاتا ہوں، تُو بھی آجا۔ جواں مردوں کی طرح فیصلہ کر لیتے ہیں۔ پر میں جانتا ہوں، تُو اپنے باپ کا تخم نہیں ہے۔ کوئی بدکار جنگلی جانور تیری پیدائش کی وجہ بنا ہے۔ تُو نہیں آئے گا اور نہ تجھے آنا ہے۔''

ریاض خاموش تھا۔ شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اگر کوئی اس سے ایسے لہجے میں بات کر سکتا ہے۔

رستم نے بات جاری رکھی۔ ''ڈیڑھ دو سال پہلے تُو نے ٹیلی فون پر مجھے کچھ آوازیں سنا کر اپنے پاس بلایا تھا۔ آج میں بھی تجھے کچھ آوازیں سنانا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تیرا دل بڑا خوش ہوگا۔ بس دس پندرہ منٹ انتظار کر۔'' اس کے ساتھ ہی رستم نے فون بند کر دیا۔

فون بند کر کے وہ چھت سے نیچے اترا۔ اس نے ناصر کو اپنے ساتھ لیا اور کوٹھی کے اس وسطی کمرے میں چلا گیا جہاں سب انسپکٹر طفیل کو بند رکھا گیا تھا۔ طفیل کھانا وغیرہ کھا کر لیٹا تھا اور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ رستم نے اندر داخل ہونے سے پہلے ترنا ناصر کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ اندر گھستے ہی ناصر نے کسی عقاب کی طرح طفیل کو چھاپ لیا۔ اسے اسپرنگ دار بستر سے اٹھا کر اوندھے منہ فرش پر پٹخا اور پھرتی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے۔ اس دوران میں رستم پستول لیے اس کے سر پر کھڑا رہا تھا۔

طفیل خوف سے پیلا پڑ گیا اور منت سماجت کرنے لگا۔ ''مجھے مت مارنا۔ میں تمہاری ہر بات مان رہا ہوں۔ تم جو پوچھتے ہو، میں بتا دیتا ہوں۔''

''آج تیری اسپیشل کلاس ہے۔ تجھ سے پوچھنا نہیں صرف مارنا ہے۔'' ناصر زہریلے لہجے میں بولا۔

''نہیں، خدا کے لیے نہیں..... مم..... میرے سینے میں پہلے ہی درد ہے۔ مجھے کچھ ہو گیا تو.....''

''ہو گیا تو کیا ہوگا..... زیادہ سے زیادہ تُو مر جائے گا اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تیرے ہاتھوں بھی تو ایسے ہی لوگ مرتے رہے ہیں۔''

رستم کے اشارے پر ناصر نے قالین پر پڑے طفیل کی پسلیوں میں چند ٹھوکریں رسید کیں تو وہ بری طرح ڈکرانے لگا۔ رستم نے ایک بار پھر موبائل فون پر ڈپٹی ریاض سے رابطہ کیا۔ دوسری کوشش میں ریسیور پر ڈپٹی کی منحوس آواز ابھری۔ ''کون؟''

''میرے خیال میں اب مجھے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ ابھی تھوڑی دیر

میں تُو جو آوازیں سنے گا اس کے بعد میری شناخت اور پکی ہو جائے گی۔''

''کیا بک رہا ہے حرامزادے؟'' ڈپٹی ریاض، آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا..... اور مسلسل غلیظ گالیاں دینے لگا۔

رستم نے ناصر کو اشارہ کیا۔ اس نے نیچے لیٹے ہوئے طفیل کی گردن پر اپنا بوٹ رکھ دیا۔ یہ بڑی کڑی سزا تھی۔ ناصر کے جسم کا وزن طفیل کی گردن پر آیا تو اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ اس کا منہ کھل گیا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس کا رنگ نیلا ہو گیا اور وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ رستم کے اشارے پر ناصر نے پاؤں کا دباؤ کم کیا تو طفیل نے زور سے سانس اندر کھینچی اور پھر چلانے لگا۔ وہ دو چار سانسیں لے چکا تو ناصر نے پاؤں کا دباؤ پھر بڑھا دیا اور اس کی آواز بند کر دی۔ بیس تیس سیکنڈ بعد اس نے پھر پاؤں کا وزن کم کیا تو طفیل کے گلے کا والیم کھل گیا۔ اس کی آواز ذبح ہوتے ہوئے جانور سے مشابہ تھی۔ ''خدا کے لیے نہیں..... خدا رسول کے لیے نہیں۔'' وہ چلا رہا تھا۔

''کون ہے یہ؟'' ڈپٹی ریاض فون پر دہاڑا۔

''تیرا بھتیجا طفیل۔ وہ مرنے والا ہے۔ ہم اس کی بہت مہمان نوازی کریں گے تو بھی یہ پانچ چھ دن سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔''

لائن پر سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی ریاض ہنٹر کی گمبھیر آواز ابھری۔ ''طفیل کو کچھ ہوا تو میں تیرے.....'' اس سے آگے گالیوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔

رستم نے ایک خوفناک سرد مہری کے ساتھ یہ گالیاں سنیں اور بولا۔ ''میں نے کہا ہے ناں تُو انسان کا تخم ہی نہیں ہے۔ تجھ سے انسانوں کی طرح بات کرنا بے کار ہے۔ تیرے جیسے حرامی صرف ذلت کی زبان سمجھتے ہیں اور ذلت کی زبان یہ ہے کہ اپنے..... مشکوک نسل والے بدکار بھتیجے کو بچانا چاہتا ہے تو چار پانچ دن کے اندر بچا لے۔ تیری آسانی کے لیے تجھے یہ بتا دیتا ہوں کہ میں لاہور میں ہوں..... چل تھوڑی سی آسانی اور کر دیتا ہوں۔ نہر کی دوسری طرف اسٹیڈیم والی سائیڈ پر ہوں۔''

''لے..... اب کھانے کے بعد تھوڑی سی سویٹ ڈش بھی کھا لے۔'' ناصر نے طفیل کے کان میں سرگوشی کی..... اور پلاس کے ساتھ طفیل کی گھنی مونچھوں کو ایک زوردار کھینچا مارا۔

وہ ایک بار پھر کنوئیں میں گر جانے والے بھینسے کی طرح ڈکرایا۔ اس کے ساتھ ہی رستم نے فون بند کر دیا۔

طفیل کی مونچھیں ایک جانب سے اکھڑ گئی تھیں، وہاں سے خون رسنے لگا۔ اس کا چہ بیلا

www.pdfbooksfree.pk

وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ایک ایسی نصیب سڑی عورت کی طرح گھگیانے لگا جسے اپنی عزت اور جان ایک ساتھ جاتی نظر آ رہی ہو۔ شاید ان لمحوں میں وہ اس گرد باد والی رات کو بھی کوس رہا تھا جب وہ ایک غیر ملکی خاتون کی حدت سے اپنا پہلو گرم کرنے کے لیے ایک مخصوص اڈے میں پہنچا تھا اور رستم کے شکنجے میں پھنسا تھا۔

کمرے میں ٹی وی پہ دستور آن تھا۔ فلم لگی ہوئی تھی۔ انڈین فلم کا گانا گونجنے لگا.....

رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا..... جب نشہ چھائے گا تب مزہ آئے گا.....! طفیل اچھی حالت میں ہوتا تو شاید اسے یہ گانا اچھا لگتا۔ یہ کمرہ کافی حد تک محفوظ تھا اور ویسے بھی کوٹھی کے بالکل اندرونی حصے میں تھا۔ رستم کو امید تھی کہ طفیل کے رونے چلانے کی آوازیں آپو زاہدہ اور سرمد کے کانوں تک نہیں پہنچنے دیں گی۔ آپو زاہدہ پہلے ہی بہت پریشان تھیں، وہ انہیں مزید پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

☆======☆======☆

عین اس وقت کوٹھی کے ایک کمرے میں آپو زاہدہ بستر پر بڑی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھیں۔ طفیل کی آواز تو ان تک نہیں پہنچی تھی لیکن ان کے اپنے اندر سے ابھرنے والی آوازیں انہیں ہلکان کر رہی تھیں۔ یہ آوازیں کہہ رہی تھیں۔ ”زاہدہ! تیرا چھوٹا بھائی اندر ہی اندر ایک قاتل آگ میں سڑ رہا ہے۔ اس نے تجھ سے جس لڑکی کی بات کی تھی وہ کوئی اور نہیں رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ہے۔ وہ شانی ہی ہے جس کے سینے تیرے بدنصیب بھرا نے دیکھے ہیں اور جس کی چاہ کو دن رات اپنے دل میں پالا ہے۔ وہ چھوٹا تھا تب بھی ایسے کھلونوں کو دیکھ کر مچل اٹھتا تھا جن تک اس کی پہنچ نہیں ہوتی تھی۔ اب بھی وہ ایک ایسی شے کی خواہش کر بیٹھا ہے جو اس کی ہمت اور طاقت سے بہت اونچی ہے۔ وہ بہت اونچی پگڑیوں والے خاندان کی ایک بہت اونچی حویلی کی طرف دیکھ بیٹھا ہے۔“

آپو زاہدہ کو تسلی تھی تو صرف ایک بات کی اور وہ یہ کہ ان کا دل ایک بات کی گواہی دے رہا تھا۔ گواہی یہ تھی کہ رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی بھی اس کے چھوٹے دیر کو بہت چاہتی ہے..... تو پھر کیا وجہ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے دور تھے؟ یقیناً کچھ لوگوں نے ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر رکھی تھیں۔ یہ غلط فہمیاں ہی تھیں جو رستم کو دن رات تڑپا رہی تھیں۔ انہوں نے رستم کی بے چین راتوں کے درد کو اتنی شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ اندر تک کانپ اٹھی تھیں۔ وہ دن رات تڑپ رہا تھا۔ کیا چھوٹی چوہدرانی بھی اس کے لیے ایسے ہی تڑپ رہی تھی؟ آپو زاہدہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جس دن وہ اور اکرام رنگ والی سے اچانک لاہور

پہنچائے گئے تھے، رستم نے بند کمرے میں کتنی دیر تک اپنے دل کو لہو کیا تھا۔ ان دونوں کا رنگ والی سے آنا بھی کسی دل دکھانے والی غلط فہمی کا ہی نتیجہ تھا۔ آپو زاہدہ نے پختہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خاموشی سے رنگ والی پہنچے گی اور چھوٹی چوہدرانی سے ملے گی۔ وہ اس کو سب کچھ بتائے گی جو شاید رستم خود نہیں بتا سکتا۔ وہ اس کے سامنے اپنی جھولی پھیلا دے گی اور اتنے درد سے روئے گی کہ چھوٹی چوہدرانی کے پاس اقرار کے سوا کوئی راستہ ہی نہیں رہے گا۔

آپو زاہدہ سب کچھ طے کر چکی تھیں۔ اگلے روز صبح سویرے ابھی رستم اور سرمد سو رہے تھے کہ آپو زاہدہ برقع اوڑھ کر رنگ والی جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ جاتے وقت انہوں نے سردار دراج کی بیوی کے بھائی کو جگایا اور اسے صرف اتنا بتایا کہ وہ اپنے کسی ضروری کام سے جا رہی ہیں، شام تک واپس آ جائیں گی۔ بہت ہوا تو کل دوپہر تک لوٹ آئیں گی۔

انہوں نے کوٹھی کے باہر سے رکشہ لیا اور سیدھا بادامی باغ پہنچ گئیں۔ یہاں سے بس میں سوار ہو کر انہوں نے گوجرانوالہ کا رخ کیا..... گوجرانوالہ سے آگے ویگن اور پھر..... تانگے کا سفر تھا۔ ان تمام مرحلوں سے وہ قریباً پانچ گھنٹے میں فارغ ہوئیں اس وقت دوپہر کا سورج ڈھلنا شروع ہوا تھا جب وہ رنگ والی میں ایک کھٹارا تانگے پر سے اتریں۔ رنگ والی اپنی روایتی آب و تاب سے دمک رہا تھا۔ چوہدریوں کی بلند و بالا حویلی دور ہی سے نظر آ جاتی تھی۔ قریبی دیہات سے آنے والے اور بھی بہت سے ضرورت مند حویلی تک جانے والے راستے پر آ جا رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو رنگ والی کی ہر دل عزیز چوہدرانی سے ملنے کے لیے کٹھن سفر کر کے یہاں پہنچی تھیں۔ آپو زاہدہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ ان اونچی شان والے چوہدریوں اور زمینداروں کی نگری میں اس کا غریب دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ چھوٹے بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر وہ چلی تو آئی تھی مگر اب ڈر بھی رہی تھی۔ وہ ٹوپی والے دیسی برقع میں لپٹی لپٹائی حویلی کے صدر دروازے تک پہنچی۔ پھر پہرے داروں کے سامنے سے گزر کر زنان خانے میں آئی اور اس قطار میں لگ گئی جہاں ضرورت مند کھڑے تھے۔ پتا چلا کہ تھوڑی دیر میں چھوٹی چوہدرانی آئے گی اور حسب معمول اپنے ہاتھ سے حاجت مندوں میں صدقہ خیرات تقسیم کرے گی۔ زاہدہ نے سوچ رکھا تھا کہ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر چھوٹی چوہدرانی کو اپنی صورت دکھائے گی اور اس سے درخواست کرے گی کہ وہ اسے علیحدہ میں بات کرنے کا موقع دیں۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد اندر ایک برآمدے میں چھوٹی چوہدرانی کی مختصر جھلک دکھائی دی۔ اس کے ساتھ ہی طویل قطار میں ہلچل محسوس ہونے لگی۔ چھوٹی چوہدرانی ملازم عورتوں کے

www.pdfbooksfree.pk

ساتھ اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئی تھی اور اب اسے قریباً ایک گھنٹہ یہیں پر رہنا تھا۔ زاہدہ نے دور ہی سے آنکھوں آنکھوں میں چھوٹی چوہدرانی کی بلائیں لیں۔ زرتار چادر میں لپٹی ہوئی وہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق دکھائی دیتی تھی۔ اس کے اردگرد جیسے محبتوں سے بنا ہوا ایک نورانی ہالہ سا تھا۔ حویلی کی رنگ برنگ دوپٹوں والی نوکرانیاں اس کے آس پاس چہکتی پھرتی تھیں۔ کوئی اس کا دامن سنبھالتی تھی، کوئی ادب سے اس کے کان میں سرگوشی کرتی تھی۔

اچانک زاہدہ چونک گئی۔ دو پہرے دار قطار کو گھورتے ہوئے زاہدہ کے قریب آ رہے تھے..... ''کہاں سے آئی ہو بی بی؟'' ایک پہرے دار نے ملائمت سے پوچھا۔

وہ چکرا گئی۔ ''تن..... نور پور سے۔'' اس کے ذہن میں بس یہی نام آیا۔

''نور پور؟ یہ کہاں ہے؟'' دوسرے پہرے دار نے دریافت کیا۔

''گوجرانوالہ!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''اکیلی ہو؟'' پہرے دار نے پوچھا۔

زاہدہ نے گھبرا کر اپنا سر اثبات میں ہلایا۔ پہرے دار کی آنکھوں میں شک نظر آیا۔ اس نے ایک ملازمہ صورت کو بلایا۔ ملازمہ عورت نے زاہدہ کا برقع اٹھا کر اس کی صورت وغیرہ دیکھنا چاہی۔ زاہدہ نے برقع کو دونوں ہاتھوں سے چہرے کے سامنے تھام لیا۔ پہرے داروں کو مزید تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ زاہدہ کو ملائمت مگر پختہ ارادے کے ساتھ قطار میں سے نکال کر لے گئے۔ زاہدہ کو پاس ہی واقع ایک نیچی چھت والے کمرے میں لے جایا گیا۔ ملازمہ عورت نے زاہدہ کی جامہ تلاشی لینا چاہی۔ اس کے بعد ان لوگوں کو یہ جاننے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ برقع میں درحقیقت کون ہے۔ زنان خانے کی ملازمائیں بڑی اچھی طرح آپو زاہدہ کو پہچانتی تھیں۔ یہ ملازمہ بھی جانتی تھی۔ وہ آپو زاہدہ کو اس حال میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ فوری طور پر چوہدری اعجاز کو موقع پر بلایا گیا۔ چوہدری اعجاز نے بھی پہلی نظر میں زاہدہ کو پہچان لیا۔ چوہدری کے چہرے پر حیرت کے ساتھ ساتھ غصے اور جھنجلاہٹ کے تاثرات بھی پھیلتے چلے گئے۔ انہوں نے دونوں پہرے داروں اور ملازمہ کو فوری طور پر رازداری کا پابند کر دیا اور زاہدہ کو بظاہر احترام کے ساتھ مردانے کے ایک کمرے میں لے گئے۔ بند کمرے میں چوہدری اعجاز نے زاہدہ کا برقع اتروا دیا۔ وہ باریک سے دوپٹے میں سمٹی سمٹائی کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی۔ چوہدری نے سرخ آنکھوں سے اسے سرتاپا گھورا اور قہر سے بولا۔ ''تو خیر سے اپنے بھائی کی جاسوس بن کر آئی ہو یہاں؟''

''نہیں چوہدری صاحب! میں نے اللہ کو جان دینی ہے۔ میں سچ کہتی ہوں۔ اس

وچارے کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ میں یہاں ہوں..... مم..... میرا کوئی برا ارادہ نہیں تھا چوہدری جی!''

''اس سے برا ارادہ اور کیا ہوگا کہ تُو چھپ چھپا کر یہاں گھسی ہے اور چھوٹی چوہدرانی تک پہنچنا چاہ رہی تھی۔ تجھے پتا ہے کہ اس طرح گھسنے والوں کو یہاں کیا سزا دی جاتی ہے؟''

آپو زاہدہ نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں نمانی تو بس چھوٹی چوہدرانی کو دیکھنے کے لیے آ گئی تھی..... میں نے تو.....''

''مجھے پتا ہے چھوٹی چوہدرانی سے ملنے کے لیے تم لوگوں کے دل کیسے تڑپ رہے ہیں۔'' چوہدری نے تیزی سے زاہدہ کی بات کاٹی۔ ''تم لوگ ہمیں برباد کر دو گے اور خود بھی ہو جاؤ گے۔''

''اللہ نہ کرے چوہدری جی!'' زاہدہ نے تڑپ کر کہا۔

چوہدری طیش میں بڑبڑاتا اور دروازے پر غصہ اُتارتا ہوا باہر نکل گیا۔ لگتا تھا کہ وہ زاہدہ کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتا ہے کہ مبادا وہ غم و غصے میں کوئی بہت سخت بات کہہ دے۔ ابھی چوہدری کو گئے دو چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ شانی کا ایک چچازاد بھائی طوفانی انداز میں اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر بیس بائیس سال رہی ہوگی۔ اس کے ساتھ ایک ملازم بھی تھا۔ ملازم کے ہاتھ میں ایک دیوہیکل کُتے کی زنجیر تھی۔ کتے کی خوفناک سرخ زبان اس کی ٹھوڑی پر لٹک رہی تھی۔ ایک تو کُتے کی شکل ویسے ہی ڈراؤنی تھی، دوسرے اس کے تھوبڑے اور گردن پر زخموں کے بہت سے نشان بھی تھے۔ غالباً یہ ان کتوں میں سے تھا جو ریچھوں کے ساتھ لڑائی میں استعمال ہوتے تھے۔

نوجوان چوہدری الگن نے زاہدہ کو دیکھا پھر سوالیہ نظروں سے ملازم کو دیکھ کر بولا۔ ''یہی وہ عورت ہے؟''

''ہاں جی۔''

چوہدری نے زاہدہ کو چوٹی سے پکڑا اور بری طرح جھنجوڑ کر بولا۔ ''کون ہے تُو..... کیا ارادہ تھا؟''

''مم..... میں..... میں.....''

''کیا بکرا کی طرح میں میں کر رہی ہے۔'' اس نے زاہدہ کو زور سے دھکا دیا۔ وہ گھوڑے کے ایک دھاتی نجسے سے ٹکراتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ ''چوری کے ارادے سے آئی تھی؟'' نوجوان چوہدری چنگھاڑا۔

www.pdfbooksfree.pk

اس سے پہلے کہ زاہدہ جواب میں کچھ کہتی، دیو ہیکل بلڈاگ نے زنجیر میں ذرا سی ڈھیل پا کر زاہدہ پر چڑھائی کی۔ اس کی آواز دل دہلا دینے والی تھی۔ زاہدہ کی قمیص کا پلو کتے کے جبڑے میں آیا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے میں قمیص کو پہلو سے تار تار کر دیا۔ زاہدہ چلائی اور کتے کو خود سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر اس کے جسم میں تو جنگلی شیر کی سی طاقت تھی۔ زاہدہ گر گئی۔ کتا اس کی گردن کی طرف آیا۔ زاہدہ نے اپنے ہاتھوں سے گردن کو ڈھانپا۔ کتے کے بدبودار نکیلے دانت زاہدہ کے ہاتھوں کی پشت سے ٹکرائے اور کھال کو زخمی کر گئے۔ کتے کے محافظ نے کتے کو کھینچنے کی ادھوری کوشش کی..... زاہدہ کے چلانے، کتے کے شور اور محافظ کے للکاروں سے چند سیکنڈ کے لیے جیسے قیامت برپا ہو گئی۔ اسی دوران میں چوہدری اعجاز تیر قدموں سے اندر داخل ہوا۔ ''اوئے کیا کرتے ہو..... کیا کرتے ہو؟ پیچھے ہٹو.....'' وہ گرجا۔

محافظ نے زور لگا کر کتے کو زاہدہ سے دور کھینچ لیا۔ نوجوان چوہدری افگن بھی ٹھٹک کر چوہدری اعجاز کو دیکھنے لگا۔ چوہدری اعجاز نے افگن کو زاہدہ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں کہنا اسے..... جو کہنا تھا میں نے خود کہہ لیا ہے۔ تم نے پوچھ تو لینا تھا مجھ سے!''

''لیکن یہ ہے کون؟'' چوہدری افگن نرم پڑتے ہوئے بولا۔

''بس ہے کوئی..... تم باہر جاؤ۔''

نوجوان چوہدری، ملازم اور کتے کے ساتھ باہر نکل گیا۔ چوہدری اعجاز نے دروازہ بند کیا۔ کچھ دیر تک زاہدہ کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ''تُو رستم کی بہن ہے۔ ورنہ اس طرح یہاں گھسنے پر تیرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''مجھے معاف کر دیں۔ میں تو.....''

''اب یہ میں میں چھوڑ۔ جس طرح آئی ہے، اسی طرح یہاں سے چلی جا۔ یہی ہمارے اور تمہارے حق میں بہتر ہے۔ رستم کو بھی یہی بات سمجھانے کی کوشش کر۔ جو کچھ ہوا وہ اسے بھول جائے اگر یہ معاملہ کنٹرول نہ ہوا تو بہت زیادہ خون خرابا ہو سکتا ہے۔''

''مگر میرا بھائی.....''

''بس چپ۔ اس بارے میں ایک لفظ نہیں کہنا۔'' چوہدری نے شہادت کی انگلی اٹھائی۔ ''رب کا شکر کر کہ میں یہاں تھا اور تُو بچ گئی ہے۔ بس اب نکل جا یہاں سے۔ میں تیرے لیے دوسری قمیص منگواتا ہوں۔ اسے پہن اور پھوٹ جا خوشی سے۔''

چوہدری نے نورے نامی ملازم کو آواز دی۔ نورا اندر داخل ہوا۔ اس مرتبہ دیو ہیکل کتا اس کے ساتھ نہیں تھا۔ چوہدری نے زاہدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نورے سے کہا۔ ''بی بی کو

عزت کے ساتھ گاؤں سے باہر چھوڑ آنا۔'' عزت کا لفظ چوہدری نے بہت چبا کر کہا تھا۔ اپنا فقرہ مکمل کرتے کرتے چوہدری دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ پھر واپس آیا۔ اس نے جلتی نظروں سے زاہدہ کو دیکھا اور انگلی اٹھا کر بولا۔ ''دیکھ..... اپنی عقل کو ہتھ مار۔ پولیس رستم کے ساتھ ساتھ تجھے اور تیرے بندے کو بھی کھوجتی پھر رہی ہے۔ اگر تُو کہیں پولیس کے ہتھے چڑھ گئی تو قیامت تک نہیں چھوٹ سکے گی۔ چپ کر کے لاہور پہنچ جا اور کہیں چھپ چھپا کے بیٹھ۔''

چوہدری اعجاز کے الفاظ میں طیش ہلکورے لے رہا تھا۔ اپنی بات ختم کر کے وہ پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ زاہدہ کے لیے قمیص والی بات وہ بھول ہی گیا تھا۔ اس نے نورے کو اس بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی۔

نورے نے رخت بچھے میں کہا۔ ''چلو بی بی!''

نورے کے تاثرات گواہ تھے کہ زاہدہ کے پاس باہر جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔

زاہدہ نے چادر و چار برقع اوڑھا اور نورے کے ساتھ حویلی کے احاطے میں نکل آئی۔ اس کی پھٹی ہوئی قمیص کا ایک حصہ برقع کے نیچے سے نکل کر زمین پر گھسٹ رہا تھا اور وہ بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ احاطے میں موجود لوگ پُرتجسس اور مضحکہ اڑانے والی نظروں سے اسے دیکھنے لگے..... ان دیکھنے والوں میں دو آنکھیں حویلی کے سب سے پرانے ملزم بابا خادم حسین کی بھی تھیں۔ پچھلے آدھ پون گھنٹے میں جو کچھ ہوا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے ہوا تھا۔ اس نے رستم کی بڑی بہن کو چوہدری اعجاز کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا تھا۔ خادم حسین کو سب کچھ معلوم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ زاہدہ پر کتا چڑھانے کا ڈراما بھی چوہدری نے خود ہی کیا تھا۔ اس نے پہلے افگن اور نورے کو کتے کے ساتھ اندر بھیجا تھا پھر زاہدہ کا ہمدرد بن کر اندر چلا گیا تھا۔

زاہدہ جب حویلی میں تھی تو بابا خادم حسین اسے بیٹیوں کی طرح سمجھنے لگا تھا۔ وہ بھی بابا کی بہت عزت کرتی تھی۔ خادم حسین حویلی کے ان دو چار افراد میں سے ایک تھا جو جانتے تھے کہ آپو زاہدہ اور اکرام دراصل رستم کے بہن اور بہنوئی ہیں۔ اب خادم حسین حویلی کی دوسری منزل پر کھڑا تھا۔ وہ چوہدری کی مکاری اور زاہدہ کی درگت دیکھ رہا تھا۔ ملازم نورے کے ساتھ حویلی سے باہر جاتی ہوئی زاہدہ بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ وہ مڑ مڑ کر حویلی کی طرف دیکھتی تھی۔ اس کے قدم غالباً رکنا چاہتے تھے مگر صورتِ حال کا جبر اُسے آگے کو دھکیل دیتا تھا۔ خادم حسین دیکھتا رہا۔ وہ اپنے پاؤں گھسیٹتی ہوئی رنگ والی کی بیرونی حدود تک پہنچ

www.pdfbooksfree.pk

گئی۔ نورا واپس آ گیا۔ وہ سُست انداز میں چلتی ہوئی تانگوں کے اڈے کی طرف جانے لگی۔ مرے کو مارے شاہ مدار کے مصداق یہاں زاہدہ کے ساتھ ایک اور زیادتی ہوئی۔ گاؤں کے آوارہ کتوں کی ایک ٹولی اس کے پیچھے لگ گئی۔ وہ خود کو کتوں سے بچاتی ہوئی کبھی کھیتوں میں کھس، کبھی راستے پر آئی۔ وہ مسلسل شور مچا رہے تھے اور زاہدہ کے پیچھے جا رہے تھے۔ ایک خدا ترس راہ گیر نے کتوں کو ڈرا دھمکا کر زاہدہ سے دور کیا۔ وہ تھک ہار کر ایک کنوئیں کے قریب بنی ہوئی منڈیر پر بیٹھ گئی۔ بلندی سے خادم کو سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

خادم حسین کے اندر کئی ہفتوں سے جو جنگ جاری تھی، وہ آج زاہدہ کی حالتِ زار دیکھ کر اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ خادم حسین کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ اب بھی چپ رہا تو اس کا کلیجا پھٹ جائے گا۔ اس نے چوہدری معصوم اور چوہدری اعجاز کی خاطر بہت برداشت کیا تھا مگر آج اس کی برداشت ختم ہو گئی تھی۔ اسے لگا جیسے اس کی محسنہ، اس کی مالکہ وڈی آپا اس کے سامنے کھڑی ہیں۔ ایک باوقار چوہدرانی کا مکمل روپ! وہ کہہ رہی ہیں..... خادم حسین! کیا آج بھی چپ رہو گے؟ کیا آج بھی اپنے بند ہونٹوں کا تالا نہیں کھولو گے؟

وہ بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سیڑھیاں اترا، احاطے سے گزرا اور اس کنوئیں کی طرف چل دیا جہاں ایک نامراد بہن اپنے بھائی کے لیے کچھ کر گزرنے کی خواہش لیے ایک درخت تلے بیٹھی تھی۔

خادم حسین اس کے پاس پہنچا تو وہ اس کی صورت دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔ وہاں ارد گرد کوئی نہیں تھا۔ ایک سنسناتی دوپہر نے ہر طرف سکوت طاری کر رکھا تھا۔ وہ سسک اٹھی۔

''بابا! یہ دیکھو ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

''میں نے سب دیکھا ہے وڈی رانی..... میں سب دیکھ رہا ہوں۔'' خادم حسین نے گلو گلیر آواز میں کہا اور بے ساختہ زاہدہ کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ زاہدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر اس کے چہرے پر خوف نہیں تھا۔ آخر وہ رستم کی بہن تھی۔ وہ اتنی جلدی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''بابا! میرا بھائی رستم دکھی ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں..... وہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ شاید..... تمہیں تھوڑا بہت پتا ہی ہو۔ وہ اور چھوٹی چوہدرانی..... میرا مطلب ہے چھوٹی چوہدرانی اور وہ.....'' زاہدہ ہکلا کر رہ گئی۔

بابا خادم حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے کچھ بتانے کی لوڑ نہیں بیٹی! میں اس بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں..... اور بہت کچھ ایسا بھی ہے جو میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا..... کوئی نہیں جانتا۔'' خادم کی آواز بھرا گئی۔

''بابا خادم حسین! اگر میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو کرو۔ میں ایک بار..... صرف ایک بار چھوٹی چوہدرانی سے ملنا چاہتی ہوں۔ ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے پتا ہے بٹی! تُو نے اس سے کیا کہنا ہے۔ تُو ایسا کر..... تُو یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔ تُو اسی طرح واپس چلی جا..... بالکل بے فکر ہو کر بالکل سکون کے ساتھ۔ تیری جگہ اب میں شانی بی بی سے بات کروں گا۔ میں اسے بتاؤں گا سب کچھ..... میں اس کی آنکھیں کھولوں گا اور اسے یہ سب کچھ بھی بتاؤں گا جو ابھی تیرے ساتھ ہوا ہے۔ اب میں اور چپ نہیں رہوں گا، چاہے اس کے بدلے میری جان ہی چلی جائے۔'' خادم حسین کی بوڑھی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو گرنے لگے۔

ان گھنے درختوں تلے بابا خادم حسین اور زاہدہ کے درمیان بس آٹھ دس منٹ ہی بات ہوئی۔ یہ بڑی جذباتی گفتگو تھی۔ اس گفتگو میں خادم حسین نے زاہدہ کو بتا دیا کہ وہ ان ساری غلط فہمیوں سے باخبر ہے جو جان بوجھ کر رستم اور شانی بی بی کے درمیان پیدا کی جا رہی ہیں۔ وہ اب تک خاموش رہا ہے لیکن اب اس خاموشی کا ازالہ کرے گا۔ خادم حسین نے بڑی دانائی سے زاہدہ کو واپس لاہور جانے کے لیے نہ صرف آمادہ کر لیا بلکہ اس کے لیے تانگے کا انتظام بھی کر دیا۔

☆======☆======☆

زاہدہ کی واپسی کے قریباً دو گھنٹے بعد خادم حسین ایک بند کمرے میں شانی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سفید مائل داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ وہ عجیب انداز سے اپنی چھوٹی بی بی کی طرف دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو بابا؟'' شانی نے پوچھا۔

''تُو کتنی جلدی بڑی ہو گئی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی کل کی بات ہے جب میں تجھے گود میں اٹھائے اس حویلی کے برانڈوں میں گھوما کرتا تھا۔''

''بابا! کیا آج کوئی خاص بات ہوئی ہے..... بہت دکھی نظر آ رہے ہو؟''

''ہاں شانی بی بی! آج بہت خاص بات ہوئی ہے۔ آج میں نے ایک بہن کو اپنے بھائی کے لیے اس طرح تڑپتے دیکھا ہے کہ میرا کلیجا پھٹ گیا ہے۔ آج میں نے بھی اپنے اندر کے ڈر اور مجبوری کو مار دیا ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو بابا؟''

خادم حسین نے محتاط نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور دھیمی آواز سے بولا۔ ''میں یہ

www.pdfbooksfree.pk

کہنا چاہتا ہوں چھوٹی بی بی..... کہ آپ کے آلے دوالے سازش ہو رہی ہے۔ آپ سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ آپ کو دھوکے میں رکھا جا رہا ہے۔''

''کون کر رہا ہے ایسا؟''

''چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے بی بی..... لیکن کہہ وہی رہا ہوں جو حق ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ آپ کو یہ سب کچھ بتانے کے بعد زندہ بھی رہوں گا یا نہیں لیکن اب میں اور چپ نہیں رہ سکتا۔''

''پہیلیاں نہ بجھواؤ بابا! تم کس کی بات کر رہے ہو؟'' شانی نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

''میں آپ کے خالو اعجاز کی بات کر رہا ہوں بی بی! وہ آپ سے..... اور چوہدری معصوم سے بھی بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ وہ..... دھوکا دے رہے ہیں۔''

اچانک ہی جیسے ایک بڑا شیشہ چھناکے سے شانی کے سر پر ٹوٹ گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو بابا؟''

''سچ کڑوا ہے بی بی! لیکن یہی سچ ہے۔'' خادم حسین بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میرے دل پر اس معاملے کا بڑا بوجھ ہے بی بی! کیونکہ میں خود بھی اس گناہ میں شریک رہا ہوں۔ پتا نہیں قیامت کے دن اپنی مالکن کو کیا منہ دکھاؤں گا۔''

''بابا! مجھے اس طرح بتاؤ کہ میں کچھ سمجھ سکوں۔'' شانی کراہی۔

خادم حسین نے گہری سانس لی۔ ''چھوٹی بی بی! چوہدری اعجاز آپ کو رستم سیال سے دور رکھنے کی ہر جائز و ناجائز کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اب ہر حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ لاہور سے آپ کو جان بوجھ کر اچانک یہاں لایا گیا تھا۔ لاہور سے آنے کے بعد آپ رستم کے لیے جتنے پیغام میرے ذریعے پہنچاتی رہی ہیں، ان میں سے کوئی بھی رستم تک نہیں پہنچا۔ یہ پیغام پہنچائے بغیر ہی میں اپنا کالا منہ لے کر آپ کے پاس آتا رہا ہوں اور جھوٹ بکتا رہا ہوں۔''

شانی کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ خادم حسین بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو یہ بھی پتا نہیں ہوگا کہ میں صرف آپ کا سامان واپس لانے کے لیے ہی لاہور گیا تھا اور مجھے بھیجنے والے چوہدری اعجاز تھے۔ اسی طرح آپ کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ حویلی کا ٹیلی فون ہر وقت خراب کیوں رہتا ہے۔ یہ بھی آپ کو رستم سے دور رکھنے کے لیے ہے۔ جب چوہدری اعجاز کی مرضی ہوتی ہے، فون ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' شانی سناٹے کے عالم میں سن رہی تھی۔ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔

خادم حسین نے اپنے صافے سے آنسو پونچھے اور بولا۔ ''رستم سے چوہدری اعجاز کا

www.pdfbooksfree.pk

رویہ بہت کرخت رہا ہے۔ ایک دو باتیں تو میں نے خود اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ شروع میں رستم برداشت کرتا رہا مگر پھر اس کے بس میں نہ رہا اور وزیری گاؤں میں تھپڑ والا واقعہ ہو گیا۔''

''مگر بابا! کچھ بھی ہے، اس واقعے کے بعد رستم کو معذرت تو کرنی چاہیے تھی یا کم از کم وہ.....''

''آپ کو کچھ پتا نہیں چھوٹی بی بی..... یہاں کیا ہو رہا ہے۔'' خادم حسین نے تیزی سے شانی کی بات کاٹی۔ ''آپ کو کچھ پتا نہیں۔ آپ سنیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔'' خادم کی آواز میں کرب تھا۔

''مجھے بتاؤ بابا! مم..... مجھے خود بھی لگ رہا ہے کہ میرے اردگرد کچھ ہو رہا ہے۔''

خادم حسین نے ایک بار پھر احتیاط سے دائیں بائیں دیکھا پھر اپنی آواز کو مزید پست کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ سے غلط نہیں بولا کہ رستم کی دشمنی میں چوہدری اعجاز ہر حد سے گزرے ہوئے ہیں۔ آپ کو ان میاں بیوی کا پتا ہے ناں جو مہمان خانے میں اعجاز صاحب کے مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں؟'' شانی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آپ جانتی ہیں، وہ کون ہیں؟'' اس بار شانی نے نفی میں جواب دیا۔ خادم حسین بولا۔ ''آپ نے انہیں دیکھا ہوا ہے مگر آپ بھول گئی ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آپ وزیری گاؤں میں چوہدری شہاب کے بیٹے کی شادی پر گئی تھیں۔ وہاں تھیٹر لگایا گیا تھا اور کچھ ایکٹر نقلیں اتار کر لوگوں کو ہنسا رہے تھے۔''

''ہاں..... وہ ورائٹی شو تھا۔ لاہور سے اداکار آئے ہوئے تھے۔''

''یہ میاں بیوی ان ایکٹروں میں سے ہی ہیں۔ یہ آوازوں کی نقلیں اتارنے میں ماہر ہیں۔ عورت کا نام نائلہ ہے۔ کچھ ہفتے پہلے اعجاز صاحب نے نائلہ کو آپ کی آواز کی کیسٹ دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ آپ کی آواز بنانے کی مشق کرے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اعجاز صاحب نے اس کام کے لیے نائلہ اور اس کے بندے کو بہت سا روپیہ بھی دیا ہے۔'' خادم حسین کی آواز لرز رہی تھی۔

شانی کی آنکھیں حیرت سے کچھ اور کھل گئیں۔ وہ غیر یقینی نظروں سے خادم حسین کو دیکھتی رہی۔ ''بابا! تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' اس نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

''میں آپ کو سنی سنائی باتیں نہیں بتا رہا۔ وہی کچھ بتا رہا ہوں جو میں نے خود دیکھا اور سنا ہے۔ مجھے بہت اچھی طرح پتا ہے کہ وہ نائلہ نام کی عورت آپ کی جگہ رستم اور اس کے دوستوں سے بات کرتی رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ چوہدری اعجاز والے واقعے کے بعد بھی رستم نے معافی مانگنے کے لیے آپ کو فون کیا ہو۔ مگر اس کا جواب اس عورت نے اس طرح دیا

ہوگا کہ رستم کو پھر بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی ہوگی۔ ایک مرتبہ میں اسے خود بھی فون کرتے سن چکا ہوں۔ وہ رستم کے کسی دوست سے بڑی بدتمیزی کے ساتھ بول رہی تھی۔ اس کی آواز آپ سے اتنی ملتی تھی کہ آپ خود بھی سنتیں تو حیران رہ جاتیں۔ ایسے لگتا تھا کہ..... بس آپ ہی بول رہی ہیں۔''

شانی پتھر کی طرح ساکت بیٹھی رہی۔ اس میں جیسے بولنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔ جو کچھ خادم حسین بتا رہا تھا، وہ ناقابل یقین تھا مگر شانی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ایک دم شانی کی آنکھوں میں بہت سے آنسو جمع ہو گئے..... تو کیا اسی لیے رستم ایک دم لاتعلق ہو گیا تھا..... اس قدر بے حس بن گیا تھا؟

خادم حسین نے صافے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''رستم کی بہن نے بتایا ہے کہ وہ بہت دکھی ہے، اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔ وہ اپنے آپ سے بھی بالکل بے پرواہ ہو گیا ہے جیسے مرنے کے لیے موقع ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ یہ اوپر نیچے جو واردا تیں ہو رہی ہیں، ان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ مرنے مارنے پر آ گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اگلے چند دن میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

شانی نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے خادم حسین سے پوچھا۔ ''آپ زاہدہ آپ کو کہاں ملی تھیں؟''

خادم حسین کچھ بھی نہ چھپانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے شانی کو مختصراً الفاظ میں وہ سب کچھ بتا دیا جو تقریباً ڈھائی گھنٹے پہلے حویلی کے احاطے میں رستم کی بڑی بہن کے ساتھ ہوا تھا۔

شانی پوری جان سے تڑپ گئی۔ سارے حالات کی ایک دھندلی سی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی تھی۔ اس تصویر میں خالو اعجاز کا چہرہ یوں ابھر کر سامنے آیا تھا کہ شانی سکتہ زدہ رہ گئی تھی۔ خالو اعجاز کے حوالے سے کچھ معاملات اسے پہلے بھی الجھاتے رہے تھے۔ اسے لگتا تھا کہ خالو اعجاز میں بڑی تیزی سے کچھ تبدیلیاں آئی ہیں..... مگر اب تو صورتِ حال کا ایک بالکل نیا رخ سامنے آ گیا تھا۔ اس کا دل سینے میں پھڑ پھڑانے لگا۔ کسی کی جدائی اتنی شدت سے محسوس ہوئی کہ اس کے جسم کی کومل رگیں ٹوٹنے لگیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر تک اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے پھر وہ راہداری کے اس حصے کی طرف بڑھی جہاں خالو اعجاز کے کمرے کے سامنے ٹیلی فون سیٹ پڑا رہتا تھا۔

ان دنوں لائن ٹھیک تھی۔ اتفاقاً خالو اعجاز بھی گھر میں نہیں تھے۔ شانی نے چڑھی

سانسوں اور کانپتی انگلیوں کے ساتھ لاہور میں رستم اور ناصر کی قیام گاہ کا نمبر ملانا شروع کیا۔ بہت دیر تک بیل ہوتی رہی..... پھر اسے خانساماں ظفر احمد کی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

''کون؟''

''رستم صاحب کہاں ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟'' خانساماں ظفر، شانی کی آواز پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔

''میں..... ان کی عزیز ہوں۔ ان سے بات کرا دیں۔''

''لیکن رستم صاحب تو یہاں سے جا چکے ہیں۔''

''کہاں؟''

''کچھ پتا نہیں ہے جی۔ کئی دن ہو گئے ہیں۔''

''اور ان کے دوست وغیرہ؟''

''وہ بھی سب چلے گئے ہیں بلکہ میں بھی تھوڑی دیر میں جا رہا ہوں۔ مگر..... آپ ان کی کیا لگتی ہیں؟'' آخر میں شاید ظفر کو احساس ہوا تھا کہ وہ کچھ زیادہ بول رہا ہے۔

اسی دوران میں شانی کو خالو اعجاز کی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ وہ کسی ملازم سے باتیں کرتے ہوئے اسی طرف آ رہے تھے۔ شانی نے فون بند کر دیا اور اپنے کمرے میں آ کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ظفر احمد نے بتایا تھا کہ رستم اور اس کے ساتھی لاہور والی کوٹھی سے جا چکے ہیں۔ غالباً وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مگر وہاں سے کم از کم یہ تو پتا چل سکتا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ شانی نے فیصلہ کیا کہ وہ لاہور جائے گی..... ابھی اور اسی وقت! وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆=======☆=======☆

ڈپٹی ریاض ہٹلر نے فون پر اپنے گمشدہ بھتیجے سب انسپکٹر طفیل کا رونا چلانا سنا تھا اور وہ آتش فشاں کی طرح کھول گیا تھا۔ یہ شک تو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا کہ یہ کہیں رستم اور لالے کے کسی ساتھی کا کام نہ ہو مگر یہ بات اس کے گمان میں نہیں تھی کہ رستم، حیات ہے اور وہی طفیل کو اچک کر لے گیا ہے۔

کرم ایجنسی کے قبائلی علاقے میں اپنا کام جہاں کا تہاں چھوڑ کر وہ آندھی کی طرح لاہور پہنچ گیا۔ حالانکہ یہ اس کے لیے بڑا اہم ٹاسک تھا۔ ایس پی کی پوسٹ کے لیے ریاض کی ترقی وڈے ڈیرے والے واقعے کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ یہ قبائلی علاقے والا کیس اس ترقی کی رکاوٹ دور کر سکتا تھا یہ کام ادھورا چھوڑ کر اسے لاہور آنا پڑ گیا تھا۔ اب وہ ڈیفنس کی ایک

www.pdfbooksfree.pk

کوٹھی میں تھا۔ وسیع ڈرائنگ روم میں اپنے ہاتھ کمر پر باندھے وہ کسی زخمی درندے کی طرح چکرا رہا تھا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس بائیس سال ہو گی۔ وہ بے حد مختصر لباس میں تھی۔ دو بالشت کپڑا تھا جس نے اسے چھپانے کے بجائے مزید نمایاں کر دیا تھا۔ وہ شکل سے ہی طوائف زادی دکھائی دیتی تھی۔ میڈم ڈی اپنے محسن ریاض ہٹلر کے پاس ایسے تحفے ارسال کرتی رہتی تھی۔ آج کل اس طرح کے دو تحفے اس کوٹھی کی بالائی منزل پر موجود تھے۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک پرات تھی اور نیم گرم پانی سے بھرا ہوا ایک بڑا جگ تھا۔ وہ بڑی ادا سے ریاض ہٹلر کے قدموں میں بیٹھ گئی۔ اس کے بوٹ اتارے۔ بدبودار جرابیں اتاریں۔ اس کے پاؤں پرات میں رکھے اور انہیں نکور کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ڈپٹی ریاض سگریٹ پھونک رہا تھا اور لڑکی کے لمس بلکہ اس کی موجودگی سے بھی بے خبر نظر آتا تھا پھر جیسے اچانک اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا۔ اس نے لڑکی کے پہلو پر ہلکی سی لات رسید کر کے اسے دور ہٹا دیا۔ نیم گرم پانی چھلک گیا اور نوخیز طوائف حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ پھنکارا۔ ''چل دفع ہو جا یہاں سے۔''

وہ مشینی انداز میں اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

''کہاں چل پڑی ہے چھمک چھلو! پوری بات تو سن۔'' وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ''میں نے اوپر جانے کو نہیں کہا۔'' ڈپٹی دہاڑا۔ ''اس کوٹھی سے چلی جا۔ تو بھی اور وہ دوسری ناچی بھی۔ اپنا سامان سمیٹ لو اور ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی شکلیں گم کرو۔''

''ک۔ک..... کوئی غلطی ہوئی ہے..... جی۔'' وہ زرد ہو کر ہکلائی۔

''نہیں ہوئی غلطی۔ بس جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ تمہاری کوئی نشانی نظر نہیں آنی چاہیے اوپر کی منزل پر۔ خوب اچھی طرح دیکھ لو۔ کوئی شے رہ گئی تو برا حشر کروں گا۔''

''ٹھ..... ٹھیک..... ہے..... جی۔''

''میڈم کو فون کرو۔ اسے کہو، گاڑی دے کر کسی کو بھیجے جو تمہیں لے جائے۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ واپس مڑی۔

''اور اپنی اس ماں کو بھی لے جا یہاں سے۔'' ڈپٹی نے طیش میں پرات کی طرف اشارہ کیا۔

نوخیز طوائف گھبرا کر آگے آئی۔ پرات اٹھائی اور باہر نکل گئی۔

اس دوران میں کال بیل ہوئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا۔ کچھ دیر بعد اجرالی برادری کا

ایک سردار اندر داخل ہوا۔ اس کا قد ساڑھے چھ فٹ سے کم نہیں تھا۔ کانوں میں ہیرے کی بالیاں تھیں۔ وہ بڑا دبنگ شخص نظر آتا تھا۔ ریاض اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

''خیریت تو ہے مینڈے بھائی؟'' اس نے صوفہ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے۔'' ریاض پھنکارا۔ ''وہ ٹکنے کا بی رستم واقعی زندہ ہے۔ اس حرامی کا فون آیا۔ طفیل بھی اس کے پاس ہے۔ وہ اور اس کے یار تشدد کر رہے ہیں طفیل پر۔''

''یہ تو بڑی بُری ہے ناں تُرتھلی۔'' ڈپٹی سر سراتے لہجے میں بولا۔ ''اس کنجر کے پُتر نے طفیل کو جان سے مارنے کی دھمکی دی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اعلان کیا ہے کہ وہ وڈے ڈیرے پر مرنے والوں کا بدلہ لے گا۔''

''تو پھر آ جائے سامنے۔ بدلے تو اساں نے بھی بڑے لینے ہیں۔ اور سب سے بڑا بدلہ ہے وڈے ڈیرے کی لڑائی میں سردار غلام کبیر کی موت کا۔'' اجرالی سردار تہور خان پھنکارا۔

''صرف باتیں بنانے سے کام نہیں چلے گا تہور خان۔ میرے خون میں بھانبڑ مچا ہوا ہے۔ میں اس کی ماری ہوئی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتا ہوں۔ کچھ ایسا سوچو کہ اس کی ٹانگوں کے بیچ آگ لگ جائے اور یہ آگ لگی رہے..... اس کی اگلی دو تین نسلوں تک۔''

''تو کیا ہے تمہارے دماغ میں؟''

''کچھ نہیں یار! کچھ نہیں۔'' ڈپٹی دہاڑا۔ ''کیا سب کچھ سوچنے کو میرا دماغ ہی رہ گیا ہے۔ تم سب کے کھوپڑوں میں بھی تو کچھ نہ کچھ رکھا ہو گا۔''

اجرالی سردار کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔

ڈپٹی ریاض اٹھ کر کمرے میں چکرانے لگا پھر جیسے اسے ایک دم خیال آیا۔ اس نے موبائل پر اپنی رہائش گاہ کا نمبر ملایا۔ وہاں اس کی بیوی، سالی اور پندرہ سالہ لڑکا رہتے تھے۔ رستم زندہ تھا اور اس موقع پر ڈپٹی کسی طرح کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بیوی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ ابھی دو ڈھائی گھنٹے میں ڈرائیور کو بھیجے گا، وہ اس کے ساتھ یہاں ڈیفنس میں چلی آئے۔ ڈپٹی ریاض کو امید تھی کہ تب تک دونوں طوائف زادیاں یہاں سے جا چکی ہوں گی۔

ریاض نے فون بند کیا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ رنگ والی میں ڈپٹی ریاض کا ایک مخبر تھا۔ وہ وہاں موٹر مکینکی کرتا تھا۔ مخبر کی آواز ہانپی ہوئی تھی۔ وہ بغیر تمہید کے بولا۔ ''سر

www.pdfbooksfree.pk

جی! نیاز بول رہا ہوں۔ لگتا ہے جی ستارے ہمارے حق میں ہیں۔ کل آپ نے فون کیا تھا، آج آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

''کچھ کہے گا بھی یا مجرا سنا تا رہے گا۔''

''سر جی! میری اطلاع کے مطابق رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک کالے برقع میں حویلی سے نکلی ہے۔ اس کے ساتھ سکینہ نام کی ایک لڑکی بھی ہے۔ دونوں تانگے کے اڈے کی طرف جا رہی ہیں۔''

ریاض کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''تم نے پوتل تو نہیں لگائی؟ چھوٹی چوہدرانی تو اپنی ماں کی بغل میں گھس کر بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ اپنے پالتو کتوں کے بغیر کیسے نکل آئی حویلی سے؟ تجھے غلطی لگی ہوگی۔''

''نہیں سر! ایک دم کنفرم اطلاع ہے۔'' وہ یقین سے بولا۔

''تم کہاں ہو؟''

''میں موٹر سائیکل پر ہوں۔ ان دونوں سے میرا کافی فاصلہ ہے مگر وہ پوری طرح میری نظر میں ہیں۔''

''دیکھ اگر اس بار اطلاع غلط ہوئی ناں تو میں نے ''نیچے'' سے کاٹ ڈالنا ہے تجھ کو۔ بیوی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

''نہیں سر! غلطی کا چانس نہیں ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ ان کے پیچھے رہ۔ مجھے خبر دیتا جا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ اگر برقع میں واقعی شانی ہے تو پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا رخ لاہور کو ہو۔ اگر لاہور کو ہے تو پھر وہ حرامزادی اپنے منہ بولے خصم سے ملنے جا رہی ہوگی۔'' ریاض کے لہجے میں جوشیلی لرزش تھی۔

''او کے سر!''

''تیرے موبائل کی بیٹری وغیرہ سیٹ ہے ناں؟ ہمارا رابطہ ٹوٹنا نہیں چاہیے۔''

''مولا کریم نے چاہا تو نہیں ٹوٹے گا جی۔'' انفارمر نیاز کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی سوٹر سائیکل کی گڑگڑاہٹ ابھری۔

ڈپٹی ریاض کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر موبائل پر گوجرانوالہ کے ایک تھانے میں رابطہ قائم کیا۔ یہاں کا سب انسپکٹر تاج طارق، ڈپٹی کے معتمد ساتھیوں میں سے تھا۔ تاج طارق سے رابطہ ہوتے ہی ڈپٹی نے کہا۔ ''طارق! چھوٹی چوہدرانی چوری

چھپے حویلی سے نکلی ہے۔ اس کا کوئی بڑا خاص ارادہ ہے۔ تم سادہ کپڑوں میں پرائیویٹ کار پر نکلو اور فوراً رنگ والی کی طرف چل پڑو۔ نیاز سے رابطہ رکھو، وہ چوہدرانی کے پیچھے ہے۔ میں بھی لاہور سے نکل رہا ہوں۔ چھوٹی چوہدرانی کو کسی بھی صورت نظروں سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں دیکھنا ہے وہ کہاں جاتی ہے۔''

''وہ اکیلی ہے؟'' طارق نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، ایک لڑکی بھی ساتھ ہے۔ وہ اس وقت رنگ والی سے نکل کر تانگوں کے اڈے کی طرف جا رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے پہنچنے تک وہ کسی بس وغیرہ پر چڑھ جائیں۔ نیاز الرٹ ہے۔ وہ تمہیں خبر دیتا رہے گا۔ تم بس فوراً نکلو۔ دو تین ہوشیار بندے بھی ساتھ لے لو لیکن کسی کو وردی میں نہیں ہونا چاہیے۔''

سر۔ ''آپ بے فکر رہیں جی۔''

ریاض نے رابطہ منقطع کیا اور ہولسٹر میں 38 بور کا سرکاری پسٹل لگاتا ہوا سردار تہور سے بولا۔ ''یہ سنہری موقع ہے۔ آج اس کتیا کو چھوڑوں گا نہیں۔ کسی صورت نہیں۔''

کچھ دیر بعد ریاض اپنی نیلی ڈاٹسن کار پر تیز رفتاری سے نکلا اور لاہور کے مضافات کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا رخ گوجرانوالہ کی جانب تھا۔ اجرالی سردار تہور خان بھی اس کے ساتھ تھا۔ ابھی وہ راوی کا پل پار کر ہی رہے تھے کہ انفارمر نیاز کی طرف سے کال آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''سر! دونوں حافظ آباد سے آنے والی ایک لاری میں بیٹھ گئی ہیں..... لاری گوجرانوالہ جا رہی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہارا یہ اندازہ درست ہے کہ وہ لاہور آ رہی ہیں؟''

''بالکل جی۔ ایسا ہی لگ رہا ہے۔ آپ ابھی لاہور میں ہی ٹھہریں تو بہتر ہے۔ سب انسپکٹر تاج طارق صاحب بھی پہنچ گئے ہیں۔ ان کی سفید گاڑی میرے آگے آگے جا رہی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ہم ان دونوں کو غائب نہیں ہونے دیں گے۔''

''ٹھیک ہے، میں لاہور سے باہر نکل کر جی ٹی روڈ پر ہی رکتا ہوں۔'' ڈپٹی ریاض نے کہا۔

ریاض کی بے چینی عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد شانی کا زرد چہرہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ قدرت اللہ کی دردناک موت اور طفیل کے اغوا کے ساتھ ہی وہ ساری انڈر اسٹینڈنگ ختم ہو چکی تھی جو ریاض اور رنگ والی کے چوہدریوں کے درمیان حاجی حیات نے کروائی تھی۔ اب ریاض خود کو ہر طرح سے آزاد سمجھ رہا تھا۔ وہ سانپ تھا اور اس کی

www.pdfbooksfree.pk

تھیلیوں کے اندر بہت ساز ہر جمع ہو چکا تھا۔ اب اسے کسی کو کاٹنا تھا اور بہت شدت سے کاٹنا تھا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ریاض کو فون پر وہ اطلاع موصول ہوگئی جس کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ سب انسپکٹر طارق نے اسے بتایا کہ برقع پوش شانی اور اس کی ساتھی لڑکی لاہور آنے والی بس پر سوار ہو چکی ہیں۔ یہ سلطان ٹرانسپورٹ کمپنی کی بس تھی۔ طارق نے بس کا نمبر وغیرہ بھی ریاض کو نوٹ کرا دیا۔

اجرالی سردار نے کہا۔ ”ریاض بھائی! معاملہ صاف ہے۔ چھوٹی چوہدرانی اپنے یار سے ملنے کے لیے آ رہی ہے۔ اب ان دونوں کو پہنچانیں چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ہیڈ کوارٹر میں اطلاع دے دو اور نفری کو ریڈی کرا دو۔“

”نفری کو ریڈی ہی سمجھو۔ بس ایک کال کی ضرورت پڑے گی۔“ ریاض نے کہا۔

”بڑا پکا کام ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ وہ حرامی اکیلا نہیں ہوگا۔ اس کے چار چھ ساتھی بھی ضرور ہوں گے۔“

”چار چھ ہوں یا چالیس پچاس..... اب ان میں سے کوئی بچے گا نہیں۔“ ریاض ہٹلر کے لہجے میں زہر کی سی کاٹ تھی۔

”رستم کو بھی پار کرنا ہے؟“ تہور خان نے پوچھا۔

”جی تو نہیں چاہتا اس کتے کے تخم کو اتنی آسان موت دی جائے، پر مجبوری ہے۔ اس مرتبہ میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔“

ریاض اور تہور خان نے قریباً ایک گھنٹہ مزید انتظار کی سُولی پر گزارا..... پھر شانی اور اس کی سہیلی کو لانے والی بس موقع پر پہنچ گئی۔ سب انسپکٹر طارق کی سفید کار اس کے تعاقب میں تھی۔ طارق نے بتایا کہ اس نے مخبر نیاز کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا ہے۔ اس نے موٹر سائیکل چھوڑ دی ہے۔

”اچھا کیا ہے۔“ ڈپٹی ریاض نے کہا۔ ”بس ہوشیاری سے پیچھا جاری رکھو..... میں بھی تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔“

”ایک دو اہلکار موٹر سائیکل والے بھی ہو جائیں تو بہتر ہے۔“ طارق بولا۔

”بے فکر رہو۔ میں نے انتظام کر لیا ہے۔ ایک گاڑی بھی اور آ رہی ہے۔“ ڈپٹی ریاض نے کہا پھر اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ سے وہسکی کا ادھا نکالا اور غٹا غٹ آدھی بوتل خالی کر گیا۔ سانپ کے پھن ہی کی طرح اس کی گردن اور جبڑوں سے نیچے کا گوشت پھولا ہوا تھا۔

گیڈ سے آلودہ آنکھوں میں قاتل سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆=======☆=======☆

شانی اور سکینہ بادامی باغ کے اڈے پر بس سے اتریں اور ایک ٹیکسی والے سے کرایہ طے کر کے اقبال ٹاؤن کی طرف روانہ ہوگئیں۔ اگر رستم اور اجمل وغیرہ اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں نہیں تھے تو بھی وہاں سے ان کا پتا ٹھکانا تو معلوم ہو سکتا تھا۔

جوں جوں رستم سے شانی کا فاصلہ کم ہو رہا تھا اس کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی، وہ بہت خفا ہوگا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی تو اس کی ناراضگی برقرار نہیں رہ سکے گی۔ وہ اسے منا لے گی۔ اسے اپنی محبت کی بے پناہ طاقت پر بھروسہ تھا۔

اچانک وہ کچھ چونک گئی۔ اس کی نظر عقب نما آئینے پر پڑی تھی اور اسے پھر وہی سفید کار دکھائی دی تھی جسے وہ پہلے بھی دو تین بار دیکھ چکی تھی۔ پہلی مرتبہ اس کار پر شانی کی نگاہ تب پڑی تھی جب وہ تانگے سے اُتر کر لاری پر سوار ہو رہی تھیں۔ دوسری بار شاید گوجرانوالہ کے پُر ہجوم بس اڈے پر شانی نے اس کار کو دیکھا تھا..... اور اب پھر.....!

”کیا بات ہے شانی؟“ سکینہ نے شانی کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ دونوں ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔

”بس شک سا پڑ رہا ہے۔ لگتا ہے ایک کار ہمارے پیچھے ہے۔“ شانی نے بھی جوابی سرگوشی کی۔

”ہائے اللہ..... کیوں ڈرا رہی ہو۔“

”نہیں سکینہ! کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ سامنے شیشے میں دیکھو، تمہیں سفید کار نظر آئے گی۔“

سکینہ نے چادر کے گھونگھٹ میں سے قریباً ایک منٹ تک عقب نما آئینے کو گھورا پھر بولی۔ ”کار تو نظر آئی ہے مگر.....“

”یہ بہت دیر سے پیچھے ہے۔“ شانی کی آواز میں لرزش تھی۔

”ہائے میں مر گئی۔ کہیں یہ..... میرا مطلب ہے کہیں یہ قدرت اللہ کے بندے تو نہیں؟“

”کیا کہا جا سکتا ہے۔“ شانی نے کہا پھر ذرا توقف کے ساتھ ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”بھائی صاحب! اگلی سڑک سے دائیں طرف لے لینا۔ یہاں مارکیٹ کے پاس بس دو منٹ کے لیے رکنا ہے۔“

www.pdfbooksfree.pk

جواں سال ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی بغلی سڑک سے دائیں طرف موڑ دی۔ شانی بیک مرر میں دیکھتی رہی۔ چند سیکنڈ بعد اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ سفید گاڑی بھی اسی تنگ سڑک پر مرگئی تھی۔ اب شبہے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ خوف کے پہلے حملے کے بعد شانی کے اندر کی دلیر لڑکی نے اسے حوصلہ دیا۔ ڈرائیور نے گاڑی مارکیٹ کے سامنے روک دی۔ یہ ایک درمیانے رقبے کی مارکیٹ تھی۔ شانی شاید پہلے بھی ایک دفعہ یہاں آئی تھی۔ سفید گاڑی ان سے کافی فاصلے پر ہی رک گئی تھی۔ اس میں دو سے زیادہ افراد بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ ایک موٹر سائیکل سوار ان کے بالکل پاس سے ہوتا ہوا اور انہیں گھورتا ہوا گزر گیا۔ اَن دیکھے خطرے کا احساس شانی کے اندر شدید تر ہو گیا۔

''کیا بات ہے بی بی جی! آپ نے یہاں سے کچھ خریدنا ہے؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

ایک دم شانی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے سو سو کے تین نوٹ ڈرائیور کی طرف پھینکے، یہ طے شدہ کرائے سے پچاس روپے زیادہ تھے۔ اس کے ساتھ ہی شانی، سکینہ کا بازو پکڑ کر باہر نکل آئی۔ شانی جانتی تھی کہ مارکیٹ کے اندر سے گزر کر دوسری سڑک پر نکلا جا سکتا ہے۔ اب بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی۔ وہ دونوں تیزی کے ساتھ مارکیٹ کے اندر سے گزر کر دوسری سڑک پر پہنچ جاتیں اور فوراً کسی رکشہ ٹیکسی میں بیٹھ کر نکل جاتیں یا پھر خود کو کسی دکان میں چھپا لیتیں۔

دونوں تیزی سے مارکیٹ کے اندر داخل ہوئیں۔ یہ شام آٹھ بجے کا وقت تھا۔ ان دونوں نے تیزی سے مارکیٹ کے اندر ساٹھ ستر میٹر کا فاصلہ طے کیا اور دوسری طرف کی سڑک پر نکل آئیں۔ شانی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ کچھ دیر پہلے جو کرخت صورت موٹر سائیکل سوار انہیں گھورتے ہوئے گزرا تھا، وہ موٹر سائیکل سمیت بالکل سامنے موجود تھا۔ شانی اور سکینہ کو دیکھتے ہی وہ چونکا اور موٹر سائیکل سے اُتر آیا۔ شانی اور سکینہ واپس مارکیٹ میں پلٹیں۔ ''ہائے اللہ شانی! وہ ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔''

سکینہ کے فقرے سے ظاہر تھا کہ وہ ایک سے زیادہ ہیں۔ شانی نے سکینہ کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رکھا اور اپنی رفتار کم نہیں کی۔ وہ راہ گیروں سے ٹکراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ کئی لوگ مڑ مڑ کر حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

''کون ہیں یہ؟'' سکینہ پھر ہانپتی ہوئی آواز میں کراہی۔

''کچھ پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ قدرت اللہ کے بندے یا پھر..... پولیس والے۔'' شانی نے بھی ہانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

سامنے ایک کار کھڑی تھی۔ اس کے قریب دو ادھیڑ عمر کے افراد کھڑے تھے۔ کار کے دروازے کھلے تھے۔ شانی اور سکینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ کار کے قریب جا کر کھڑی ہو گئیں۔

''کیا بات ہے بی بی! بہت پریشان ہو؟'' ایک ادھیڑ عمر نے پوچھا۔

''کچھ غنڈے ہمارے پیچھے ہیں..... تنگ کر رہے ہیں۔'' شانی نے کہا۔

دونوں افراد نے دائیں بائیں دیکھا جیسے پیچھے آنے والوں کو ڈھونڈ رہے ہوں۔ اسی دوران میں چند میٹر کے فاصلے پر دو دھماکے ہوئے۔ یہ ربی پیٹر کے دو گنج دار فائر تھے۔ ایک شوکیس کا شیشہ چکنا چُور ہو گیا۔ ارد گرد موجود لوگوں کی توجہ چند سیکنڈ کے لیے ان فائرز کی طرف گئی۔ اسی دوران میں کار کے قریب موجود دونوں افراد نے شانی اور سکینہ کو گھسیٹ کر کار کے اندر کر لیا۔ اس کام میں دو دیگر افراد نے بھی ان کی مدد کی تھی۔ یہ کام اتنی سُرعت اور ٹائمنگ کے ساتھ ہوا کہ ارد گرد موجود افراد میں سے شاید ہی کسی کو پتا چلا ہو۔ یقینی بات تھی کہ کچھ فاصلے پر ربی پیٹر کے دھماکے خیز فائر لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے کیے گئے ہیں۔

شانی کو پچھلی سیٹ پر اور سکینہ کو اگلی سیٹ پر دو ہٹے کٹے افراد نے اس طرح دبوچ لیا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کر سکیں۔ گاڑی کے شیشے ''ٹنٹڈ'' تھے اور وہ بغلی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت میں آ گئی تھی۔ شانی نے خود کو دبوچنے والے شخص کے منہ پر کئی طمانچے رسید کیے۔ اس کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں مگر پھر اس کی کلائیاں بڑی بے دردی سے دبوچ لی گئیں۔ شانی کو دبوچنے والے شخص نے شانی کو بے حرکت رکھنے کے لیے اپنے جسم کا سارا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ وہ جیسے کسی وزنی پتھر کے نیچے پسنے لگی۔ اگلی سیٹ پر سکینہ بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھی۔ وہ مسلسل چلا رہی تھی۔ ''چھوڑ دے..... حرامی چھوڑ دے۔''

پھر شاید سکینہ نے حملہ آور کا منہ نوچا تھا۔ وہ ڈکرایا۔ پھر دو دفعہ کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ حملہ آور نے سکینہ کے سر کو بڑی سفاکی سے پسٹل کے دستے سے نشانہ بنایا تھا۔ سکینہ کی آواز معدوم ہو گئی۔ گاڑی لہراتی ہوئی برق رفتاری کے ساتھ اُڑی چلی جا رہی تھی۔

یہ سفر بیس منٹ کا تھا۔ شانی اور سکینہ کو بالکل بے دست و پا کر کے اس بیس منٹ میں پہنچایا گیا تھا۔ سکینہ تو نیم بے ہوش تھی، شانی کے ہاتھ گاڑی کے اندر ہی اچھی طرح باندھ دیئے گئے تھے۔ اس کے منہ پر ایک بڑی زبردست قسم کی ٹیپ چڑھائی گئی تھی۔ شانی کے برقع کا بالائی حصہ اس کے جسم سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ گاڑی رکنے کے بعد اسے ایک بڑی چادر میں لپیٹا گیا اور ایک تنومند شخص نے اسے اپنے کندھے پر لاد کر ایک تہہ خانے میں پہنچا دیا۔ اب

www.pdfbooksfree.pk

شانی کے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے اور منہ سے ٹیپ بھی ہٹائی جا چکی تھی۔ وہ نیم بے ہوش سکینہ کی طرف لپکی۔ وہ ایک فوم میٹرس پر پڑی تھی اور کراہ رہی تھی۔ اس کی کنپٹی پر دو جگہ گومڑ بن گئے تھے اور وہاں سے خون رس رہا تھا..... تاہم اس کی حالت غیر تسلی بخش نہیں تھی۔ شانی نے دس پندرہ منٹ کوشش کی۔ وہ واش روم سے ٹھنڈا پانی لے کر آئی اور سکینہ کے چہرے پر چھینٹے دیئے۔ آخر سکینہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ خود کو اس چاروں طرف سے بند تہہ خانے میں پا کر اس کا رنگ پھر زرد ہونے لگا۔

''ہم کہاں ہیں شانی؟'' وہ سسکی۔

''ابھی مجھے خود ٹھیک سے پتا نہیں لیکن اتنا اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ قدرت اللہ کے لوگ نہیں ہیں۔ شاید.....'' شانی کی آواز بھرا گئی اور اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''کہیں یہ..... پولیس کے لوگ تو نہیں؟ مجھے ان کی شکلوں سے کچھ کچھ شک ہو رہا تھا۔''

''ہو سکتا ہے اور نہیں بھی.....''

''وہ گولیاں کیسی چلی تھیں؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ سارا ڈراما تھا۔ ہمیں بہت آہستہ بولنا چاہیے سکینہ! کیا پتا یہاں کوئی آواز پکڑنے والی شے چھپائی گئی ہو۔''

سکینہ کا رنگ زرد تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سہمی سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے کچھ ہونہ جائے شانی! میرا دل ڈوب رہا ہے..... ہم..... مجھے تو لگ رہا ہے ہمیں ڈپٹی ریاض نے پکڑوایا ہے۔''

سکینہ نے وہی بات کہی تھی جو خود شانی کے ذہن میں بھی اَن گنت اندیشوں کو جگا رہی تھی۔ بہرحال اس نے سکینہ کے خیال کی تصدیق کر کے اسے مزید خوف زدہ کرنا نہیں چاہا۔

شانی نے چاروں طرف دیکھا۔ اس مستطیل تہہ خانے میں صرف ایک میٹرس بچھا تھا۔ دو سنگل میٹرس ایک دیوار کے ساتھ کھڑے کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک الماری اور ایک اسٹیل کا پلنگ تھا۔ تہہ خانے میں داخل ہونے کا واحد راستہ ایک دروازہ تھا۔ اس دروازے کی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ جگہ بالکل ساؤنڈ پروف ہے۔ ایک چھوٹا سا بغلی دروازہ اور بھی دکھائی دے رہا تھا، یہ کسی اندرونی حصے میں کھلتا تھا۔ شانی اور سکینہ کو اس زمین دوز قبر میں پھینک کر جانے والے اب ناپید ہو چکے تھے۔ اردگرد سے کوئی مدھم سی آواز بھی اندر نہیں پہنچ رہی تھی۔

اچانک دروازہ خود کار طریقے سے سلائیڈ کر کے کھلا اور ڈپٹی ریاض طوفان کی طرح

www.pdfbooksfree.pk

اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک ہٹا کٹا شخص تھا۔ شانی کو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی اجرالی سردار ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بڑی بڑی مونچھوں اور پتھریلے چہرے والا ایک ملازم صورت شخص تھا۔ ڈپٹی ریاض نے اندر آتے ہی ایک زناٹے کا تھپڑ شانی کے چہرے پر مارا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اس کو اپنے ہونٹوں پر خون کا نمکین ذائقہ محسوس ہوا۔

''تیرا یار کہاں ہے؟'' ڈپٹی ریاض نے شانی کو بالوں سے جکڑ کر زوردار جھٹکے دیئے۔

''مجھے نہیں پتا۔'' وہ کراہی۔

''تجھے نہیں پتا تو پھر اپنے کس خصم کے پاس جا رہی تھی ٹیکسی پر چڑھ کر؟'' ریاض نے ایک اور بے رحم تھپڑ رسید کیا۔ شانی کی نگاہوں میں درد و یاس گھوم گئے۔

وہ چیل کی طرح سکینہ پر جھپٹا اور اسے بالوں سے جکڑ لیا۔ ''تُو بتا حرامزادی! کہاں جا رہی تھیں تم دونوں.....؟''

''ب..... بازار۔'' سکینہ نے ہکلا کر کہا۔

''بازار تو یہاں ایک ہی ہے تم جیسی آوارہ عورتوں کے لیے۔ اور مجھے لگتا ہے کہ تم دونوں کو وہیں پہنچانا پڑے گا۔'' اس نے سکینہ کو وحشیانہ دھکا دیا۔ وہ پہلے دیوار سے ٹکرائی پھر پھسل کر فوم پر گر گئی۔ اس کے بال کھل گئے تھے۔

ریاض ہٹلر ملازم کو دیکھ کر پھنکارا۔ ''اتنی آسانی سے نہیں ماننا ہے انہوں نے..... دوسری طرف لاؤ اس حرامزادی کو۔'' ریاض کا اشارہ سکینہ کی طرف تھا۔ موچھیل ملازم چیل کی طرح سکینہ پر جھپٹا۔ اجرالی سردار نے اس کی مدد کی۔ وہ دونوں پلک جھپکتے میں سکینہ کو بغلی دروازے سے گزار کر ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ شانی نے سکینہ کو بچانے کی کوشش کی مگر ریاض ہٹلر ایک سفلاخ دیوار کی طرح اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ اس نے شانی کو تھپڑ مارے اور دیوار کے ساتھ لگا کر بے بس کر دیا۔

دونوں کمروں کے درمیان والا دروازہ دہرا تھا۔ ایک دروازہ پلائی ووڈ کا تھا اور دوسرا آہنی سلاخوں والا۔ پلائی ووڈ والا دروازہ کھلا رہنے دیا گیا اور آہنی سلاخوں والا دوسری طرف سے بند کر دیا گیا۔ اجرالی سردار، ریاض ہٹلر اور ملازم اب تینوں سکینہ کے ساتھ دوسرے کمرے میں تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے روتی چلاتی سکینہ کے کپڑے اتار کر اور پھاڑ کر اسے برہنہ کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ باندھ کر اسے چھت کے ایک آہنی ہک کے ساتھ رسے کی مدد سے لٹکا دیا۔ یہ منظر اتنا ہولناک تھا کہ شانی کو لگا، وہ کسی بھی لمحے بے ہوش ہو جائے گی۔ وہ آہنی سلاخوں والے دروازے کے ساتھ چمٹ گئی اور التجائیں کرنے لگی۔ ''مجھے جو کچھ پتا ہے

میں بتا دیتی ہوں۔ خدا کا واسطہ اس کو چھوڑ دو۔'' اس نے بار بار کہا مگر انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شانی کو آخری حد تک خوف زدہ کر دینا چاہتے ہیں تاکہ جب وہ اس کی فریاد پر کان دھر کر اسے بولنے کے لیے کہیں تو وہ فر فر بولتی جائے۔

''مار و حرامزادی کو۔'' ریاض ہٹلر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے گرجا۔

موچھیل ملازم ہیرے نے پانی کے ربر پائپ کا ایک تین فٹ لمبا ٹکڑا پکڑا۔ یہ کافی سخت ربر تھا۔ اس نے بے دردی سے سکینہ کے جسم پر ضربیں لگائیں۔ جہاں جہاں چوٹ لگی فوراً خونی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ سکینہ اذیت کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ کچھ یہی کیفیت شانی کی بھی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سکینہ کی اذیت جسمانی اور شانی کی ذہنی تھی۔ وہ جو کسی غیر کو بھی کانٹا چبھنے کی تکلیف نہیں دیکھ سکتی تھی، اس کے سامنے اس کی عزیز ترین سہیلی کو بدترین تکلیف سے گزارا جا رہا تھا۔

''بس کر دو..... خدا رسول کا واسطہ، بس کر دو۔'' شانی نے سلاخ دار دروازے کو بری طرح جھنجوڑا۔

ریاض ہٹلر نے بڑے تفاخر سے شانی کو دیکھا..... جیسے کہہ رہا ہو، بس میری رانی! اتنی سی برداشت۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے موچھیل ہیرے کو رکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے اپنا سفاک ہاتھ روک لیا۔ سکینہ نیم جان ہو گئی تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی۔ چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔

ڈپٹی ریاض نے سلاخ دار دروازے کے سامنے پہنچ کر پوچھا۔ ''ہاں، بتا کہاں ہے وہ تیرا منہ بولا خصم؟ اور یاد رکھ، جھوٹ بولا تو ابھی..... آج کی ڈیٹ میں ہی تیری سہیلی کی چڑی پنڈے سے دکھری ہو جائے گی۔''

''مجھے بس اتنا پتا ہے رستم کے بارے میں کہ وہ..... اقبال ٹاؤن میں ہے۔''

''کون سا بلاک؟''

''شش شاید..... برگس بلاک تھا.....''

''شاید نہیں..... ٹھیک ٹھیک بتانا پڑے گا اور کوٹھی کا نمبر بھی۔''

شانی کا دل ہول رہا تھا مگر اسے کوٹھی کا نمبر بتانا پڑا۔

''فون نمبر بھی بتاؤ ان کا..... اور دیکھو، میں نے ابھی یہیں بیٹھے بیٹھے دس منٹ کے اندر ان ساری معلومات کی تصدیق کرنی ہے۔ تصدیق ہونے کے بعد ہی تیری اس موم بتی کو چھت سے اتاروں گا۔'' ریاض کا اشارہ سکینہ کی طرف تھا۔

شانی نے چارو نا چار کوٹھی کا فون نمبر بھی بتایا۔ اس کے ساتھ ہی وہ سسکی۔ ''اتنا ظلم مت کرو ریاض! یہ مر جائے گی۔ اسے چھت سے اتار دو۔''

وہ ایک بدبودار ڈکار لیتے ہوئے مسکرایا۔ ''چل نکی چوہدرانی! تیری بات مان لیتے ہیں۔ چھت سے اتار دیتا ہوں مگر ساتھ ہی کھلے گا جب تیری باتوں کی تصدیق ہو جائے گی۔'' اس نے موچھیل ہیرے کو اشارہ کیا۔ اس نے دروازے کی سلاخ سے بندھے ہوئے رسے کو کھول کر تھوڑی سی ڈھیل دی۔ سکینہ نیچے کو آئی اور اس کے پاؤں کے دونوں پنجے فرش سے ٹک گئے۔ یوں اس کے کندھوں پر اس کے جسم کا جان لیوا دباؤ ختم ہو گیا۔ تاہم وہ اسی شرمناک حالت میں حسرت کی تصویر بنی کھڑی رہی۔

شانی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی طرف زیادہ دیر دیکھ سکے۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں شانی کو موت کے سائے دکھائی دے رہے تھے۔ شانی نے اپنا رخ پھیر لیا اور ریاض سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''دیکھو، مجھے جو کچھ پتا تھا..... میں نے پوری سچائی سے بتا دیا ہے۔ اب مجھے پتا نہیں کہ رستم اس کوٹھی میں ہے یا جا چکا ہے۔''

''تجھے سب پتا ہے مساۃ شانی عرف نکی چوہدرانی! لیکن تُو بتائے گی آہستہ آہستہ رک رک کر۔ تیری زبان میں اٹک ہے۔ اس کو ساتھ ساتھ گریس دینی پڑے گی۔''

''نہیں ریاض! میں جھوٹ نہیں بول رہی۔''

''نہیں نہیں..... تُو جھوٹ کیسے بولے گی۔ تُو تو دنیا کی سب سے سچی کھری عورت ہے۔ تُو نے ہمیشہ سچ بولا، اپنی اونچی پگڑی والے باپ سے سچ بولا..... اپنے لوگوں سے سچ بولا، پنچایت اور قانون سے سچ بولا..... اور یہ سارے سچ تُو نے کس کے لیے بولے۔ اس قاتل ڈکیت کے لیے جو اب تک تیرے علاوہ بھی نہ جانے کتنی زنانیوں کے ساتھ منہ کالا کر چکا ہے..... اور کر رہا ہے۔ جی چاہتا ہے سو جان سے صدقے چلا جاؤں تیرے ان سارے سنہری سچوں پر۔''

''دیکھو میں غلط نہیں کہہ رہی.....''

''نہیں نہیں..... غلط تو میں ہوں۔'' وہ جنونی انداز میں بولا۔ ''تُو غلط نہیں ہے۔ تُو سولہ آنے صحیح ہے اور اسی لیے اتنی خوش قسمت بھی ہے۔ ایک حرامی ڈکیت کی منہ بولی جورو ہے پھر بھی علاقے کے لوگ تجھ پر صدقے واری جاتے ہیں۔ الیکشن میں تیری صندوقڑی کو ووٹوں سے بھرنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ نہیں نہیں..... تُو غلط کہاں ہے۔ غلط تو میں حرامزادہ ہوں۔ غلط تو میں..... ہوں۔'' اس نے بڑی روانی سے خود کو ایک غلیظ گالی دی..... اور شانی کی

www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور میں بہت ساری غلطیاں کروں گا بھی..... اگر تُو نے اپنی زبان نہ کھولی۔''

سکینہ کو پانی وغیرہ پلایا گیا مگر اس کی رسی مزید ڈھیلی نہیں کی گئی۔ یہ قیامت کے لمحے تھے۔ شانی کا دل چاہ رہا تھا کہ ریاض اس کے سامنے ہو۔ وہ اسے مار دے یا خود مر جائے۔ چند منٹ بعد ریاض کے فون کی گھنٹی بجی۔ تہہ خانے میں آواز صاف نہیں تھی پھر بھی ریاض کسی نہ کسی طرح بات سننے میں کامیاب رہا۔

''کوئی ملازم شلازم بھی نہیں ہے؟'' دوسری طرف سے غالباً نفی میں جواب ملا۔ ریاض پھنکارا۔ ''آلے دوالے کے گھروں سے پوچھنا تھا..... اچھا..... ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔'' اس نے آخری دو الفاظ تین چار دفعہ دہرائے اور سرخ چہرے کے ساتھ فون بند کر دیا..... اور شانی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''وہاں تیرا یار ہے اور نہ اس کے یار۔ وہ تیری ماں خالی پڑی ہوئی ہے اور گیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔ آس پاس والوں کو بھی کچھ پتا نہیں..... اب بتا میں غلط ہو جاؤں تو کیا کروں؟ غلط تو ہونا ہی پڑے گا۔'' اس کے لہجے میں درجنوں سانپ پھنکار رہے تھے۔ اجرالی سردار بھی شانی کی دگرگوں حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''چھڈ ریاض بھائی۔ اپنا کم شروع کر۔ یہ لاتوں کی بھوتیاں ہیں، باتوں سے نہیں مانیں گی۔''

ریاض نے سفاکی سے موچھیل ہیرے کو اشارہ کیا۔ اس نے ایک ہی جھٹکے سے نیم جان سکینہ کو پھر ہوا میں معلق کر دیا۔ سکینہ نحیف آواز میں چلائی اور بے چارگی سے آنکھیں بند کر لیں۔ دوسرے کمرے میں شانی کے پاس بھی آنکھیں بند کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایک بار پھر ربر پائپ سکینہ کے جسم پر برسنے لگا اور اس کے چلانے کی کربناک آوازیں شانی کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ کچھ دیر برداشت کرتی رہی پھر تڑپ کر بولی۔

''خدا کے لیے اسے چھوڑ دو۔ جو ظلم کرنا ہے مجھ پر کر لو۔ مار ڈالو مجھے..... مجھے مار ڈالو۔''

''اتنی بے صبری نہ بن میری چن مکھنی! تیرے سارے شوق بھی پورے کریں گے.....'' ریاض ہٹلر نے زہر خند لہجے میں کہا۔

چند سیکنڈ بعد سکینہ کی آواز معدوم ہو گئی۔ اس کا چہرہ ہلدی تھا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ شانی نے پوری جان سے تڑپ کر اس کے عرق آلود پیٹ کی طرف دیکھا۔ وہاں زیر و بم موجود تھا۔ وہ سانس لے رہی تھی، وہ چلائی۔ ''تمہیں تمہارے بچوں کا واسطہ ریاض..... اسے نیچے اتار دو، یہ مر جائے گی۔''

ریاض نے شانی کی دیگر فریادوں کی طرح یہ فریاد بھی نہیں سنی۔ تاہم سکینہ کی بے ہوشی دیکھ کر ہیرے کو رسا ڈھیلا کرنے کا اشارہ کر دیا۔ ہیرے نے سلاخ دار دروازے سے رسے کی گرہ کھولی۔ سکینہ نیچے آئی۔ پہلے اس کے پاؤں فرش سے لگے پھر وہ لیٹتی چلی گئی۔

ریاض کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ وہ فون سنتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی باہر نکل گئے۔ تہہ خانے کو پھر باہر سے مقفل کر دیا گیا۔ تہہ خانے کے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ اب کھلا تھا۔ شانی لپک کر سکینہ کے پاس پہنچ گئی۔ سب سے پہلے اس نے ایک چادر سکینہ کے جسم پر پھیلائی پھر اس کا منہ چومنے لگی اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ ''سکینہ! میری بہن! آنکھیں کھول۔'' وہ بار بار پکارنے لگی۔

سکینہ کا رنگ غیر معمولی طور پر زرد تھا اور ہونٹ گہرے سانولے نظر آ رہے تھے۔ شانی کی سخت تگ و دو کے باوجود وہ ہوش میں نہیں آئی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ اس بار سکینہ کی بے ہوشی گہری ہے اور اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ تہہ خانے کا دروازہ پیٹنے لگی۔ ''دروازہ کھولو..... یہ مر جائے گی..... دروازہ کھولو۔''

شانی کی پکار کا جواب دو تین منٹ بعد آیا۔ تنومند ہیرے نے دروازے کو سلائیڈ کیا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ پستول پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔ ہیرے کے عقب میں ایک اور کرخت چہرہ شخص بھی موجود تھا۔

''کیا موت پڑ گئی ہے؟'' ہیرے نے بدتمیزی سے کہا۔

''اس کو دیکھو..... اس کی سانس ٹھیک نہیں آ رہی.....'' شانی، سکینہ کی طرف اشارہ کر کے ہکلائی۔

ہیرا پستول بہ دست ایک کونے میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا شخص شانی کے ساتھ مل کر سکینہ کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ سکینہ یکسر ساکت تھی۔ اس کی سانس بھی بہت دھیمی پڑ گئی تھی۔ نووارد شخص شاید میڈیکل کی تھوڑی بہت سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے کونے میں جا کر ہیرے کے ساتھ تھوڑی سی کھسر پھسر کی۔ پھر دونوں تیزی سے باہر نکل گئے۔ جاتے جاتے ہیرے نے شانی سے کہا۔ ''حوصلہ رکھ بی بی! ڈاکٹر لاتے ہیں اس کے لیے۔''

سکینہ کی حالت دیکھ کر شانی کے جسم میں لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے اسٹیل کے ایک گلاس میں پانی لے کر سکینہ کو پلانے کی کوشش کی۔ یہ پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا..... شانی کا دل رونے لگا۔ یہ ایکا ایکی کیا قیامت ٹوٹ پڑی تھی؟ اس نے کہیں سنا تھا کہ شیش ناگ کی

www.pdfbooksfree.pk

دہشت سے اس کا شکار سکتے میں چلا جاتا ہے..... اور بلی کے خونخوار جبڑوں کے خوف سے چڑیا کا دل پھٹ جاتا ہے۔ تو کیا یہاں بھی چڑیا کا دل پھٹ گیا تھا؟

وہ سکینہ کو مسلسل جھنجوڑ رہی تھی اور اس سے آنکھیں کھولنے کی درخواست کر رہی تھی۔ اسی دوران میں موچھیل ہیرے اور اس کا ساتھی ایک گہرے سانولے رنگ والے ڈاکٹر نما شخص کو لے کر تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے شانی کو دوسرے کمرے میں بھجوا دیا اور میڈیکل باکس کھول کر سکینہ کے معائنے میں مصروف ہو گیا..... یقیناً یہ ڈاکٹر ڈپٹی ریاض کا اپنا بندہ ہی تھا۔ اس نے سکینہ کی برہنگی اور ارد گرد کی صورتِ حال کو بالکل حیرت کی نظر سے نہیں دیکھا۔

جوں جوں ڈاکٹر کا معائنہ طویل ہوتا گیا، شانی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ شانی اب کچھ دیکھ نہیں سکتی تھی کیونکہ تہہ خانے کے دونوں کمروں کا درمیانی دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ ایک بار شانی کو محسوس ہوا کہ ہیرا شاید فون پر ڈپٹی ریاض سے بات کر رہا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے ہیرے کے ساتھی کو دیکھا۔ وہ تیز قدموں سے تہہ خانے سے باہر گیا اور قریباً دس منٹ بعد کچھ انجکشن وغیرہ لیے ہوئے واپس آیا۔ شانی نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ! کیا ہوا ہے سکینہ کو؟''

''ہمیں نہیں پتا۔ کیا پہلے بھی بیمار تھی؟'' خشک لہجے میں پوچھا گیا۔

''نہیں کچھ نہیں تھا اسے۔ جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے۔'' شانی چلائی۔

وہ شخص شانی کو راستے سے ہٹاتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ صرف پانچ منٹ بعد شانی کو سکینہ کی موت کی خبر مل گئی..... ہاں وہ مر گئی تھی۔ صرف پانچ چھ گھنٹے پہلے جو ہنستی کھیلتی، جیتی جاگتی سکینہ رنگ والی سے اس کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہوئی تھی، وہ اب نہیں رہی تھی..... شانی نے اب کبھی اس کی آواز نہیں سننا تھی۔

یہ ایک قیامت تھی جو شانی پر ٹوٹی۔ اسے مارنے والے تو اپنا کام کر کے نکل گئے۔ شانی اس کی سرد لاش سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر روتی رہی۔ شانی کو لگا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو وہ زندہ تھی۔ وہ بری حالت میں تھی مگر وہ بول رہی تھی، دیکھ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی..... شانی میرا دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے کچھ ہو نہ جائے..... اور کچھ ہو گیا تھا۔ اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔ وہ مر گئی تھی۔

''سکینہ! میری بہن!'' شانی نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پکارا۔ اس نے سفید چادر میں لپٹی ہوئی سکینہ کو اپنے سینے سے لگایا اور روتی چلی گئی۔

☆=======☆=======☆

سردار دراج کی حالت زخمی درندے کی سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے جتنی زندگی بھی گزاری تھی، عزت اور وقار سے گزاری تھی۔ کسی پر ظلم کیا تھا نہ کسی کا ظلم برداشت کیا تھا لیکن اب جو کچھ ہوا تھا، بے حد اذیت ناک تھا۔ سگے بھائی کے قتل کا صدمہ ہی کچھ کم نہیں تھا، اوپر سے پولیس اور گوراہی چوہدریوں نے اس کی زندگی عذاب بنا دی تھی۔ پچھلے ایک دو مہینے میں بے گناہ مہتموں کے ساتھ بدترین سلوک ہوا تھا۔ انہیں سخت تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا اور ان کی عورتوں کو بے عزت کیا گیا تھا۔ دراج جانتا تھا کہ دو چار مہتم عورتیں ایسی بھی ہیں جو بدنامی کے ڈر سے اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کو چھپا بھی رہی ہیں۔ ایسی ہی دولڑکیوں کو مزید تشدد سے بچانے کے لیے دراج نے اپنی بیوی ماکھو کے ساتھ رنگ والی بھیج دیا تھا۔ وہ اب شانی اور چوہدری معصوم کی پناہ میں تھیں۔

''کیا سوچ رہے ہو کھیا؟'' دراج کے ایک زخمی ساتھی نے اسے مخاطب کیا۔

''وہی جو تم بھی سوچ رہے ہو گے۔ کھد کو جلیل کھوار کرنے والے گوراہیوں کا پتا چل جائے تو ان کی چھاتی پر بیٹھ کر ان کے منہ پر پیشاب کریں۔''

''گوراہی چوہدریوں کے بارے میں تو پتا نہیں، پر ایک بندے کو ڈھونڈنے میں شاید میں تمہاری مدد کر سکوں کھیا جی۔''

''کیا مطبل؟''

دراج کے زخمی ساتھی نے اپنی پنڈلی کے زخموں پر سے مکھیاں اڑائیں اور بولا۔ ''میں نے ایک بار ڈپٹی ریاج کو لاہور کمپنی باغ کے پاس دیکھا تھا..... وہ گڈی میں تھا اور ایک کوٹھی کے اندر جا رہا تھا۔''

''اس سے کیا ہو گا؟''

''میری پوری گل تو سنو کھیا جی! ان دنوں میں اپنے چھوٹے کاکے کا الاج گنگا رام ہسپتال میں کروانے آیا ہوا تھا۔ بس ایک دن پیدل جاتے ہوئے میری نجر اچانک ہی ڈپٹی ریاج پر پڑی تھی۔ وہ پلس کی گڈی نہیں تھی، نہ ہی ریاج پلس کے کپڑوں میں تھا۔ اس نے چوروں کی طرح اپنا منہ مفلر میں چھپایا ہوا تھا۔ میں بالکل پاس تھا اس لیے میں نے اسے پہچان لیا۔ پتا نہیں کیوں مجھے شک پڑا تھا کہ یہ ریاج کی کوٹھی ہے۔ یہ کوئی ایک سال پہلے کی گل ہے۔''

''تیرا کیا کھیال ہے..... آپاں کو اسی کوٹھی میں ریاج مل سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے کہ مل جائے۔ اگر نہ بھی ملے تو اس کا کوئی کھوج تو لگ سکتا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''تُو تو چٹا اَن پڑھ ہے۔ کوٹھی کا نمبر شمبر تو پڑھا نہیں ہوگا تُو نے؟''

''تم نمبر کی بات کرتے ہو کھیا جی..... مجھے تو سڑک بھی یاد نہیں۔ پر تم جانتے ہو اپنا حاپھجا کا پھی سچ ہے۔ اگر تم مجھ کو لے جا کر گنگا رام کے پاس چڑیا گھر کے چھوٹے گیٹ کے سامنے کھڑا کر دو تو میں وہ سڑک ڈھونڈ لوں گا اور اس کوٹھی کو بھی.....''

اپنے ساتھی ساہے کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی دراج نے اس کا بازو دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ رستم اور ناصر باتیں کرتے ہوئے تیز قدموں سے اندر داخل ہو رہے تھے۔ وہ پاس سے ہو کر گزر گئے تو دراج نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''دیکھو! آپاں کے کسی بھی ارادے کے بارے میں رستم اور ناصر کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

''وہ کیوں؟''

''بس جیادہ سوال نہ کر۔ کہہ دیا ہے ناں۔'' دراج کے لہجے میں ہلکا سا تحکم آ گیا۔

دراج جانتا تھا کہ بی بی سے دور ہو کر اور اپنے دوست حاجی حیات سے ناراض ہو کر رستم بہت زیادہ پریشان ہے۔ وہ اس کی پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا پھر جس طرح رستم نے خود کو شدید خطرے میں ڈال کر اسے اور اس کے تینوں ساتھیوں کو نامعلوم لوگوں کے چنگل سے نکالا تھا، وہ بات بھی کوئی بھولنے والی نہیں تھی۔ اب دراج کی خواہش تھی کہ اس کے کسی اچھے برے ارادے کا بوجھ رستم پر نہ پڑے۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا، اپنے بل بوتے پر کرنا چاہتا تھا۔

رستم اور ناصر کے جانے کے بعد سردار اور اس کے ساتھی پھر سرگوشیوں میں مصروف ہو گئے۔ جوں جوں بات آگے بڑھ رہی تھی، ان کے سانولے چہروں پر تمتماہٹ آتی جا رہی تھی..... پانیوں کے رسیلے کناروں میں سرکنڈوں اور داب کے اندر بسنے والے یہ قدیم جنگجو اپنی بے عزتی کو شاذ و نادر ہی برداشت کرپاتے تھے.....

☆=======☆=======☆

شانی اڑتالیس گھنٹے سے اس تہہ خانے میں سکتہ زدہ بیٹھی تھی۔ وہ کیا سوچ کر رنگ والی سے نکلی تھی اور کیا ہو گیا تھا۔ وہ اکیلی آنا چاہتی تھی لیکن سکینہ نے اسے اکیلے نہیں آنے دیا تھا..... وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے بہرصورت اکیلے رہ جانا ہے۔

وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر دل ہی دل میں پکاری۔ ''کہاں ہو رستم؟ میں تمہارے سینے پر سر رکھ کر اتنا رونا چاہتی ہوں کہ آنسوؤں کے ساتھ ہی میری جان بھی آنکھوں کے راستے نکل جائے۔'' لیکن رستم کہیں نہیں تھا۔ ان کے درمیان نامعلوم فاصلے حائل تھے۔ تیسرے دن

شانی نے جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے چند لقمے لیے۔ وہ بھی جیسے اس کے حلق میں ہی اٹکے رہ گئے۔ سکینہ کی تجہیز و تکفین کیسے ہوئی تھی اور ہوئی بھی تھی یا نہیں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ لاوارث مقتولوں کی طرح اس کا مُردہ جسم بھی کہیں خاک میں ملا دیا گیا ہے یا کسی پختہ کمرے کا فرش اکھاڑ کر اس پر نئی ٹائلیں لگوا دی گئی ہیں۔

اور پھر وہ بری گھڑی بھی آن پہنچی جس کے اندیشے شانی کو دن رات شدید اضطراب میں رکھ رہے تھے۔ تہہ خانے کے دروازے نے سلائیڈ کیا اور ڈپٹی ریاض اندر آ گیا۔ وہ عجیب ہیئت کذائی میں تھا..... اس کے بالوں پر تازہ تازہ مہندی لگی ہوئی تھی۔ جسم پر فقط ایک انڈرویئر تھا۔ چمڑے کا ایک کالا ہولسٹر اس کے عریاں جسم سے بندھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں موبائل تھا۔ اندر آتے ہی اس نے عقابی نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا پھر شانی کو سرتاپا گھورا..... جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں دیکھ لینا چاہتا ہو کہ اس کے پاس کوئی ایسی خطرناک شے تو نہیں جس سے وہ حملہ آور ہو سکتی ہو۔

مطمئن ہو کر وہ بڑے بے ہودہ طریقے سے پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ مکمل لباس میں ہے یا ایک مختصر ترین انڈرویئر میں۔ اپنے بالوں بھرے پیٹ کو کھجا کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تمہارا سوگ شوگ ختم ہو گیا ہوگا۔ کچھ کام کی بات کر لی جائے۔''

''بہتر ہے کہ مجھے بھی مار ہی ڈالو۔'' شانی سسکی۔

''میں اتنا بھی کھوتا نہیں ہوں نکی چوہدرانی.....! تُو نہ ہوگی تو تیرے عاشق یار سے کیسے ملاقات ہو سکے گی۔'' اس نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر گلا صاف کیا اور اجڈ پن سے تہہ خانے کی شفاف دیوار پر تھوکا۔ تھوڑی دیر تک شانی کو گھورنے کے بعد بولا۔ ''اس نے طفیل کو بند کر رکھا ہے۔ اسے بے دردی سے مارتا پیٹتا ہے۔ مجھے ٹیلی فون پر اس کی آوازیں سنا تا ہے۔ مگر حرامزادہ اپنا پتا ٹھکانا نہیں بتاتا..... کب تک نہیں بتائے گا؟ بلکہ آج ہی بتائے گا۔ فون پر تیری دہائیاں سنے گا تو بتائے گا..... یا پھر تیرے سامنے بے غیرتی کا ثبوت بن جائے گا۔''

اس نے فون آن کیا اور کال ملائی۔ کچھ دیر بعد تہہ خانے میں رستم کی بوجھل آواز گونجی۔

''ہیلو کیا بات ہے؟'' شانی کے جسم میں جیسے بجلی لپک گئی۔ ہاں، یہ رستم کی آواز ہی تھی۔

''میں نے تجھ سے کہا تھا ناں رستے! میں وہ عزت مآب کھوتا ہوں جس نے کبھی کسی کنجر کو اپنے اوپر سواری نہیں کرنے دی۔ تُو نے مجھے فون پر طفیل کی دہائی سنائی تھی، آج میں اس

www.pdfbooksfree.pk

کے بدلے تجھے تیری ایک پسندیدہ دہائی سناتا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے؟"

"یہ بکواس نہیں ہے۔ یہ تو ماں کی موم بتی ہے اور یہ میرے کمرے میں جل رہی ہے۔ عمر بائیس اور پچیس سال کے درمیان، قد تقریباً پانچ فٹ سات انچ، رنگ چوکھا گورا..... جسم رنگ رنگیلا، لک پتلا، فی الحال صرف سر اور پاؤں سے ننگی ہے..... گونگی بنی ہوئی ہے لیکن مار کٹائی کی زبان بڑی اچھی طرح سمجھ جائے گی اور ابھی تھوڑی دیر میں تم اسے فون پر فرفر بولتے سنو گے۔ نام ہے اس کا مسماۃ شانی!"

"تم جھوٹ بک رہے ہو۔" رستم کی آواز لرز اٹھی۔

ریاض نے جواب دینے کے بجائے ہاتھ بڑھا کر شانی کے بال مٹھی میں جکڑے اور اتنی زور سے جھٹکا دیا کہ اس کا ماتھا ریاض کے گھٹنوں سے ٹکرا گیا۔ وہ بے ساختہ چلا اٹھی، ریاض فون میں پھنکارا۔ "اس سوہنی موہنی آواز کو تو تم لاکھوں میں پہچان سکتے ہو رستے! اب دیکھ لو، حساب برابر ہے۔ تم جتنی بار فون پر طفیل کی دہائی سنو گے، میں اتنی ہی بار اس چن مکھنی کا نغمہ سناؤں گا۔ اور یاد رکھو کہ یہ عورت ہے۔ اس کو ٹاہلی پھلکی موسیقی ہی نہیں بڑے سخت قسم کے پکے راگ گانے پر بھی مجبور کیا جا سکتا ہے۔"

"اگر تُو ٹھیک کہہ رہا ہے تو میری بات کروا بی بی جی سے۔"

"ہائے اوئے میں صدقے جاواں اس عاشقی معشوقی پر..... بی بی جی..... زور کس پر ہوا "جی" پر۔ تاریخ میں جتنے بھی بڑے بڑے بھوتنی دے عاشق ہیں، ان میں تیرا نام سب سے اُچی جگہ پر لکھا جانا چاہیے۔ باقی رہی بی بی جی صاحبہ سے بات کرنے کی بات تو میں نے کہا ہے ناں، اب تیرا میرا حساب برابر ہے۔ بی بی جی سے باتوں کا ٹھرک جھاڑنا ہے تو پہلے طفیل سے میری بات کرانی ہوگی۔"

رستم کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے ریاض پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ رستم نے کبھی شانی کے سامنے بدزبانی نہیں کی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ریاض کے موبائل کا مائیک آن ہے۔ جواب میں ریاض نے بھی اس فحش گالیاں دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شانی کو بے رحمی سے نوچا۔ شانی چلائی اور دو ہتڑ مار کر ریاض کا ہاتھ اپنے جسم سے دور کیا۔

ریاض درندگی سے بھرپور لہجے میں بولا۔ "رستے! میں تجھے آخری وارننگ دیتا ہوں..... پیش ہو جا..... ورنہ اس نگی چوہدرانی کو ایسی موت ماروں گا کہ لوگ مثال دیں گے۔

ہاں، سچ کہہ رہا ہوں۔ مائیں اپنی جوان کا کیوں کو سمجھائیں گی۔ نہ نہ، یار نہ پالنا ورنہ نگی چوہدرانی والا حشر ہوگا۔"

رستم ایک بار پھر قہرناک انداز میں دہاڑا۔ اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ شاید لائن کٹ گئی تھی یا پھر رستم نے طیش کے عالم میں خود ہی فون بند کر دیا تھا۔

ریاض نے فون کے ذریعے ہی موچھیل ملازم ہیرے کو اندر بلایا۔ وہ سلائیڈنگ دروازے سے اندر آ گیا۔ ریاض نے آنکھوں آنکھوں میں اسے اشارہ کیا۔ اس گرانڈیل نے لپک کر شانی کو چڑیا کی طرح دبوچ لیا اور گھسیٹتا ہوا سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھا۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اب سکینہ کی جگہ سنبھالنے والی ہے۔ شاید چھت پر لگا ہوا آہنی کنڈا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر ابھی ہیرا دو چار قدم ہی چلا تھا کہ ریاض نے اسے روک دیا۔ "نہیں..... اِدھر نہیں..... اُدھر!" اس نے آہنی بیڈ کی طرف اشارہ کیا۔

غالباً اسے سکینہ کی اچانک موت کا خیال آ گیا تھا اور ریاض شانی کے اچانک مرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اگلے تین چار منٹ شانی کے لیے بہت اذیت ناک تھے۔ گرانڈیل ہیرے اور ریاض ہٹلر نے شانی کو آہنی بیڈ کے ساتھ باندھ دیا۔ اسے باندھنے کے لیے وہی منحوس رسا استعمال کیا گیا تھا جس نے ساتھ والے کمرے میں سکینہ کی جان لی تھی۔ اس عمل کے دوران میں شانی نے بھرپور مزاحمت کی تھی۔ اس کی انگلیوں کے متعدد نشان ہیرے اور ریاض ہٹلر کے چہرے پر موجود تھے۔ ہیرے کی قمیص بھی تار تار ہو گئی تھی۔ شانی کا لباس بھی کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔

ریاض ہٹلر نے دوبارہ رستم سے رابطہ کیا۔ دوسری تیسری کوشش میں کال مل گئی۔ ریاض نے زہریلی ٹون میں کہا۔ "ہاں رستے! بات کرے گا اپنی بی..... بی..... جی سے۔"

رستم دہاڑا۔ "حرامزادے! اگر بی بی کو کچھ ہوا ناں تو میں تیرے پورے خاندان کو زندہ جلا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے۔"

"ہاں، یہ پرابلم تو ہے۔ اپنے خاندان کے بدلے، مجھے تیرے خاندان کو زندہ جلانا پڑے گا لیکن تُو تو دم کٹا کتا ہے۔ اس بی..... بی..... جی کے سوا تیرا آگے پیچھے کوئی ہے نہیں۔ بس ایک بہن تھی جو تیری ماں کی کسی غلطی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اور ایک اس کا حرامی خصم تھا۔ ان دونوں کو تُو نے پتا نہیں کس کھوڑ (سوراخ) میں چھپا رکھا ہے۔ اب میں مسکین کیا کروں گا۔ مجھے تو پھر سارے بدلے تیری اس چن مکھنی سے ہی لینے پڑیں گے۔ آخر میں کسی کو زندہ جلانے کے لیے بھی اسی پر گزارہ کرنا ہوگا۔"

www.pdfbooksfree.pk

اس کے ساتھ ہی ریاض نے تنومند ملازم ہیرے کو اشارہ کیا۔ وہ تو جیسے طمانچوں کا حساب برابر کرنے کے لیے پہلے ہی بے چین بیٹھا تھا۔ اس نے منحوس ربر پائپ کا تین فٹ لمبا ٹکڑا ہاتھ میں لیا اور شانی کے نازک تلوؤں اور جسم پر بے رحمی سے ضربیں لگائیں۔ شانی پہلے تو ہونٹ بھینچ کر برداشت کرتی رہی..... پھر وہ درد سے لاچار ہو کر کراہنے لگی۔ ریاض نے موبائل سیٹ شانی کے ہونٹوں سے قریب تر کر دیا تھا۔ ایک بار شانی زور سے چلائی۔ ریاض کے ہونٹوں پر سفاکی کا رنگ اور گہرا ہو گیا۔

رستم چنگھاڑا تو اس کی آواز فرط کرب سے پھٹی ہوئی تھی۔ ''ریاض..... ریاض..... تُو جتنا ظلم کر رہا ہے اتنا سہہ نہیں سکے گا..... تُو نہیں سہہ سکے گا..... بس کر دے..... چھوڑ دے بی بی جی کو..... چھوڑ دے.....''

''ٹھیک ہے..... چھوڑ دیتا ہوں۔ تُو ناصر اور اس پٹھان کے ساتھ پیش ہو جا.....''

''میں ہو جاتا ہوں پیش..... تُو بی بی کو مارنا بند کر۔''

''چلو کر دیتا ہوں بند..... لیکن اس سے پہلے اپنی مزید تسلی کر لے۔ ہو سکتا ہے تیرے دماغ میں آئے کہ یہ ریکارڈنگ شیکا رڈنگ ہے۔ لے تھوڑا سا منہ بیٹھا کر لے اپنی رکھیل سے بات کر کے۔''

اس نے فون شانی کے ہونٹوں کی طرف بڑھایا۔ شانی بلا تمہید کراہ کر بولی۔ ''رستم! میں غلطی پر تھی..... مجھے معاف کر دیں..... ہمارے درمیان کسی نے غلط فہمیاں پیدا کیں..... رستم آپ سن رہے ہیں ناں..... پھر شاید میں کچھ کہہ نہ سکوں.....''

''ششش..... شانی آپ کہاں ہیں..... آپ.....''

''مجھے نہیں معلوم۔ آپ نے میری بات سن لی ہے ناں.....'' شانی نے نفی میں جواب دیا۔

ریاض نے ایک دم موبائل فون پیچھے ہٹا لیا۔ مائیک پر انگوٹھا رکھ کر شانی سے مخاطب ہوا۔ ''اوئے سری دیوی! یہ کیا رام لیلا شروع کر دی ہے تُو نے۔ میں نے تجھے فون اس لیے تو نہیں دیا تھا۔''

وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا اور رستم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ہاں اب بتا..... کہاں اور کب گرفتاری دینی ہے؟''

''تُو کیا چاہتا ہے؟''

''میں تو چاہتا ہوں، جتنی جلدی سے جلدی تیرے درشن ہو جائیں اتنا ہی اچھا

ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے تھوڑا سا وقت دو۔ میں ساتھیوں سے مشورہ کر کے شام تک تمہیں بتاتا ہوں۔''

''مشورہ کرنا ہے یا کوئی چال سوچنی ہے؟ اگر کوئی چال سوچنی ہے تو پھر اس چن مکھنی پر ابھی فاتحہ پڑھ لے۔''

''دیکھ بی بی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے..... ورنہ وہ کچھ ہو جائے گا جو تیرے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا۔'' رستم کی آواز میں مہیب چٹانوں کی گڑگڑاہٹ تھی۔

''چل، اپنے بلڈ پریشر کی دُم میں آگ نہ لگا۔ تیری بی..... بی..... جی کو چار پانچ گھنٹے تک کچھ نہیں ہو گا۔ اس کے بعد کوئی ذمے داری نہیں ہے۔''

فون بند ہو گیا۔ ریاض نے فون کو گھور کر رستم کو ایک ننگی گالی دی اور اپنے انڈر ویئر میں بے پروائی سے ہاتھ ڈال کر اپنی پشت کو کھجاتا ہوا شانی کے قریب آن بیٹھا۔ ''دال میں کالا ہے لاڈو رانی! تیرا یار اوپر سے تپا ہوا ہے اور اندر سے بھی زور دار پٹاخے مار رہا ہے۔ اب اس حرامی نے کوئی نہ کوئی بڑا پنگا ضرور لینا ہے۔ میں ایک بار پھر تجھ سے کہتا ہوں، اس کا پتا ٹھکانا بتا دے اور مجھے پتا ہے کہ تُو جانتی ہے۔ دیکھ چن مکھنی! اس نے تو اب مرنا ہی مرنا ہے، پر ہو سکتا ہے کہ تیری جنڈی بچ جائے۔ تیرے پیٹ میں اس کا کوئی بچہ مچہ تو ہو گا ہی۔ اس کو پال پوس لینا۔ تیرا دل لگا رہے گا اور کیا پتا، کل کو وہ کوئی بڑا آدمی بن جائے اور اپنے ناجائز باپ کو جائز موت مارنے والوں سے بدلہ لے لے۔ کیا خیال ہے لاڈو رانی؟''

''مجھے کچھ پتا نہیں۔'' شانی نے بیڈ سے بندھے بندھے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا، اس سے معافی کس بات کی مانگ رہی تھی۔ کیا اس کے ساتھ سونے میں کوئی کسر رہ گئی ہے؟''

''میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر.....'' شانی زور سے چلائی۔ ''اور تمہاری گندی زبان پر بھی۔''

ریاض کا چہرہ سرخ انگارہ ہو گیا۔ اس نے ہیرے کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ہیرا پائپ کا ٹکڑا ایک کونے میں رکھ کر باہر چلا گیا۔

ریاض نے شانی کو سر سے پاؤں تک گھورا اور سرسراتے لہجے میں بولا۔ ''میں کوئی درویش اللہ لوک نہیں ہوں۔ رج کے گندم کھاتا ہوں۔ میرے اندر کے جانور کو نہ جگا۔ میں ہر

www.pdfbooksfree.pk

حد تک جا سکتا ہوں۔ ہر..... حد..... تک۔'' اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی بدبودار انگلیوں سے شانی کے ہونٹوں کو بری طرح مسلا۔ تمباکو زدہ انگلیوں کی بُو اور ان کا کھردرا پن شانی کے رگ و پے میں اترتا چلا گیا۔

اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر اپنے بالوں سے بھرے ہوئے بازوؤں کو کھجایا اور بولا۔ ''تیرے پاس سوچنے کے لیے پانچ گھنٹے ہیں۔ ان پانچ گھنٹوں میں اپنا اچھا برا دیکھ لے..... اور لمبے پینڈے (سفر) کے لیے اپنے انجن کا تیل پانی بھی چیک کر لے.....'' وہ شانی کو سخت دھمکی آمیز نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کی زبان زہر میں بجھے ہوئے تیروں کی طرح تھی جو اپنے مخاطب کا سینہ چھلنی کر دیتے تھے۔

شانی سوچتی رہی، کیا اب وہ بھی اذیت کے دریا سے گزر کر سکینہ کے پاس پہنچنے والی ہے؟ کیا اب وہ کبھی رستم کی صورت نہیں دیکھ سکے گی؟ اس کی بانہوں میں چھپ کر رو نہیں سکے گی..... کیا اب اس کے ہونٹ کبھی مُنے کا ماتھا نہیں چومیں گے؟

وہ بڑی مضبوطی کے ساتھ بیڈ سے بندھی ہوئی تھی۔ رسی کی بندشوں کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں اور کندھے سن ہو گئے تھے۔ جہاں جہاں ربر کے سخت پائپ نے اسے چوٹ لگائی تھی، وہاں آگ سی جل رہی تھی۔ وہ کسی بدترین انجام سے دوچار ہونے کے بجائے مرنا بہتر سمجھتی تھی مگر فی الوقت تو زندگی کی طرح موت بھی اس کے بس میں نہیں تھی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد دروازے نے سلائیڈ کیا اور دوبارہ ریاض کی مخمور شکل نظر آئی۔ وہ اب انڈر ویئر کے بجائے مکمل لباس میں تھا۔ شاید کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''وہ تیرا ایجوٹا یار اب فون اٹینڈ نہیں کر رہا۔ شاید پیچھا دکھا گیا ہے یا پھر کوئی چال شال سوچ رہا ہے۔ بہرحال ایک بات کلیئر ہے کہ میں نے تجھے جو پانچ گھنٹے دیئے تھے، ان میں سے ایک گھنٹہ گزر چکا ہے۔ چار گھنٹے یعنی 240 منٹ بعد تجھ پر بڑا سخت وقت آنے والا ہے۔''

شانی نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ریاض! تم نے بہت کچھ کیا ہے میرے ساتھ اور میرے رشتے داروں کے ساتھ۔ جمشید قتل ہوا، تایا معصوم زخمی اور بیمار ہوئے، رستم کی ٹانگ گئی..... اس کے علاوہ اور بھی پتا نہیں کیا کچھ لیکن میں سچ کہتی ہوں ریاض..... میں تمہیں اب بھی اپنا دشمن نہیں سمجھتی۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ میری قسمت میں تھا۔ میں اپنے مرے ماں باپ کی قسم کھاتی ہوں ریاض! میں اب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں

www.pdfbooksfree.pk

تو تمہاری بہتری کے لیے دعا مانگتی ہوں۔ میں اللہ سے التجا کرتی ہوں کہ وہ تمہیں سیدھا راستہ دکھائے.....''

''تالیاں..... تالیاں!'' ریاض نے تمسخر سے کہا۔ ''تمہاری اس اطلاع پر مجھے سر کے بل کھڑا ہو کر ناچنا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ تمہیں مبارک ہو۔ تمہاری التجا قبول ہوئی۔ مجھے سیدھا راستہ نظر آ گیا ہے۔ یہ راستہ چار گھنٹے بعد سیدھا اس تہہ خانے میں آئے گا..... پھر میں کوشش کروں گا کہ تمہارے بھگوڑے یار کو ٹیلی فون پر تمہارے کچے راگ سنوا سکوں۔''

وہ سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''ریاض! میں نے اپنے مرے باپ کی قسم کھائی ہے۔ میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔ میں نے کبھی تمہارے لیے بددعا نہیں کی، کبھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ یہ کہنے والی باتیں نہیں ہوتیں لیکن میں کہہ رہی ہوں۔ میں اوروں کی طرح تمہارے نام سے بھی صدقہ خیرات کرتی رہی ہوں۔ اپنے اندر یہ امید پالتی رہی ہوں کہ ایک دن تم وہ نہیں رہو گے جو اب ہو۔ تم اسے میرا دیوانہ پن کہہ سکتے ہو لیکن میں تمہارے لیے روتی رہی ہوں۔ اوپر والے سے تمہارا بھلا مانگتی رہی ہوں.....''

''تالیاں..... ایک بار پھر تالیاں..... بھئی لوگ سچ کہتے ہیں، رنگ والی میں ایک جادوگرنی رہتی ہے جو اپنے چلتروں کے ساتھ چنگے بھلے لوگوں کی بیڑیوں میں وٹے ڈال دیتی ہے۔ وہ اس کے نام کی مالا جپنے لگتے ہیں۔ بالکل سچ کہتے ہیں لوگ..... لیکن ایک بات یاد رکھ! میں خود بھی اللہ دین ہوں۔ تیری جیسی جادوگرنیوں کو اپنے مُوت کی دھار میں بہا دیتا ہوں، بشوں کر کے.....''

شانی نے بولنا چاہا مگر فرطِ رنج سے اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ ریاض نے بے رحمی سے اس کے لمبے ریشمی بالوں کو جھٹکا دیا اور پھنکارا۔ ''اپنی یہ ساری لولو پوپو باتیں اپنے پاس رکھ..... تیرے جیسی فٹے کٹنیوں کے ایسے بڑے ناٹک دیکھے ہوئے ہیں ہم نے۔ یہ جو خلقِ خدا کی محبت چڑھی ہوئی ہے ناں تجھ پر، دو منٹ میں اتار کر ایک طرف رکھ دوں گا۔ اپنی چمڑی بچانے کے لیے کسی طوائف کی طرح الٹا سیدھا ناچتی نظر آئے گی..... حرامزادی..... آوارہ کتیا.....'' اس نے شانی کے لیے فصیح و بلیغ گالیاں بکیں پھر ذرا دم لے کر بولا۔ ''یہ محبت نہیں لیڈری ہے۔ تیری اصل محبت، صرف اس حرامی ڈکیت کے پاس گھسنے میں ہے..... باقی سب گندی فلم، گندہ ڈراما! اگر نہیں تو پھر آج میرے یا ہیرے کے ساتھ بھی اس طرح سو کر دکھا جس طرح اس حرامی کے ساتھ سوتی ہے۔''

شانی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہچکیاں لینے لگی۔ جاتے جاتے ریاض نے بیڈ کو زور دار ٹھوکر لگائی اور بولا۔ ''کان کھول کر سن لے۔ اب تیرے پاس چار گھنٹے سے بھی کم ہیں.....''

شانی آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ اس کی چوٹیں تکلیف دے رہی تھیں اور دل خشک پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ریاض کے کمرے سے جانے کے بعد بھی دیر تک اس کی بُو کمرے میں چکراتی رہتی تھی۔ اس سے پہلے بھی اس کریہہ بُو سے اس کا واسطہ پڑ چکا تھا۔ شاید ہر زور آور اور جابر جسم کی بُو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس کے جاگیردار شوہر فاخر کے جسم سے بھی تو ایسی ہی باس آیا کرتی تھی..... اور یہ باس لاہور کی ایک کوٹھی میں قاسم برلاس کے جسم سے بھی آئی تھی..... اور اس ریچھ کے جسم سے بھی جس نے گریس کے بچے پر حملہ کیا تھا..... اور پھر چوہدری بشیر کے جسم سے بھی جب اس نے شانی کو ایک جعلی نکاح نامے کی آڑ میں روندنا چاہا تھا۔ ہاں..... یہ جانی پہچانی بُو تھی۔

شانی بندھی پڑی رہی اور اپنے دل کی دھڑکنیں گنتی رہی۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹہ اسی عالم میں گزر گیا۔ اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ ایک بار پھر کوئی سلائیڈنگ دروازے سے باہر موجود ہے۔ چند سیکنڈ بعد ایک زوردار آواز آئی جیسے دروازے سے کوئی وزنی شے ٹکرائی ہو۔ چند سیکنڈ مزید گزرے پھر دروازہ کھل گیا۔ اس کے ساتھ ہی کئی افراد کے بلند آواز سے بولنے کی آوازیں آئیں۔ دو تین افراد دندناتے ہوئے اندر گھس آئے۔ ان کے رنگ سانولے اور جسم توانا تھے۔ انہوں نے گھیر دار شلواریں اور شلو کے پہن رکھے تھے۔ انہوں نے اپنے منہ سر ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے تاہم شانی دیکھتے ہی پہچان گئی۔ وہ مہتم تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور دو کے ہاتھ میں ایک فٹ لمبے چھرے تھے جو سر کنڈے وغیرہ کاٹنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے سر پر خون سوار تھا اور ان میں سے ایک کے جسم پر بھی تازہ لہو کے چھینٹے نظر آ رہے تھے۔ شانی سکتہ زدہ رہ گئی۔

اسی دوران میں شانی نے سردار دراج کو دیکھا۔ وہ لپکتا ہوا اندر آیا اور شانی کو بیڈ سے بندھا دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ کچھ دیر تک تو جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں ہوا۔ پھر وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ''نکڑی! تم یہاں؟''

شانی خشک لبوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ ''تم ٹھیک تو ہو ناں نکڑی..... تم کو کچھ ہوا تو نہیں؟'' دراج تڑپ کر بولا پھر وہ اپنے بندوں سے مخاطب ہوا۔ ''کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ کھولو ان کو۔'' وہ خود بھی شانی کی بندشیں کھولنے لگا۔ چند سیکنڈ بعد شانی آزاد تھی۔ اس

کا لباس کہیں کہیں سے پھٹا ہوا تھا۔ دراج نے بستر کی چادر شانی کے سر پر ڈال دی۔

''میں اس کُتے ریاج کی ایک ایک بوٹی کر کے اپنے کتوں کو کھلاؤں گا۔ اس کے بچے بچے کو مار دوں گا۔'' دراج پھنکارا۔

کہیں باہر سے کسی عورت کے چلانے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کا منہ بند کیا گیا ہے اور وہ گھٹی گھٹی آواز میں دہائی دے رہی ہے پھر یہ آواز قریب آتی چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد دو بندے کسمساتی ایک تیس بتیس سالہ عورت کو گھسیٹتے ہوئے اندر لائے۔ عورت ذرا فربہ اندام لیکن خوش شکل تھی۔ اس کا بالائی لباس تار تار ہو چکا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ ''یہ اس کُتے ریاج کی جنانی (بیوی) ہے کھیاجی۔'' ایک مہتم نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''اس کی جنانی ہے تو تمہاری بھی ہے۔ لے جاؤ اس کو کسی کمرے میں۔'' دراج نے سخت ہیجانی لہجے میں کہا۔ ڈھاٹے کے اندر سے دراج کی بُل خوری آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔

عورت چلائی۔ ''خدا کے لیے نہیں..... خدا کے لیے معاف کر دو..... ہمارا کوئی قصور نہیں۔''

''اوئے چل..... آپاں کسور بھی منوا لیتے ہیں تجھ سے۔'' ایک چھرا بردار مہتم وحشی انداز میں دہاڑا۔

پھر عالم جوش میں اس نے قدرے وزنی عورت کو اپنے بازوؤں میں بھر کر اٹھا لیا۔ عورت نے ایک بار پھر گھگیاتے ہوئے فریاد کی۔ اس کی کراہٹ در و دیوار میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ شانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ غالباً امکان یہی تھا کہ ریاض کوٹھی میں نہیں۔ اس کی غیر موجودگی میں مہتم یہاں حملہ آور ہو گئے ہیں۔ ساؤنڈ پروف تہہ خانے کی وجہ سے شانی کو باہر کی آوازوں کا کچھ پتا نہیں چل سکا تھا۔ تنومند مخنث کے شکنجے میں جکڑی ہوئی لاچار عورت نے ایک بار پھر فریادی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ شانی کے اندر کی وہ عورت جاگ اٹھی جو ہر ظلم کے سامنے دیوار بن جانے کی خُو رکھتی تھی۔

وہ تڑپ کر تنومند افراد کے سامنے آ گئی۔ ''اس کو کہاں لے جا رہے ہو..... اس کا کیا گناہ ہے؟''

دراج خونخوار لہجے میں بولا۔ ''نکڑی! تجھے کچھ کہا نہیں۔ تُو اس معاملے میں نہ آ۔ اس ڈپٹی کے بڑے جلم سہے ہیں آپاں نے۔ اب حساب برابر کرنے کا وقت ہے۔ تُو پیچھے ہٹ جا نکڑی۔''

www.pdfbooksfree.pk

''ظلم ڈپٹی نے کیے ہوں گے.....اس عورت کا کیا گناہ ہے؟''

''تو آپاں کی عورتوں کا کیا گناہ تھا؟ ان کے ساتھ ہرجلم کیا گیا۔ ہر جیادتی کی گئی۔ مار مار کر ہمارے جنوں (جوانوں) کی ہڈیاں کانی کردی گئیں۔''

''دراج! میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔ تم اس کو چھوڑ دو۔ یہ عورت ہے۔''

''عورت سے ہونے والی جیادتی کا بدلہ عورت کو ہی دینا پڑے گا۔'' فریاد کناں عورت کو گود میں بھرنے والا شخص پھنکارا۔

''میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔'' شانی پختہ ارادے کے ساتھ بولی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے عورت پر سے مشتعل مہتم کی گرفت ختم کرنا چاہی۔

مہتم نے سردار دراج کی طرف دیکھا۔ سردار دراج نے کارروائی جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ مہتم شانی کو دھکیلتا ہوا، عورت سمیت اس سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھا جس کی دوسری جانب رنگ والی کی الہڑ مٹیار سکینہ کی جان گئی تھی۔ عورت کربناک انداز میں چلا رہی تھی۔ شانی تڑپ کر سلاخ دار دروازے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ نہ صرف کھڑی ہوگئی بلکہ اس نے دروازے کو بند رکھنے کے لیے کنڈی بھی چڑھادی۔

سردار دراج آتش فشاں تھا۔ وہ شانی کو کندھوں سے پکڑ کر پھنکارا۔ ''نکڑی! تُو پہلے اپنی حالت دیکھ پھر بات کر..... آپاں کی جنانیاں گاجر مولیاں نہیں ہیں۔ آپاں کی چھاتیوں میں آگ جل رہی ہے۔ اس آگ کو ٹھنڈا ہونے دے۔ پیچھے ہٹ جا۔''

''میں نہیں ہٹوں گی۔ مجھے ہٹانا ہے تو پھر مار دو مجھے۔'' شانی نے آخری الفاظ اتنے زور سے کہے کہ وہ پورے بیس منٹ میں گونج اٹھے۔ وہ چٹان کی طرح دروازے کے سامنے موجود تھی۔

ہٹے کٹے شخص نے دو سیکنڈ کے لیے سوچا پھر وہ کسی دوسرے کمرے میں جانے کے لیے تہہ خانے کے بیرونی دروازے کی طرف مڑا۔ عورت مسلسل اس کی آہنی گود میں تڑپ رہی تھی۔ اس کی مزاحمت کو بے اثر کرنے کے لیے ایک دوسرا مہتم مدد کر رہا تھا۔ شانی نے انہیں دروازے سے باہر نکلتے دیکھا تو ایک بار پھر رستے میں حائل ہوگئی۔ ''میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔'' اس نے کہا اور عورت کو گرفت سے چھڑانے کے لیے دیوانہ وار کوشش کرنے لگی۔

اس کا آہنی عزم دیکھ کر دراج کا ہیجان جیسے ایک دم ماند پڑ گیا۔ وہ نسبتاً کم سخت لہجے میں بولا۔ ''نکڑی! تُو شاید اپنے ہوش میں نہیں۔ دشمن کی جنانی کے لیے اتنی جد (ضد)؟''

''یہ دشمن کی عورت نہیں.....بس عورت ہے..... مجھے تم پر شرم آ رہی ہے دراج! خدا کے

لیے ان کو روک دو۔'' شانی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

دراج نے چند سیکنڈ تک شانی کے چٹانی چہرے کو دیکھا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اس حرام جادی کے ہتھ باندھو اور اسے بند کر دو اس تہہ کھانے میں۔'' عورت مہتم کی جابر آغوش سے نکل آئی۔

اچانک کہیں اوپر سے پھر دھاچوکڑی کی آوازیں گونجیں۔ کوئی وزنی شے گری پھر دو تین افراد اندھا دھند بھاگے اور کسی عورت کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ یہ کوئی نوعمر لڑکی لگتی تھی یا شاید لڑکا تھا۔ اس ہنگامے نے سردار دراج سمیت سب کو چونکا دیا۔ وہ سب تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر کی طرف گئے۔ صرف ایک چھریرا بردار مہتم ان کے پاس رہ گیا۔ خوش شکل عورت نے ایک دم شانی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور اپنے لہجے میں دنیا جہاں کی التجا سمیٹ کر بولی۔ ''میری چھوٹی بہن! تمہیں خدا رسول کا واسطہ، میرے بچے کو بچا لو۔ یہ اسے بھی مار دیں گے۔ خدا کے لیے.....'' وہ اچانک شانی کے پاؤں میں گر پڑی اور اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ ''میں زندگی بھر تمہاری غلامی کروں گی، اسے بچا لو۔''

شانی دروازے کی طرف لپکی۔ فربہ اندام عورت بھی جسے ریاض کی بیوی کہا گیا تھا، دروازے کی طرف بڑھی۔ چھریرا بردار مہتم نے فوراً اس کا راستہ روک لیا۔ ''نہیں، تم باہر نہیں جاؤ گی۔'' وہ گرجا۔

''تو پھر تم باہر جاؤ۔ میں اسے یہاں بند کرتی ہوں۔'' شانی نے چلا کر کہا۔

مہتم نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر وہ تہہ خانے سے باہر آ گیا۔ شانی نے سلائیڈنگ دروازہ بند کیا اور باہر سے مقفل کر کے چابی نکال لی۔ اس کے بعد وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھی۔ آوازیں بالائی منزل سے آ رہی تھیں۔ وہ بالائی منزل کی طرف بڑھی۔ اس کے اندازے کے عین مطابق یہ رات کا وقت تھا۔ کوٹھی کے وسیع و عریض احاطے میں گہرا سناٹا نظر آ رہا تھا۔ شانی بالائی منزل کی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سیڑھیوں پر مچھیل ہیرے کی لاش الٹی سیدھی پڑی تھی۔ اس کی شہ رگ بالکل قربانی کے بکرے والے انداز میں کٹی ہوئی تھی۔ شانی اسے پھلانگتی ہوئی بالائی منزل پر پہنچی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جس آواز کو نسوانی سمجھ رہی تھی، وہ نسوانی نہیں تھی بلکہ وہ فربہ اندام عورت کے بچے کی آواز تھی اور غالباً وہ ریاض کا ہی بچہ تھا۔

یہاں بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ بچے کی آواز بھی اب نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ خود کو چھڑا کر کسی طرف نکل گیا تھا یا کوٹھی میں ہی کہیں چھپ گیا تھا۔ شانی چکراتی ہوئی کچن کے سامنے

www.pdfbooksfree.pk

سے گزری اور اسے ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ ایک جواں سال لڑکی کچن کے فرش پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے اردگرد تازہ دودھ بکھرا ہوا تھا اور سالن کا ایک پتیلا اوندھا پڑا تھا۔ لڑکی کی پیشانی اور گردن پر گولی کا نشان تھا۔ وہ مر چکی تھی۔ لڑکی کی ایک ہی جھلک نے شانی کو بتا دیا کہ وہ فربہ اندام عورت کی چھوٹی بہن یا بہت قریبی عزیز ہے۔

دفعتاً لڑکے کی آہ و بکا پھر سنائی دینے لگی۔ شاید اسے پکڑ لیا گیا تھا۔ شانی حتی الامکان تیزی سے آواز کی طرف لپکی۔ یہ ایک وسیع کوٹھی تھی۔ پڑوسی عمارتیں کچھ فاصلے پر دکھائی دیتی تھیں۔ جلد ہی شانی ایک بیضوی کمرے میں پہنچ گئی۔ یہاں سردار دراج کے دو ساتھیوں نے ایک لڑکے کو دبوچ رکھا تھا۔ لڑکے کی عمر چودہ پندرہ برس سے کم نہیں تھی۔ لڑکے کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی قمیص دھجیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔

''کھون کے بدلے کھون۔'' ایک مہتم گرجا۔ ''اپنے بھائی بادل کے بدلے میں مار دو اس کتے کے پلے کو۔''

''ہاں مار دو۔'' ایک اور شخص دہاڑا۔

پہلا شخص ایک فٹ لمبے چمک دار چھرے کے ساتھ لڑکے کی طرف بڑھا۔ شانی ایک بار پھر قاتل اور مقتول کے درمیان دیوار بن گئی۔ اس نے بے حد اضطراب کے ساتھ دہشت زدہ لڑکے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا..... جیسے مرغی چوزے کو پروں میں ڈھانپتی ہے..... اس کے ساتھ ساتھ وہ دراج کو آوازیں دینے لگی۔

لڑکا گر گیا۔ شانی اس کے اوپر گر گئی۔ مہتم لڑکے کو جو وحشیانہ ٹھوکریں رسید کر رہے تھے، وہ شانی کا جسم سہہ رہا تھا۔ وہ بدترین دشمن کا بیٹا تھا لیکن وہ شانی تھی۔ وہ ایک انوکھی عورت تھی، وہ ایک جدا روح تھی۔ تیز دھار چھرے کی ایک ضرب شانی کے کندھے پر لگی۔ ایک اور وار بچاتے ہوئے اس کی انگلیاں زخمی ہو گئیں۔ اس دوران میں دراج بھاگتا ہوا موقع پر پہنچ گیا۔ اس نے شانی کو خطرے میں دیکھا۔

''اوئے چھوڑ دو۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔'' وہ چلایا۔

جیسے شکاری کتے مالک کے حکم پر شکار سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں، وہ تینوں افراد بھی ٹھٹک کر علیحدہ ہو گئے لیکن ان تینوں کے تیور اب بھی خطرناک تھے۔ جب تک وہ سردار دراج کے حکم پر بیضوی کمرے سے باہر نہیں گئے، شانی لڑکے سے علیحدہ نہیں ہوئی۔ لڑکا جس انداز میں غوں غاں کر رہا تھا، اس سے پتا چلا کہ وہ گونگا ہے..... وہ ڈپٹی ریاض کا بیٹا تھا۔ ڈپٹی ریاض کی زبان تلوار سے زیادہ تیز اور بچھو سے زیادہ زہریلی تھی۔ مگر ریاض کا بیٹا زبان ہی نہیں

رکھتا تھا۔

دراج بے بسی کے عالم میں شانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی حیران آنکھیں شاید سوچ رہی تھی کہ کیا کوئی شانی جیسا سنگی شانی بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی اکثر باتیں سمجھ میں نہ آنے والی ہوتی تھیں۔

شانی کراہی۔ ''بس کرو سردار دراج! جو ہو چکا وہی بہت زیادہ ہے۔ اب ان کی جان بخشی کرو اور اپنی جانوں پر بھی رحم کرو۔ اب نکلو یہاں سے۔''

سردار دراج الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''ان کو یہاں جندہ چھوڑ کر جائیں گے تو یہ ہمارے کھلاف ثبوت بنیں گے۔''

''ان کو مار بھی دو گے تو یہ سب کچھ چھپا نہیں رہ سکے گا۔''

سردار دراج آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ اس کا اصل شکار ڈپٹی ریاض اس کے ہتھے نہیں چڑھا تھا۔ مگر وہ یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب یہاں رکنا از حد خطرناک ہے..... اسی دوران میں ایک مہتم بھاگتا ہوا اندر آیا۔ ''پلس کی دو بڑی گڈیاں آئی ہیں۔ بڑے دروازے کے سامنے۔''

''کدھر ہیں؟'' دراج کھڑکی کی طرف لپکا۔

اطلاع لانے والے مہتم اور دراج کے درمیان جو بات ہوئی اس سے اندازہ ہوا کہ یہ پولیس کسی اطلاع پر یہاں پہنچی تھی۔ یقیناً یہاں فائرنگ بھی ہوئی تھی۔ کچن میں پڑی لڑکی کو دو گولیاں لگی ہوئی تھیں۔ شاید اڑوس پڑوس میں سے کسی نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ دراج نے اپنے ساتھیوں کو فوراً یہاں سے نکلنے کا حکم دیا۔ انہوں نے فوراً ضروری ثبوت اٹھائے۔ صرف دو منٹ بعد ساتوں ڈھاٹا پوش مہتم، شانی سمیت کوٹھی کے عقبی دروازے پر تھے۔ اس چھوٹے سے دروازے سے باہر دو کاریں موجود تھیں۔ وہ آناً فاناً کاروں میں بیٹھے اور ایک تنگ سڑک سے ہو کر نکل گئے..... غیر متوقع طور پر کہیں ان کا راستہ نہیں روکا گیا۔

کوٹھی چھوڑنے سے پہلے شانی نے تہہ خانے کی چابی لرزتے کانپتے دہشت زدہ لڑکے کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ لڑکے کے ہاتھ میں چابی نہیں تھما رہی، اس کی ماں کا ہاتھ تھما رہی ہے..... اور یہ احساس اس کے لیے بڑا ہی جاں افزا تھا۔

رات کی تیرگی میں دونوں کاریں آگے پیچھے لاہور کی سڑکوں پر اُڑی چلی جا رہی تھیں۔ شانی دراج کے ساتھ کار کی پچھلی نشست پر موجود تھی۔ سردار دراج گم صم تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تو تھی کہ وہ بالکل اتفاقی طور پر شانی کو ایک خوفناک صورتِ حال سے نکالنے میں کامیاب

www.pdfbooksfree.pk

ہوا ہے مگر اس بات کا دکھ بھی تھا کہ وہ ڈپٹی ریاض کو انجام تک نہیں پہنچا سکا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں دراج؟'' شانی نے پوچھا۔

''تم کہاں جانا چاہتی ہو کنڑی؟''

''مجھے رستم کے پاس پہنچا دو۔'' وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

''آپاں وہیں جا رہے ہیں؟''

''کتنی دیر کا رستہ ہے؟''

''دس بارہ منٹ لگیں گے۔ گلبرگ پہنچنا ہے۔''

شانی جلد از جلد رستم کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ وقت کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے۔ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کچھ ہو جائے، وہ رستم کو سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی۔ اپنے بارے میں، خالو انجاز کے بارے میں اور ان حالات کے بارے میں جنہوں نے انہیں ایک دوسرے سے دور کیا۔ وہ رستم کے کشادہ سینے سے لگ کر دیر تک آنسو بہانا چاہتی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ آج فون پر رستم اور ریاض کے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ ریاض نے رستم کو تھوڑی سی مہلت دی تھی اور اس مہلت کے دوران میں رستم نے اپنے آپ کو ریاض کے حوالے کرنا تھا۔ شانی کو خوف تھا کہ کہیں ایک بار پھر وڈے ڈیرے والی کہانی نہ دہرا دی جائے۔ شانی کی خاطر رستم، ریاض کے سامنے پیش ہوا تھا اور ریاض نے اس پر سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔

''کیا تم میں سے کسی کے پاس موبائل فون نہیں؟'' شانی نے دراج سے پوچھا۔

''نہیں کنڑی۔ پڑھو پریشان کیوں ہوتی ہے، بس جرا سا رستہ رہ گیا ہے۔''

''اس سے کہو گاڑی ذرا تیز چلائے۔'' شانی نے کہا۔

دراج کی ہدایت پر گاڑی چلانے والے نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ شانی زخمی تھی۔ کندھے سے تو باقاعدہ خون رس رہا تھا مگر ان لمحوں میں شانی کو ان زخموں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اصل تکلیف تو سینے کے اندر تھی۔ دل کی گہرائی میں..... جہاں حالات کا مہیب ستم مسلسل کچوکے لگا رہا تھا۔

گاڑیاں تیز رفتاری سے گلبرگ کی ایک کوٹھی میں داخل ہوئیں۔ پرانی تعمیر کی اس کوٹھی میں بس کہیں کہیں روشنی نظر آ رہی تھی۔ باغیچے، ڈرائیو وے، پورچ، سب تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''یہیں ہیں رستم؟'' شانی نے بے چینی سے پوچھا۔

دراج نے اثبات میں جواب دیا۔ ملازم نے مین گیٹ فوراً بند کر دیا تھا۔ وہ سب گاڑیوں سے اترے۔ شانی کی نگاہ سب سے پہلے ناصر پر پڑی۔ وہ رہائشی حصے کے داخلی دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور قدرے حیرت سے گاڑیوں کو اور گاڑیوں سے اترنے والے مہتموں کو دیکھ رہا تھا۔ سردار سمیت سارے مہتموں نے اب اپنے ڈھاٹے اتار دیئے تھے۔ ناصر کو دیکھ کر شانی کا دل بھر آیا۔ جیسے مدت سے بچھڑا ہوا کوئی ساتھی نظر آیا تھا۔ وہ اس کی طرف لپکی۔ جب وہ پورچ میں پہنچی تو ناصر نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ دو تین سیڑھیاں اُتر کر شانی کی طرف بڑھا۔ ''بھابی! آپ یہاں؟'' وہ بے حد حیرت سے بولا۔

''ناصر! رستم کہاں ہیں؟ شانی نے بلا تمہید کہا۔ اس کی بے تابی قابلِ دید تھی۔

''کیا ہوا بھابی! وہ یہیں ہیں..... آپ..... حوصلہ رکھیں۔''

''مجھے ان سے ملاؤ ناصر! جلدی کرو۔''

''اوہو، آپ تو زخمی لگ رہی ہیں۔ آپ اندر تو آئیں۔'' ناصر نے اس کے کندھے سے اوپر چادر پر خون کا دھبا دیکھ کر کہا۔

وہ شانی کو لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھا۔ وہ دراج اور اس کے ساتھیوں کو بھی سخت الجھن زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ غالباً اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہ لوگ رات کے اس پہر کہاں سے وارد ہوئے ہیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دراج کے مسلح ساتھیوں کو یہاں پہلی بار دیکھ رہا ہے۔

شانی نے اندر پہنچتے ہی ایک بار پھر رستم کے بارے میں پوچھا۔ ناصر نے کہا۔ ''وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں سے نکلے ہیں۔''

''کہاں؟'' وہ پوری جان سے تڑپ گئی۔

''انہوں نے بتایا نہیں۔ میں بھی گیٹ کی آواز سن کر باہر آیا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سفید گاڑی بھی نہیں ہے۔ شاید اسی پر گئے ہیں۔ میرا خیال ہے اجمل کو کسی دوا کی ضرورت پڑی ہو گی۔''

''اوہ مائی گاڈ!'' شانی نے سر تھام لیا۔ ''ناصر تمہیں کچھ پتا نہیں۔ ان کا موبائل نمبر ہے تو ملاؤ پلیز..... جلدی کرو۔''

ناصر نے پی ٹی سی ایل کی لائن سے رستم کا نمبر ملانے کی کوشش کی۔ اسی دوران میں جہانگیر سلیپنگ سوٹ پہنے برآمد ہوا۔ شانی نے خود کو اوڑھنی میں چھپا لیا تھا۔ درحقیقت وہ

www.pdfbooksfree.pk

جہانگیر کو پہچان ہی نہیں پائی تھی۔ جہانگیر نے ایک سوالیہ نظر شانی پر ڈالی پھر ناصر سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''یار! وہ بندہ کدھر ہے؟ کمرے کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے۔''

''کون..... طفیل؟'' ناصر نے ٹھٹک کر پوچھا۔ جہانگیر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کہیں وہ رستم بھائی کے ساتھ تو نہیں گیا؟'' ناصر کا لہجہ متفکر تھا۔

''یہ فون کس کو کر رہے ہو؟'' جہانگیر نے ناصر سے پوچھا۔

''رستم بھائی کو۔''

''اس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ میں نے بھی دو تین بار ٹرائی کی ہے۔'' جہانگیر نے بتایا۔

شانی نے ناصر کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سسک کر بولی۔ ''ناصر! ہم نے دیر کی تو..... پھر کبھی رستم کو دیکھ نہیں سکیں گے۔ مم..... مجھے ڈر ہے کہ وہ..... اپنی گرفتاری دینے.....'' اس سے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

اب ناصر کو بھی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ ناصر، شانی اور جہانگیر دوڑتے ہوئے باہر آئے اور پورچ میں کھڑی ایک گاڑی کی طرف لپکے۔ جہانگیر ساتھ ساتھ موبائل پر رستم سے رابطے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ ناصر نے سنبھالی۔ رات کے سناٹے میں ہنڈا سوک کے پہیے چرچرائے اور وہ لہراتی ہوئی سڑک پر آ گئی۔

''پہلے قریشی تھانے کی طرف چلو۔'' پچھلی نشست سے شانی نے کہا۔

ناصر نے ایک راؤنڈ اباؤٹ سے گاڑی کو گھمایا اور بڑی سڑک پر ڈال دیا۔ لاہور کی اس ٹھہری ہوئی خاموش رات میں ایک طوفان سر اٹھا رہا تھا۔

ابھی وہ تھوڑا آگے ہی گئے تھے کہ جہانگیر کا رابطہ رستم سے ہو گیا۔ ''ہیلو رستم! کہاں ہو تم؟'' جہانگیر نے بے حد بے قراری سے پوچھا۔

''کیوں، کیا بات ہے؟'' رستم کی گمبھیر آواز اسپیکر سے ابھری۔

''رستم یار! خدا کے لیے بتاؤ کہاں ہو؟ وہ حرامزدہ طفیل بھی کمرے میں نہیں ہے۔''

''وہ میرے ساتھ ہے۔''

''کہاں جا رہے ہو تم؟''

دوسری طرف خاموشی رہی۔ ناصر کو لگا کہ کہیں رستم رابطہ منقطع نہ کر دے۔ اس نے موبائل سیٹ جہانگیر کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ''رستم بھائی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہم آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

چند سیکنڈ کی بوجھل خاموشی کے بعد رستم نے نہایت گمبھیر آواز میں کہا۔ ''ناصر! میں طفیل

کو اچھرہ کی طرف لے جا رہا ہوں۔ شمع چوک کے آس پاس میں اسے کہیں چھوڑ دوں گا۔''

''لیکن کیوں؟''

رستم کی بوجھل آواز ابھری۔ ''تمہیں معلوم نہیں ناصر! ایک بار پھر قسمت نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے..... ہم ایک بڑی مصیبت میں ہیں۔ شانی بی بی دوبارہ ڈپٹی ریاض کے قبضے میں چلی گئی ہیں۔ میں نے خود فون پر بات کی ہے ان سے۔ وہ بڑی مشکل میں ہیں ناصر۔'' رستم کی آواز بھرا گئی۔

''لیکن رستم بھائی ابھی تھوڑی دیر.....'' اس سے پہلے کہ ناصر کا فقرہ مکمل ہوتا اور وہ رستم تک یہ خوشخبری پہنچا تا کہ شانی یہاں موجود ہے، شانی نے ناصر کا بازو دبا کر اسے خاموش کر دیا۔ ناصر حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ شانی نے اشارے سے اسے سمجھایا کہ وہ ابھی رستم کو اس بارے میں نہ بتائے۔

رستم کی آواز دوبارہ ابھری۔ ''ناصر! ریاض کے ساتھ کل سے فون پر میری بات ہو رہی ہے۔ وہ ہم تینوں کی گرفتاری کے سوا کسی بات پر راضی نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ بس اس حد تک مانا ہے کہ اگر ہم طفیل کو چھوڑ دیں تو وہ بی بی جی پر تشدد کا سلسلہ بند کر دے گا۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسے چھوڑ دیں۔ میں نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور ہاتھ بھی باندھے ہوئے ہیں۔ شمع سینما کے قریب میں اسے چھوڑ کر واپس آؤں گا۔ وہاں سے یہ خود ہی ریاض کے پاس پہنچ جائے گا۔''

''کہیں آپ خود گرفتاری دینے کا ارادہ تو نہیں کر رہے؟''

''نہیں..... ابھی تو نہیں۔ میں واپس آتا ہوں تو اس بارے میں بات کرتے ہیں۔''

''لیکن رستم بھائی!'' ناصر نے الجھن سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مائیک پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے شانی کی طرف دیکھا۔ شانی نے فون ناصر سے لیا اور کال منقطع کر دی۔

ناصر اور جہانگیر دونوں حیران تھے۔ یہ بات تو ان دونوں کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ شانی طفیل کی رہائی چاہ رہی ہے..... مگر کیوں؟

شانی کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی اور آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے سرخ نظر آ رہی تھیں۔

ناصر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! ریاض کے بھتیجے کو ہمارے پاس رہنا چاہیے اس سے ہم بارگیننگ کر سکیں گے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''اس سے کچھ نہیں ہوگا ناصر۔'' وہ کراہی۔''بس یہ ہوگا کہ بھڑکتی ہوئی آگ کچھ اور بھڑ کے گی۔ کچھ اور لوگ قتل ہوں گے۔ کچھ اور مائیں بَین ڈالیں گی۔ اس آگ کو ٹھنڈا کرو ناصر! کسی بھی طرح ٹھنڈا کرو..... ورنہ کچھ باقی نہیں بچے گا۔''

ناصر اور جہانگیر اضطراب کے عالم میں شانی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ پوری طرح شانی سے متفق نہیں تھے مگر شانی کے چہرے پر ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ وہ اپنے لب نہیں کھول سکے۔ گاڑی واپس کوٹھی کی طرف پلٹ آئی۔ یہ سارا معاملہ ناصر اور جہانگیر کے لیے بے حد تجسس انگیز تھا۔ راستے میں ناصر نے شانی سے اس بارے میں پوچھا.....

''بھابی! میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے۔ آپ تو رنگ والی میں تھیں۔ وہاں سخت پہرا ہے پھر آپ ڈپٹی ریاض تک کیسے پہنچ گئیں..... اور اس سے بھی زیادہ حیرانی یہ ہے کہ آپ اس بدبخت کی گرفت سے نکل بھی آئیں۔ سردار دراج والا معاملہ بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہ پتا نہیں کب کوٹھی سے نکلا ہے..... اور اس کے یہ ہٹے کٹے مسلح ساتھی..... یہ کہاں سے آئے ہیں؟''

شانی نے سوالیہ نظروں سے جہانگیر کی طرف دیکھا۔ ناصر نے اس کا انداز بھانپ کر کہا..... ''جہانگیر بھائی سے کوئی پردہ نہیں۔ آپ ان کے سامنے بات کر سکتی ہیں۔''

شانی نے مختصر الفاظ میں ساری صورت حال ناصر کے سامنے بیان کر دی۔ اس کا سکینہ کے ساتھ رنگ والی کی حویلی سے نکلنا، لاہور پہنچنا..... یہاں مشکوک افراد کا ان کے پیچھے لگنا اور بالآخر شانی کا ڈپٹی ریاض کی تحویل میں چلے جانا..... اس نے سب کچھ ناصر کو بتا دیا۔ اگر کوئی بات چھپائی تو وہ سکینہ کی دردناک موت تھی۔ اس نے ناصر کو بتایا کہ لاہور میں صرف وہی ریاض کے ہتھے چڑھی، سکینہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔

پتا نہیں کہ وہ یہ بات کیوں چھپا رہی تھی؟ بس اس کے اندر سے آواز سی آ رہی تھی کہ وہ یہ بات بتائے گی تو بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے کچھ اور بھڑ کیں گے۔ حالات اور بھی سنگین ہو جائیں گے۔

جہانگیر نے پوچھا۔''بھابی! سردار دراج ریاض کی کوٹھی تک کیسے پہنچ گیا؟ کیا اسے کوئی اطلاع ملی تھی؟''

''اس بارے میں تو وہی بہتر بتا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے مدد کی۔ وہ اور اس کے ساتھی بڑے وقت پر پہنچے..... لیکن..... وہاں بھی جو کچھ ہوا ہے، وہ شاید نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سردار اور اس کے ساتھی بہت بپھرے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہاں لوگوں کی جان لی

ہے۔ دو لاشیں تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی جانی نقصان ہوا ہوگا۔ اللہ رحم کرے۔ آثار خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ ریاض نے اب بہت بھڑ کنا ہے۔''

وہ منزل پر پہنچ گئے۔ کوٹھی کا گیٹ کھلا۔ پہرے دار نے انہیں پہچاننے کے بعد کوٹھی کے اندر جانے دیا۔ سردار دراج اور اس کے مسلح ساتھی برآمدے میں موجود تھے۔ ان کے ہتھیار ابھی تک ان کے پاس موجود تھے۔ گاڑی میں سے نکلنے سے پہلے ناصر نے شانی سے پوچھا۔ ''رستم بھائی نے پوچھنا ہے کہ اگر آپ یہاں پہنچ چکی تھیں تو پھر ہم نے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کیوں نہیں۔ اس بارے میں رستم بھائی سے کیا کہنا ہے؟''

''پلیز! ابھی آپ دونوں نے انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ بس یہی کہنا ہے کہ جس وقت فون ہوا، تب تک میں نہیں پہنچی تھی۔ بعد میں موقع دیکھ کر ہم انہیں سچ بتا دیں گے۔ تم سمجھ ہی رہے ہو نا کہ ابھی یہ سچ انہیں بہت دکھ دے گا۔''

ناصر اور جہانگیر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ناصر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اجمل کہاں ہے؟'' شانی نے بے تابی سے پوچھا۔

''ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں۔'' ناصر نے دائیں طرف اشارہ کیا۔

شانی، اجمل کو دیکھنے کے لیے فوراً کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ ناصر لمبے ڈگ بھرتا ہوا دراج کی طرف گیا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ناصر کے ذہن میں کئی سوال ابھر رہے تھے۔ وہ ان سوالوں کے جواب دراج سے جاننا چاہ رہا تھا۔

''یہ سب کیا ہوا ہے دراج؟ رات تو بیچ تو تم اپنے کمرے میں آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ ڈپٹی ریاض کے ٹھکانے کا تمہیں کیسے پتا چلا؟ اور کیسے پتا چلا کہ بھابی شانی وہاں ہیں؟ اور..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ بھابی بتا رہی ہیں کہ وہاں لاشیں بھی پڑی ہیں۔''

دراج کی آنکھیں ابھی تک سرخ انگارہ تھیں۔ اس کے سر پر جیسے خون سوار تھا۔ وہ پھنکارا۔''اس حرامی ریاج کی قسمت چنگی ہے، وہ بچ گیا ہے۔ آپاں نے اس کو چھوڑنا نہیں تھا۔ اس کا سر کاٹنا تھا اور تھیلے میں ڈال کر لانا تھا یہاں۔'' دراج نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے کینوس کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے وحشی لہجے نے ناصر جیسے شخص کو بھی ہلا دیا۔

دراج نے اپنی بات جاری رکھی۔''آپاں کو اس بات کا تو ڈھاڈا غم ہے کہ ریاج وقتی طور پر بچ گیا ہے، پر اس بات کی بہت جیادہ خوشی بھی ہے کہ اس نیلی چھتری والے نے مجھ جیسے ''بچ نمانے'' سے ایک بہت چنگا کام کرا دیا ہے۔ اس حرام جادے ریاج نے اپنی نکڑی چوہدرائی کو وہاں کوٹھی میں بند کیا ہوا تھا۔ پلنگ چارپائی کے ساتھ رسیوں سے باندھا ہوا تھا۔ تم

www.pdfbooksfree.pk

خود دیکھ لو۔ اس کی مار سے نکڑی کا پنڈا نیلو نیل ہے۔ اس کی نیت نکڑی کی جان لینے کی تھی.....''

''یہ تو جو ہوا بہت اچھا ہوا ہے دراج! اوپر والے نے بھابی کے لیے اور ہم سب کے لیے تمہیں رحمت کا فرشتہ بنایا ہے مگر..... یہ بہت خطرے والا کام تھا۔ اس میں مشورہ ہونا چاہیے تھا۔ شاید اگر مشورہ ہوتا تو ڈپٹی ریاض کا کام بھی تمام ہو جاتا۔''

دراج نے ناصر کو تفصیل بتائی کہ کس طرح اس کے ایک ساتھی نے ریاض کے ٹھکانے کا سراغ دیا۔ کس طرح اس نے اپنے مسلح ساتھیوں کو گوجرانوالہ سے لاہور بلایا اور کس طرح ریاض کی کوٹھی پر ہلا بولا۔ سارا کام پروگرام کے عین مطابق ہوا مگر بدقسمتی سے ریاض اس وقت گھر میں نہیں تھا۔ دراج نے ایک بار پھر چھاتی ٹھونک کر کہا۔ ''اگر وہ گھر میں ہوتا تو اس وقت اس تھیلے میں اس کا کٹا ہوا سر ہوتا۔''

ابھی ناصر اور دراج کے درمیان گفتگو جاری تھی کہ بیرونی گیٹ پر ہارن سنائی دیا۔ ناصر نے کھڑکی میں سے دیکھا، مسلح چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ اندر آنے والا رستم ہی تھا۔ اس کی سفید گاڑی ڈرائیو وے پر آئی اور دھیرے دھیرے چلتی پورچ میں رک گئی۔ اندر سے رستم نکلا۔ اس کے لمبے بال منتشر تھے، چہرہ دکھ کی تصویر بنا ہوا تھا۔ اس کی چال میں غیر محسوس سی لنگڑاہٹ اب بھی تھی تاہم کسی وقت بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔ وہ بڑے تھکے تھکے انداز میں چلتا ہوا زینے چڑھا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ناصر نے سوچا کہ کمرے میں جا کر اسے بھابی شانی والی خوشخبری سنائے مگر پھر اسے یہ زیادہ مناسب محسوس ہوا کہ شانی خود ہی رستم کے پاس پہنچے۔ یہ سرپرائز یقیناً رستم پر شادیٔ مرگ طاری کر سکتا تھا۔ ناصر فوراً شانی کے پاس پہنچا۔ وہ اجمل کے سرہانے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ بیمار اجمل کے کندھے پر تھے۔ دونوں ڈولے کی موت کو یاد کر کے اشک بار ہو رہے تھے۔ ناصر نے ان کے قریب جا کر کہا۔ ''بھابی! رستم بھائی آ گئے ہیں۔''

شانی کے چہرے پر رنگ سا لہرا گیا۔ اضطراب، خوشی، خوف..... سب کچھ اس رنگ میں شامل تھا۔ ''میں ابھی آتی ہوں اجمل۔'' شانی نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ ناصر کے ساتھ چلتی ہوئی زینوں تک پہنچی۔ ناصر نے اسے اشارے سے بتایا کہ رستم کس کمرے میں ہے۔ شانی زینے چڑھ کر اوپر آ گئی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ دوسری، تیسری دستک پر اندر سے رستم کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''آ جاؤ ناصر!''

شانی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ وہ صوفے پر نیم دراز تھا اور موبائل پر کوئی نمبر ملانے میں مصروف تھا۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ یکایک اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی نگاہ شانی پر پڑی اور جیسے ساکت ہو کر رہ گئی۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سگریٹ کا پیکٹ اس کی گود سے نکل کر گرا اور سگریٹ قالین پر بکھر گئے۔

''شانی..... آپ..... یہاں؟'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔

''ہاں رستم۔''

''مگر..... آپ..... تو.....'' وہ ہکلا کر رہ گیا۔

''رستم! میں نکل آئی ہوں ریاض کے پاس سے۔'' شانی نے اَشک بار لہجے میں کہا۔

''لیکن..... کب..... یہ کیسے ہوا..... میرا مطلب ہے آپ.....'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ انتہا درجے کی حیرت بھی تھی۔

شانی بے ساختہ رستم کی طرف بڑھی اور اس کے گلے لگ گئی۔ اس نے رستم کو اپنی بانہوں میں لیا اور سسکنے لگی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہلنے لگا۔ رستم پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔ رستم کا شانہ، شانی کے گرم آنسوؤں سے بھیگنے لگا۔

''رستم! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو دکھ دیا ہے۔ میں آپ کی مجرم ہوں۔ آپ مجھے جو سزا دیں، مجھے منظور ہو گی۔'' وہ کہتی چلی گئی۔

رستم تحیر زدہ تھا۔ اس نے شانی کو ٹٹولا..... جیسے اس کے صحیح سالم ہونے کا یقین کرنا چاہتا ہو۔ تب اس نے تسلی آمیز انداز میں اسے بازوؤں میں لے لیا۔ ''میرا دماغ پھٹ جائے گا شانی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مجھے بتائیں کہ آپ یہاں کیسے پہنچیں؟''

''میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گی۔ پہلے آپ مجھے اس دکھ کے لیے معاف کریں جو میں نے آپ کو دیا۔'' وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے چھپائے سسکی۔

''معافی تو مجھے بھی مانگنی تھی آپ سے لیکن آپ نے تو دو تین مہینے سے میری بات ہی نہیں سنی۔ میں دن رات آپ کے فون کا انتظار کرتا رہا مگر جب فون ہوا تو آپ نے بس دو لفظ بول کر بند کر دیا۔ ایسا کیوں کیا آپ نے شانی؟ کیوں اتنا انتظار کرایا؟ آپ کو پتا تھا کہ میرا ایک ایک پل کیسے گزر رہا ہو گا۔ آپ سب جانتی تھیں۔'' رستم کی آواز بوجھل ہو گئی۔

شانی کسی آکاش بیل کی طرح رستم سے چمٹی ہوئی تھی۔ شرم کو بالائے طاق رکھ کر اس نے نم ہونٹوں سے رستم کا رخسار چوما۔ جواب میں رستم نے بھی اسے چوما۔ وہ دیر تک گلے

www.pdfbooksfree.pk

لگے رہے ان کے دل روتے رہے۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں بند کمرے میں ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ وہ اس کے شانے سے لگی ہوئی تھی۔ وہی مضبوط شانہ جس کا لمس اسے ہر غم اور فکر سے آزاد کرتا تھا۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ وہ کیسے اور کیونکر ڈپٹی ریاض کی مہلک ترین گرفت سے بچ کر یہاں پہنچ سکی ہے۔ اس نے اس کرشماتی واقعے کی پوری تفصیل رستم کو بتائی۔ رستم تحیر میں ڈوب کر سنتا رہا۔ ریاض کی ڈیفنس روڈ والی رہائش گاہ پر دراج اور اس کے ساتھیوں کی ڈرامائی کارروائی کا ذکر سنسنی خیز تھا۔ آخر میں شانی نے بتایا۔ ''ریاض کی قسمت اچھی ہے کہ وہ کچھ ہی دیر پہلے تیار ہو کر گھر سے جا چکا تھا..... ورنہ آج دراج اور اس کے ساتھیوں سے اس کا بچنا مشکل تھا۔ وہ سب ایک دم خونی ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے چھرے اور پستول تھے۔ انہوں نے وہاں کئی لوگوں کو جان سے مار دیا ہے۔ ریاض کی بیوی اور بیٹا بھی مشکل سے جان بچا سکے ہیں۔''

''دراج اور اس کے ساتھیوں کا تو کوئی نقصان نہیں ہوا؟'' رستم نے پوچھا۔

''نہیں، وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔''

''آپ کو دراج ہی یہاں لایا ہے؟''

شانی نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ہم آپ کے آنے سے بس تھوڑی ہی دیر پہلے یہاں پہنچے ہیں۔ بس دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہیں۔''

رستم نے جذباتی انداز میں شانی کے دونوں ہاتھ تھامے۔ ''مجھے اب تک اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا۔ میں تو یہاں بیٹھا ریاض سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ اب کیا چاہتا ہے..... لیکن اب میں آپ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔''

''ہاں، مجھے ناصر نے سب کچھ بتایا ہے۔ اس کا بھتیجا طفیل آپ کے پاس تھا۔ آپ شاید اسے کہیں چھوڑنے گئے تھے۔''

رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں نے اپنی پیشانی کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جو وہ دیکھ رہا ہے، وہ وہم نہیں حقیقت ہے۔ پھر اچانک رستم کی نگاہ شانی کے کندھے پر پڑی۔ یہاں چادر پر خون کا دھبا تھا۔ ''اوہ..... آپ تو زخمی ہیں۔'' وہ تڑپ گیا۔

''نہیں، معمولی چوٹ ہے رستم۔'' شانی نے کہا پھر ذرا توقف سے جذباتی لہجے میں بولی۔ ''اصل زخم تو دل میں ہیں۔''

وہ ایک بار پھر رستم کے شانے سے لگ گئی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ رستم کو سکینہ کی

اندوہناک موت کے بارے میں بتا دے۔ مگر ایسا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رستم اور ریاض تو پہلے ہی دو آتش فشاں چوٹیوں کی طرح دہک رہے تھے۔ اس آگ میں تیل کا یہ چھینٹا اور بھی مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کے لیے اپنے سینے سے ابھرنے والی سسکیوں کو سینے میں ہی دبا گئی۔

ان کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے بہت سی باتیں تھیں، بہت سے سوال جواب تھے لیکن رستم پہلے دراج سے ملنا چاہتا تھا۔ اس نے شانی سے بس چند منٹ کی اجازت لی اور کمرے سے نکل گیا۔ شانی نے دیکھا، کھڑکیوں سے باہر رات کا قاتل اندھیرا سرسرا رہا تھا۔ اس اندھیرے میں مہلک خاموشی تھی۔ وہی خاموشی جو طوفانوں کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

☆=======☆=======☆



www.pdfbooksfree.pk



سکینہ مر چکی تھی اور اس کی آنکھوں کے سامنے مری تھی لیکن شانی نے ابھی تک کسی کو بتایا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اپنے شریکِ حیات رستم کو بھی نہیں..... مگر اس خبر کو وہ رستم سے کب تک چھپا سکتی تھی؟ شانی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں رنگ والی میں حالات کیا ہیں۔ اسے رنگ والی سے آئے اب 72 گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ یقینی بات تھی کہ اس کی اور سکینہ کی گمشدگی نے وہاں ہلچل مچا دی ہوگی۔ بہرحال، وہ اس بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ یہ خبر عام ہوئی ہوگی یا نہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ بدنامی کے خوف سے حویلی میں اس خبر کو دبا لیا گیا ہو اور چپکے چپکے ان دونوں کی تلاش کی جا رہی ہو۔ اگر یہ تلاش چپکے چپکے نہ ہوتی اور خبر پھیل چکی ہوتی تو پھر پچھلے ڈیڑھ گھنٹے میں ناصر نے اس سے کوئی نہ کوئی سوال ضرور کیا ہوتا۔

اب وہ کیا کرے؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ حویلی میں بابا خادم حسین نے اسے جو کچھ بتایا تھا، اس کے بعد اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اسے خالوا عجاز کا دوسرا چہرہ نظر آیا تھا اور یہ بے حد مختلف تھا۔ اس کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ خالوا عجاز وہ نہیں رہے جو کبھی تھے۔ ان کی نظریں اس کی بیش بہا جائیداد پر لگ گئی ہیں۔ وہ اس حوالے سے اپنے چھوٹے بھائی شاداب کو ایک مہرے کے طور پر آگے بڑھا رہے ہیں۔ شاداب کچھ عرصہ پہلے انگلینڈ سے پاکستان میں آیا تھا۔ اس نے انڈسٹری لگائی تھی..... رنگ والی میں آنا جانا شروع کیا تھا۔ تایا معصوم اور پھوپی آمنہ کے ساتھ اسے بہت لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ ان کے لیے اکثر قیمتی تحفے لاتا تھا۔ اب شانی کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ یہ سارا کھیل کس لیے کھیلا جا رہا ہے۔

اور شانی دیکھ رہی تھی کہ اس سے فائدہ حاصل کرنے کے خواہش مندوں میں خالوا عجاز ہی پیش پیش نہیں..... خاندان کے باقی لوگ بھی اپنے اپنے انداز میں اس سے فائدے کی توقع لگائے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ اسے زبردستی سیاست میں دھکیل رہے تھے۔ کچھ ویسے ہی

اسے منظر سے ہٹانا چاہتے تھے۔ وہ تایا معصوم اور پھوپی آمنہ کے سوا کسی پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی لیکن تایا معصوم اپنی بیماری کی وجہ سے اور پھوپی آمنہ عورت ہونے کے سبب شانی کے لیے مؤثر کردار ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔

پتا نہیں کیوں، شانی کا دل چاہنے لگا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ دے۔ جائیداد، شہرت، رشتے داریاں..... اسے کچھ درکار نہیں تھا۔ وہ صرف دل کا سکون چاہتی تھی۔ وہ صرف اپنے شریکِ حیات کا ساتھ چاہتی تھی..... روکیٹ بستی جیسا ایک گل پوش گھر جہاں صرف رستم کی محبت ہو۔ اس گھر میں اگر اسے اپنے معصوم مُنے کا ساتھ بھی مل جاتا تو اس کی دنیا مکمل ہو جاتی لیکن وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سب کچھ چھوڑنا اتنا آسان نہیں۔ وہ گردن تک اس دلدل میں دھنسی ہوئی تھی اور رستم اس سے زیادہ دھنسا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد رستم واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں مرہم پٹی کا سامان تھا۔ رستم کے کہنے پر شانی نے اپنی قمیص کا ایک بازو اُتارا اور اپنے کندھے کے زخم پر رستم سے دوا لگوائی۔ رستم نے اپنے ہاتھوں سے اس کے کندھے پر پٹی باندھی۔ پھر اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کا زخم بھی رستم سے چھپا نہیں رہ سکا۔ یہ ہاتھ شانی نے اب تک اوڑھنی کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ رستم نے انگلیوں کی بینڈیج بھی کی۔ اس نے شانی سے بار بار پوچھا کہ یہ زخم کیسے لگے۔ شانی نے بس گول مول جواب دیا۔ رستم کے لمس نے ایک جاں فزا ٹھنڈک شانی کے رگ و پے میں اتار دی۔

''دراج کیا کہتا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہی جو آپ نے بتایا ہے۔ اس نے ریاض کی سالی کو مار دیا ہے۔ وہ اس کی بیوی اور بچے کو بھی مار دینا چاہتا تھا مگر آپ نے انہیں بچا لیا اور میرا خیال ہے.....'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''کیا کہنے لگے تھے آپ؟''

وہ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولا ''شاید آپ کو یہ زخم بھی ان دونوں کو بچاتے ہوئے ہی لگے ہیں۔''

شانی اعتراف کرنے والے انداز میں چپ رہی پھر بولی۔ ''کیا میں نے غلط کیا؟''

''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن آپ جانتی ہیں کہ ریاض زہریلا سانپ ہے..... اور لوگ کہتے ہیں کہ سانپ کے ساتھ اس کی مادہ اور سپولیوں کو بھی مار دینا چاہیے۔'' رستم کے لہجے میں وہی دھاڑ پوشیدہ تھی جو شانی کو لرزا دیا کرتی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

''وہاں کتنے بندے مرے ہیں رستم؟''

''دو گارڈز..... ریاض کا ایک خاص ملازم ہیرا اور اس کی سالی۔''

شانی ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ ''رستم! آپو زاہدہ کہاں ہیں؟''

''وہ موجود ہیں..... فجر کی اذان سے پہلے نہیں جاگیں گی۔''

''بھائی اکرام اور بچے؟''

''بھائی اکرام یہاں نہیں ہیں۔ عاشی بھی ان کے ساتھ ہے۔ ہاں، سرمد یہیں پر ہے۔''

شانی کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''رستم! آپو ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں، ٹھیک ہیں۔ بس ہاتھ میں تھوڑی سی چوٹ لگی ہوئی ہے۔ ایک دن ہاتھ پنکھے میں آ گیا تھا۔''

شانی سمجھ گئی کہ آپو زاہدہ نے رستم سے رنگ والی کا واقعہ چھپایا ہے۔ ہاتھ کی چوٹ یقیناً وہی تھی جو رنگ والی میں آئی تھی۔ خوں خوار کتے نے ان پر حملہ کیا تھا۔ وہ اس بارے میں رستم سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ آپو زاہدہ سامنے ہوتیں تو وہ ہاتھ جوڑ کر ان سے معافی مانگتی..... وہ کچھ دیر تک اَشک بار نظروں سے رستم کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔

''رستم! آپ مجھ سے بہت ناراض ہیں ناں؟''

''ناراضگی والا کام تو میں نے کیا تھا شانی۔ وزیری گاؤں میں چوہدری اعجاز صاحب کو تھپڑ مار دیا تھا۔ کچھ بھی تھا..... کچھ بھی تھا، وہ آپ کے بڑے تھے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ سے بہت شرمندہ ہوں بی بی۔ میں نے آپ سے اور چوہدری اعجاز سے معافی مانگنے کے لیے کئی بار رابطہ کرنا چاہا مگر نہ ہو سکا۔''

''رابطہ کیسے ہوتا، وہاں کوئی رابطہ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔''

''کیا مطلب شانی؟''

''آپ کو کچھ معلوم نہیں رستم! وہاں کیا ہوتا رہا ہے۔ خالو اعجاز..... بہت بدل گئے ہیں۔ بہت زیادہ بدل گئے ہیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کریں۔ وہ حویلی کا فون اکثر خراب رکھتے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وزیری گاؤں میں جو کچھ ہوا، اس میں آپ اکیلے قصوروار نہ تھے۔''

''میں بہت برداشت کرتا رہا شانی! مگر چوہدری صاحب اپنی زبان کو خنجر کی طرح استعمال کرتے رہے۔ شاید وہ چاہتے ہی یہ تھے کہ کوئی ایسا واقعہ ہو جائے۔''

شانی نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''رستم! وزیری گاؤں والے واقعے کے

بعد فون پر آپ نے مجھ سے کتنی بار بات کی تھی؟''

''ایک دو بار..... اس کے علاوہ ایک دو بار اجمل اور ناصر نے بھی کی ہوگی۔''

''لیکن رستم! اصل میں آپ سب سے میری بات ایک بار بھی نہیں ہوئی۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' رستم سوالیہ نظروں سے شانی کا غمزدہ چہرہ دیکھنے لگا۔

''وہاں ایک گہری چال چلی گئی ہے رستم! شاید آپ کو یقین نہ آئے۔ جب بابا خادم حسین نے مجھے اس بارے میں بتایا تو میں خود بھی حیران رہ گئی تھی مگر پھر یقین کرنا پڑا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

شانی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ''وزیری گاؤں میں آپ نے دیکھا ہی ہوگا، ایک ورائٹی شو ہو رہا تھا۔ وہاں اسٹیج کے اداکار آوازوں کی نقلیں اتار رہے تھے۔'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''ان میں ایک لڑکی نائلہ بھی تھی۔ اس کو وہاں بہت داد ملی تھی۔ وہی لڑکی بعد میں خالو اعجاز کے ساتھ رنگ والی پہنچ گئی۔ آپ اور ناصر وغیرہ فون پر جو آواز سنتے رہے ہیں، وہ میری نہیں تھی..... وہ اسی نائلہ کی تھی۔ مجھے یہ سب خادم حسین نے بتایا ہے۔''

رستم ناقابلِ یقین نظروں سے شانی کو دیکھ رہا تھا۔ شانی نے اس بارے میں مکمل تفصیل رستم کو بتائی اور اس کی حیرانی اور کرب کو مزید گہرا کر دیا۔ ایک بار پھر وہی فقرہ رستم کے کانوں میں گونجنے لگا۔ ''رستم! تم گھنیا ہو اور گھنیا ہی رہو گے۔'' یہ الفاظ گزرے ہوئے دنوں میں لاتعداد بار اس کے سینے کو چھلنی کر چکے تھے۔ اس نے ہر بار بے حد تعجب سے سوچا تھا..... کیا بی بی اتنے سخت الفاظ اپنی زبان سے ادا کر سکتی ہیں؟ ہر بار جواب نفی میں آیا تھا اور ایک بے پناہ کرب اس کے رگ و پے میں پھیلا تھا اور آج بی بی اپنی زبان سے اسے بتا رہی تھیں کہ یہ ان کے الفاظ نہیں تھے۔ انہوں نے ادا نہیں کیے تھے۔ یہ ایک اداکارہ کے الفاظ تھے اور اس کے پیچھے چوہدری اعجاز کی ہدایت کاری تھی۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟ رستم نے ایک بار پھر بے پناہ تحیر سے سوچا۔ یہ سب کچھ کسی فلم یا ڈرامے کی سچویشن جیسا تھا۔ بہرحال، اس بات سے انکار بھی ممکن نہیں تھا کہ کچھ لوگ ہو بہو آوازوں کی نقل کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ نہایت قریبی لوگوں کے لیے بھی اصل نقل میں فرق کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ رستم کے اندر میں ہلچل تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر سینے میں جمی ہوئی برف پگھلنے لگی۔ اس کا دل جیسے ایک بار پھر دھڑکنے لگا۔ اس کا دل..... جو صرف بی بی کا تھا۔ جس کی رگوں میں خون کی جگہ بی بی کا عشق حرکت کرتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بی بی کو ایکا ایکی اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس کے

www.pdfbooksfree.pk

بازوؤں نے جذب کے عالم میں بی بی کو اپنے ساتھ بھینچا..... وہ نم ناک لہجے میں منمنائی۔

''میں نے آپ کو کئی پیغام بھیجے لیکن اب پتا چلا ہے، کوئی بھی آپ کو نہ مل سکا..... میں نے آپ کو بہت انتظار کرایا..... بڑا دکھ دیا۔''

''میں سب سمجھ گیا ہوں۔ آپ کچھ نہ کہیں۔''

وہ جذباتی کیفیت میں، بی بی کے اَشکوں سے تر چہرے کو چومتا چلا گیا۔ بی بی نے اسے مضبوطی سے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ جیسے اپنے شریکِ حیات کے سینے میں سما کر ناپید ہو جانا چاہتی تھی۔ رات کے اس آخری پہر اس بند کمرے کی فضا میں یہ ملن بہت جذباتی اور رقت آمیز تھا۔

صبح سویرے شانی کی ملاقات اپنی نند آپو زاہدہ سے ہوئی۔ آپو زاہدہ کی آنکھوں میں پہلے تو تحیر کا سمندر ابھرا پھر انہوں نے شانی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور بے شمار بلائیں لیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس گھر میں شانی کا استقبال کس طرح کریں۔ فرصت ملتے ہی آپو زاہدہ نے کہا۔ ''شانی! تمہیں پتا ہے نا، میں تمہارے لیے رنگ والی گئی تھی؟''

''ہاں۔ مجھے بابا خادم حسین نے سب بتایا ہے۔'' شانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور وہاں رنگ والی میں جو کچھ آپ کے ساتھ ہوا، اس کے لیے معافی مانگنے کے لیے میرے پاس لفظ بھی نہیں ہیں۔''

''ان باتوں کو چھوڑو شانی! بس تم نے رستم کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

''نہیں، میں نے نہیں بتایا۔'' شانی نے آپو کا زخمی ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

آپو زاہدہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر ایک بار پھر شانی کو گلے سے لگا لیا۔ ''شانی! وہ تم کو بہت چاہتا ہے۔ اتنا کہ شاید تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو۔ مجھے پتا ہے، وہ رات دن تمہارے لیے تڑپتا رہا ہے۔ وہ تمہارے بغیر مر جائے گا شانی۔ اس کے لیے کچھ کر سکتی ہو تو کرو۔''

''اچھا آپو۔'' وہ ناک میں گنگنائی۔

''مجھے پتا ہے کہ اس نے اونچی جگہ متھا لگایا ہے شانی۔ ہم غریبوں کا تم چوہدریوں سے کوئی جوڑ نہیں۔ پر اگر تم بھی اسے چاہتی ہو شانی تو پھر سب کچھ ہو سکتا ہے..... تم اس سے شادی کر لو۔ وہ تمہیں اتنا خوش رکھے گا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی بدل جائے۔ وہ بڑے خطرے والے رستے پر چل رہا ہے۔ تم اسے واپس لا سکتی ہو۔ تم اسے جس طرح چاہو بدل سکتی ہو۔'' وہ بولتی چلی جا رہی تھیں۔

وہ اس بات سے بے خبر تھیں کہ وہ جس شادی کی بات کر رہی ہیں، وہ تو ڈیڑھ دو برس

www.pdfbooksfree.pk

پہلے ہو چکی ہے۔ شانی نے انہیں تسلی دی۔ ''آپو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ۔ بے فکر رہیں۔''

''نہیں شانی! وقت بہت تھوڑا ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے، جلدی کرنا ہے۔ تم اس سے بات کرو۔ اسے دشمنی کی آگ میں چھال مارنے سے روک لو۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ بس تم اسے روک سکتی ہو۔ اسے سمجھاؤ کہ پولیس اسے ہر جگہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ وہ اس کی بات تک نہیں سنیں گے۔ وہ کچھ دیر کے لیے کہیں رُوپوش ہو جائے۔ اگر اس نے کسی ڈپٹی شپٹی سے اپنا بدلہ لینا بھی ہے تو کچھ مہینوں کے لیے اس کام کو آگے ڈال دے۔ اگر نہیں ڈالے گا تو کچھ نہیں بچے گا۔''

شانی اور آپو زاہدہ کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ آپو جو کچھ کہہ رہی تھیں، وہ شانی کے دل کی آواز بھی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اگر رستم نے ریاض ہٹلر سے فوری بدلہ چکانے کا ارادہ ترک نہ کیا تو نتائج خوفناک ہوں گے۔ وہ رستم کے ساتھ ایک آخری کوشش کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے سینے کا ایک بہت بڑا زخم رستم سے چھپا لیا تھا۔ سکینہ کے قتل کا غم کوئی معمولی زخم نہیں تھا۔

زاہدہ اور شانی میں ابھی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ زری بھاگتی ہوئی آئی اور عقب سے شانی کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔ شانی نے رخ پھیر کر اس کا رخسار چوما۔

''تم کہاں چلا گیا تھا۔ میں تم کو ڈھونڈتا۔ تم مجھ کو بہت اچھا لگتا۔'' زری نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''تم بھی بہت اچھی ہو زری۔'' شانی بولی۔

شانی کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر زری ایک دم پیچھے ہٹی۔ زری کے لپٹنے سے شانی کے کندھے کا زخم دِکھ گیا تھا اور تھوڑا سا خون رِس آیا تھا۔

زری ایک دم گھبرا گئی۔ ''اوہو..... مجھ کو پتا نہیں تھا۔ مجھ سے غلطی ہوا۔ میں معافی مانگتا۔'' اس نے حسبِ عادت دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔''

''میں بہت بے وقوف ہوں۔ مجھ سے کچھ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ میں بہت تنگ کرتا۔''

''نہیں، تم تو اتنی پیاری ہو کہ تمہیں دل میں بٹھانے کو دل چاہتا ہے۔'' شانی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے اپنے ساتھ لگایا۔

وہ غمزدہ لہجے میں بولی۔ ''تم نہ جاتا تو شاید وہ بھی نہ جاتا..... وہ مر گیا..... وہ آپ کو بہت یاد کرتا۔'' زری ڈولے کا ذکر کر رہی تھی۔

ڈولے کے ذکر نے ان تینوں کو ایک دم اداس و غم زدہ کر دیا۔ شانی کو لگا جیسے ڈولا اب بھی ان کے اردگرد کہیں موجود ہے اور اچانک کہیں سے مسکراتا ہوا نمودار ہو جائے گا۔

اسی دوران میں ناصر بڑے تیز قدموں سے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اس کا رنگ فق تھا اور ہاتھوں میں اسٹیتھ اسکوپ نظر آ رہا تھا۔ آپو زاہدہ نے کہا۔ ''لگتا ہے اجمل کی طبیعت پھر خراب ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہونا ہے۔''

شانی بھی مضطرب ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ناصر کے پیچھے وہ بھی کمرے میں پہنچ گئی۔ ہنستا مسکراتا اجمل دکھ اور تکلیف کے گھیرے میں تھا۔ اسے سانس لینے میں سخت دشواری ہو رہی تھی اور سرخ و سپید رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ ناصر تیزی سے اس پر جھک گیا۔ پہلے اس نے اسٹیتھ اسکوپ سے چیک کیا پھر بی پی اپریٹس اس کے بازو سے منسلک کرنے لگا۔ اس کام میں شانی نے اس کی مدد کی۔ شانی نے محسوس کیا کہ اجمل کا جسم آگ کی طرح تپ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر ایک بڑی سی پٹی بندھی تھی۔ اس پٹی کے ساتھ ایک نلکی بھی منسلک تھی جو جسم کے اندر سے پس کھینچ کر ایک بوتل میں ڈالتی تھی۔ اجمل کا بی پی چیک کرنے کے بعد ناصر نے اسے نس میں ایک انجکشن دیا۔ اس انجکشن کے بعد اس نے موبائل پر اجمل کے ڈاکٹر سرجن طارق سے تھوڑی سی بات چیت کی اور اسے ڈرپ لگا دی۔ انجکشن لگتے ہی اجمل کی طبیعت کچھ بحال ہو گئی تھی۔ اس کی سانس میں روانی پیدا ہو گئی اور چہرے کی رنگت میں بھی قدرے تبدیلی آئی۔

اجمل نے شانی کی طرف دیکھا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''دیکھا شانی بہن! آپ ام کو ایک دم چھوڑ کر چلا گیا تو کیا ہوا۔ چھوٹو بھائی (ڈولا) ختم ہو گیا اور ام بیمار ہو کر اس بستر پر پڑ گیا ہے۔ اب آپ کہیں نہیں جانا، بس ہمارے پاس رہو۔''

''میں تمہارے پاس ہی ہوں اجمل ... میں یہیں ہوں۔'' شانی نے اس کے گرم ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''آپ بے فکر رہو شانی بہن۔ ام اس چھوٹے سے زخم سے مرنے والا نہیں۔ ام ایک دم بھلا چنگا ہو جائے گا۔ پھر ام آپ کو افغانی پلاؤ کھلائے گا۔ اس میں دنبے کا گوشت ڈالے گا اور پلاؤ کے ساتھ سیخ کباب کے لیے تو ام خود بھی ترس گیا ہے۔ مطلب یہ کہ سلسلہ وہیں سے جوڑے گا جہاں سے ٹوٹا تھا۔''

''ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا اجمل۔''

''اور صرپ افغانی پلاؤ کی بات ہی نہیں ہے، وہ سب کچھ ہوگا جو اقبال ٹاؤن والی کوٹھی میں ہوتا تھا۔ صبح کو بیڈ منٹن، دوپہر میں تیراکی اور شام کو کرکٹ۔ ام بال پھینکے گا اور ایک ہی بار میں درمیان والا وکٹ اُڑا دے گا۔''

ناصر نے کہا۔ ''یہ حقیقت ہے بھابی کہ اجمل میں بیماری سے لڑنے کا زبردست حوصلہ ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا ہمت ہار گیا ہوتا۔''

''دراصل یہ سب تمہارا مہربانی ہے ناصر بھائی! خود تمہارا ڈاکٹری ام کو مارتا ہے لیکن تمہارا دشمنی ام کو مرنے نہیں دیتا۔ ام تم سے بہت بہت لڑنا چاہتا ہے اور لڑنے کے لیے زندہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس موقع کے لیے بھی ام نے ایک کتا (قطعہ) کہا ہے..... ارشاد کیا ہے۔

اس سے امارا دشمنی ہے، اس سے امارا پیار ہے
ہر ایک بات پر لڑائی ہے، ہر ایک بات پر تکرار ہے
مرنے میں حرج تو نہیں ہے، مگر ام سوچتا ہے
اس سے پہلے ام مر گیا تو اس میں امارا ہار ہے''

ناصر اور شانی کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ آ گئی۔ اجمل نے بھی ہنسنا چاہا مگر اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے اس کا چہرہ سیاہی مائل ہو گیا اور جسم اینٹھنے لگا۔ ناصر نے اس کے سینے پر مساج کیا اور تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔ شانی نے اس کے منہ سے پانی کا گلاس لگایا۔ اجمل نے دو گھونٹ پانی پیا اور قدرے بہتر نظر آنے لگا۔ ناصر کوئی دوا لینے کے لیے اپنے کمرے کی طرف لپک گیا۔ شانی نے گلاس میز پر رکھا تو اس کے کنارے پر سرخ رنگ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ یہ خون کا رنگ تھا اور خون کی یہی آلائش اجمل کے ہونٹوں پر بھی موجود تھی۔ شانی نے رومال سے اجمل کے ہونٹ صاف کیے پھر اس کی نظر بچا کر گلاس کا کنارہ بھی اپنی اوڑھنی سے پونچھ دیا۔ اجمل نے عجیب لہجے میں کہا۔ ''ام سے کیا چھپاتا ہے شانی بہن! ام نے سب دیکھ لیا ہے۔ دراصل آپ کو یہاں دیکھ کر امارا خون سیروں بڑھ گیا ہے۔ اس لیے تھوڑا سا خون باہر بھی آ گیا ہوگا۔ پکر کا بات نہیں ہے۔''

شانی نے کچھ دیر پہلے بھی ڈسٹ بن میں خون آلود روئی دیکھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خون کے اخراج کا یہ سلسلہ پہلے سے جاری ہے اور یقیناً اجمل کو بھی اس کا علم تھا۔ شانی نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر آنسو پھر بھی آنکھوں میں امڈ آئے۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

اجمل نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ دکھی کیوں ہوتا ہے شانی بہن۔ اول تو ام

www.pdfbooksfree.pk

مرے گا نہیں اور اگر ناصر کی مہربانیوں سے کوئی ایسا ویسا بات ہو بھی گیا تو ام اپنے دل پر کوئی بوجھ لے کر نہیں جائے گا۔ ام ایک دم ''سیٹس پائیڈ'' ہے۔ شاہی اور قدرت اللہ کی موت سے بڑا خوشی ام کو بھلا اور کیا ہوگا۔ خاص طور پر شاہی کو مار کر تو رستم بھائی نے امارے دل میں لڈوؤں کا پورا دکان پھوڑ دیا ہے۔ ہاں شانی بہن! شاہی مر گیا۔ قدرت اللہ بھی مر گیا۔ امارا مشن پورا ہو گیا۔ قدرت اللہ کو رستم بھائی نے مارنا تھا اور شاہی امارا شکار تھا۔ امارا کام رستم بھائی نے بہ قلم خود کیا اور ام نے رستم بھائی کا کام بہ قلم خود کیا۔ اسی کو محبت کہتے ہیں جی۔''

اجمل کی آواز کمزور تھی اور اسے بہت ہمت کر کے بولنا پڑ رہا تھا۔ شانی نے اسے خاموش رہنے کو کہا مگر وہ جذب کے عالم میں بولتا چلا گیا۔ ''ام نے رستم بھائی سے شاہی کے مرنے کا پورا تفصیل پوچھا ہے۔ آستانے کی سیڑھیوں کے اندر اس حرامی کا گردن رستم بھائی نے اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑا اور ایک بار جکڑنے کے بعد پھر چھوڑنے کا نام نہ لیا۔ وہ تین چار منٹ تک رستم بھائی کی گرپت میں تڑپتا پھڑکتا رہا۔ اس نے خون کا الٹی کیا، اس کا زبان باہر نکل آیا اور رستم بھائی کے بازو میں ہی اس کا جان خارج ہو گیا۔ اس نے بہت لوگوں کا زندگی خراب کیا تھا شانی بہن۔ اس کا موت ایسا ہی تڑپیلا ہونا چاہیے تھا۔''

تھوڑا سا مزید خون اجمل کے ہونٹوں پر نظر آیا۔ شانی نے اسے کپڑے سے پونچھ دیا۔ اس کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ اجمل کی حالت اس کی توقع سے زیادہ خراب تھی۔ ناصر نے اسے بتایا تھا کہ گولی سینے میں لگ کر کندھے کی طرف گئی تھی مگر یہ زخم پھیپھڑے سے بہت نزدیک تھا۔

''کبھی کبھی ام کو خود پر بہت غصہ آتا ہے شانی بہن۔'' اجمل بولا۔ ''ام سوچتا ہے، کیا ام سچ مچ بستر پر ہی مر جائے گا۔ امارے لیے یہ بڑا ناانصافی والا بات ہوگا۔ ام نے تو ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ اگر ام پوت ہوا تو امارا موت ایک دم تڑتھلی مچانے والا ہوگا۔ ام اپنے رستم بھائی کی حفاظت کے لیے لڑتا ہوا مرے گا۔ اپنی آخری گولی اور آخری سانس تک ام ہتھیار نہیں پھینکے گا لیکن اب.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیا؟'' شانی نے پوچھا۔

''لیکن اب ام ذرا اور طریقے سے بھی سوچتا ہے شانی بہن! سب لوگ جنگ کے میدان کے اندر ہی تو نہیں مرتا ہے۔ بہت بڑا بڑا لوگ ایسا بھی گزرا ہے جنہوں نے لڑائی میں بہادری سے لڑتے ہوئے چوٹ کھایا..... اور پھر اسی چوٹ کی وجہ سے کئی مہینے یا کئی سال بعد مرا۔ ان کا موت بھی تو بہادری کا موت ہی ہوتا ہے نا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو مگر ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو اجمل۔'' شانی نے بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ دی۔ ''تمہاری ابھی بہت زندگی باقی ہے۔ ابھی تم نے بہت کچھ کرنا ہے۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں ابھی رستم اور ناصر سے بات کرتی ہوں۔ ہم تمہارے علاج کے لیے کوئی اور طریقہ ڈھونڈتے ہیں۔''

ناصر دوائیں لے کر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس بھی تھا۔ وہ بڑی محبت اور توجہ سے اجمل کو دوا کھلانے میں مصروف ہو گیا۔

شام کا کھانا جلدی کھا لیا گیا۔ کچھ دیر بعد کسی قریبی مسجد سے عشاء کی اذان ابھری۔ شانی نے آپوزاہدہ کو دیکھا، وہ اپنا چہرہ دوپٹے میں لپیٹے کوٹھی کی شمالی جانب جا رہی تھیں۔ شانی ان کے پیچھے چل دی۔ رہائشی حصے کے ساتھ منسلک ایک بڑا ہال نما کمرہ اور برآمدہ تھا۔ ایک طرح سے یہ رہائشی حصے کا ہی پورشن تھا۔ اس ہال کمرے کے دو دروازے کوٹھی کے اندر سے نکلتے تھے۔ ایک دروازہ باہر لان کی طرف تھا۔ یہ پورشن بھی باقی کوٹھی کی طرح قدیم طرز کا ہی تھا۔ اونچے محرابی دروازے تھے۔ تعمیر میں لکڑی کثرت سے استعمال کی گئی تھی۔ یہ نماز کی جگہ تھی۔ اسی دوران میں آپوزاہدہ نے بھی شانی کو دیکھ لیا۔

''نماز کے لیے کتنی پیاری جگہ بنائی ہے۔'' شانی نے کہا۔

''ہاں..... جہانگیر بتا رہا تھا کہ ہندوستان پاکستان بننے سے پہلے یہ کوٹھی یوپی کے کسی نواب صاحب کی تھی۔ نواب صاحب نماز روزے کے بڑے پابند تھے..... وہ کئی سال یہیوں والی کر کے پڑے رہے مگر اسی حالت میں انہوں نے حج بھی کیا۔ بس جس کو اللہ توفیق دے۔''

آپوزاہدہ کے ساتھ شانی نے بھی مرمریں برآمدے میں نماز ادا کی۔ اس نے سکینہ کے لیے، رو رو کر بخشش کی دعا کی اور اپنے حالات کے لیے بھی اللہ سے مدد مانگی.....

رات کو رستم اور شانی کے درمیان طویل بات چیت ہوئی۔ رستم کے ہاتھ شانی کے ہاتھوں میں تھے۔ اس کے سینے میں غم کا سمندر ہلکورے لے رہا تھا مگر وہ خود کو حتی الامکان نارمل رکھے ہوئے تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جو کہہ دے گی رستم کو ماننا پڑے گا لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ ایک بہت بڑی بات کہے گی۔ یہ ایسی بات ہوگی جس کو ماننے کے لیے رستم کو برف اور آگ کے سات سمندروں پر سے گزرنا پڑے گا۔ اس بات کو ماننے مانتے دو سیکنڈوں بار جیے گا اور مرے گا۔

تو کیا وہ یہ بات کہہ دے..... یہ حکم جاری کر دے..... وہ جو ہر حکم پر سر اطاعت خم کرتا ہے، اسے آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزار دے؟ وہ سوچ رہی تھی اور اپنے

www.pdfbooksfree.pk

اندر حوصلہ جمع کر رہی تھی۔ وہ اپنے ذہن میں وہ مناسب ترین الفاظ جوڑ رہی تھی جو رستم کو کم تکلیف پہنچائیں۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی..... رستم! آپ ڈپٹی ریاض اور اس کے ساتھیوں سے انتقام کا خیال دل سے نکال دیں۔ کم از کم وقتی طور پر نکال دیں۔ اس انتقام کو اپنی زندگی کے کسی اور حصے کے لیے چھوڑ دیں۔ چلیں آئیں، ہم..... موت اور بربادی کے اس گھیرے سے نکلنے کی ایک آخری کوشش کریں۔ اجمل خان کے ساتھ قبائلی علاقے کی کسی دور دراز بستی میں جا بسیں..... یا پھر کسی طرف سے پاکستان کی سرحد پار کر جائیں۔

گفتگو کے دوران میں اس نے کئی بار کوشش کی مگر یہ باتیں اس کی زبان پر نہیں آ سکیں۔ اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اسے ڈر یہ تھا کہ اس کی بات مانتے مانتے رستم کا دل اس کے سینے کے اندر ہزار ہا ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ وہ ایک دوسرے سے عشق میں انسان کی اپنی کوئی مرضی ومختار رہتی ہی نہیں ہے۔ جب اپنی کوئی منشا ہی نہیں ہوتی تو پھر کوئی اختلافی بات کیسے کی جا سکتی ہے؟

بار کر شانی نے گفتگو کا رخ اجمل کی طرف موڑ دیا۔ وہ بولی۔ ''رستم! اجمل کی حالت نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ کیا ہم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟''

''جو زیادہ سے زیادہ کر سکتے ہیں، وہ تو ہو رہا ہے شانی۔ جہانگیر نے ایک بہت اچھے ڈاکٹر سرجن کا انتظام کر رکھا ہے۔ وہ تقریباً ہر دوسرے روز اجمل کو دیکھنے آ رہا ہے۔''

''لیکن کیا وہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈمٹ نہیں ہو سکتا؟''

''نہیں..... یہ بہت خطرناک ہے۔ جہانگیر نے سارا پتا کرایا ہے۔ لاہور کے تقریباً سارے ہی بڑے ہسپتالوں اور پرائیویٹ کلینکوں پر پولیس کی گہری نظر ہے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ قدرت اللہ کے آستانے پر حملہ کرنے والوں میں سے ایک حملہ آور شدید زخمی ہوا تھا۔ اب وہ اس زخمی کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ آج صبح مجھے پتا چلا ہے کہ پولیس کے مخبروں نے قبرستانوں کے بھی بہت چکر لگائے ہیں۔ انہوں نے ڈولے کی قبر ڈھونڈ لی ہے۔ اس کی قبر کشائی کا پروگرام بن رہا ہے۔ وہ لوگ ڈولے کی قبر تک پہنچ گئے ہیں تو حاجی حیات کی کوٹھی تک بھی پہنچ جائیں گے۔ شاید حاجی حیات ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہماری وجہ سے اس کی نوکری اور عزت بھی سخت خطرے میں پڑ گئی ہے۔''

ڈولے کی قبر کشائی والی بات پر شانی سخت حیرت میں ڈوب گئی۔ وہ دونوں کچھ دیر اس پر تبصرہ کرتے رہے پھر شانی نے پوچھا۔ ''کیا حاجی صاحب کی کوٹھی سے ان کا کوئی کھوج مل سکتا ہے؟''

''کوٹھی کو تو اب تالا لگا ہوا ہے۔ ممکن ہے، حاجی نے وہاں سے ثبوت وغیرہ ختم کر دیئے ہوں..... پھر بھی خطرہ تو موجود ہے۔''

آخر میں شانی نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اجمل خان کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا؟''

''ابھی تو ایسا ہی لگ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والے دنوں میں کچھ تبدیلی آ جائے۔''

اگلے روز شانی نے ناصر کو بتایا۔ ''ناصر! میں نے ایک بہت اہم فیصلہ کیا ہے۔''

''کیا؟''

''میں اب حویلی واپس نہیں جاؤں گی۔ میں اکتا گئی ہوں جھوٹ اور فریب کی اس زندگی سے..... مجھے وہاں سے کچھ نہیں چاہیے۔ جائیداد، نہ شہرت، نہ سیاست..... میں نے اب جتنا بھی جینا ہے رستم کے ساتھ جیوں گی..... اور شاید..... مجھے یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا بھابی! یہ آپ کی زندگی ہے۔ آپ اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔''

''مجھے اگر رنگ والی سے کچھ چاہیے تو وہ مُنا ہے۔ اگر وہ کسی طرح یہاں آ سکے تو میرے لیے وہاں سب کچھ ختم ہے۔''

''جس قسم کے حالات جا رہے ہیں، ان میں فوری طور پر تو ممکن نہیں۔ بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ ابھی آپ کا یہاں رکنا بھی ٹھیک نہیں۔ درحقیقت ریاض کے ساتھ ہماری فیصلہ کن لڑائی چھڑ چکی ہے۔ وہ ہمیں معاف کر سکتا ہے، نہ ہم اسے کر سکتے ہیں۔ خاص طور سے دراج والے واقعے کے بعد تو اب کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں یہی تو چاہتی ہوں کہ وہ سب کچھ نمٹ جائے جو ہونے والا ہے۔''

''اب یہ نہیں ہو سکے گا شانی بھابی! ہم بہت آگے نکل گئے ہیں۔''

''کیا رستم میری بات بھی نہیں مانیں گے؟''

ناصر ایک دم چونک کر شانی کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ بالآخر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ''اگر آپ کہیں تو شاید وہ مان جائیں لیکن میں آپ کو پورے یقین سے کہتا ہوں بھابی! ان کے سینے کا زخم ناسور بن جائے گا۔ وہ ان کو جینے نہیں دے گا۔ میں ان کے دل کی حالت بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ وڈے ڈیرے کے قتل عام کو بھول کر جئیں گے تو ہر گھڑی سولی پر لٹک کر گزاریں گے۔ یہ صورت حال آپ کو اور زیادہ

www.pdfbooksfree.pk

بھی کر دے گی۔"

"کیا نفرت، محبت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے ناصر؟"

"یہ نفرت نہیں ہے بھابی! یہ تو ایک قرض ہے جو ڈیرے کے مقتولوں نے جاتے جاتے ہمارے سروں پر رکھا ہے۔ اس قرض کو اتارے بغیر زندہ رہنا پڑا تو یہ ہمارے لیے موت سے بدتر ہوگا۔"

"زندگی کو موت سے بدتر نہ کہو ناصر! یہ ناشکری ہے۔ زندگی کیسی بھی ہو، زندگی ہی ہوتی ہے..... اور میں اس زندگی کے لیے ایک آخری کوشش کرنا چاہتی ہوں۔"

"جو کچھ میری سمجھ میں آیا، میں نے بتا دیا ہے۔ اب آپ جو بھی مناسب سمجھیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے..... ڈپٹی ریاض کے گھیرے میں آنے سے پہلے پہلے ہم کسی طرح آزاد علاقے کی طرح نکل سکتے ہیں؟"

"حاجی حیات صاحب نے یہی بات رستم بھائی سے کہی تھی لیکن رستم بھائی بے حد طیش میں آ گئے تھے۔"

"حاجی حیات نے کیا کہا تھا۔"

"یہی کہ پولیس کا گھیرا تنگ ہو رہا ہے لیکن وہ اب بھی کوشش کر کے ہمیں سرحدی علاقے میں پہنچا سکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس سلسلے میں پہلوان اور جبرا بہت کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"حاجی حیات سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہے؟" شانی نے پوچھا۔

"اگر آپ کہیں گی تو میں فون نمبر آپ کو دے دوں گا لیکن پہلے آپ اس بارے میں اچھی طرح سوچ لیں کہ رستم بھائی سے کس طرح بات کرنی ہے..... اور کرنی بھی ہے یا نہیں۔"

☆=======☆=======☆

ڈپٹی ریاض کی آنکھیں نشے کے سبب سوجی ہوئی تھیں۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا۔ وہ بس ایک مختصر نیکر میں تھا۔ بالوں بھرا جسم جنگلی ریچھ سے مشابہ تھا۔ اس کے سامنے اس کا زخمی بھتیجا طفیل تھا۔ وہ دونوں اس کوٹھی کے ایک کمرے میں موجود تھے جہاں دو دن پہلے نامعلوم افراد کی طرف سے ایک خوفناک حملہ ہوا تھا۔ نہایت دیدہ دلیری کے ساتھ ریاض کی سالی اور تین کارندوں کو جان سے مار دیا گیا تھا۔ یہ معمولی واردات نہیں تھی۔ ہر طرف تہلکہ مچ گیا تھا۔ پورے علاقے کی پولیس حرکت میں آ گئی تھی اور قاتلوں

کو چپے چپے پر تلاش کیا جا رہا تھا۔ اس سرتوڑ تلاش کے نتیجے میں کچھ کامیابی بھی ہوئی تھی۔ ایک تھانے کے اہلکاروں نے اقبال ٹاؤن کے علاقے میں ایک پستہ قد شخص کی تازہ قبر کا سراغ لگایا تھا۔ اس بات کے خاصے شواہد تھے کہ یہ قبر رستم اور ناصر کے ساتھی کی ہے۔

جہاں تک کوٹھی پر حملہ آور ہونے والوں کا تعلق تھا ریاض کو نانوے فیصد یقین تھا کہ یہ رستم کے ساتھی ہیں۔ اس بات کے بھی کافی ثبوت موجود تھے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی بجی۔ ریاض نے سی ایل آئی میں نمبر دیکھا اور طفیل سے بولا۔ "چل، تُو خود بات کر..... وہی مرغی کا بچا چھولہوری ہے۔ اسے سمجھا دو ساری بات اس کی مادری زبان میں۔"

طفیل کراہتا ہوا اٹھا اور فون کے قریب آ بیٹھا۔ اس نے فون اٹھایا اور ذرا رعب دار آواز میں بولا۔ "میں طفیل بول رہا ہوں۔"

"جی سر! میں آپ کا خادم اچھو۔ مجھے جناب عالی محترم ریاض صاحب نے ساری بات بتائی ہے۔ آپ حکم فرمائیں، مجھے کیا کرنا ہے؟"

"دیکھو، میری بات دھیان سے سنو اچھو! یہ بات تو طے ہے کہ مجھے جس علاقے میں رکھا گیا، وہ گلبرگ کا تھا۔ گلبرگ نمبر ایک تھا یا دو..... اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ جو خاص بات میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ وہاں کہیں پاس ہی ایک جامع مسجد ہے۔ کوٹھی سے مسجد کا فاصلہ آدھ فرلانگ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اس مسجد میں مغرب اور عشاء کی اذان ایک لڑکا دیتا ہے۔ مشکل سے چودہ پندرہ سال کا ہوگا۔ تم تھوڑی سی کوشش کرو تو پتا چل سکتا ہے کہ یہ مسجد کون سی ہے۔ ایک بار مسجد کا پتا چل گیا تو پھر اس کوٹھی کا بھی پتا چل جائے گا جہاں وہ سارے حرامی اپنی ماں کی شادی پر ڈھولک بجانے کے لیے جمع ہیں۔"

"یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے جی۔ میں ایک دو بھروے کے بندے ساتھ لے لیتا ہوں اور ابھی چل پڑتا ہوں۔"

"ہمیں تمہارے چل پڑنے سے غرض نہیں ہے۔ رات دس بارہ بجے تک ہر صورت میں رپورٹ چاہیے..... اور یہی ڈپٹی صاحب کا بھی حکم ہے۔" طفیل گرجا۔

"آپ فکر ہی نہ کرو جی۔ میں بارہ بجے سے ڈھیر پہلے ہی آپ کے پاس حاضر ہو جاؤں گا..... بلکہ اگر آپ کہیں تو اس کوٹھی کی ٹوہ شوہ بھی لگا لیں؟"

ریاض مداخلت کرتے ہوئے پھنکارا۔ "کیا کہتا ہے یہ مرغی کا؟"

طفیل نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کہتا ہے کہ کوٹھی کی ٹوہ بھی لگاؤں؟"

ریاض نے بھڑک کر ریسیور طفیل کے ہاتھ سے لے لیا اور دہاڑا۔ "اوئے گندے

www.pdfbooksfree.pk

انڈے! تیری ماں کے ساتھ کچھ برا کیا تھا میں نے؟''

''جج جی..... مم..... مم..... کوئی غلطی ہوئی جناب عالی!''

''جناب عالی کے بچے! تجھے کتنی بار کہا ہے کہ اپنا بیوخود نہ بنا کر۔ تجھے جتنا کہا ہے اتنا ہی کر۔ فالتو پنگا لیا نا تو تیری تشریف پر سے ساری چربی اتروا دوں گا۔ چل پھٹ اب یہاں سے۔ بارہ بجے سے پہلے رپورٹ چاہیے اور بارہ بجے تک تُو نے ٹھرے کو ہاتھ بھی لگایا تو سمجھو آج میرے ہاتھوں گھنٹی بج گئی تیری۔''

ریاض کی آواز میں اتنا قہر تھا کہ مخبر اچھولہوری ہکلا کر رہ گیا۔ ریاض نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ ریسیور اٹھایا اور اچھو کا نمبر ری ڈائل کیا۔ ''ہیلو۔'' اچھو کی آواز آئی۔

ڈپٹی نرم لہجے میں بولا۔ ''اور سن..... اگر کام فٹ فاٹ ہو گیا نا تو پورا کریٹ وہسکی کا ملے گا اور یہ کریٹ میڈم ڈی کی سب سے چہیتے دار ڈانسر اپنے سر پر اٹھا کر لائے گی تیرے مکان میں۔''

''ٹھٹھ..... ٹھیک ہے جناب! ہم آپ کے خادم..... آپ کے نوکروں کے نوکر۔ اوپر والے نے چاہا تو بارہ بجے سے پہلے پہلے.....''

ریاض نے فون بند کر دیا۔ اوپر کی منزل سے مدھم نسوانی آواز آئی۔ ''ذرا سنیے۔'' یہ ریاض کی بیوی تھی۔

ریاض نے برا سا منہ بنایا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ اوپر کی منزل سے کوٹھی کی اطراف نظر آتی تھی۔ واردات کے بعد سے یہاں وردی والے اور سادہ لباس پولیس اہلکاروں کا کڑا پہرا تھا۔ ریاض کا چودہ پندرہ سالہ لڑکا ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر سو رہا تھا۔ اس کے پہرے اور گردن پر نیل تھے۔ یہ نیل اس سنگین کھینچا تانی کا نتیجہ تھے جو اس لڑکے اور دراج کے نقاب پوش ساتھیوں کے درمیان ہوئی تھی۔

اس خیال سے کہ لڑکا جاگ جائے گا، ریاض اور اس کی بیوی فرزانہ ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔ ''ہاں، کیا واویلا ہے تجھے۔'' ریاض نے ٹانگیں کھجاتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں ریاض! مرضی تو آپ نے اپنی ہی کرنی ہے لیکن ایک بات میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں.....'' فرزانہ کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اس کی گردن پر بھی گہری خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

ریاض پھنکارا۔ ''مجھے پتا ہے تُو کیا کہنا چاہتی ہے۔ تُو کہنا چاہتی ہے..... دیکھیں جی! چھوٹی چوہدرانی جیسی تیسی بھی ہے، پر اس نے ہمارا بھلا کیا ہے۔ ہمارے بچے کی جان بچائی ہے۔ میری عزت کی رکھوالی بنی ہے..... اس لیے میرے سرتاج..... میں آپ پر صدقے واری، چھوٹی چوہدرانی کو اپنی بہن بنا لیں اور اس حرامی رستم کو بہنوئی تسلیم کر لیں۔ پھر ان دونوں کو اپنے خرچے پر بنی مون کے لیے بھیج دیں تھیا گلی میں..... یہی کہنا چاہتی ہو نا؟''

''مم..... میرا مطلب ہے کہ.....''

ریاض نے بڑے قہر سے اپنی بیوی کی چوٹی پکڑی اور دانت پیس کر بولا۔ ''تم زنانیوں کی عقل یہاں ہوتی ہے اس عُمت میں..... محکمہ ہی وکھرا ہے تم سب کا، محکمہ ہی وکھرا ہے۔'' اس نے بیوی کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ وہ دہاڑا۔ ''خبردار..... ایک لفظ بھی نکالا زبان سے اس بارے میں تو..... وہ بہت بڑی فٹے کٹنی ہے۔ عاجزی مسکینی اس حرامزادی کے ہتھیار ہیں۔ اندر سے ایک نمبر کی کھوچل، بدمعاش عورت ہے۔ اپنی لولو پوپو باتوں سے تیری جیسیوں کو اُلو بناتی ہے اور اپنا مطلب نکالتی ہے..... وہ دو چہروں والی ناگن ہے۔ اس ناگن کی زندہ کھال نہ اُتاروں گا تو مجھے اپنے پیو کا تخم کون کہے گا۔'' ریاض کی آنکھوں میں نیلے شعلے رقصاں تھے۔

فرزانہ نے سسک کر کہا۔ ''میں اس کی حمایت کہاں کر رہی ہوں۔ میں تو آپ کی خیر مانگ رہی ہوں۔ وہ رستم بالکل وحشی ہو رہا ہے۔ وہ بس آپ سے بدلہ لینا چاہ رہا ہے۔ وہ پہلے ہی بہت خطرناک تھا۔ اب اپنی موت سامنے دیکھ کر اور بھی خطرناک ہو گیا ہے۔''

''چل پھر تُو ہی بتا میں کیا کروں..... میری دلبر جانی! تُو جو کہے گی تیرا یہ نوکر خصم ویسا ہی کرے گا۔'' ریاض کے لہجے سے زہر اُبلا پڑ رہا تھا۔

''مم..... میں تو بس یہ کہتی ہوں کہ..... آپ اس کام میں سب سے آگے آگے نہ رہیں۔ یہ کوئی فرض واجب تو نہیں ہے کہ رستے کو آپ نے ہی مارنا ہے۔ اتنی پولیس پڑی ہے۔ اتنے افسر ہیں۔ دوسروں کو بھی تو اپنی نوکریاں حلال کرنے دیں۔''

''تیرے جیسی عورتیں ہوتی ہیں جو مردوں کو بیجڑا بناتی ہیں پھر بیجڑے سے مُردہ بنا دیتی ہیں۔ یہ اپنا بھینس جیسا تھوبڑا لے کر دفع ہو جا یہاں سے۔ میں کہتا ہوں دفع ہو جا۔'' آخر میں ڈپٹی اتنے زور سے دہاڑا کہ دیواریں لرز گئیں۔ ڈپٹی کی بیوی فرزانہ تیزی سے دوسرے کمرے میں اوجھل ہو گئی۔

ڈپٹی ریاض سیڑھیوں کو اپنے پاؤں سے کوٹتا ہوا نیچے آ گیا۔ اس کے گلے کی رگیں پھولی

www.pdfbooksfree.pk

ہوئی تھیں۔اس نے دیکھا کہ ایک ملازم اس کے بھتیجے طفیل سے بات کر رہا ہے۔

''کیا کہتا ہے یہ؟'' ریاض نے پوچھا۔

''کہتا ہے کہ رنگ والی سے دو بندے آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔''

''نام شام نہیں بتایا؟''

''نہیں جی۔ کہتے ہیں، بس یہ بتا دیں کہ رنگ والی حویلی سے آئے ہیں۔''

ڈپٹی ریاض نے انٹر کام پر بات کی۔ وہ چوہدری اعجاز کی آواز پہچان کر حیران رہ گیا۔ اس نے ملازم سے کہا۔''ان دونوں بندوں کے پاس اگر کوئی ہتھیار وغیرہ ہے تو اسے اپنے پاس رکھ لو اور ان کی تلاشی لے کر اندر لے آؤ۔''

چند منٹ بعد چوہدری اعجاز اور اس کا چھوٹا بھائی شاداب عرف شابی ڈپٹی کے رُوبرو تھے۔ وہ دونوں رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح یہاں پہنچے تھے۔ گیٹ پر بھی انہوں نے اپنا نام وغیرہ نہیں بتایا تھا۔ شاداب کی کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں طفیل کی رہائی کے بارے میں جانتے تھے اس لیے طفیل کو دیکھ کر حیران نہیں ہوئے۔

''خیریت ہے چوہدری اعجاز! آج تم اپنی اچی پگڑی کے ساتھ اس کی کمین پولیس والے کی دہلیز کیسے پار کر آئے ہو؟''

''دیکھو ریاض! جو خود چل کر گھر آ جاتا ہے اس کے بارے میں اپنا دل صاف کر لیا جاتا ہے۔''

''میرا دل صاف ستھرا ہی رہتا ہے۔ تم اپنے دل میں جھاتی مار کر دیکھ لو۔''

''یہ میرا چھوٹا بھائی شاداب ہے۔ سردار دراج اور اس کے تینوں ساتھی گوجرانوالہ میں اسی کی کوٹھی پر رکھے گئے تھے۔''

''اچھا اچھا..... پھر تو اس بندے کو خوش خطی کے نمبر ملنے چاہئیں۔'' ریاض نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے شاداب کی طرف بڑھایا۔ اس سے حوصلہ پا کر چوہدری اعجاز نے بھی ڈپٹی سے مصافحہ کیا۔

ریاض بولا۔''پر چوہدری اعجاز..... اگر سوال ہی ٹھیک نہ کیا ہو تو پھر خوش خطی وغیرہ بالکل بے کار ہوتی ہے۔ دراج اور اس کے چمچوں کو رستم تمہارے بھائی سے چھین کر لے گیا تھا۔ اس کا ذمے دار کون ہے؟''

''آپ جانتے ہی ہو ریاض..... رستم کو روکنے کی کوشش میں شاداب کے چار بندوں کی جان گئی اور یہ خود بھی زخمی ہوا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک ٹھیک کام نہیں کرتا۔''

''لیکن کچھ شریف لوگ کہتے ہیں کہ سردار دراج کو چھوڑنے میں تمہاری اپنی مرضی بھی تھی۔ تم اپنی بھانجی شانی کے سامنے جھوٹا پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ بہر حال چلو، ان باتوں کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں..... اب بتاؤ کیسے تشریف آوریاں ہوئی ہیں؟''

چوہدری نے سب سے پہلے تو ریاض کی سالی کی ناگہانی موت پر تعزیت کی اور اس امید کا اظہار کیا کہ اصل قاتل جلد اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ اس کے بعد وہ اپنے اصل موضوع پر آ گیا۔ اس نے کہا۔''ریاض! وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدلتا ہے۔ کل کے دشمن آج کے دوست اور آج کے دوست کل کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ہمارے آپ کے درمیان بھی اختلاف وغیرہ رہے ہیں۔ اس اختلاف کی اصل وجہ یہی رستم تھا۔ اپنے خاندان کی عزت کے لیے ہم نے اس بندے کو بہت برداشت کیا ہے لیکن اب سب کچھ برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔ شانی بیٹی کی جمی جمائی زندگی کو خراب کرنے کے لیے رستم پھر یہاں آ دھمکا ہے۔ اس نے اوپر نیچے خطرناک کارروائیاں کی ہیں۔ آپ بھی جانتے ہو کہ درجنوں بندے مرے ہیں..... اب وہ ہمیں بھی لال آنکھیں دکھا رہا ہے۔''

''ہاں..... ہاں مجھے سب پتا ہے۔ وزیری گاؤں میں اس نے بڑی عزت افزائی کی تھی تمہاری..... سنا ہے چیپڑ شیپڑ ماردی تھی۔''

چوہدری اعجاز نے بلا تبصرہ بات جاری رکھی۔''اب میرا یہ بھائی اس خونی کے ہاتھوں بال بال بچا ہے۔ جو گولی اس کے بازو میں لگی ہے، سینے پر بھی لگ سکتی تھی۔ ہمارے چار بندے جان سے گئے ہیں۔ یہ کوئی معمولی نقصان تو نہیں ہے۔''

''چوہدری! تم ذرا اپنی ہزار داستان کے صفحے جھیتی پھٹیتی پلٹ دو تو اچھا ہے۔ مجھے مین بات بتاؤ..... کیا کہنے کے لیے یہاں آئے ہو؟''

چوہدری نے کھسیانے انداز میں گلا صاف کیا اور دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔''ریاض پُتر! آج سے تم ہمیں دلی طور پر اپنے ساتھ ہی سمجھو۔ ہمیں رستم یا اس کے کسی ساتھی کے بارے میں کوئی بھی اطلاع ملی، میں ڈریکٹ تم کو خبر دوں گا۔ تم کو پتا ہی ہے، علاقے میں ہمارے اپنے مخبر بھی ہیں۔ ہمارے مخبر تمہارے مخبروں کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی تمہیں جس طرح کے تعاون کی ضرورت ہو، ہم حاضر ہیں۔ پر اب اس بندے کو زیادہ دیر قانون کی پکڑ سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔''

''کس طرح کا تعاون کر سکتے ہو؟'' ریاض کا لہجہ بہت تیکھا تھا۔

''جس طرح کا بھی تم چاہو پُتر جی۔''

www.pdfbooksfree.pk

''تن من دھن، سب کچھ حاضر ہے ڈپٹی صاحب۔'' شاداب نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''تن..... یہ تن اپنا حاضر ہے یا ان ماڈل کڑیوں کا جو تمہارے آلے دوالے رہتی ہیں؟'' ریاض نے خشک انداز میں پوچھا۔

شاداب کے چہرے پر رنگ سا گزرا پھر وہ کھسیانے انداز میں ہنس دیا۔ ''آپ تو خبروں کے بادشاہ ہیں جی۔ آپ سے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔''

ریاض نے بے پروائی سے اپنی بالوں بھری رانوں پر ہاتھ پھیرا اور سگریٹ کا دھواں دونوں بھائیوں کی طرف چھوڑا۔ پھر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ایک لمبی ڈکار لی جس میں گوشت اور پیاز کی بو تھی۔ اس کے بعد چوہدری اعجاز سے مخاطب ہوا۔ ''اصل بات بتاؤ چوہدری..... اصل بات!''

چوہدری اعجاز کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ''میں سمجھا نہیں پُتر جی!''

''چھوٹی چوہدرانی کہاں ہے؟'' ریاض نے اچانک سوال کیا۔

چوہدری اعجاز اور شاداب دونوں بدک گئے۔ ''آپ کا مطلب ہے، شش شانی بیٹی.....؟ وہ تو حویلی میں ہے۔'' چوہدری ہکلایا۔

''وہاں کسی رڑک کر مکھن نکال رہی ہوگی تم دونوں بھائیوں کے لیے..... اور ساتھ ساتھ گا رہی ہوگی..... خوشیاں دے نال، میئوں چڑھ گئے نیں حال..... کیوں، ایسا ہی ہے نا؟''

دونوں بھائی گنگ ہو گئے تھے۔ ریاض پھنکارا۔ ''چوہدری! میں نے چھولے دے کر افسری نہیں لی ہے۔ تیرے جیسے چوہدریوں کے اندر سے ہو کر گزرا ہوں..... مجھے اصل بات بتا۔ مجھے پتا ہے کہ چھوٹی چوہدرانی اور اس کی لنگوٹن سہیلی حویلی میں نہیں ہیں۔ بتا..... کیا ہوا ہے ان کے ساتھ؟ وہ خود بھاگی ہیں یا پھر وہ کنجر کا تخم رستا بھگا کر لے گیا ہے؟''

چوہدری کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ شاداب بھی بنجر نظر آنے لگا۔

''یہ..... آپ..... کیا کہہ رہے ہو پُتر جی؟''

''کون پُتر؟ کس کا پُتر؟'' ''تُو اپنی یہ ابا گیری اپنی بغل میں داب کے رکھ۔ میں راشی پولیس والا ہوں اور تُو حرام خور چوہدری ہے۔ بس یہ رشتہ کافی ہے ہم دونوں کے لیے..... چل، بول کدھر ہے وہ تیری لاٹری تین سو مربعوں والی..... اور ساتھ میں اس کی لنگوٹن سہیلی؟''

چوہدری گنگ تھا، شاداب کے ہونٹوں پر بھی مہر لگ گئی تھی۔ چوہدری کراہ کر بولا۔

''میں دراصل..... میں آپ کو اس بارے میں بتانا چاہ رہا تھا..... لیکن..... میرا مطلب ہے..... وہاں حویلی میں کچھ عجیب پوزیشن ہو گئی ہے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔''

''پریشانی تو ماں کے پیٹ میں شروع ہو جاتی ہے..... تُو میری بات کا جواب دے۔ نکی چوہدرانی شانی حویلی میں ہے کہ نہیں؟''

''نن..... نہیں ہے ریاض..... لیکن اگر اس بات کا پتا عام لوگوں کو لگ گیا تو بہت بدنامی ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے، الیکشن بالکل پاس آ گئے ہیں۔ بہت ساری تیاریاں بھی ہو گئی ہیں۔ ایسے میں اگر..... آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔''

ریاض نے بے پروائی سے اپنی ننگی ٹانگیں پھیلا کر سگریٹ کا طویل کش لیا۔ ''اب دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں چوہدری..... یا تو حویلی کے اندر سے کسی نے ان دونوں کڑیوں کو غائب کیا ہے یا پھر وہ اپنی مرضی سے اپنے یار کی طرف بھاگی ہیں۔ دونوں صورتوں میں یہ بڑا ٹنگڑا پولیس کیس ہے۔''

''لیکن ریاض پُتر..... میرا مطلب ہے ریاض باؤ! اس موقع پر ہم کسی صورت یہ نہیں چاہتے کہ یہ بات باہر نکلے۔ چوہدری معصوم نے حویلی میں بھی یہی کہا ہے کہ شانی بیٹی کچھ دنوں کے لیے لاہور گئی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ قریبی رشتے داروں کو بھی اصل بات کا پتا نہیں۔''

ریاض نے کہا۔ ''چوہدری! ایسے راز بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ ان کے لیے قیمت دینی پڑتی ہیں۔''

چوہدری اعجاز کی بجھی ہوئی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک آ گئی۔ ''ریاض باؤ! میں نے تو شروع میں ہی کہا ہے، ہم ہر قسم کے تعاون کے لیے حاضر ہیں۔''

''اگر وہ تیری بندے مار بھانجی فل فلیج بدنام ہو جائے اور الیکشن میں اپنا بچ نہ تل سکے اور نہ تم لوگوں کا کچ تلا جائے تو کتنا نقصان ہوگا۔ کم از کم آٹھ دس کروڑ کو تو آگ لگ جائے گی نا..... بولو لگ جائے گی نا؟''

دونوں بھائیوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ چوہدری اعجاز نے مرے مرے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں جی ریاض باؤ..... بہت نقصان ہے۔''

''تو اس آٹھ دس کروڑ میں سے ساٹھ لاکھ کوئی بڑی رقم تو نہیں ہوگی؟''

''سس..... ساٹھ لاکھ؟'' چوہدری کا رنگ زرد پڑ گیا۔

''چل دو چار لاکھ کم کر لے..... مگر پچاس سے کم نہیں ہوگا۔ پچاس لاکھ میں تو آج کل

www.pdfbooksfree.pk

شہر میں مشکل سے فرنٹ کی ایک دکان آتی ہے اور پھر یہ صرف راز کو راز رکھنے کی قیمت نہیں ہے۔ اس رقم میں تمہارا دوسرا کام بھی تو ہوگا..... یعنی ایک خرید دوسرا مفت!''

''دوسرا کام؟'' چوہدری کی سوالیہ نظریں ریاض کے تمتماتے چہرے کی طرف اٹھیں۔

''اوئے! اس رستے کنجر سے بھی تو تمہارا پیچھا ہمیشہ کے لیے چھڑانا ہے کہ نہیں؟''

چوہدری اعجاز نے سر ہلایا پھر مرے مرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن یہ کافی بڑی رقم ہے۔''

''اوئے..... عقل کو ہتھ مار چوہدری! رستم سے تیرا پیچھا چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے تیری بھانجی کو بھی برآمد کرنا اور یہ لو ہے پر لکیر ہے کہ وہ بھوتنی دی ہوگی اس کے پاس ہی اور ان سارے کاموں کے لیے تجھ کو پچاس لاکھ زیادہ لگ رہا ہے؟ اگر زیادہ لگ رہا ہے تو پھر ٹھیک ہے..... سوچ لے..... میں بھی ذرا سوچ لیتا ہوں۔'' ریاض ایک دم جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

چوہدری نے گھبرا کر کہا۔ ''نہیں..... نہیں..... میرا مطلب ہے اتنی بڑی رقم..... اتنی جلدی..... دراصل..... وہ مگر..... آپ بیٹھو تو سہی۔''

ریاض اسے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پھر بیٹھ گیا۔ ''دیکھ چوہدری! مجھ سے ہینگی ہینگی نہ لگا۔ میں جانتا ہوں تُو کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔ چل اگر زیادہ بات ہے تو آج کا دن لے لے۔ کل پہنچا دینا۔ کیش ہو تو اچھا ہے۔ چیک ہو تو کراس نہیں ہونا چاہیے۔ نام شام نہ لکھنا، میں خود بھر لوں گا۔''

''ایک منٹ..... ہم ذرا بات کر لیں۔'' چوہدری نے کہا اور کپکپاتی ٹانگوں کے ساتھ شاداب کو لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ دونوں نے دو تین منٹ بات کی پھر واپس آ گئے۔

اس رشوت پیکیج کے سلسلے میں ریاض اور چوہدری کے درمیان چند منٹ مزید بات ہوئی۔ اعجاز اور شاداب کے چہروں سے ظاہر تھا کہ یہ رقم ان کی توقع سے کافی زیادہ ہے۔ بہ تاہم وہ کسی نہ کسی طرح خود کو آمادہ کرنے میں کامیاب گئے تھے۔

سب کچھ طے ہو گیا۔ مختصر یہ کہ چوہدری اعجاز نے اگلی شام تک ریاض کو پچاس لاکھ پہنچانے تھے۔ کچھ دیر بعد دونوں بھائی کرزتے کانپتے رخصت ہو گئے تو ریاض نے ان پر غائبانہ گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ آخر میں بولا۔ ''حرامزادے..... سوکھی محبت کا چڑھاوا لے کر آئے تھے۔ پیدائشی کھوچل لوگ ہیں اور اس بڑے کمینے سے وہ چھوٹا کمینہ زیادہ کھوچل تھا۔ بہن خور..... گونگا بن کر بیٹھا ہوا تھا مگر اصل عقل اسی کی کام کر رہی تھی۔''

''لیکن یہ بڑا چوہدری بھی کچھ کم نہیں ہے پچاسی۔ ڈھائی تین سال میں ہی حویلی کا کرتا

دھرتا بن بیٹھا ہے۔ چوہدری معصوم ایک کونے میں لگا ہوا ہے۔''

''اب یہ حرام خور اس سے بھی آگے کی سوچ رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے، چھوٹے بھائی کو نکی چوہدرانی کا خصم بنا دے۔ اس کے علاوہ اسے امید ہے کہ الیکشن کے بعد بھی دولت بارش کی طرح برسے گی اس کے گنجے کھوپڑے پر۔''

طفیل نے اپنے زخمی ہونٹوں سے سگریٹ لگاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن چچا! چوہدری اعجاز سے آپ کے وعدے کا کیا بنے گا؟''

''کیا مطلب؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ نے اس اخبار والے کو بتا دیا ہے سب کچھ۔''

''کوئی بات نہیں۔ تم فون لگاؤ اس ٹھرکی ایڈیٹر کو۔''

طفیل نے ایک نمبر پریس کیا اور پھر ریسیور ریاض کی طرف بڑھا دیا۔ ''ہیلو! کون ہے؟'' ریاض نے کہا۔

دوسری طرف سے خوشامدی آواز ابھری۔ ''جی ڈپٹی صاحب! آپ کا خادم گلزار راہی عرض کر رہا ہوں۔ کوئی اور خبر ہے جناب؟''

''اوئے، خبروں کی بھوک تو تمہارے پیٹ میں ایسی وڑی ہوئی ہے کہ قیامت آنے کی اطلاع سے بھی کم نہیں ہو سکتی۔ اس وقت خبر دینی نہیں، واپس لینی ہے۔''

''میں سمجھا نہیں ریاض صاحب؟''

''وہ جو رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی کی خبر ہے نا..... اس کو ابھی روکنا ہے۔''

''روکنا ہے؟'' گلزار راہی کے لہجے میں گہری مایوسی سرایت کر گئی۔

''اوئے، مرا کیوں جا رہا ہے گلزارے..... اس خبر کا جھنڈا تیرے ہی دفتر پر لگے گا۔ بس دو دن کے لیے چھری کے نیچے سانس لے۔ بلکہ بس پرسوں رات تک۔ پرسوں رات چھاپ دینا سب کچھ۔''

''لیکن.....''

''لیکن شیکن کچھ نہیں۔'' ڈپٹی دہاڑا۔ ''بس کہہ دیا ہے نا۔ پرسوں رات تک دبا لے اپنی اس حاجت کو..... میرا ایک مسئلہ ہے۔''

''ٹھیک..... ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے، جیسے آپ کہتے ہیں لیکن اس سے پہلے کوئی اور بریک نہ کر دے۔''

''جب کسی کے پاس خبر ہی نہیں تو بریک اپنی ماں کا سر کرے گا۔ پتا نہیں کیسی باتیں کرتا

www.pdfbooksfree.pk

ہے تُو۔''

''نہیں..... وہ تو..... میں نے بس..... بچ..... چلیں ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کہتے ہیں، ویسے ہو جائے گا۔'' گلزار راہی ہکلایا۔

ریسیور کریڈل پر پٹخنے کے بعد ریاض کچھ دیر بڑبڑاتا رہا پھر اس نے مخبر اچھولہوری کی ماں بہن سے چند نازیبا رشتے جوڑنے کے بعد طفیل سے کہا کہ وہ لہوری کا نمبر لگائے..... دوسری تیسری کوشش میں طفیل نے اچھولہوری کا موبائل نمبر ملانے میں کامیابی حاصل کی۔ اچھولہوری سے رابطہ ہونے کے بعد ریاض نے اس پر دھاڑنا شروع کیا اور اس سے پوچھا کہ کام کس اسٹیج پر پہنچا ہے۔ اچھولہوری نے بتایا کہ وہ اور اس کے تین ساتھی پوری تندہی سے کام کر رہے ہیں۔ اب تک وہ علاقے کی چھوٹی بڑی تقریباً تیس مسجدیں دیکھ چکے ہیں۔ صرف ایک مسجد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکا اذان دیتا تھا مگر وہ پچھلے دو مہینے سے اپنے آبائی علاقے ایبٹ آباد گیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مطلوبہ مسجد نہیں ہے۔ ریاض نے اچھولہوری کو کام کی رفتار بڑھانے کی ہدایت کی اور فون بند کر دیا۔

اگلے اڑتالیس گھنٹے میں تین بڑے اہم کام ہوئے۔ سب سے پہلے تو دوسرے روز شام پانچ بجے تک رنگ والی کے چوہدریوں نے ریاض تک مطلوبہ رقم پہنچا دی۔ اس میں دو تین چیک بھی تھے۔

اگلے روز چیک کیش ہونے کے فوراً بعد ریاض نے ایڈیٹر گلزار راہی کو گرین سگنل دے دیا کہ وہ چھوٹی چوہدرانی کی خبر چھاپ سکتا ہے۔

اس رات تیسرا اہم ترین کام یہ ہوا کہ مخبر اچھولہوری گلبرگ کی مطلوبہ مسجد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی فراہم کردہ اطلاعات بڑی ٹھوس تھیں۔ یہ اطلاعات طفیل کی ڈیمانڈ کے عین مطابق تھیں۔ مسجد میں مغرب اور عشاء کی اذان امام مسجد کا کم سن پوتا دیتا تھا۔ اس اطلاع کو سننے کے فوراً بعد ڈپٹی ریاض، طفیل اور تین سادہ پوش اہلکار پرائیویٹ گاڑی میں مطلوبہ علاقے کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سارے کام میں بے حد راز داری اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ لہٰذا کسی فالتو آدمی کو ساتھ نہیں لیا گیا۔ جس گاڑی میں وہ لوگ روانہ ہوئے، اس کے شیشے کلر ڈ تھے۔

سب سے پہلے ایک اندرونی سڑک پر واقع یہ مسجد لوکیٹ کی تھی۔ طفیل نے گاڑی مسجد کے سامنے رکوائی اور اس کا رخ شمال کی جانب رکھا۔ ''اب کیا کہتے ہو؟'' ریاض نے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ہم اپنے ٹارگٹ سے زیادہ دور نہیں۔'' طفیل کی آواز اندرونی جوش

سے لرز رہی تھی۔ ''یہ دیکھیے، دائیں طرف قطار میں دس بارہ کوٹھیاں ہیں۔ ان کے آگے ہی چوڑی گراؤنڈ ہے۔ پیچھے کی طرف مارکیٹ ہے اور کوئی رہائشی مکان نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارا کام اور آسان ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنے سیاہی مائل کپکپاتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ ''اس قطار کی پہلی تین چار کوٹھیاں تو ہم ویسے ہی چھوڑ سکتے ہیں..... کیونکہ اذان کی آواز مجھے کچھ فاصلے سے سنائی دیتی تھی۔ باقی کوٹھیوں کو ہم دیکھ لیتے ہیں۔''

''باقی کوٹھیوں میں سے کوئی خاص پہچان؟''

''ایک تو وہ کوٹھی دو منزلہ ہے۔ دوسرا..... میرے اندازے کے مطابق اس کا مین گیٹ لکڑی کا ہے۔''

''اوکے!'' ریاض نے کہا اور ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے سڑک کا ایک چکر لگایا۔ سات آٹھ کوٹھیوں میں سے صرف دو کے مین گیٹ لکڑی کے تھے اور لکڑی کے گیٹس والی ان کوٹھیوں میں سے صرف ایک کوٹھی ڈبل اسٹوری تھی۔ وہ اپنی منزل سے قریب تر پہنچتے جا رہے تھے۔ پرانی تعمیر والی اس دو منزلہ کوٹھی کی زیادہ تر کھڑکیاں تاریک دکھائی دیتی تھیں۔

انہوں نے گاڑی اس کوٹھی کے سامنے تاریکی میں روک دی۔ ان کے دائیں جانب وہ وسیع گراؤنڈ تھا جس میں کہیں کہیں پتھر کی بچیں رکھی ہوئی تھیں۔ گراؤنڈ میں کہیں کہیں بارش کا پانی کھڑا تھا اور وہ خالی پڑا تھا۔ اچانک دوسری منزل کی ایک بالکونی روشن ہوئی۔ ایک شخص تیزی سے چلتا ہوا بالکونی میں سے گزرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ دو تین منٹ بعد وہ واپس آیا۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ ایک اور شخص تھا۔ اس دوسرے شخص کو دیکھتے ہی ڈپٹی ریاض کی دھڑکن نقارے کی طرح گونجنے لگی۔ اس کے لہو میں جیسے آگ بھڑک اٹھی تھی۔ فاصلہ کافی تھا پھر بھی وہ پہچان گیا۔ اسے نوے فیصد امید تھی کہ یہ دوسرا شخص رستم کا ساتھی ڈاکٹر ناصر ہے۔

اس نے وائرلیس سیٹ آن کیا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس کا رابطہ ہیڈ کوارٹر میں ہو گیا۔ اس نے شاہ زمان نامی کسی ساتھی کو مخاطب کیا اور بلا تمہید کہا۔ ''مبارک ہو..... کوٹھی ٹریس ہو گئی ہے۔ جتنی جلدی ہو سکتا ہے، فورس کے ساتھ مین مارکیٹ پہنچ جاؤ۔ میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔''

رابطہ منقطع کرنے کے بعد ڈپٹی ریاض نے جلدی جلدی تین چار جگہ وائرلیس اور موبائل سے رابطہ کیا۔ اس نے ہر جگہ، چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ کوٹھی ٹریس ہونے کی

www.pdfbooksfree.pk

اطلاع دی اور نفری طلب کی۔ کوٹھی کے مکین اس بات سے بے خبر تھے کہ وہ کس طوفان میں گھرنے والے ہیں۔

☆=======☆=======☆

کوٹھی کے اندر رستم کے سامنے چائے کا کپ پڑا تھا اور وہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ رنگ والی کی خبر شام کے اخبار میں ہی چھپ گئی تھی۔ سرخی تھی۔ ''انتخابی مہم موجود..... امیدوار غائب!'' ذیلی سرخیاں یوں تھیں۔ ''رنگ والی کی چھوٹی چوہدرانی رُوپوش یا اغوا؟ لواحقین صورت حال کو پوشیدہ رکھنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف۔''

خبر کے متن میں تفصیل درج تھی۔ اس واقعے کو خوب مرچ مسالا لگا کر بیان کیا گیا تھا۔ شانی اور رستم کے تعلق کو بھی ایک بار پھر پورے زور وشور سے اچھالا گیا تھا۔ ان دونوں پر کئی گفتنی ناگفتنی الزام لگائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کی پرانی تصویریں بھی شائع ہوئی تھیں۔ یہ اخبار ایک ملازم ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے لے کر آیا تھا۔ سب سے پہلے یہ رستم کے ہاتھ میں ہی آیا۔ اسے سخت صدمہ پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اسے اخبار چھپا لینا چاہیے۔ وہ شانی کو مزید دکھی اور پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اخبار چھپا لیا لیکن اخبار چھپانے سے خبر تو نہیں چھپ جاتی۔ قریباً پندرہ منٹ بعد ناصر نے ایک نیوز چینل پر یہ خبر دیکھی اور اس بارے میں رستم کو بتایا۔ یہ بات اب طے تھی کہ رنگ والی میں شانی کی غیر موجودگی اب کہیں بھی راز نہیں رہے گی۔ اس خبر سے شانی کے ان ہزاروں خیر خواہوں اور مداحوں کو بھی شدید صدمہ پہنچا تھا جو ہر جگہ اس کے حق میں نعرے لگاتے تھے اور اس کے گن گاتے پھر رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی نگاہیں شانی کو عنقریب ایک بہت اونچے مقام پر دیکھ رہی تھیں۔

رنگ والی کی خبر میں ایک نئی اطلاع بھی تھی۔ شانی نے بتایا تھا کہ اس کی عزیز سہیلی سکینہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی مگر اس خبر کے مطابق وہ بھی ابھی تک لاپتا تھی۔ وہ رنگ والی واپس نہیں پہنچی تھی۔ رستم سوچنے لگا کہ حالات کس طرح انسان کا بانکا کرتے ہیں۔ وہ سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے۔ پھر رستم سوچنے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ سکینہ ختم ہو چکی ہو اور شانی نے یہ خبر اس لیے چھپالی ہو۔ شانی کے عجیب وغریب مزاج کو سمجھنا رستم کے بس سے بھی باہر تھا۔ اکثر اس کی باتیں سمجھ سے بالاتر ہوتی تھیں۔ اب یہ بات کل شانی نے رستم کو خود ہی بتائی تھی کہ طفیل کو چھوڑے جانے سے پہلے وہ ریاض سے چھوٹ کر یہاں پہنچ چکی تھی مگر اس نے ناصر اور جہانگیر کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ طفیل کی رہائی رک

www.pdfbooksfree.pk

جائے۔ یوں لگتا تھا کہ شانی برے سے برے اور اچھے سے اچھے شخص کے بارے میں ایک ہی مہربان طریقے سے سوچتی ہے

بستر پر جانے کے بجائے رستم چھت پر چلا گیا اور دیر تک بے چین پھرتا رہا۔ اجمل کی حالت بھی سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ آج پھر اسے تیز بخار تھا اور شدید درد کا سامنا بھی تھا۔ وہ تکلیف سے ہار ماننے والا شخص نہیں تھا لیکن مسلسل سختیاں پہاڑوں کو بھی مسمار کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ آپو زاہدہ آج اجمل کی حالت دیکھ کر بہت آزردہ ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک بار پھر رستم کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ان سارے چکروں کو چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں اجمل کو بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور وہاں اس کا علاج کراتے ہیں۔ اس کی سادہ دل بہن نہیں جانتی تھی کہ ان سب کو حالات نے کس بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ ہسپتال تو رہے دور کی بات، اب تو قبروں میں بھی ان کا پیچھا کیا جا رہا تھا..... یہ لڑائی اب اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والی تھی۔ اس لڑائی کا انجام جو بھی ہوتا مگر رستم کو ہر صورت ڈپٹی ریاض کا بوجھ دھرتی پر سے کم کرنا تھا۔ اگر وہ یہ بوجھ چھوڑ کر مر بھی جاتا تو چین نہ پا سکتا۔ اس کی روح روزِ محشر تک بھٹکتی رہتی۔ وہ مرنے سے نہیں ڈرتا تھا۔ یہ ڈر بہت پہلے اس کے دل سے نکل چکا تھا لیکن وہ دو باتیں ضرور چاہتا تھا۔ ایک تو اس کے ساتھی اس آگ میں راکھ ہونے سے بچ جائیں۔ دوسرے مرنے سے پہلے وہ ریاض کو آخری سانس اور آخری ہچکی لیتے ہوئے دیکھ لے۔ بس..... اس کے سوا..... اس کے سوا اسے کچھ درکار نہیں تھا۔

اچانک اس کی عقابی نگاہوں کو کچھ دکھائی دیا۔ ایک قریبی کوٹھی کی چھت پر دو متحرک سائے نمودار ہوئے اور تیزی سے ایک طرف اوجھل ہو گئے۔ رستم ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ وہ چھت کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اسے نیچے سڑک پر دو گاڑیاں مشکوک انداز میں کھڑی دکھائی دیں۔ گاڑیوں کی لائٹس آف تھیں مگر وہ گاڑیاں خالی نہیں تھیں۔ ان کے اندر لوگ موجود تھے۔ یکا یک رستم کی رگوں کی گردش تیز ہو گئی۔ اردگرد کچھ ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ موجود تھے۔

ایک سوال خوفناک چنگھاڑ کی طرح اس کے سینے میں ابھرا..... تو کیا کچھ لوگ ان کے بارے میں جان چکے تھے؟ پھر فوراً اس نے ایک اور بات محسوس کی۔ آس پاس کی دو تین کوٹھیاں خلافِ معمول تاریک دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ زینے پھلانگتا ہوا نیچے آیا۔ آپو زاہدہ نماز کے لیے مصلے پر تھیں۔ سرمدان کے قریب قالین پر اوندھا لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ زری کچن میں آڑھی ترچھی روٹیاں پکا رہی تھی اور ان

کی شکلیں دیکھ دیکھ کر خود ہی مسکرا رہی تھی۔ ناصر، اجمل کے سرہانے بیٹھا تھا۔ اجمل پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ رستم نے اشارے سے اسے باہر بلایا۔ ''خیریت ہے رستم بھائی؟''

''مجھے گڑبڑ لگ رہی ہے۔ اردگرد کچھ ہو رہا ہے۔ شاید کچھ بندے ہیں۔''

ناصر کی آنکھوں میں بھی گہری تشویش ابھر آئی۔ اس نے سب سے پہلے اپنی کمر ٹٹول کر وہاں پستول کی موجودگی کا یقین کیا۔ رستم نے پوچھا۔ ''ٹیلی اسکوپ کہاں ہے؟''

''میں ابھی لایا۔'' ناصر بولا اور تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں ٹیلی اسکوپ سمیت چھت کے ایک محفوظ حصے میں موجود تھے۔ یہ وہی ٹیلی اسکوپ تھی جو اجمل وغیرہ کے ٹوہ کے نواح میں استعمال کرتے رہے تھے۔ پہلے ناصر نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ چند سیکنڈ بعد اس کے ہونٹوں سے سرسراتی آواز نکلی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔''

رستم نے اس سے ٹیلی اسکوپ لے کر اپنی آنکھوں سے لگائی..... وہ ششدر رہ گیا۔ وہ چھت کے اس حصے سے جتنا کچھ بھی دیکھ سکتے تھے، وہ تہلکہ خیز تھا۔ قریبی چھتوں اور سڑک کے ساتھ ساتھ درختوں میں متحرک سائے موجود تھے۔ یقیناً یہ پولیس کے لوگ تھے۔ وہ گھیرے میں آ چکے تھے۔

''ناصر! سردار کو بلاؤ۔'' رستم نے تیزی سے کہا۔

ناصر نیچے گیا اور چند سیکنڈ بعد سردار کو لے کر آ گیا۔ ''ہمیں گھیر لیا گیا ہے سردار! آس پاس کی چھتوں پر لوگ موجود ہیں۔ اپنے بندوں کو چوکس کر دو۔ دو چار کو چھت پر بھیجو۔ باقی کو نیچے لگا دو۔''

''پر..... یہ ہوا کیسے؟''

''ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں۔ یہ نہ ہو، ہم پر ایک دم چڑھائی ہو جائے..... جلدی کرو۔''

سردار کے نتھنے پھول گئے۔ آنکھوں میں سرخی لپک آئی۔ وہ دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد زینوں کی طرف سے شانی کی پریشان آواز سنائی دی۔ ''رستم..... رستم!''

رستم اپنا اوورکوٹ قریب کے نیچے چھپاتا ہوا زینوں پر پہنچا۔ شانی چند زینے نیچے کھڑی تھی۔

''کیا بات ہے رستم! آپ سب پریشان ہیں۔ کچھ گڑبڑ ہے؟''

''نہیں۔ بس شک سا ہے، ابھی پتا چل جائے گا۔ آپ لوگ اندر کے کمروں میں رہیں۔''

''کیا..... پولیس؟'' شانی نے رستم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

رستم کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانی کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ اسی دوران میں ناصر نے چھت پر سے رستم کو پکارا۔ رستم اوپر آیا۔ شانی تیزی سے نیچے چلی گئی۔

''رستم بھائی! یہ بڑا سخت گھیرا ہے۔ ان لوگوں نے بڑی ہوشیاری سے پوزیشنیں لی ہوئی ہیں۔ دیکھیں..... نیچے دو گاڑیاں اور آ گئی ہیں۔''

رستم نے دیکھا، دو مزید گاڑیاں گراسی میدان کے قریب آ کر رک گئی تھیں۔ یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اب پولیس والوں کی پوزیشن اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ انہیں اپنا آپ چھپانے کی ضرورت نہیں رہی۔

پہلے سے موجود گاڑیوں میں سے دو سائے نکل کر نئی آنے والی گاڑیوں کی طرف لپکے بس ان کی ایک جھلک ہی نظر آئی۔ ناصر کی آنکھوں پر دوربین تھی اس لیے وہ بہتر طور پر دیکھ سکا۔ ان میں سے ڈپٹی کے سانولے سلونے بھتیجے طفیل کو اس نے صاف پہچان لیا۔

رستم نے پوچھا۔ ''وہ حرامی ریاض تو دکھائی نہیں دیا؟''

''نہیں بھائی! ابھی نہیں..... مگر بھتیجے صاحب نظر آئے ہیں۔''

''کون؟ طفیل؟''

''جی ہاں۔'' ناصر نے طویل سانس لی۔ ''اور مجھے لگتا ہے کہ پولیس اسی کی مدد سے یہاں تک پہنچ سکی ہے۔ شاید اس بدبخت نے اپنے حافظے کے زور پر یہاں تک کا راستہ ڈھونڈ لیا ہے۔''

اچانک یکے بعد دیگرے اردگرد کی چھتوں پر قریباً نصف درجن سرچ لائٹس روشن ہو گئیں۔ ان ساری لائٹس کی روشنی اس پرانی طرز کی دو منزلہ کوٹھی پر ہی پڑ رہی تھی۔ خاص طور سے کوٹھی کی ایک سائیڈ اور سامنے والا حصہ روشنی میں نہا گئے تھے۔ رستم اور ناصر تاریک گوشوں میں چلے گئے۔

طاقتور میگا فون پر ایک کریہہ آواز ابھری۔ اس آواز کو رستم اور ناصر ہزارہا آوازوں میں پہچان سکتے تھے۔ یہ اس فرعون صفت شخص کی آواز تھی جس نے عیاری اور سفاکی میں نام پیدا کیا تھا..... اور جو اپنے اردگرد موجود انسانوں کو حقیر کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا اور یہی وہ شخص تھا جس نے پوٹھوہار کی گھاٹیوں میں بھی بے رحم خوں ریزی کی تاریخ رقم

www.pdfbooksfree.pk

کی تھی۔ یہ ڈپٹی ریاض کی آواز تھی۔ وہ ہولناک فقرہ جو ایسے موقعوں پر اکثر کہا جاتا ہے، ڈپٹی ریاض کی آواز نے اس فقرے کو مزید قہر ناک بنا دیا تھا۔ ''رستم! تم اور تمہارے ساتھی پوری طرح گھیرے میں آ چکے ہیں۔ بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ..... ورنہ مارے جاؤ گے۔''

یہ اعلان قریباً 300 فٹ کی دوری سے دو مرتبہ دہرایا گیا۔ اس دوران میں پولیس کی موبائل گاڑیوں کے ہوٹر بھی سنائی دیتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ چھتوں پر لگی ہوئی نیلی ریوالونگ لائٹس بھی اپنی چمک دکھاتی رہیں۔ یوں لگتا تھا کہ بڑی خاموشی کے ساتھ اردگرد کی کوٹھیوں میں اور مارکیٹ کی چھتوں پر پوزیشن لینے کے بعد اب اردگرد کے علاقے کو بھی گھیرے میں لیا جا رہا ہے۔ بہت سے گھروں کے مکینوں کو تو غالباً گھروں کے اندر ہی محفوظ کمروں میں پہنچا دیا گیا تھا، تاہم کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے گھر چھوڑ کر ٹولیوں کی شکل میں پیچھے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ رستم اور ناصر نگاہِ تصور سے دیکھ سکتے تھے کہ درجنوں طاقتور رائفلوں کا رخ اس کوٹھی کی جانب ہے۔

سردار دراج اپنے ساتھیوں کو مختلف پوزیشنوں پر لگانے کے بعد ہانپتا ہوا رستم کے پاس پہنچا۔ ''رستم! آپاں نے بندوں کو بالکل ٹھکانے پر بٹھا دیا ہے۔ دو جنے (بندے) اوپر پانی والی بڑی ٹینکی کے اندر ہیں۔ ان کو تو بنا بنایا مورچال مل گیا ہے۔ ایک جنے کو وہ سامنے کھبے کنارے پر لگا دیا ہے۔ اس کے پاس ری پیٹر ہے۔ دو سر ایہ تھم (ستون) کے پیچھے کھڑا ہے۔ باقی نیچے ہیں۔ نیلی چھتری والے نے چاہا تو ان میں سے ایک بندہ بھی اپنی جگہ سے ہلے گا نہیں۔ آکھری گولی اور آکھری ساہ تک لڑ کر دکھائے گا۔''

''ٹھیک ہے دراج! تم بھی نیچے ہی رہو۔ کلاشنکوف کا کتنا خرچہ پانی ہے تمہارے پاس؟''

''تین چار سو گولیاں تو جرور ہوں گی۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اپنے بندوں سے بھی کہہ دو کہ فائرنگ کی نوبت آئی تو بچت کے ساتھ گولی چلانی ہے۔ جن کے پاس آٹو میٹک ہیں، وہ اپنی رائفلوں کو سنگل پر سیٹ کر لیں..... برسٹ خاص ضرورت کے وقت ہی چلایا جائے۔''

''تم ایک دم بے پھکر رہو رستم! آپاں نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی یہ باتیں بول دی ہیں۔''

اتنے میں جہانگیر سیڑھیوں کی طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور

آنکھیں سرخ تھیں۔ یہ نیند اور نشے کی ملی جلی سرخی تھی۔ وہ آج جلدی سو گیا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ غالباً وہ اس صورتِ حال سے ابھی ابھی باخبر ہوا تھا۔

''رستم! یہ کیا ہو گیا ہے یار..... اس کی تو بالکل امید نہیں تھی۔'' وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

''بس دیکھ لو..... جو کچھ ہے تمہارے سامنے ہے۔''

''یار! کہیں اس ڈاکٹر طارق نے تو.....''

''نہیں نہیں۔'' ناصر نے یقین سے سر ہلایا۔ ''یہ دوسرا چکر ہے۔''

''پھر کیا ہو سکتا ہے؟'' جہانگیر نے کہا پھر چند سیکنڈ بعد پُر سوچ انداز میں بولا۔ ''کہیں وہ حرامی طفیل تو جج منٹ نہیں کر گیا؟''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' رستم بولا۔

یہی وقت تھا جب پولیس کی طرف سے دوسرا اعلان کیا گیا۔ اس مرتبہ بھی ساعت کو چکنا چُور کرنے والی زہریلی آواز ڈپٹی ریاض ہٹلر کی ہی تھی۔ ''اپنی اور اپنے ساتھیوں کی زندگی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ۔ تمہارے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر تم لوگ خود کو ہمارے حوالے کر دیتے ہو تو تمہارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ اس بات کی گارنٹی ہم پریس والوں کی موجودگی میں دے رہے ہیں..... میں اپنا اعلان پھر دہرا رہا ہوں۔''

اس کے بعد ریاض نے غالباً لکھا ہوا اعلان ایک بار پھر دہرایا۔ اسی دوران میں درجنوں پولیس اہلکار اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتے ہوئے کچھ مزید قریب آ گئے تھے۔ انہوں نے گاڑیوں کے عقب میں اور گرا سی میدان کے تناور درختوں کے پیچھے پوزیشنیں لے لی تھیں۔ تارکول کی سڑسک پر ان کے بوٹوں کی گونج سناٹے میں بار بار ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

رستم نے جہانگیر سے کہا۔ ''جہانگیر! تم اپنی گن لے لو اور عورتوں کے پاس چلے جاؤ۔ ان کی حفاظت اور حوصلہ تسلی تمہاری ذمے داری ہے۔''

''یار، ہو سکتا ہے ابھی پیچھے مارکیٹ کی طرف گھیرا زیادہ سخت نہ ہوا ہو۔ کیوں نہ فائرنگ کرتے ہوئے نکلنے کی کوشش کریں۔''

رستم اور ناصر نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں جہانگیر! تم نے پیچھے دیکھا نہیں۔ وہاں چھتوں پر اس سے زیادہ نفری ہے۔'' رستم نے کہا۔

میگا فون پر ایک بار پھر اعلان گونجا۔ ڈپٹی ریاض نے کہا۔ ''رستم سیال، اجمل خان،

www.pdfbooksfree.pk

دراج مہتم اور ناصر..... ہم تمہیں دس منٹ کی مہلت دے رہے ہیں۔ ہتھیار ڈال کر اور دونوں ہاتھ اٹھا کر، ایک ایک کر کے اوپر والی گیلری میں آ جاؤ۔ تم پر گولی نہیں چلائی جائے گی..... میں پھر کہتا ہوں..... تم پر گولی نہیں چلائی جائے گی۔ اگر تم باہر نہیں آتے ہو تو ٹھیک دس منٹ بعد ہم فائر کھول دیں گے۔''

اگلے دس منٹ میں رستم اور اس کے ساتھیوں نے خود کو ذہنی طور پر آنے والے حالات کے لیے تیار کر لیا۔ دوسری طرف پولیس فورس نے بھی مورچا بندی کر لی۔ ٹھیک دس منٹ بعد بغیر کسی مزید وارننگ کے فائرنگ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے خود کار رائفل سے ایک طویل برسٹ چلا جس نے بالکونی کے پیچھے ساری کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور کر دیئے۔ پھر اوپر تلے کئی چھوٹے برسٹ چلے اور سناٹا تڑتڑ کی لرزہ خیز آوازوں سے تھرا اٹھا۔ رستم کے ساتھیوں نے بھی اس حملے کا بھرپور جواب دیا اور ہر طرف دھماکوں کے ساتھ شعلے لپکتے نظر آئے۔

یہ فائرنگ قریباً تین منٹ تک جاری رہی۔ پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ یقیناً پولیس فورس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اندر لڑائی کا سامان موجود ہے اور لڑنے والے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں بھرپور مزاحمت کی جائے گی۔

قریباً تین چار منٹ تک جاری رہنے والی اس فائرنگ میں دراج کا ایک ساتھی زخمی ہوا۔ اس کے گھٹنے میں گولی لگی۔ اس کے علاوہ کوئی اور نقصان نہیں پہنچا۔ رستم اور اس کے ساتھیوں کی فائرنگ سے بھی یقیناً کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا ہو گا۔ بہرحال، تین سرچ لائٹس کا تاریک ہونا تو ثابت تھا۔

فائرنگ کے وقفے کے دوران میں مسلح پولیس اہلکار تیزی سے اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتے نظر آئے۔ ان کے سروں پر ہیلمٹ تھے اور اکثر نے حفاظتی جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔ وہ اسپیشل فورس کے لوگ تھے۔ رستم جانتا تھا کہ یہ لوگ عمارتوں کے اندر گھسنے اور کمانڈو یکشن کے ماہر ہوتے ہیں۔ ان کا گھیرا اتنا مکمل تھا کہ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

زینوں پر ایک بار پھر شانی کی آواز سنائی دی۔ رستم ایک چوڑے ستون کی اوٹ سے نکلا اور تیزی سے زینوں میں داخل ہو گیا۔ زینوں پر گولیوں کے بہت سے خول بکھرے تھے اور ہر طرف بارود کی بو پھیلی محسوس ہو رہی تھی۔

شانی نے کراہ کر کہا۔ ''رستم! آخر وہی ہوا نا جس کا ڈر تھا۔ پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ دائیں طرف سے اور پیچھے سے وہ بالکل پاس آ گئے ہیں۔''

''شانی! آپ نے تو دوسروں کو حوصلہ دینا ہے۔ آپ خود پریشان ہوں گی تو پھر کیا بنے

گا۔ باقی آپ ان کے قریب آنے سے پریشان نہ ہوں۔ ہم ان کے لیے حلوہ نہیں ہیں۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گی کہ وہ اس کوٹھی کے قریب پھٹک بھی نہیں سکیں گے۔ ابھی تو ہم نے انہیں کچھ دکھایا ہی نہیں ہے۔''

''مگر اس کا اینڈ کیا ہو گا رستم؟ ہم کب تک انہیں روک سکیں گے؟''

''جب تک دم ہے۔'' رستم نے عجیب لہجے میں کہا۔

نیچے کمرے سے اجمل کے بری طرح کھانسنے کی آواز آنے لگی۔ بارود کی بو اور دھواں اس پر اثر کرنے لگا تھا۔ سرمد کے رونے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ یقیناً اس صورتِ حال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔

اچانک ایک بار پھر تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ پہلی پولیس کی طرف سے ہی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کوٹھی کے اندر سے بھی جواب دیا جانے لگا۔ کوٹھی کے شیشے چکنا چور ہونے لگے۔ لکڑی کے پرخچے اُڑنے لگے۔ پورچ میں کھڑی کسی گاڑی کے دو ٹائر دھماکوں سے پھٹ گئے..... سردار دراج کا ایک ساتھی گردن میں گولی کھا کر زینوں پر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ اس کے دو ساتھی اسے گھسیٹ کر ایک محفوظ آڑ میں لے گئے۔ شانی اور رستم زینوں میں ہی کھڑے تھے۔ وہ نیچے بیٹھ گئے اور دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔ شانی کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت رستم کے بازو پر قائم تھی۔ بارود کی بُو بڑھتی جا رہی تھی۔ اجمل کی کھانسی، بارود کی بُو اور دھماکوں کی آواز..... سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔

فائرنگ کا یہ دوسرا دورانیہ کم و بیش پانچ منٹ کا تھا۔ دو طرفہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ کوٹھی کی اکثر لائٹس بھی چکنا چور ہو گئی تھیں۔ بس دو چار کمرے ہی روشن نظر آ رہے تھے۔ اجمل کی کھانسی اب ذرا رک رک کر سنائی دے رہی تھی۔ شاید اس کی سانس اٹک رہی تھی۔ رستم اور شانی تیزی سے زینے اترتے ہوئے اجمل کی طرف بڑھے۔ زینوں کے نچلے سرے پر جہانگیر موجود تھا۔ اسے بھی گولی لگ گئی تھی۔ یہ گولی اس کے بائیں بازو کو چھیدتی ہوئی گزری تھی۔ خون بہہ رہا تھا تاہم جہانگیر کا مورال بلند تھا۔ رستم نے دیکھا کہ وہ خود ہی اپنے بازو پر پٹی باندھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ڈرائنگ روم میں آپو زاہدہ، سرمد کو اپنے بازوؤں میں چھپائے ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم کی بیشتر کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہو گئے تھے۔ رستم اور شانی اجمل کے کمرے میں پہنچے۔ ناصر نے اسے آکسیجن لگا دی تھی۔ اجمل کا چہرہ ہوا کی کمی کے سبب نیلگوں ہو رہا تھا۔ اگر کچھ دیر بعد پولیس فورس کی طرف سے یہاں ٹیئر گیس پھینکی جاتی یا اس قسم کا کوئی اور حربہ استعمال ہوتا تو اجمل کی سانسوں کا بحال رہنا

www.pdfbooksfree.pk

مشکل تھا۔ اسی اثنا میں پھر میگافون پر ہتھیار پھینک کر باہر آنے کی ترغیب دی جانے لگی۔ اس مرتبہ آواز ڈپٹی ریاض کی نہیں تھی۔ یہ مجسٹریٹ تھا۔ شانی نے رستم کا بازو تھاما اور اجمل کے کمرے سے باہر لے آئی۔ ''رستم! کہیں یہاں پھر وڈے ڈیرے والی کہانی نہ دہرائی جائے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتی ہیں شانی؟''

''میں کچھ بھی کہنا نہیں چاہتی..... کیونکہ مجھے پتا ہے کہ میں جو کہوں گی آپ مان لیں گے اور اگر میری رائے غلط ہوئی تو میں ذمے دار ٹھہروں گی۔ میں تو..... میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ آپ خود دیکھیں اور فیصلہ کریں۔''

''آپ کا مطلب ہے گرفتاری؟''

''نہیں رستم! میری کوئی رائے نہیں۔ بس آپ، ناصر اور سردار خود سوچیں۔''

رستم نے کہا۔ ''ضروری نہیں کہ ہم گرفتاری دیں اور وہ ہمیں گرفتار ہی کریں..... وڈے ڈیرے پر ہتھیار پھینکنے والوں کو بھی چھلنی کر دیا گیا تھا۔''

''مگر یہاں حالات وہ نہیں رستم! وہ تو ویرانہ تھا۔ یہاں پولیس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ موجود ہیں لیکن میں ایک بار پھر کہوں گی، آخری فیصلہ آپ نے اور آپ کے ساتھیوں نے کرنا ہے۔'' شانی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

جہانگیر کے بازو سے خون کا اخراج بہت تیز تھا۔ وہ ابھی تک پٹی باندھنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ شانی اس کی مدد کرنے کے لیے اس کی طرف لپک گئی۔

رستم کو اکیلا دیکھ کر دراج تیزی سے اس کے پاس آیا۔ اس کا سینہ پہلے سے زیادہ چوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں شعلے رقصاں تھا۔ ''رستم! انکڑی کیا کہہ رہی تھی؟''

''کچھ نہیں۔''

''رستم! وہ انکڑی ہے، چھوٹی ہے۔ اس کی چھاتی میں بڑا نرم دل ہے۔ پر جو بات آپاں مرد سمجھ رہے ہیں، وہ انکڑی نہیں سمجھ سکتی۔ آپاں اس وقت بغیر کسی شرط کے باہر نکلیں گے تو وہ آپاں کو بھون ڈالیں گے۔ کسی جنانی، بچے کا لحاظ بھی نہیں کریں گے۔ اگر آپاں نے گرفتاری دینی بھی ہے تو ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔''

ناصر بھی اجمل کو آکسیجن لگا کر وہاں پہنچ گیا۔ ناصر کی صورتِ حال نے اسے بھی ایک دم افسردہ کر دیا تھا۔ اس نے بھی دراج کی بات کی تائید کی۔ وہ بولا۔ ''اگر ہم اگلے دس بارہ گھنٹے بھی پولیس کو روک لیں تو پھر سچویشن بدل جائے گی۔ ذمے دار لوگ یہاں پہنچیں گے

اور تب گرفتاری دینے یا نہ دینے کی بات بھی کی جا سکے گی۔''

ایک بار پھر دونوں طرف سے اکا دکا فائر ہونے لگے۔ رات کی تیرگی میں گولیاں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں اور فرشتۂ اجل کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ دراج نے جن دو رائفل برداروں کو اوپر پانی کی ٹنکی میں چھپایا تھا، وہ بڑی مؤثر فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی فائرنگ کے سبب پولیس بے حد محتاط رویہ اپنانے پر مجبور ہو گئی تھی۔

رستم اور ناصر ایک بار پھر چھت پر آ گئے۔ ناصر دبے لہجے میں بولا۔ ''رستم بھائی! شاید دراج ٹھیک ہی کہتا ہے۔ شانی بھابی کے سینے میں بہت ہی مہربان اور نرم دل ہے۔ کئی دفعہ وہ اپنی رَو میں انوکھا فیصلہ کر جاتی ہیں۔ اب اس دن والی بات ہی لیں۔ وہ یہاں پہنچ چکی تھیں مگر انہوں نے یہ بات ہمیں آپ کو بتانے سے روک دیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ طفیل ہماری گرفت میں رہے۔ اپنے طور پر تو انہوں نے طفیل کی بھلائی کی..... لیکن اب یہی طفیل ہمارے لیے مصیبت بن کر آ گیا ہے۔''

رستم نے اس بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ طفیل کی رہائی کا دکھ تو اسے بھی تھا مگر اپنی بی بی کے کسی فیصلے پر وہ مخالفانہ انداز میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسنیپر کی ایک گولی ان سے چار پانچ فٹ کی دوری سے سنسناتی ہوئی گزری اور گیلری کی چھت سے لگے قیمتی فانوس کا ایک حصہ کرچیوں میں بدل گیا۔ فائرنگ میں ایک بار پھر شدت آتی جا رہی تھی۔ لگا ہے بہ لگا ہے رستم اور ناصر بھی اس فائرنگ میں حصہ لینے لگے۔ ناصر کے پاس سیون ایم ایم رائفل تھی جبکہ رستم کے پاس سائیلنسر لگا ہوا ماؤزر تھا۔

کچھ دیر بعد جہانگیر بھی ان کے پاس آن بیٹھا۔ اس کے بازو کی بینڈیج ہو چکی تھی..... اپنے درد سے دھیان ہٹانے کے لیے اس نے تین چار پیگ وہسکی کے چڑھا لیے تھے۔ اب وہ بالکل ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

''میرا دل کہتا ہے رستم..... یہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ہے۔'' جہانگیر نے پُر سوچ لہجے میں کہا۔

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''بس ایک پرانی بات یاد آ رہی ہے۔ یہ کوٹھی میرے دوست ملک تنویر کی ہے..... تمہیں بتایا ہے نا، وہ آج کل دبئی میں ہے۔ تنویر سے پہلے اس کوٹھی کا مالک فلم ساز، ہدایت کار سرتاج مبارک تھا۔ سرتاج آج کل تو بیماری اور بڑھاپے کے گھیرے میں ہے مگر اٹھارہ بیس سال پہلے اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ سرتاج کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ وہ ہر فلم میں ایک نئی

www.pdfbooksfree.pk

اداکارہ ضرور لیتا تھا۔ اس دور کی زیادہ تر ہیروئنیں سرتاج کی ہی بنائی ہوئی تھیں۔ مگر یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ وہ ہر نئی ہیروئن سے قیمت ضرور وصول کرتا تھا۔ فلم کی کاغذی کارروائیوں کے دوران میں ہی وہ ہیروئن سرتاج کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی تھی۔''

''ہاں، یہ بات تو تم نے پہلے بھی بتائی تھی۔'' رستم نے کہا۔

''لیکن ایک بات شاید نہیں بتائی ہوگی۔ یہ بات کسی وجہ سے اخباروں میں بھی نہیں آ سکی تھی۔ ہاں، خاص خاص لوگوں کو پتا ہے۔ مجھے تنویر نے ہی بتایا تھا کہ ایک بار سرتاج ایک نئی لڑکی کو اس کوٹھی میں ہیروئن بنا رہا تھا کہ اس کی پہلی بیوی کے بھائی اسحاق بٹ اور شوکت بٹ وغیرہ کئی درجن مسلح ساتھیوں کے ہمراہ یہاں پہنچ گئے تھے۔ سرتاج مبارک اپنی ہیروئن کا اسکرین ٹیسٹ چھوڑ کر بھاگ نکلا تھا۔ لڑکی اور سرتاج کے کپڑے بھی ایک کمرے میں پڑے رہ گئے تھے۔ بعد میں پتا چلا تھا کہ وہ کسی اندرونی راستے سے فرار ہوا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہاں کوئی ایسا راستہ موجود ہے؟'' رستم نے پوچھا۔

''دو سال پہلے میں یہاں تنویر کے ساتھ دس پندرہ دن رہا تھا۔ یہاں دو تین تہہ خانے بھی ہیں۔ ہم کافی دیر ان تہہ خانوں میں گھومتے رہے تھے۔ اس وقت تو کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ ایک پرانے ملازم نے بھی یہی کہا تھا کہ یہاں کوئی چور راستہ نہیں ہے مگر..... میرا مطلب ہے اگر وہ نئی ہیروئن والا واقعہ صحیح ہے تو پھر سرتاج اور وہ ہیروئن کسی نہ کسی طرح تو بھاگے ہوں گے نا..... اور مجھے یقین ہے کہ وہ واقعہ ہے بالکل صحیح۔''

ناصر بے زاری سے بولا۔ ''جہانگیر! اگر کوٹھی کے نئے مالک کو تین چار سال یہاں رہنے کے بعد بھی کسی ایسے راستے کا پتا نہیں چل سکا تو ہمیں کیسے چل جائے گا؟ کئی دفعہ ایسی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کی حقیقت نہیں ہوتی۔''

''نہیں ناصر! میرے ذہن میں ایک اور بات ہے۔ مجھے شک سا ہو رہا ہے۔''

''کیسا شک؟''

''نہیں، پہلے مجھے تصدیق کرنے دو پھر بتاؤں گا۔'' جہانگیر نے کہا۔

اس دوران میں کوٹھی ایک دم تاریکی میں ڈوب گئی۔ لائٹس کے ساتھ ساتھ پنکھے اور ایئر کنڈیشنر بھی بند ہو گئے۔ غالباً باہر سے کوٹھی کی بجلی کاٹ دی گئی تھی۔

''یہ خطرناک ہے۔'' رستم نے تیزی سے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ چارج کریں۔''

وہ سب اپنی اپنی پوزیشنوں کی طرف لپک گئے۔ بہرحال، رستم وغیرہ کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا کہ تاریکی کی آڑ میں کوئی زوردار ہلا بولا جائے گا۔ اکا دکا فائر دونوں طرف سے

ہوتے رہے۔ کبھی کبھی برسٹ بھی چلتا رہا۔ ہاں، یہ اندازہ ضرور ہو رہا تھا کہ پولیس اپنا گھیرا سخت تر کرتی جا رہی ہے۔ وہ ایک ایک چپے پر موجود تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ کسی کے فرار کے لیے ایک انچ جگہ بھی خالی نہ چھوڑی جائے۔

محاصرے کی طویل رات گزر گئی۔ اگلا دن طلوع ہو گیا۔ دن جوتا زگی اور امنگ ترنگ کی علامت ہوتا ہے لیکن یہ دن بارود کی بو، خون کے چھینٹے اور موت کے سائے لے کر آیا تھا۔ دور دور تک پولیس اور انتظامیہ کی گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ کوٹھی کی طرف آنے والے راستوں کو خاردار باڑیں لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔ اردگرد کے مکانات میں کہیں کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔

کوٹھی کی حالت بھی ابتر تھی۔ ہر طرف شیشے کی کرچیاں، گولیوں کے خول اور لکڑی کے پرخچے بکھرے ہوئے تھے۔ گردن میں گولی لگنے والا مہتم علی الصباح دم توڑ گیا تھا۔ جہانگیر کے علاوہ دو اور مہتم بھی زخمی ہوئے تھے۔ کوٹھی کی برقی رَو منقطع کر دی گئی تھی اور دونوں فون بھی کاٹ دیے گئے تھے۔ لہٰذا باہر کی کوئی خبر ان تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ٹی وی پر بھی کچھ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔

دوپہر سے ذرا قبل رستم کے موبائل فون پر باہر سے رابطہ کیا گیا۔ یہ رابطہ انتظامیہ کے ایک اعلیٰ عہدے دار نے کیا۔ اس نے بالکل یک طرفہ بات کی۔ اس نے رستم سے کہا کہ وہ اور اس کے ساتھی مکمل طور پر پولیس کے گھیرے میں ہیں۔ اگر وہ مزاحمت جاری رکھیں گے تو فوری موت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ بہتر ہے کہ وہ اپنے ساتھ موجود عورتوں اور بچوں پر رحم کریں اور خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔ ان کے ساتھ قانون کے مطابق سلوک ہوگا۔

رستم نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ایسا ہی قانونی سلوک ہمارے ساتھ وڈے ڈیرے پر ہو چکا ہے ہم ہتھیار پھینکنے سے لڑتے ہوئے مر جانا بہتر سمجھتے ہیں۔''

''تمہارے بہت سے ساتھیوں کی رائے یہ نہیں ہوگی۔ وہ زندہ رہنا چاہتے ہوں گے۔ تم اپنے ساتھ انہیں بھی لے ڈوبو گے۔''

''ہم میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جسے تمہاری دی ہوئی زندگی سے موت پیاری نہ ہو۔''

رستم نے فون بند کر دیا۔ ایک دو منٹ کے وقفے سے پھر بیل ہونے لگی۔ اس مرتبہ ناصر نے کال ریسیو کی۔ وہی عہدے دار پھر لائن پر تھا۔ اس نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔ ''دیکھو، فون بند نہ کرنا۔ ہم تمہیں درمیانی راستے کی طرف لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ تمہیں

www.pdfbooksfree.pk

مارنا اتنا مشکل نہیں۔"

"کوئی نئی بات ہے تو بتاؤ۔ ہم یہ سب کچھ پہلے بھی سن چکے ہیں۔" ناصر نے رکھائی سے کہا۔

"جناب سرفراز قزلباش صاحب تم سے خود بات کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ راستے میں ہیں۔ پندرہ بیس منٹ تک پہنچ جائیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے، ان کو پہنچنے دو۔"

"فون بند نہ کرنا۔ تم اتنی دیر رنگ والی کے چوہدری معصوم صاحب سے بات کرو۔ وہ یہاں موجود ہیں۔

رستم کے اشارے پر ناصر نے فون بند کر دیا۔

رستم، ناصر اور جہانگیر اس صورتِ حال کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ کوٹھی کا محاصرہ کرنے والوں کو یقین تھا کہ شانی اندر موجود ہے۔ وہ شانی کی جان بچانا چاہتے تھے ورنہ اس پوری عمارت کو تہس نہس کرنے میں بھی انہیں کوئی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

ان سب نے کل دوپہر سے کھانا کھایا ہوا تھا۔ اب چوبیس گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ شانی اور زاہدہ نے کھانا تیار کیا۔ دراج اور اس کے ساتھیوں کو ان کی پوزیشنوں پر کھانا پہنچایا گیا۔ باقی افراد نے بھی اس ترتیب کے ساتھ کھانا کھایا کہ کوئی اہم پوزیشن تادیر خالی نہ رہے۔

زری ایک دم مغموم نظر آنے لگی تھی۔ وہ ہر پل ناصر کے ساتھ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش کی وجہ سے اسے کئی بار ناصر سے ہلکی سی ڈانٹ بھی پڑی۔ آخری ڈانٹ کے بعد وہ باقاعدہ رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔

جہانگیر نے اسے پچکارا تو وہ اور زور سے رونے لگی۔ "میں بہت برا۔ میں کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ مجھ کو اپنا گھر بہت یاد آتا۔ میں واپس جانا چاہتا..... چچا کے پاس جانا چاہتا۔"

ناصر جل کر بولا۔ "ہاں بھئی لے جاؤ اسے۔ نیچے سے رکشہ پکڑو اور اسے بس اڈے پر پہنچا دو۔ وہاں سے یہ مانسہرہ والی بس پکڑ لے گی۔"

وہ اور زور سے رونے لگی۔ "تم کیا سمجھتا۔ میں جا نہیں سکتا۔ تم کو چھوڑ نہیں سکتا ہوں؟"

وہ ایک دم اٹھی اور واپس مڑی۔ کھڑکی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے جھکنا تھا مگر وہ سیدھی چلی گئی۔ سامنے گراسی میدان کی طرف سے دو فائر ہوئے۔ کھڑکی کا بچا کھچا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ زری پٹ سے اوندھے منہ گری۔ ناصر رائفل پھینک کر چلاتا ہوا اس کی طرف

لپکا۔ "زری..... زری!" اس نے اسے بازوؤں میں بھر کر سینے سے چمٹا لیا۔ وہ بھی اس سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بال بال بچی تھی۔ ناصر نے کئی بار اس کی پیشانی چومی، اسے گود میں اٹھایا اور زینے طے کر کے نیچے لے گیا۔ وہ دونوں آپس میں جھگڑتے رہتے تھے۔ مگر سب جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر دو پل بھی رہ نہیں سکتے۔

دونوں طرف سے اکا دکا فائر ہوتے رہے۔ پانچ دس منٹ بعد رستم کے موبائل پر باہر سے دوبارہ رابطہ کیا گیا۔ اس مرتبہ فون پر اہم سیاسی رہنما سرفراز قزلباش تھے۔ سرفراز قزلباش اور رستم کے درمیان جو بات چیت ہوئی، وہ کچھ اس طرح تھی۔

سرفراز قزلباش نے کہا۔ "رستم! بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔ تم لوگوں کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"یہ بات ہم پہلے بھی ایک سو ایک دفعہ سن چکے ہیں۔ کیا آپ یہی کہنے کے لیے یہاں آئے ہیں؟"

"دیکھو، میں تمہیں ایک آفر دیتا ہوں۔ تم اندر موجود عورتوں اور بچے کو باہر بھیج دو۔ اس کے بدلے ہم تمہیں سوچ بچار کے لیے چھ گھنٹے کی مہلت دیتے ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارے کچھ لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ ان کے لیے دوائیں وغیرہ بھی میں بھجوا دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ....."

"آپ کی اس پیشکش کی بنیاد ہی غلط ہے۔ اندر موجود عورتوں اور بچے کو یہاں زبردستی نہیں روکا گیا ہے۔ وہ ہمارے ساتھی ہیں۔ آخری دم تک ہمارے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہیں بھی تو انہیں باہر نہیں بھیج سکتے۔"

"تو پھر..... شانی بی بی کو بھیج دو۔" سرفراز قزلباش نے اصل بات کہی۔

"وہ بھی کسی صورت آنا نہیں چاہتیں۔"

"کیا تم ان سے میری بات کرا سکتے ہو؟"

"وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتیں۔"

"اپنے گھر والوں سے بھی نہیں۔"

"نہیں!"

"تم چاہتے کیا ہو رستم؟"

"جو ہم چاہتے ہیں، وہ آپ کر نہیں سکتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ پولیس کا گھیرا ختم کرا دیں اور اس حرامی ریاض ہٹلر کے گلے میں پٹا ڈال کر اسے یہاں سے واپس لے جائیں۔"

www.pdfbooksfree.pk

''رستم! یہ سراسر تباہی کا راستہ ہے۔ تمہیں شاید اپنی جان کی پرواہ نہ ہو لیکن تمہیں ان لوگوں کی پرواہ کرنی چاہیے جن کی جانیں بچ سکتی ہیں..... جنہیں انصاف مل سکتا ہے۔ کیا تم پھر وڈے ڈیرے والی کہانی دہرانا چاہتے ہو؟''

''جب تک بے انصافی رہے گی۔ وڈا ڈیرا رہے گا اور وڈے ڈیرے کی کہانیاں بھی رہیں گی۔''

رستم اور سرفراز قزلباش کے درمیان آٹھ دس منٹ بات ہوئی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ آخر میں سرفراز قزلباش نے یہ بھی کہا کہ وہ اندر آ کر بات کرنا چاہتے ہیں لیکن رستم اور ناصر جانتے تھے کہ وہ اس تجویز میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ اندر آنے کا رسک کوئی معمولی رسک نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کے پیچھے ریاض کی کوئی چال بھی ہو سکتی تھی۔

سرفراز قزلباش کے واپس جانے کے کچھ ہی دیر بعد ایک بار پھر شدید فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ کوٹھی پر تین طرف سے فائر کھولا گیا۔ یہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ کچن کی طرف جانے والی گیس لائن کو بھی نقصان پہنچا اور کچن میں دھماکے سے آگ بھڑک اٹھی۔ کچھ دیر کے لیے کوٹھی میں افراتفری نظر آئی۔ اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پولیس کمانڈوز ساتھ والی چھت پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے وہاں محفوظ جگہوں پر پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اس ملحقہ چھت پر رسائی حاصل ہونے کے بعد پولیس کی فائرنگ سے براہِ راست اندرونی کمرے متاثر ہونے لگے۔ دراج کے تین ساتھی کچن کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا۔ آٹھ ایم ایم کی گولی اس کا سینہ پھاڑ کر نکل گئی تھی۔

رستم خطرے کو بالائے طاق رکھ کر دوڑتا ہوا پانی والی ٹنکی تک پہنچ گیا اور ان دو مہتموں کے ساتھ شریک ہو گیا جو کل سے بھوکے پیاسے مزاحمت کر رہے تھے۔ رستم کے آنے سے ان دو افراد کو نہ صرف زبردست سہارا ملا بلکہ کھانے پینے کی اشیا بھی دستیاب ہوئیں۔ اس ٹنکی پر سے ہونے والی لگاتار اور مؤثر فائرنگ نے پولیس اہلکاروں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ورنہ کچھ دیر کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ ساتھ والی چھت پر آنے کے بعد پولیس کوٹھی کے اندر بھی پہنچ جائے گی۔

دراج کے ساتھیوں نے جہانگیر کے ساتھ مل کر بڑی دلیری سے کچن کی آگ پر قابو پایا..... گیس کا کاک بند کرنے کی کوشش میں جو مہتم ہلاک ہوا تھا، اس کی لاش اندرونی کمرے میں دوسری لاش کے پاس پہنچا دی گئی۔ یہ زوردار فائرنگ تقریباً آدھ گھنٹے تک جاری رہی۔

www.pdfbooksfree.pk

یوں لگتا تھا کہ یہ بے رحم فائرنگ ریاض کے طیش کا نتیجہ ہے اور یہ طیش بات چیت کی ناکامی سے پیدا ہوا ہے۔

اس فائرنگ کے بعد دو ڈھائی گھنٹے تک خاموشی رہی۔ ایسے لگتا تھا کہ محاصرہ کرنے والے حکمتِ عملی طے کر رہے ہیں۔ تھکے ہوئے پولیس اہلکاروں کی جگہ تازہ دم سپاہیوں کی آمد بھی ہو رہی تھی۔ اندھیرا پھیلتے ہی ایک بار پھر فائرنگ کا آغاز ہو گیا۔ شروع میں اکا دکا فائر ہوتے رہے۔ پھر بتدریج دونوں طرف سے فائرنگ میں شدت آ گئی۔ کوٹھی گہری تاریکی اور حبس کے گھیرے میں تھی۔ چاروں طرف سنسناتے شعلے رقص کر رہے تھے۔ اجمل اپنے بستر پر تھا۔ وہ ہوش میں تھا مگر درد نے اسے بے حال کر رکھا تھا۔ رستم اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ رائفل رستم کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ وہ نیم دراز اجمل کو اپنے ہاتھ سے گندم کا دلیا کھلا رہا تھا۔ چند چمچ لینے کے بعد اجمل نے بے ذائقہ دلیے کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ رستم نے تھوڑے سے اصرار کے بعد پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔ اجمل نے کہا۔ ''رستم بھائی! کاش اس وقت امم بھی آپ کے ساتھ لڑائی میں شریک ہو سکتا۔ امم کو بستر پر مرنا بالکل پسند نہیں۔''

''اور مجھے تمہارا کہیں بھی مرنا پسند نہیں۔ تم زندہ رہو گے اجمل! ابھی تمہیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔''

''آپ امم کو جینے کا دعا نہ دے۔ اگر یہ دعا دیتا ہے تو پھر ساتھ میں آپ اپنا زندگی بھی مانگے۔ آپ امارے دل کی بات پوچھتا ہے رستم بھائی تو آپ امارا ہیرو ہے۔ امم نے آپ کو دیکھ کر جینا سیکھا۔ آپ کو دیکھ کر امارے دل میں یہ امید پیدا ہوا کہ امم اپنے سب سے بڑے دشمن سے بدلہ لے سکتا ہے..... اور یہ امید پورا ہوا۔ شاہی اور قدرت اللہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ امم خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اور یہ سب کچھ آپ کی مدد سے ہوا ہے۔ اس لیے امم کہتا ہے کہ آپ امارا ہیرو ہے۔''

''اور تم کیا ہو؟ کریکٹر ایکٹر!''

''ہاں جی..... امم کو کریکٹر ایکٹر ہی سمجھو اور آپ کو پتا ہو گا ہالی وڈ (فلم) کے ایکٹر میں اکثر کریکٹر ایکٹر مر جاتا ہے جبکہ ہیرو زندہ رہتا ہے۔''

''لیکن کبھی کبھی الٹ بھی تو ہوتا ہے۔'' رستم نے کہا۔ اجمل کراہ کر رہ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی قوتِ برداشت اور خوش دلی بیماری کے ریلے میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

چند گھنٹے کے وقفے کے بعد رات بارہ بجے ایک بار پھر تیز فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ آنسو گیس بھی استعمال کی گئی۔ مگر تیز ہوا اور نامؤافق رخ کی وجہ سے یہ گیس زیادہ مؤثر

ثابت نہیں ہوئی۔ رستم، ناصر اور دراج چھت پر موجود تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے گیلے کپڑوں میں لپیٹ لیے اور زور دار مزاحمت جاری رکھی۔ ساتھ والی چھت پر پولیس والوں نے اپنی پوزیشنیں مضبوط کر لی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس جانب سے وہ اتنے نزدیک تھے کہ ان کی پکارتی ہوئی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ ان میں ریاض کے بھتیجے طفیل کی آواز پہچانی جاتی تھی۔ وہ گاہے بہ گاہے چلا کر اپنے رائفل مینوں کو مختلف ہدایات دیتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے میگا فون پر خوفناک نتائج کی دھمکیاں بھی دیں۔ وہ گالیاں بک رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ طیش کے سبب اس کے منہ سے جھاگ اُڑ رہا ہے۔ رستم وغیرہ کی اطلاعات کے مطابق وہ آج کل بدعنوانی کی وجہ سے معطل تھا..... اب پتا نہیں کہ وہ کس حیثیت سے اس اِن کاؤنٹر میں حصہ لے رہا تھا۔

رات آخری پہر رستم اور اس کے ساتھیوں کو ایک شدید نقصان پہنچا۔ پولیس کے کمانڈوز نے طاقتور گن سے پانی کی ٹنکی پر کئی طویل برسٹ چلائے۔ اُف اندھا دھند فائرنگ سے ٹنکی کی ایک دیوار مسمار ہوگئی اور اندر بیٹھے دونوں مہتم بھی ہلاک ہوگئے۔ یہ مورچا اب تک رستم اور اس کے ساتھیوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوا تھا۔ اس کے ختم ہونے کے بعد خطرہ پیدا ہوا کہ رستم اور اس کے ساتھیوں کو چھت خالی کر کے نیچے جانا پڑے گا مگر پھر رستم اور ناصر نے فوراً چھت کی برساتی میں ایک اور مضبوط پوزیشن بنالی اور مزاحمت جاری رکھنے میں کامیاب ہوئے۔

دن کا اجالا پھیلتے ہی فائرنگ رُک گئی۔ رستم اور اس کے ساتھی ایک اور رات پولیس کو خود سے دور رکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ اجالا ہونے کے بعد نقصانات کا جائزہ لیا گیا۔ کوٹھی کی حالت خراب تر ہوتی جارہی تھی۔ دو تین جگہ سے پانی لیک کرنے لگا تھا۔ کچن مکمل طور پر تباہ ہو چکا تھا اور گیس بند تھی۔ مرنے والے دونوں مہتموں کی لاشیں اوپر مسمار شدہ ٹنکی میں ہی پڑی تھیں۔ انہیں وہاں سے نکالنا فی الحال ممکن نہیں تھا۔

رستم اور ناصر کوٹھی کے مختلف حصوں کا جائزہ لیتے ہوئے بالائی منزل کے ایک نیم تاریک کمرے میں پہنچے تو ششدر رہ گئے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایک دیوار کے ساتھ اجمل خان کی لاش پڑی تھی..... وہ مر چکا تھا۔ اس کے سینے پر دو جگہ خون کا پھول کھلا ہوا تھا۔ وہ فرش پر تھا اور اس نے بڑے آرام دہ انداز میں دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

''اجمل..... اجمل!'' رستم نے بے ساختہ اسے پکارا اور نیچے بیٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر

www.pdfbooksfree.pk

ناصر کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ کچھ دیر بعد سردار دراج اور جہانگیر بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ سب حیرت زدہ تھے۔ اجمل خان کے پاس ہی ٹیلی اسکوپ والی دور مار رائفل (اسنائپر) پڑی تھی۔ اردگرد کم و بیش پچاس خول بکھرے ہوئے تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شب کی تاریکی میں کئی گھنٹے یہاں رہا ہے اور فائر کرتا رہا ہے۔

''خان تو بستر سے مل نہیں سکتا تھا..... یہ کیسے پہنچ گیا یہاں؟'' جہانگیر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''نہ صرف پہنچا ہے بلکہ دو تین گھنٹے گولیاں بھی چلائی ہیں۔'' ناصر کا لہجہ اَٹک ہارتا۔

موقع کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اجمل خان نے گزر جانے والی رات کو بڑے اہتمام کے ساتھ گزارا ہے اور شاید انجوائے کیا ہے۔ اس کے قریب درود کے والی گولیوں کی ایک فیشی خالی پڑی تھی۔ ناصر کے اندازے کے مطابق اس میں سات آٹھ گولیاں موجود تھیں۔ اجمل نے یہ ساری گولیاں ایک ساتھ کھا کر اپنے شدید درد پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے الماری میں سے اسنائپر اور اس کے راؤنڈ نکالے تھے۔ قریبی کمرے کے ریفریجریٹر سے اس نے یخ کہاڑیوں سے بھری ہوئی ایک پلیٹ لی تھی۔ اس کو اوون میں گرم کیا تھا..... اور اس کمرے میں پہنچ گیا تھا..... پلیٹ اب بھی موقع پر ہی موجود تھی، اس میں ایک دو کباب بچے تھے۔ قریب ہی نسوار کی خالی ڈبیا بھی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کوک کی ایک لیٹر بوتل تھی۔ یہ بھی تین چوتھائی خالی تھی۔ اجمل نے ہر وہ کام کیا تھا جس سے اسے سخت پرہیز بتایا گیا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دو تین گھنٹوں کو اس نے مکمل طور پر اپنی مرضی سے گزارا تھا۔ وہ اپنے ارد گرد یہ ساری چیزیں سجا کر بڑے اطمینان سے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا اور اسنائپر استعمال کرتا رہا تھا۔ خون آلود گن اب بھی کسی محبوب شے کی طرح اس کی گود میں موجود تھی.....

رستم نے اجمل کے خون آلود جسم کو سینے سے لگا کر بھینچا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ ''کہتا تھا کہ میں بستر پر مرنا نہیں چاہتا..... اور مجھے پتا تھا، یہ ہٹ کا بڑا پکا ہے۔''

رستم، اجمل کی لاش کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا کر نیچے لایا اور اسی بستر پر لٹا دیا جہاں کل شام اس سے آخری باتیں کی تھیں۔ اجمل کا چہرہ بیماری زدہ ضرور تھا مگر اس پر گہرا اطمینان تھا۔

''میرا بھائی!'' شانی نے چلا کر کہا اور اس سے لپٹ گئی۔

زاہدہ اور زری بھی رونے لگیں۔ رستم اپنے خون آلود ہاتھ سے اجمل کے سر کے ریشمی

بالوں کو سہلاتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھوری چٹانوں کی سختی تھی۔

دوپہر کے وقت باہر سے ایک بار پھر موبائل پر رابطہ کیا گیا۔ یہ کال رستم کے موبائل پر آئی تھی۔ دوسری طرف انتظامیہ کا ایک اہم عہدے دار تھا۔ اس نے وہی باتیں دہرائیں جو اس سے پہلے بھی کی جا چکی تھیں بلکہ اب ان باتوں کا لب ولہجہ زیادہ سخت تھا..... رستم سے کہا گیا کہ اس کے پاس ہتھیار پھینکنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں..... اور اب اس کام کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں رہا۔ وہ اور اس کے ساتھی جلد از جلد فیصلہ کر لیں۔

رستم نے کہا۔ ''ہم اپنے ان ساتھیوں کی لاشیں اٹھانا چاہتے ہیں جن کو اوپر ٹنکی میں گولیاں لگی ہیں۔''

''جب تم اپنی طرف سے کوئی نرمی نہیں دکھا رہے تو ہم سے یہ امید کیوں رکھتے ہو؟'' عہدے دار نے تحمل بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا نرمی چاہتے ہو؟''

''چھوٹی چوہدرائی کے لواحقین پرسوں رات سے یہاں موجود ہیں۔ چوہدرانی کے تایا اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... تم ہمیں لاشیں اٹھانے دو۔ میں بات کرانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

تھوڑی سی بحث وتمحیص کے بعد طے ہو گیا۔ دراج اور اس کے تین ساتھی جہانگیر کے ساتھ اوپر چھت پر گئے اور مسمار شدہ ٹنکی میں سے دونوں مہتموں کی لاشیں نکال لائے۔

کچھ دیر بعد رستم کے موبائل پر دوبارہ کال آئی۔ اس مرتبہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ شانی کے تایا معصوم تھے۔ ان کے لہجے میں گھبراہٹ اور ہراس تھا۔ وہ بولے۔ ''رستم! تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟ تم اسے باہر کیوں نہیں آنے دیتے؟''

''وہ خود باہر آنا نہیں چاہتیں اور اس کی وجہ آپ خود اس سے پوچھیں۔ بلکہ بہتر ہے کہ چوہدری اعجاز سے پوچھیں۔ یہ بندہ آستین کا سانپ ہے۔ یہ آپ سمیت سب کو دھوکا دے رہا ہے۔''

''میں تم سے کسی طرح کی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ تم بس ایک بار میری بات شانی بیٹی سے کرا دو۔''

شانی پاس ہی تھی۔ رستم نے موبائل اس کی طرف بڑھا دیا اور اشارے سے کہا کہ وہ تایا سے کچھ بولے۔ ''ہیلو تایا جی!'' شانی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''شانی! تم کیسی ہو؟ تت..... تم ٹھیک تو ہو نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شانی نے بہ مشکل کہا۔

''رستم کہتا ہے کہ تم باہر آنا نہیں چاہتیں۔ مجھے پتا ہے، وہ جھوٹ بک رہا ہے۔ وہ کیوں کر رہا ہے ایسا..... کیوں کر رہا ہے؟'' شانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یوں لگتا تھا کہ کوشش کے باوجود وہ بول نہیں پا رہی۔ ''شانی! تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ میری بات کا جواب دو نا۔'' شانی پھر بھی کچھ نہیں بولی۔ اس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو گر رہے تھے۔ تایا معصوم نے اسے بار بار بولنے کے لیے کہا لیکن وہ خاموش رہی۔ آخر میں اس نے بھرائی ہوئی آواز میں ''خدا حافظ تایا جی'' کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر بعد فائرنگ پھر شروع ہو گئی۔ ٹنکی والی پوزیشن ختم ہونے کے بعد محاصرہ کرنے والوں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اب عقب سے بھی قریب آ گئے تھے۔ بہرحال وہ اب بھی کوٹھی کی حدود میں داخل ہونے سے احتیاط برت رہے تھے۔ رستم کے خیال میں اس احتیاط کی ایک وجہ ان کا یہ اندیشہ تھا کہ رستم اور اس کے ساتھیوں کے پاس مہلک "M67" دستی بم موجود ہیں اور ان کا یہ اندیشہ غلط نہیں تھا۔ قدرت اللہ کے ڈیرے پر تباہی مچانے والے "M67" ہینڈ گرینیڈز میں سے چار اب بھی کوٹھی میں موجود تھے۔

جہانگیر کافی دیر سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رستم اسے دیکھنے کے لیے نیچے گیا تو شانی سے ملاقات ہو گئی۔ شانی نے اسے چھوٹا سا ٹی وی سیٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ یہ ایک الماری سے ملا ہے۔ بیٹری سلز سے بھی چلتا ہے۔'' شانی نے ٹی وی سیٹ آن کر کے دکھایا۔

وہ پچھلے 36 گھنٹے سے باہر کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ ناصر نے ٹی وی سے کیبل وائر منسلک کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک نیوز چینل دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ چینل پر اس طویل پولیس مقابلے کی خبر وقفے وقفے سے چل رہی تھی۔ چینل کے مقامی رپورٹر نے علاقے کے کچھ مکینوں کے مختصر تاثرات نشر کیے۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ دو راتوں سے سو نہیں سکے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سرچ لائٹس کی چکراتی ہوئی روشنیاں اور آنسو گیس کی شیلنگ سب کچھ ان کا جینا دوبھر کر رہا ہے۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ اس آپریشن کو جلد از جلد مکمل کیا جائے۔

اردگرد کی کوٹھیوں سے جو لوگ نقل مکانی کر کے گئے تھے، وہ بھی جلد از جلد اپنے گھروں میں واپس آنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گنتی کے چند قانون شکن افراد کی وجہ سے علاقے کے مکینوں کو مشکلات کے سپرد کر دیا گیا ہے۔

ان تاثرات کے بعد انتظامیہ کے ایک عہدے دار نے مختصر انٹرویو دیا۔ اس نے کہا کہ ایس آئی طفیل کی صورت میں ایک قیمتی جانی نقصان ہوا ہے۔ عہدے دار نے رپورٹر کے سوال

www.pdfbooksfree.pk

کے جواب میں بتایا کہ طفیل آن ڈیوٹی نہیں تھا اور رضا کارانہ طور پر اس کارروائی میں حصہ لے رہا تھا۔

طفیل کی موت کی خبر کو رستم اور ناصر وغیرہ نے خوشگوار حیرت کے ساتھ سنا۔ اگر یہ رپورٹ ایسل ٹی وی آن نہ ہوتا تو وہ یقیناً اس اہم خبر سے بھی بے خبر ہی رہتے۔

رپورٹر نے پوچھا۔ ''جناب! کیا یہ بات درست ہے کہ طفیل صاحب کی موت ٹارگٹ کلنگ ہے۔ جیسا کہ کچھ دیر پہلے ان کے ایک ساتھی نے بتایا ہے کہ طفیل صاحب کارروائی کے دوران میں بہ آواز بلند ہدایات جاری کر رہے تھے۔ دو تین بار ان کی آواز پر فائر آیا اور وہ بال بال بچے۔ ان کے ساتھی نے انہیں تنبیہ بھی کی تھی کہ وہ اونچی آواز میں نہ بولیں۔''

عہدے دار نے کہا۔ ''ہاں، یہ بات سنی جا رہی ہے مگر ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ ایس آئی طفیل کو اتفاقیہ گولی لگی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے نشانہ بنایا گیا ہو۔ یہ بات بھی درست ہے کہ طرحان میں اجمل خان ایک بہترین نشانہ باز ہے۔ اس قسم کے پروفیشنل نشانے باز گہری تاریکی میں بھی آواز کی نشاندہی پر شوٹ کر سکتے ہیں۔''

رپورٹر نے کہا۔ ''اس شبے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ایس آئی طفیل پر ہونے والے فائر اسٹیمر گن کے تھے اور حوالدار اجمل خان کو پولیس میں اسٹیمر گن کا ماسٹر سمجھا جاتا تھا۔ کیا آپ اس بات سے اتفاق کرتے ہیں؟''

عہدے دار نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلایا۔

اشتہار چلنے شروع ہو گئے تھے۔ ٹی وی کی بیٹری بچانے کے لیے ناصر نے ٹی وی آف کر دیا۔ رستم، جہانگیر اور ناصر تینوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

ناصر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ نشانے باز نے کل رات جان دینے سے پہلے ایک اور بہترین نشانہ لگایا ہے۔''

''شاید ایسا ہی ہے۔'' رستم نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

اجمل کی موت ایک بار پھر انہیں بڑی شدت سے محسوس ہوئی اور وہ تینوں سوگوار ہو گئے۔

شام کا کھانا انہوں نے باری باری کھایا۔ کچھ پوزیشنیں ایسی تھیں جنہیں وہ چند سیکنڈ کے لیے بھی چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پانی، بجلی، گیس سب کچھ منقطع تھا۔ مسلسل تناؤ اور خوف کے سبب چھوٹے سرمد کو تیز بخار ہو گیا تھا۔ وہ نیم بے

ہوشی کے عالم میں ہذیان بول رہا تھا۔ ''ماموں..... مجھے بازار لے کر جاؤ..... مجھے کپڑے لے کر دو۔ شب برأت آنے والی ہے۔ پٹاخے چل رہے ہیں۔'' وہ پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔

سرمد کی حالت دیکھ دیکھ کر زاہدہ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ رستم کو دیکھ کر سسک پڑیں۔ ''تمہیں اسی دن سے ڈراتی تھی رستم..... دیکھ لیا نا اپنے کاموں کا نتیجہ!''

رستم نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر آپو زاہدہ کو اپنے ساتھ لگایا۔ ''میں آپ سب کو کچھ نہیں ہونے دوں گا آپو..... جو مصیبت آنی ہے مجھ پر آئے گی۔ آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

''اگر تجھ کو کچھ ہوگا تو بھی ہم کو ہی ہوگا۔'' وہ رونے لگیں۔

اچانک دراج دوڑتا ہوا آیا۔ اس کی کلاشنکوف بالکل تیار حالت میں اس کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بولا۔ ''رستم! پلس والے آگے آ رہے ہیں۔ ان کی تین گڑیاں بڑے دروازے کے بالکل سامنے پہنچ گئی ہیں۔ وہ پیچھے سے بھی حرکت کر رہے ہیں۔ میرا کھیال ہے کہ وہ کچھ کرنے والے ہیں۔''

رستم، ناصر اور جہانگیر وغیرہ دراج کے پیچھے چلتے ہوئے چھت کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب میگا فون پر ریاض ہٹلر کی پتھریلی آواز گونجنے لگی۔ ''رستم سیال..... اجمل خان اور دراج مہتم! ہم تمہیں صرف پندرہ منٹ کی مہلت اور دے رہے ہیں۔ اپنی جانیں بچانا چاہتے ہو تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آؤ۔ پندرہ منٹ پورے ہونے کے فوراً بعد ہم کارروائی شروع کر دیں گے۔ میں یہ اعلان ایک بار پھر دہراتا ہوں۔''

ریاض نے پاٹ دار آواز میں اپنا بیان دہرایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ طوفان سے پہلے کی سی خاموشی تھی۔ رستم نے چھت پر سے دیکھا۔ دور تک پولیس کی گاڑیاں اور ان کی نیلی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ موت کے سائے چاروں طرف سے طویل ہو رہے تھے اور ان کے نزدیک پہنچ رہے تھے۔

برساتی کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر رستم نے اپنی سیون ایم ایم رائفل کے میگزین بھرنے شروع کیے۔ شانی اس کے قریب ہی بیٹھی تھی لیکن اس نے اس کام میں رستم کی مدد نہیں کی..... اس نے گولیوں کو ہاتھ لگایا اور نہ کسی میگزین کو۔ وہ بس چپ چاپ کسی طرح گہری سوچ میں کھوئی رہی۔ دونوں خاموش تھے لیکن شاید دونوں باتیں کر رہے تھے۔ یہ دل کی زبان تھی اور دل ہی سمجھتا تھا۔

رستم کہہ رہا تھا۔ ''شانی! آپ اپنا ارادہ بدل نہیں سکتیں؟ آپ کا معاملہ ہم سب سے

www.pdfbooksfree.pk

مختلف ہے۔آپ کو باہر ایک محفوظ زندگی ملے گی۔''

شانی نے کہا۔''رستم! ہم اکٹھے زندہ نہیں رہ سکے لیکن اکٹھے مر تو سکتے ہیں۔آپ کی بانہوں میں موت آئی تو بڑی آسان ہوگی۔''

''لیکن آپ کے مرنے سے میرا کوئی بھلا تو نہیں ہو جائے گا۔ہاں، آپ کے بچ جانے سے بہت سوں کا بھلا ہوگا۔آپ بے شمار لوگوں کے لیے امید کی روشنی ہیں۔ان کے لیے نئی زندگی کا پیغام ہیں۔''

''میں نہیں ہوں گی تو کوئی اور آ جائے گا۔کوئی بھی.....رات، سویرے کے بغیر تو نہیں ہوتی۔''

''آ.....آپ نے کچھ کہا؟''رستم نے میگزین لوڈ کرتے کرتے چونک کر پوچھا۔

''نہیں تو۔''وہ بولی۔

''کیا آپ.....کچھ کہنا چاہ رہی ہیں؟''

''نہیں.....کیا آپ چاہ رہے ہیں؟''

رستم نے گہری سانس لی اور اوپر دیکھا۔دور تاریک آسمان پر تارے جیسے پلکیں جھپک جھپک کر آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔وہ کچھ دیر چھت کے فرش کو گھورتا رہا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''شانی! آپ باہر چلی کیوں نہیں جاتیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور مصمم ارادے سے بولی۔''نہیں.....رستم! بہت دور رہ لیا.....اب نہیں۔''

''بہت.....محبت.....کرتی ہیں؟''وہ عجیب انداز سے بولا۔

''آپ.....جتنی نہیں۔''اس نے کہا اور آنسو چھپانے کے لیے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا۔

پندرہ منٹ کب پورے ہوئے، پتا بھی نہیں چلا۔محاصرہ کرنے والوں نے دو منٹ مزید انتظار کیا۔پھر ایک دم کئی سرچ لائٹس روشن ہوئیں اور اندھا دھند فائرنگ شروع ہوگئی۔حملہ کرنے والوں کی پوزیشنیں اب بہت بہتر تھیں۔اس بہتری کا نتیجہ یہ نکلا کہ فائرنگ کے پہلے ہی منٹ میں ایک نڈر مہتم سینے پر ایل ایم جی کا برسٹ کھا کر رستم اور ناصر کے درمیان ڈھیر ہوگیا۔دراج کے ہاتھ پر بھی ایک کارتوس کے وزنی چھرے لگے اور وہ اپنی کلاشنکوف کو اچھے طریقے سے استعمال کرنے کے قابل نہ رہا۔دراج کا زخمی ہونا ایک اور بڑا نقصان تھا۔اس نے چھت کی پوری ایک سائیڈ کو سنبھال رکھا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

اسی دوران میں ناصر چلایا۔''وہ آنسو گیس پھینک رہے ہیں۔''

ابھی ناصر کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ گیس کے چار پانچ شیل چھت اور سائیڈ کی راہداری میں گرے۔اس وقت ہوا نہیں تھی۔گیس تیزی سے کوٹھی کی ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اندر داخل ہونے لگی۔کسی اندرونی کمرے سے زاہدہ اور زری کے چلانے کی آوازیں آئیں۔فائرنگ سے کچن کے قریب ایک بار پھر آگ بھڑک اٹھی تھی۔یہ کٹھن لمحے تھے۔

جہانگیر ایک بار پھر غائب تھا۔پتا نہیں وہ کہاں چلا جاتا تھا۔رستم نے بری طرح کھانستے ہوئے اس کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں۔اچانک اس کی نگاہ جہانگیر پر پڑی۔اس نے اپنا چہرہ گیلے کپڑے میں لپیٹا ہوا تھا۔اس کے ہاتھ میں بڑی ٹارچ تھی اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی۔وہ جھک کر چلتا ہوا رستم کے پاس آن بیٹھا۔رستم نے محسوس کیا کہ اس کے کپڑے گندے ہیں اور ان میں سے بُو اٹھ رہی ہے۔

وہ خوشی سے لرزتی آواز میں بولا۔''یار! قسمت نے زور مارا ہے۔یہاں سے نکلنے کا راستہ مل گیا ہے۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے؟''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''پھر اس نے ناصر سے کہا۔''جم کر گولی چلاؤ یارا.....ہم دو منٹ میں آ رہے ہیں۔''

اس نے رستم کا بازو پکڑا اور اسے تقریباً گھسیٹتا ہوا زینے اترنے لگا۔وہ نچلی منزل پر پہنچے اور تہہ خانوں میں چلے گئے۔یہاں سیلن اور گھٹن تھی۔

''کیا کوئی سرنگ شرنگ ہے؟''رستم نے کھانستے ہوئے پوچھا۔

''نہیں یار! ایک بہت پرانا سیوریج پائپ ہے۔شاید انگریزوں کے زمانے سے بند پڑا ہے۔یہ پائپ آگے جا کر ایک انڈر گراؤنڈ نالے سے مل جاتا ہے۔نالہ بھی لگتا ہے، سالوں سے خشک پڑا ہوا ہے۔میں دو دن سے اس کی ٹوہ میں لگا ہوا تھا۔''

جہانگیر نے ٹارچ رستم کو پکڑائی اور ایک جگہ سے سیوریج کا ایک بڑا سا زنگ آلود ڈھکن اٹھایا۔وہی بُو اٹھی جو مدتوں سے بند کنوؤں اور سرنگوں وغیرہ سے برآمد ہوتی ہے۔جہانگیر بلا تامل اندر اتر گیا اور ٹارچ کی روشنی دور تک پھینکی۔

''اس کا دوسرا سرا بھی دیکھا ہے؟''رستم نے پوچھا۔

''دیکھ لیا ہے جگر پیارے! ایک دم سیف ہے۔کوئی دو فرلانگ دور جا کر نکلے گا اور اگر

اس سے آگے جانا چاہیں تو بھی جا سکتے ہیں..... لیکن باہر نکلنے کی گارنٹی بس دو فرلانگ تک کی ہے۔''

رستم نے خود بھی چار فٹ قطر کے قدیم پائپ میں اُتر کر تسلی کی..... انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے تیزی سے حکمتِ عملی طے کر لی۔ باہر سے تابڑ توڑ فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں..... گیس کی اذیت ناک بُو اب ہر جگہ پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔ رستم اور جہانگیر ٹارچ کی روشنی میں دوڑتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچے۔ انہوں نے عورتوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور بچے کھچے ساتھیوں کو ان کی پوزیشنوں پر جا کر صورتِ حال بتا دی۔

پانچ منٹ کے اندر اندر وہ اس نئی موومنٹ کے لیے تیار تھے۔ ''لاشوں کا کیا ہو گا؟'' ناصر نے افسردہ لہجے میں کہا۔

''وہی جو لڑائی میں ہوتا ہے..... سپردِ خدا!'' رستم نے کہا۔

رستم اور ناصر آخر وقت تک چھت پر سے فائرنگ کرتے رہے۔ دو مہتم فرسٹ فلور سے گولی چلاتے رہے۔ جہانگیر باقی افراد کو لے کر تہہ خانے میں پہنچ گیا۔ پھر رستم کی ہدایت پر دونوں مہتموں نے بھی پوزیشنیں چھوڑ دیں۔ آخر میں رستم اور ناصر بھی چھوٹے چھوٹے برسٹ چلاتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر چلے گئے۔ یہاں رستم نے ایک الماری سے کینوس کا ایک تھیلا نکال کر کندھے پر ڈال لیا۔

یہی وقت تھا جب پولیس سامنے سے چارج کر کے کوٹھی کے اندر گھس آئی۔ اس کے فوراً بعد ساتھ والی چھت سے بھی اسپیشل فورس کے لوگ کوٹھی کی بالائی بالکونیوں میں کود گئے۔ ان کی تقدیر ایک بار پھر پلٹا کھاتی محسوس ہوئی۔ جب رستم اور ناصر فائرنگ کرتے ہوئے تہہ خانے تک پہنچے، پوری کوٹھی میں پولیس دندنا رہی تھی۔ پولیس میں سے بیشتر نے گیس ماسک اور بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی تھیں۔ ان کے للکارے در و دیوار میں گونجنے لگے۔

''مارو..... پکڑو..... جانے نہ پائیں۔''

رستم نے تہہ خانے کے آہنی دروازے کو اندر سے لاک کر دیا پھر وہ زینے پھلانگتا ہوا اس پرانے مین ہول تک پہنچ گیا جس میں اس کے ساتھی ایک ایک کر کے اُتر رہے تھے۔ اسی دوران میں پولیس تہہ خانے کے دروازے کے سامنے پہنچ گئی۔ اہلکاروں کی دھاڑتی ہوئی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آہنی دروازے پر کسی وزنی شے سے ضربیں لگا رہے تھے۔ پھر ایل ایم جی کے دو طویل برسٹ چلے۔ آہنی دروازے کا لاک ٹکڑے ہو گیا۔ جس وقت رستم ہول کے اندر داخل ہوا، آہنی دروازہ کھلا۔ پولیس کمانڈوز جھپٹے اور خود کار رائفلوں کے پُرشور

برسٹ تہہ خانے میں قیامت برپا کرنے لگے۔

رستم چلایا۔ ''ناصر، جہانگیر! تم لوگ نکل جاؤ۔ میں ان کو روکتا ہوں۔''

''نہیں بھائی..... میں بھی یہاں ہوں۔'' ناصر نے کہا۔

''بکواس بند کرو۔ میں کہتا ہوں دفع ہو جاؤ۔'' رستم دہاڑا۔

دراج، رستم کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا۔ ''تم بھی جاؤ دراج!'' رستم نے اسے پیچھے دھکیلا۔

دراج نے رستم کے دھکے کی پرواہ کیے بغیر کلاشنکوف سے فائرنگ جاری رکھی۔

''دراج! جاؤ تم! یہاں بس ایک بندے کی ضرورت ہے..... جاؤ۔''

دراج نے جیسے رستم کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنے زخمی ہاتھ کی پرواہ کیے بغیر مسلسل زینوں کی طرف فائر کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اس کی سرخ آنکھوں سے بھی لہو ٹپک رہا ہے۔ اچانک ایک گولی اس کی پیشانی پر لگی اور اس نے کھوپڑی کا ایک طرف کا حصہ اُڑا کر رکھ دیا۔ دراج پیچھے کی طرف گرا۔ اس کی جیون ساتھی اس کی کلاشنکوف اس کے خون آلود ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور وہ یکسر ساکت ہو گیا..... دو گولیاں جیسے رستم کے بالوں کو چُھوتی ہوئی گزر گئیں۔ رستم نے دو جوابی فائر کیے۔

فائرنگ کی آواز سے کان پڑی بات سنائی نہیں دیتی تھی۔ رستم اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر دہاڑا۔ ''ناصر! میں تم سے کہتا ہوں کہ ان کو لے جاؤ یہاں سے..... ورنہ..... تم بھی..... بے موت مرو گے..... لے جاؤ ان کو۔'' اس کی آواز پرانے سیوریج پائپ میں دور تک گونجی۔

ناصر تذبذب میں کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے باقی ساتھی تھے۔ ان لمحوں میں اس کا ذہن جیسے ماؤف ہو گیا تھا۔ رستم پھر دہاڑا۔ ''دفع ہو جاؤ..... دفع ہو جاؤ۔'' اس نے سخت ہیجانی انداز میں ناصر کے قدموں میں برسٹ چلایا۔ ناصر بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ رستم نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا، ناصر کی آنکھوں میں پانی چمک رہا تھا۔ پھر وہ مڑا اور پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ آپو زاہدہ کے رونے اور پکارنے کی آواز دور تک رستم کے کانوں میں آتی رہی۔

رستم نے قریباً تین منٹ تک جم کر فائرنگ کی..... پھر اس کی سیون ایم ایم خالی ہو گئی..... دشمنوں کا دشمن اور دوستوں کا دوست دراج، اس کے پہلو میں ساکت پڑا تھا۔ رستم نے اس کی کلاشنکوف اٹھالی۔ اس نے کلاشنکوف سے سنگل شاٹ چلائے اور چار پانچ منٹ مزید گزار دیئے۔ تہہ خانے میں موجود مقابل اہلکار قریب آتے جا رہے تھے۔ رستم کلاشنکوف

www.pdfbooksfree.pk

کی آخری تین چار گولیاں بچا کر دس پندرہ قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اب اس کے پاس آخری ہتھیار رہ گیا تھا۔ کینوس کا وہ چھوٹا تھیلا جو اس نے اپنے کندھے سے لٹکایا ہوا تھا۔ اس میں چار عدد M67 ہینڈ گرینیڈ موجود تھے۔ یہاں پائپ میں ایک بڑا خم موجود تھا۔ وہ اس خم کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا ایک گھٹنا زمین پر ٹیکا۔ بیگ کی زپ کھولی اور ہینڈ گرینیڈ نکال لیا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید دستی بموں کے دھماکے، پولیس والوں کو وقتی طور پر خوف زدہ کر دیں اور وہ اندر گھسنے میں جلدی نہ کریں۔

اس نے پہلے بم کی پن کھینچی۔ پن کھینچنے کے فوراً بعد اس نے سینٹی لیور کو انگوٹھے سے دبا لیا اور پھر بازو گھما کر اس مہلک لوہے کو مین ہول کے رخ پر پھینک دیا۔ چمک کے ساتھ لرزہ خیز دھماکا ہوا۔ مختصر خلا میں گرد و غبار اور دھواں پھیلا۔ چند سیکنڈ کے لیے کچھ سجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ پھر رستم نے ٹارچ کی روشنی پھینکی۔ یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی کہ مین ہول نظر نہیں آ رہا۔ دھماکے سے بہت سا ملبہ گرا تھا اور اس نے سیوریج پائپ کا راستہ تقریباً بند کر دیا تھا۔ یہ نتیجہ خلاف توقع لیکن حسب ضرورت تھا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی لیکن موت کے قدم رک گئے تھے۔

رستم واپس مڑا۔ تاریکی میں اس کا پاؤں کسی زندہ شے سے ٹکرایا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی پھینکی اور ششدر رہ گیا۔ شانی واپس نہیں گئی تھی۔ وہ یہیں موجود تھی۔ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی رہی تھی۔

''شانی! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟''

''وہی جو آپ کو دیکھنا چاہیے۔'' وہ عجیب جذباتی لہجے میں بولی۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا۔''

''دراج ختم ہو گیا؟'' اس نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!'' رستم بے حد بوجھل آواز میں بولا پھر اس نے شانی کا ہاتھ تھاما اور تاریکی میں بھاگتا چلا گیا.....

ان کا بھاگنا عجیب انداز کا تھا۔ وہ بالکل جھکے ہوئے تھے۔ ان کے سر بار بار پائپ کی اندرونی سطح سے ٹکرا رہے تھے۔ پائپ میں اینٹوں کے ٹکڑے تھے، خشک ٹہنیاں تھیں، ٹوٹے ہوئے جالے تھے اور پتا نہیں کیا کچھ تھا۔ رستم کو اپنی ایک ٹانگ میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا مگر وہ شانی کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتا چلا گیا۔

قریباً تین منٹ بعد وہ گرتے پڑتے ایک نسبتاً کشادہ جگہ پر آ گئے۔ یہ بھی ایک انڈر

گراؤنڈ نالہ ہی تھا۔ پتا نہیں کتنی مدت سے خشک پڑا تھا۔ بارش اور سیوریج کے پانی کی نکاسی کے ایسے نالے عام طور پر بڑی سڑکوں کی دونوں جانب بنائے جاتے ہیں اور انہیں اوپر سے بند کر دیا جاتا ہے۔ نالہ خشک تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر سڑک متروک ہو چکی ہے.....

رستم نے ٹارچ کی روشنی دائیں بائیں پھینکی۔ زمین کی گواہی بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھی دائیں جانب سے نکلے تھے۔ وہ بھی دائیں طرف مڑ گیا۔ اس نالے کی چھت اونچی تھی۔ اب انہیں زیادہ جھکنا نہیں پڑ رہا تھا۔ ٹارچ بہترین راہنمائی کر رہی تھی۔ وہ حتی الامکان تیزی سے بھاگتے چلے گئے۔

ایک جگہ شانی گر گئی۔ تکلیف کے سبب وہ کراہی۔ رستم نے اسے اٹھایا اور بے ساختہ اس کا سر چوما۔ ''بس تھوڑی دور اور۔'' وہ ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

کچھ آگے جا کر اس نے ناصر اور جہانگیر کو آوازیں دیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید وہ اندر موجود ہوں اور جواب دیں لیکن جواب نہیں آیا۔ سو ڈیڑھ سو قدم مزید آگے جانے کے بعد رستم کو ایک جگہ چھت میں تکون سا خلا نظر آیا۔ اس نے ٹارچ فوراً بجھا دی۔

یہ سیمنٹ اور بجری کی ایک بہت پرانی سل تھی جسے شاید تھوڑی ہی دیر پہلے اس کی جگہ سے ہلایا گیا تھا۔ رستم چند لمحے سن گن لیتا رہا پھر اس نے تکونے خلا کے کناروں کو تھاما اور بازوؤں کے زور پر خود کو اوپر اٹھایا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک دم بدبو کے چنگل سے نکل کر خوشبو کے گھیرے میں آ گیا ہے۔ اس کے اردگرد بہت سے چھوٹے بڑے درخت اور پودے تھے۔ یہ ایک نرسری تھی۔ رستم نے قرب و جوار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ کسی تنفس کی موجودگی محسوس نہیں ہوئی۔

''ہمیں باہر نکلنا ہے شانی۔'' اس نے کہا اور نیچے بیٹھ گیا۔ شانی کھڑی تھی رستم نے اسے گھٹنوں کے قریب سے اٹھایا اور تکونے خلا تک پہنچا دیا۔ وہ تھوڑی سی کوشش سے باہر نکل گئی۔ رستم نے کینوس کا تھیلا، ٹارچ اور کلاشنکوف اسے تھمائی اور خود بھی نکل آیا۔

''یہاں کوئی ہے۔'' شانی کی ہانپتی ہوئی پُراندیش آواز رستم کے کانوں میں پڑی۔

رستم نے شانی کی نظر کا تعاقب کیا۔ تاریکی میں چند فٹ کے فاصلے پر نباتاتی کھاد کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس ڈھیر کے ساتھ ہی ایک غیر متحرک جسم موجود تھا۔ رستم نے ٹارچ جلائے بغیر دیکھا۔ زمین پر اوندھا پڑا یہ شخص درمیانی عمر کا تھا۔ غور سے دیکھنے پر پتا چلا کہ اس کی کنپٹی سے خون رس رہا ہے۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔

''کیا ہوا اسے؟'' شانی نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

''مجھے لگتا ہے کہ ناصر وغیرہ نے اسے بے ہوش کر کے پھینکا ہے۔ شاید یہ نرسری کا رکھوالا ہے۔''

رستم نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی دھڑکن دیکھی۔ دھڑکن سُست تھی مگر موجود تھی۔ ''یہ زندہ ہے نا؟'' شانی نے پوچھا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کہیں اسے کچھ ہو نہ جائے۔'' شانی نے پُر درد لہجے میں کہا۔

''نہیں..... کافی صحت مند ہے۔'' رستم نے مختصر جواب دیا اور گہری نظروں سے اردگرد دیکھا۔ اس امر کا امکان موجود تھا کہ اس کا کوئی ساتھی بھی یہاں موجود ہو۔ تاہم ایسی کوئی شہادت دکھائی نہیں دی۔ رستم نے چند سیکنڈ کے لیے ٹارچ روشن کر کے دائیں بائیں دیکھا۔ چند میٹر آگے کچی زمین پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے تازہ نشان موجود تھے۔ شاید یہ سوزوکی لوڈر وغیرہ تھی۔ رستم کی چھٹی حس نے کہا کہ ناصر، جہانگیر اور دیگر ساتھی اس گاڑی کے ذریعے نکل گئے ہیں۔

''وہ دیکھیں رستم!'' شانی نے انگلی سے دائیں جانب اشارہ کیا۔

کوئی نصف فرلانگ کی دوری پر پولیس موبائلز کی نیلی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ دو روشنیاں تھیں مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ روشنیوں کا رخ مخالف سمت میں تھا اور یہ دو روشنیاں ہی نہیں تھیں جو یہاں موجود تھیں..... قریباً ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر بہت سی نیلی روشنیاں جھلک دکھا رہی تھیں۔ پولیس موبائلز کے دور افتادہ سائرن بھی سنائی دیتے تھے۔ یقیناً یہ سب کچھ اسی کوٹھی کے اردگرد تھا جہاں سے وہ جان بچا کر نکلے تھے۔

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' شانی منمنائی۔

''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' رستم نے کہا اور شانی کے ساتھ نرسری کے کنارے کی طرف بڑھا۔ کینوس کا تھیلا اس کے کندھے پر تھا اور کلاشنکوف ہاتھ میں۔ دوسرے ہاتھ میں وہ چیز تھی جو اسے بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کرنے کی ہمت دے سکتی تھی۔ یہ شانی کا ہاتھ تھا۔

نرسری کے کنارے پر ایک چھوٹا سا نیم پختہ کمرہ بنا ہوا تھا۔ کمرہ خالی نظر آتا تھا۔ کمرے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا زرد بلب روشن تھا اور اپنے اردگرد کی گہری تاریکی کو بھگانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ رستم نے شانی کو وہیں درختوں کی تاریکی میں چھوڑا اور خود احتیاط سے کمرے کی طرف بڑھا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے میں پھینکا۔ یہاں نرسری کا سامان موجود تھا۔ کھاد کے پیکٹ، کیڑے مار دواؤں کی بوتلیں، خالی گملے اور بیلچے وغیرہ۔ اکلوتی چارپائی خالی تھی۔ سرہانے کی طرف ٹرانزسٹر ریڈیو بج رہا تھا..... کسی پرانی پاکستانی فلم کا

نغمہ تھا۔

آپ ہی اپنے تڑپنے کا مزہ لیتے ہیں
ہنس کے ہر غم کو وہ سینے سے لگا لیتے ہیں
غم سے ڈرتے ہوئے دیکھا نہیں دیوانوں کو
یاد کرتا ہے زمانہ انہی انسانوں کو

یہ موسیقی بکھیرتا ریڈیو یقیناً اسی شخص کا تھا جو کھاد کے ڈھیر کے پاس چوٹ کھائے پڑا تھا۔ اس کمرے میں رستم کو جس شے کی تلاش تھی وہ اسے مل گئی۔ یہ ایک بڑی چادر تھی۔ رستم نے یہ چادر بکل کی صورت میں اپنے گرد لپیٹ لی۔ کینوس کا بیگ، کلاشنکوف، ٹارچ سب کچھ بکل کے اندر چھپ گیا۔ یہ بکل واقعی بڑے کام کی چیز ہوتی ہے۔ رستم نے چارپائی کی چادر بھی کھینچ لی۔ باہر آ کر یہ چادر اس نے شانی کو اوڑھا دی۔ رستم کی طرح شانی کے سارے کپڑے بھی سیوریج کے گرد و غبار اور نمی سے برباد ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہلکی بُو بھی اٹھ رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب رستم کو ایک بار پھر اپنی ٹانگ کی تکلیف کا احساس ہوا۔ شانی کی نگاہ بچا کر اس نے اپنی شلوار کا پائنچا اٹھایا اور پنڈلی دیکھی۔ اسے جھٹکا سا لگا۔ پنڈلی کے پچھلے حصے پر گہرا زخم تھا۔ زخم سے بہنے والا خون جوتی میں چپچپا رہا تھا۔ رستم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ زخم کب لگا ہے پھر اچانک اسے اس دھماکے کا خیال آیا جو کچھ دیر پہلے اس کے پھینکے ہوئے ہینڈ گرینیڈ سے ہوا تھا۔ پتھر اور لوہے کے بہت سے پرخچے اڑے تھے۔ شاید انہی میں سے کوئی پرخچا اس کی پنڈلی کو گھائل کر گیا تھا۔

''کیا ہوا؟'' شانی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ کوئی پتھر لگا ہے شاید۔'' رستم نے کہا اور شلوار برابر کر دی۔

دونوں نرسری کے گنجان سبزے سے باہر نکل آئے۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی چلے تھے کہ انہیں پھر واپس درختوں میں آنا پڑا۔ ایک پولیس کار برق رفتاری سے ان کے پاس سے گزر گئی۔

''ہم کہاں جائیں گے رستم؟'' شانی نے دل گیر لہجے میں کہا۔

''آپ آئیں..... کوئی سواری ڈھونڈتے ہیں۔'' رستم نے شانی کا ہاتھ تھاما۔

سامنے تارکول کی سنسان سڑک تھی۔ دونوں طرف کوٹھیاں تھیں۔ ہر کوٹھی میں بس ایک دو لائٹس ہی روشن تھیں۔ کبھی کبھی رکھوالی کے کسی کتے کی آواز سنانے کا سینہ چیر دیتی تھی۔ رستم

www.pdfbooksfree.pk

کی لنگڑاہٹ میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹی سڑک کو طے کر کے وہ ایک نسبتاً کشادہ سڑک پر آ گئے۔ دور مغربی افق پر بجھا بجھا سا چاند اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ ہوا مدھم لیکن خوش گوار تھی۔ یہ رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ ان کے عقب میں قریباً ڈھائی تین فرلانگ کی دوری پر پولیس کاروں کے سائرن سنائی دیتے تھے اور کبھی کبھی کوئی پٹاخہ (فائر) بھی چل جاتا تھا۔ یہ سب کچھ اس کوٹھی کے اردگرد ہو رہا تھا جہاں سے وہ نکلے تھے۔ وہ کچھ دور چلے تھے کہ ایک مہران ٹیکسی کار نظر آئی۔ وہ مخالف سمت جا رہی تھی۔ رستم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔ دونوں ٹیکسی میں جا بیٹھے۔ رستم آگے اور شانی پیچھے بیٹھی۔ ''کہاں جانا ہے؟'' جواں سال ڈرائیور نے رستم کو سرتاپا گھورتے ہوئے کہا۔

''گلبرگ مین مارکیٹ!'' رستم نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ تین چار منٹ چلنے کے بعد جونہی وہ ایک چھوٹے چوراہے سے آگے بڑھے رستم کو زبردست پولیس ناکا دکھائی دیا۔ یہاں کوئی ایک درجن اہلکار موجود تھے۔ ایک پولیس موبائل بھی نظر آ رہی تھی..... رستم کا ذہن فوری طور پر کام کر گیا۔ ناکے تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے ٹیکسی ایک بغلی سڑک پر مڑوا دی۔

رستم کی اس حرکت سے ڈرائیور کے شبہات مزید گہرے ہو گئے ہوں گے مگر وہ خاموش ہی رہا۔ مین مارکیٹ پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی اس نے ٹیکسی ایک تاریک سڑک پر روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا اور پھر رستم کو بھی باہر بلا لیا۔ وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یار! اگر آپ کسی چکر میں ہو تو ادھر ہی اُتر جاؤ۔ ورنہ خود بھی پھنسو گے اور مجھے بھی پھنساؤ گے۔''

''کیا مطلب؟'' رستم نے پوچھا۔

''آگے موڑ کے پاس ہی پھر پولیس ناکا ہے۔ یہاں سے گلی میں ہو کر پیدل نکل جاؤ۔''

''ایسی کوئی بات نہیں..... لیکن اب تم نے گاڑی روک ہی دی ہے تو ٹھیک ہے۔'' رستم نے ڈرائیور کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ وہ تیزی سے گاڑی چلا کر نکل گیا۔ اب ایک بار پھر وہ سنسان سڑک پر تھے۔ دونوں طرف کوٹھیاں تھیں اور بغلی سڑکیں نکلتی تھیں۔

''کہیں یہ ڈرائیور کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔'' شانی نے کہا۔

''ہو سکتا ہے..... اور نہیں بھی۔'' رستم نے جواب دیا اور شانی کا نرم ہاتھ تھام کر ایک بار پھر آگے بڑھنے لگا۔ ان کا رخ مین مارکیٹ کی طرف نہیں تھا۔ اردگرد کوئی رکشہ ٹیکسی دکھائی نہیں دے رہی تھے۔ یہ سواریاں مین مارکیٹ کی طرف سے ہی مل سکتی تھیں مگر ادھر جانا

خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سامنے ایک کوٹھی کے کارنر پر نیلی وردیوں والے دو تین سیکورٹی گارڈز کھڑے تھے۔ ''کون ہو بھئی؟'' ایک موچھیل گارڈ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''رانا صاحب کے گھر جانا ہے..... کوٹھی نمبر 28۔'' رستم نے اگلے بلاک کا ایڈریس بتایا۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' گارڈ نے رستم کا ابتر حلیہ دیکھ کر سوال جواب شروع کر دیئے۔ اس کی نگاہیں بار بار رستم کی پھولی ہوئی چادر کی طرف اٹھ رہی تھیں جس کے نیچے سردار دراج کی کلاشنکوف موجود تھی۔

گارڈ کا رویہ دیکھ کر شانی کو لاہور ہی کی وہ دل خراش رات یاد آ گئی جب وہ اسی طرح سڑکوں پر بھٹک رہی تھی اور ایک گارڈ جیرے نے سکندر اور کامی نام کے لڑکوں کے ساتھ مل کر اس کو سخت ہراساں کیا تھا۔ آج شاید گارڈ جیرا ایک اور روپ میں اس کے سامنے تھا لیکن آج وہ اکیلی نہیں تھی۔ آج اس کے ساتھ رستم تھا۔ اس گارڈ جیسے چار چھ اور بھی ہوتے تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ دیگر گارڈ بھی تفصیل حال جاننے کے لیے قریب آ گئے۔ شانی دعا کرنے لگی کہ وہ اپنی کسی حرکت سے رستم کو مشتعل نہ کر دیں۔

اچانک سامنے سے آنے والی ایک کار کے پہیے زور سے چرچرائے اور وہ چند میٹر آگے جا کر رک گئی۔ ''کیا یہ کوئی نئی مصیبت ہے؟'' شانی نے لرز کر سوچا۔ سفید ٹویوٹا کار ریورس ہوئی اور رستم کے قریب آ کر رک گئی۔ اس میں سے جو فرد نکلا، اسے دیکھ کر شانی ششدر رہ گئی۔ اسے اپنی نگاہوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ راجو تھا۔ کوکی کا شوہر اور تاؤ حشام کا بیٹا! وہ پینٹ شرٹ میں تھا۔ رستم سے زیادہ وہ شانی کو جانتا تھا لیکن شانی چونکہ نقاب میں تھی اس لیے اس کی نگاہ رستم پر ہی پڑی تھی۔ رستم نے بھی راجو کو پہچان لیا تھا۔ راجو انہیں کھول کر رستم سے بغل گیر ہو گیا۔ سکیورٹی گارڈ معذرت کے انداز میں پیچھے ہٹ گئے۔

''آپ..... یہاں..... میں حیران رہ گیا ہوں۔'' راجو بولا پھر اس کی سوالیہ نگاہ شانی کی طرف اٹھی۔ ''یہ کون ہیں؟''

''تمہارے خیال میں کون ہو سکتی ہیں؟'' رستم نے کہا۔

راجو نے آنکھیں سکوڑ کر غور سے شانی کو دیکھا پھر ایک دم اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ وہ تیزی سے شانی کے قریب آیا۔ ''شانی باجی..... آپ؟'' وہ لرزاں آواز میں بولا۔ اس نے بے ساختہ اپنا سر شانی کے کندھے سے لگا دیا۔

چند منٹ بعد وہ دونوں راجو کے ساتھ اس کی سفید کار میں تھے اور کار تیزی سے نہر کی

www.pdfbooksfree.pk

طرف جا رہی تھی۔ راجو سمجھ گیا تھا کہ شانی اور رستم فی الوقت شدید مشکل میں ہیں۔ اس نے رستم کی خون آلود پنڈلی دیکھ لی تھی اور اس کی چادر کے نیچے کلاشنکوف کی موجودگی بھی محسوس کر لی تھی۔ اس نے شانی اور رستم سے زیادہ سوال جواب نہیں کیے..... اس نے اپنی تمام توجہ ڈرائیونگ کی طرف مبذول رکھی۔ وہ زیادہ اچھی ڈرائیونگ نہیں کر رہا تھا مگر سڑکیں خالی تھیں اس لیے کوئی دشواری نہیں تھی۔ پانچ چھ منٹ میں راجو کی گاڑی ایک نئی کوٹھی میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔

''کوکی کہاں ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ بھی یہیں ہے باجی۔ دراصل چھوٹی ندا کے پیٹ میں درد ہو رہا ہے، میں میڈیکل سٹور سے اس کی دوا لینے نکلا تھا۔ قدرت کو منظور تھا کہ آپ سے ملاقات ہو۔'' ندا، راجو کی بچی کا نام تھا۔

کسی اندرونی کمرے سے بچی کے رونے کی باریک آواز بلند ہو رہی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ بند کر دیا اور راجو، شانی اور رستم کو لے کر اندر آ گیا۔ اندر پہنچ کر شانی نے اپنا نقاب ہٹا دیا۔ اس نے روشنی میں دیکھا کہ رستم کی طرح اس کا اپنا حلیہ بھی ابتر ہو رہا ہے۔

راجو لرزتی آواز میں پکارا۔ ''دیکھو کوکی..... کون آیا ہے۔''

اندر سے کوکی برآمد ہوئی۔ اس کی گود میں روتی بسورتی بچی تھی۔ وہ کچھ دیر تک کھلی کھلی آنکھوں سے شانی کو دیکھتی رہی پھر اسے پہچان کر حیرت زدہ رہ گئی۔ اس نے بچی کو ایک طرف لٹایا اور شانی آپا پکارتی ہوئی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

شانی کے زخمی کندھے سے شدید ٹیس اٹھی لیکن اس نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔ پھر بھی شانی کی زخمی انگلیوں پر اس کی نظر پڑ گئی۔ ''شانی آپا! آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟ خیریت تو ہے؟ آپ کے کپڑوں کو کیا ہوا؟'' اس نے ایک ساتھ کئی سوالات پوچھ ڈالے۔

''خیریت نہیں ہے کوکی۔'' شانی نے مختصر جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اندرونی کمرے میں آ گئے۔

راجو نے کہا۔ ''آپ کسی بڑی مشکل میں ہیں شانی باجی۔''

شانی نے رستم کی طرف دیکھا۔ رستم بولا۔ ''شاید تم لوگ ٹی وی وغیرہ نہیں دیکھتے۔''

''ٹی وی تو ہے لیکن دو تین دن سے ندا کی طبیعت اتنی خراب تھی کہ ہم دونوں کو کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ کہیں..... پولیس کے ساتھ تو.....'' راجو نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''گلبرگ کے علاقے میں دو دن سے ٹاکرا ہو رہا تھا۔

www.pdfbooksfree.pk

دونوں طرف سے کافی نقصان ہوا ہے۔''

راجو نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں..... کل ہم ندا کے ساتھ ہسپتال میں تھے۔ وہاں ایک بندہ گلبرگ میں پولیس مقابلے کی بات تو کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کسی انسپکٹر طفیل کو گولی لگی ہے۔''

''انسپکٹر نہیں، سب انسپکٹر تھا۔ ڈپٹی ریاض کا رشتے دار ہے۔'' رستم نے تصحیح کی۔ ''وہ ہمارے ساتھ لڑنے والوں میں شامل تھا۔''

''آپ کے ساتھی ناصر اور اجمل خان وغیرہ کہاں ہیں؟'' راجو نے پوچھا۔

''ناصر بھی ہماری طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہوا ہے مگر اجمل کو گولی لگ گئی ہے۔'' رستم نے بے حد بوجھل لہجے میں کہا۔

''اور وہ مہتم سردار دراج؟''

''وہ بھی نہیں بچ سکا۔'' رستم کی آواز مزید بوجھل ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون تیر رہا تھا۔ راجو اور کوکی کے چہروں پر گہرا دکھ نظر آیا۔

راجو بولا۔ ''میں ابھی آپ کے لیے کمرہ ٹھیک کرواتا ہوں۔ یہاں آپ بالکل محفوظ رہیں گے۔ کسی طرح کا کوئی ڈر فکر نہیں ہے۔''

''نہیں راجو! ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔ پولیس ہمارے پیچھے ہے..... ہم تمہارے لیے مصیبت نہیں بننا چاہتے۔'' رستم نے جواب دیا۔

کوکی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''یہ آپ کیسی بات کر رہے ہیں؟ شانی آپا ہمارے لیے سگی بہنوں کی طرح ہیں۔ انہوں نے جو کچھ ہم دونوں کے لیے کیا ہے، ہم مرتے دم تک نہیں بھول سکتے۔ ان کے لیے ہماری جان بھی چلی جائے تو پرواہ نہیں۔''

اسی دوران میں کوکی کی بڑی بہن سنبل بھی اندر آ گئی۔ وہ نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ اس کی غلافی آنکھیں بھاری نظر آ رہی تھیں۔ یہی وہ لڑکی تھی جس سے کوتاہ قد ڈولے نے خاموش محبت کی تھی۔ جس کی تمنا چپکے چپکے اپنے دل میں پالی تھی اور پھر اس تمنا سمیت منوں مٹی کے نیچے جا سویا تھا۔ شانی کو پہچان کر سنبل بھی حیران ہوئی۔ پھر وہ لپک کر شانی کے گلے لگ گئی۔

کچھ ہی دیر بعد شانی نہا کر اپنے کپڑے بدل چکی تھی۔ سنبل کے کپڑے اسے تقریباً پورے آئے تھے۔ وہ اجمل خان اور دراج کی موت پر سوگوار بیٹھی تھی۔ کوکی اور سنبل اسے دلاسہ دے رہی تھیں اور ساتھ ساتھ خود بھی اشک گرا رہی تھی۔

''کوکی! یہ گھر کس کا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''ہمارا ہے آپا..... ہم نے چھ مہینے پہلے خرید لیا تھا۔ اس کا بچا کھچا کام ہو رہا تھا۔ ہم صرف بیس پچیس دن پہلے ہی گاؤں سے یہاں شفٹ ہوئے ہیں۔ ابھی تو سامان بھی پوری طرح سیٹ نہیں کیا ہے۔''

''ناؤ (حشام) کہاں ہیں؟'' شانی نے پوچھا۔

''وہ دو تین مہینے پہلے ہی یہاں آ گئے تھے۔ لاہور میں ان کے تین چار کیسوں کی تاریخیں چلتی ہیں نا۔''

''وہ ٹھیک ہیں؟'' شانی نے دریافت کیا۔

کوکی نے اثبات میں جواب دیا۔ ''وہ بھی ہماری طرح آپ کے لیے بہت پریشان رہے ہیں۔ دو دن پہلے کورٹ کے احاطے سے ان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اخبار میں آپ کے لاپتا ہونے کی خبر چھپی ہے۔ وہ اس خبر کو جھوٹا بتا رہے تھے لیکن اب یہ سب کچھ سچ نکلا ہے۔ آپ رنگ والی کے بجائے یہاں لاہور میں ہیں۔''

شانی نے کوکی اور سنبل کو مختصر الفاظ میں اپنے حالات کے بارے میں بتایا۔ تاہم سکینہ کی موت کی خبر وہ ان دونوں سے بھی چھپا گئی۔

شانی کے حالات نے کوکی اور سنبل کو مزید غم زدہ کیا۔ پھر گفتگو کا رخ ڈولے کی ناگہانی موت کی طرف مڑ گیا۔ وہ تینوں اس کی موت پر سوگوار ہو گئیں۔ سنبل نے روتے ہوئے کہا۔ ''وہ بہت اچھا تھا۔ بڑا سادہ دل..... بڑا ہمدرد۔ کوکی اور راجو کو ملانے میں آپ کی طرح اس نے بھی بہت کوشش کی۔ کوکی کی خراب حالت دیکھ کر وہ راجو کو ڈھونڈنے نکل گیا اور کئی موقعوں پر اپنی جان تک خطرے میں ڈالی۔''

''میں اس کی کوششوں کی گواہ ہوں۔'' شانی نے کہا۔ ''لیکن تمہیں پتا ہے، وہ یہ سب کس کے لیے کرتا تھا؟''

سنبل کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔ دو موٹے آنسو اس کے شفاف رخساروں پر پھسلے..... وہ بولی۔ ''پتا ہے بھی اور نہیں بھی..... وہ مجھ سے بہت لگاؤ رکھتا تھا۔ اپنے دل کی ہر بات مجھ سے کہتا تھا۔''

''لیکن کوئی بات ایسی بھی ہو گی جو اس نے نہیں کہی ہو گی۔''

سنبل نے ایک آہ کھینچ کر دوبارہ گردن جھکا لی۔ ''شاید آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ کبھی کبھی کہتا تھا، میں آپ کو ایک بات بتاؤں گا..... میں نے کبھی اسے کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ دو چار دفعہ ایسا بھی ہوا کہ مجھے لگا، وہ کچھ کہنے کے لیے میرے پاس آیا ہے۔ اس نے ڈھیروں

باتیں کیں مگر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہی کرتا رہا۔ کوئی خاص بات اس کی زبان پر کبھی نہیں آئی۔''

''تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو گیا ہو گا سنبل؟''

''سیانے کہتے ہیں نا آپا..... جس گاؤں جانا نہ ہو، اس کی راہ پوچھنے سے فائدہ!''

وہ تینوں خاموش ہو گئیں۔ اپنی اپنی جگہ سوچتی رہیں۔ ڈولے کے بارے میں..... اس کے مقدر کے بارے میں۔ آخر سنبل نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے آپا؟ قدرت کچھ لوگوں سے ایسا مذاق کیوں کرتی ہے؟ انہیں پورا دل اور پوری سوچ دیتی ہے مگر جسم..... پورا نہیں دیتی۔''

''قدرت کے کام قدرت ہی جانتی ہے اور ہر کام میں کوئی حکمت ہوتی ہے۔'' شانی نے ہولے سے کہا۔ وہ تینوں قالین پر بیٹھی تھیں۔ شانی اور سنبل نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سنبل نے اپنا ماتھا اپنے گھٹنوں پر ٹیک کر چہرہ چھپایا اور اچانک سسکیوں سے رونے لگی۔ پھر اس کی سسکیاں بلند ہوتی گئیں اور ہچکیوں میں بدل گئیں۔ وہ موسلا دھار روئی اور کئی منٹ تک روتی رہی..... شانی نے اسے اپنے کندھے سے لگا لیا تھا تاکہ وہ اپنے دل کا بوجھ اچھے طریقے سے ہلکا کر لے۔ وہ کیوں رو رہی تھی؟ شاید اسے خود بھی پتا نہیں تھا۔

اسی دوران میں راجو اور رستم نے ٹی وی کا تار وغیرہ لگا کر اسے آن کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد خبریں نشر ہوئیں تو ان میں گلبرگ کی خبر بھی موجود تھی۔ زیادہ تفصیل نہیں تھی، بس اتنا بتایا گیا کہ گھیرے میں آئے ہوئے مزید تین ڈاکو ہلاک ہو گئے ہیں۔ پولیس عمارت کے اندر پہنچ گئی ہے اور مزید ملزموں کی تلاش جاری ہے۔ تہہ خانے میں ہونے والے ایک زوردار دھماکے کا ذکر بھی خبر میں موجود تھا۔ اسے ڈائنامیٹ کا دھماکہ کہا جا رہا تھا۔ اصل میں یہ وہی "M67" دستی بم تھا جو رستم نے پرانے سیوریج پائپ کے اندر پھینکا تھا..... اور جس کی وجہ سے اسے اور شانی کو بھاگنے کا موقع ملا تھا۔

اب رات کے قریباً تین بج چکے تھے۔ کبھی کبھی کسی دور افتادہ سڑک سے گزرنے والی پولیس موبائل کا سائرن بھی سنائی دے جاتا تھا۔ راجو نے رستم کو اپنے ساتھ لیا اور دوسری منزل کے کمرے میں چلا گیا جبکہ شانی اور سنبل نیچے کوکی کے بیڈ روم میں رہیں۔ راجو سمیت یہاں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ شانی اور رستم شادی شدہ ہیں، ورنہ شاید ان کے لیے ایک ہی کمرے کا انتظام کیا جاتا۔

کوکی نے کہا۔ ''آپا! آپ کچھ دیر آرام کر لیں۔''

شانی خاموش رہی۔ وہ لیٹ گئی مگر اس کی آنکھوں میں انگارے اُترے ہوئے تھے۔

www.pdfbooksfree.pk

گزر جانے والا ایک ایک منظر آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ ابھی اجمل خان کی موت کا صدمہ ہی کم نہیں ہوا تھا کہ سردار دراج بھی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ اسے بڑے پیار سے نکڑی کہنے والا اور اپنے گز بھر چوڑے سینے سے اس کے سامنے محفوظ دیوار کھڑی کرنے والا دراج اب کبھی نہ اٹھنے کے لیے گر چکا تھا۔ پھر اسے اپنے دیگر ساتھیوں کا خیال آیا۔ ڈاکٹر ناصر، زری، جہانگیر، دراج کا برادر نسبتی اور باقی تین چار مہتم نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھے؟ نیوز میں ان کے بچڑے جانے کی کوئی اطلاع تو نہیں تھی مگر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ان کی گرفتاری کو چھپایا گیا ہو۔ رستم کا خیال تھا کہ وہ نرسری میں سے لوڈر لے کر نکل گئے ہیں۔ شانی سوچنے لگی کہ وہ کہاں جا سکتے ہیں۔ پھر اس کا دھیان رستم کی طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ رستم کی ٹانگ زخمی ہے اور یہ وہی ٹانگ تھی جو ایک بار اس کے جسم سے جدا بھی ہو چکی تھی۔ اس ٹانگ میں دوسری ٹانگ جیسی طاقت نہیں تھی۔ کم از کم ابھی تک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اب اس کے زخمی ہو جانے سے رستم کو مزید مشکل پیش آ رہی تھی۔

وہ رات بھر سو نہیں سکی..... بس دو تین بار اونگھ سی آئی۔ آنکھوں سے آنسو رستے رہے۔ کوکی اپنی روتی بسورتی بچی کو دوسرے کمرے میں لے گئی اور بچی کے ساتھ ساتھ کچھ دیر کے لیے خود بھی سو گئی۔ رات بھر قریبی سڑکوں پر پولیس موبائلز کے سائرن گونجتے رہے۔ علی الصباح شانی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ رستم کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اوپر کی منزل پر جانے کے لیے وہ برآمدے کی کھڑکیوں کے سامنے سے گزر رہی تھی جب اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ اس کی نگاہ کوٹھی کے عقبی لان میں پڑی۔ صبح کے جھٹپٹے میں اسے تاؤ حشام نظر آیا۔ وہ بڑی محویت سے ایک کیاری پر جھکا ہوا تھا اور کچھ کر رہا تھا۔ شانی نے دھیان سے دیکھا اور اس کا جسم سنسنا اٹھا۔ یہ ایک ویسا ہی منظر تھا جو وہ اس سے پہلے بھی ایک دفعہ نار پور میں دیکھ چکی تھی۔ دس پندرہ فٹ مربع کی کیاری میں کوئی زندہ شے رینگ رہی تھی۔ یقیناً یہ ایک کوبرا سانپ تھا۔ تاؤ حشام پلاسٹک کے ایک لوتے کے ذریعے کیاری میں کچھ انڈیل رہا تھا۔ یقیناً یہ پانی نہیں تھا۔ یہ خون تھا۔ تاؤ حشام اس کیاری کی ''آبیاری'' خون سے کر رہا تھا۔ کیاری کے چھوٹے چھوٹے پودوں کو دیکھ کر شانی کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ یہ وہی خونی پودا تھا جس کا حصول بہت سے لوگوں کے لیے زندگی موت کا سوال بنا ہوا تھا۔ اسی پودے کی نحوست کے سبب رستم اور ناصر کے ٹو کے قریب پاک چین سرحد تک پہنچے تھے اور پورے ایک برس تک شدید ترین مشکلات کا شکار رہے تھے۔ مہر جی کی موت کے بعد اس پودے کی کاشت کچھ لوگوں کے لیے سربستہ راز بن گئی تھی اور وہ اس راز تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش میں

تھے۔

شانی کو اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، کوکی اس کے پاس کھڑی تھی۔ وہ ننگے سر اور ننگے پاؤں تھی۔ ''کیا دیکھ رہی ہو آپا؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ تاؤ حشام کب سے اس چکر میں ہیں؟''

''پچھلے دو ڈھائی مہینے سے..... بلکہ گاؤں میں بھی یہی چکر ان پر سوار رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ یہ پودا پروان چڑھانے میں کامیاب ہو گئے تو بڑا پیسہ کما سکتے ہیں۔ ایک سنیاسی کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لگایا ہوا ہے۔ دن رات لگے رہتے ہیں؟''

''کچھ کامیابی ہوئی ہے؟''

''تاؤ تو کہتے ہیں کہ ہوئی ہے مگر راجو نہیں مانتا۔ راجو کہتا ہے کہ اس پودے کے پتوں کی شکل بالکل ویسی نہیں جیسی سپ گندل کی ہوتی ہے۔ تاؤ نہیں مانتے۔ تاؤ نے تو ایک ہفتہ پہلے کچھ پتے توڑے بھی ہیں اور ان کی دوا بھی بنائی ہے۔''

''دوا بنائی ہے..... کس لیے؟''

''بیچنے کے لیے۔ بلکہ یہاں کاروں میں بیٹھ کر دو چار گاہک آئے بھی ہیں۔ ایک تو کل بھی آیا ہوا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ آپ کا کوئی رشتے دار ہے۔''

شانی نے اس کا حلیہ پوچھا لیکن کچھ سمجھ نہ سکی۔ کوکی بولی۔ ''تاؤ جی کو پیسے کی کچھ کمی تو نہیں ہے۔ بس یہ شوق ہے ان کا۔ انہیں کوئی روک بھی نہیں سکتا۔ چپکے چپکے لگے رہتے ہیں۔ یہ تو آپ صبح سویرے اٹھ گئیں اس لیے آپ نے کیاری دیکھ لی، ورنہ انہوں نے کیاری کی چھوٹی چاردیواری کا دروازہ بند کیا ہوتا ہے۔''

کیاری میں پھنکارتا ہوا سانپ خوفناک لگ رہا تھا۔ تاؤ حشام نے ایک چھوٹے سے مُردہ چوہے کو دُم کی طرف سے پکڑ کر سانپ کے سامنے کیا۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس پر جھپٹ پڑا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید شانی اس معاملے میں دلچسپی محسوس کرتی مگر اب تو وہ ایک طوفان آندھی کے دوش پر تھی۔ اس کے اور رستم کے پیچھے موت کے ہرکارے تھے اور وہ ان سے بھاگ رہے تھے۔ اس شہر میں شاید کوئی جگہ بھی ان کے لیے محفوظ نہیں تھی۔

شانی، تاؤ حشام کو اس کے حال پر چھوڑ کر بالائی منزل کی طرف بڑھی اور اس کمرے میں پہنچ گئی جہاں رستم ٹھہرا ہوا تھا۔

رستم بھی یقیناً سو نہیں سکا تھا۔ اس کی آنکھیں متورم اور سرخ تھیں۔ اس کی حالت کسی

www.pdfbooksfree.pk

گھائل جانور کی سی تھی جو اپنے شکار پر جھپٹ پڑنا چاہتا ہو اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہو۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار بھی تھے..... یقیناً اس کی پنڈلی کا زخم پریشان کر رہا تھا۔

تنہائی ملتے ہی رستم نے کہا۔ ''شانی! آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں چلی گئیں؟ میں اکیلا ہوتا تو میرے بچ نکلنے کے مواقع زیادہ ہوتے اور میں ڈپٹی ریاض کی گردن تک بھی جلد پہنچ جاتا۔''

''اکیلے اکیلے بہت بھاگ کر دکھ لیا رستم! اب مجھ سے اور اکیلے نہیں رہا جاتا۔ اب جو کچھ بھی ہوگا، ہم دونوں کے ساتھ ہوگا۔''

''لیکن..... لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ کی زندگی..... بہت قیمتی ہے۔''

''یہ قیمتی ہے یا سستی..... مگر یہ آپ ہی کی ہے۔'' شانی نے عجیب جذباتی انداز میں کہا اور رستم کا بازو تھام کر اس کے چوڑے شانے سے لگ گئی۔

رستم کی کلاشنکوف رائفل اس کے دوسرے شانے سے جھول رہی تھی اور ہینڈ گرینیڈ والا بیگ سامنے چٹائی پر دھرا تھا۔ اردگرد کی فضا میں نادیدہ خطرات کی آہٹ محسوس ہوئی تھی۔

راجو کھنکارتا ہوا داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گرم چائے کے دو کپ تھے۔ شانی نے اسے دیکھا..... یہ راجو اس اجڈ لڑکے سے کتنا مختلف نظر آتا تھا جس نے کبھی میانہ گاؤں میں جوان نوکرانیوں کے درمیان راجا اندر کے سے شب و روز گزارے تھے اور یہیں پر بس نہیں، اس نے اپنی نوعمری کی پرواہ کیے بغیر شانی کو بھی جبر کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ آج شاید راجو ان واقعات کے بارے میں سوچ کر ہی ندامت کے پسینے میں ڈوب جاتا ہوگا۔

شانی نے چائے نہیں پی۔ رستم نے بھی دو گھونٹ لے کر ایک طرف رکھ دی۔ اسی اثنا میں ایک دیہاتی ملازم تازہ اخبار لے آیا۔ شانی اور رستم نے اخبار دیکھا۔ گلبرگ کے پولیس مقابلے کی خبر نمایاں جگہ پر موجود تھی۔

بتایا گیا تھا کہ پورے شہر کی پولیس ہائی الرٹ ہے اور مفرور ملزموں کو ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔ خبر میں کوٹھی کے نیچے پرانی سیوریج لائن کا ذکر بھی موجود تھا اور بتایا گیا تھا کہ ملزمان کس ڈرامائی انداز میں فرار ہوئے۔ خبر میں اجمل خان، دراج اور چار مہتموں کو خطرناک ڈاکو قرار دیا گیا تھا..... اجمل اور دراج کی لاشوں کی تصویروں نے ان کی موت کا غم پھر شدت سے ابھار دیا۔

میڈیا کے لوگ اس نرسری تک بھی جا پہنچے تھے جہاں نرسری کا رکھوالا بے ہوش ملا تھا اور

اس کا لوڈر غائب پایا گیا تھا۔ آخر میں ایک اعلیٰ پولیس افسر نے عوام الناس کو یقین دلایا تھا کہ خطرناک مجرم رستم اور اس کے ساتھی اگلے اڑتالیس گھنٹے کے اندر اندر زندہ یا مُردہ گرفتار ہو جائیں گے۔ پولیس افسر کا دعویٰ تھا کہ مفرور ڈاکوؤں کے گرد پولیس کا گھیرا تنگ سے تنگ ہوتا جا رہا ہے..... اور ڈراپ سین دنوں کی نہیں گھنٹوں کی بات ہے۔

رستم اور راجو اخبار دیکھ رہے تھے جب یکا یک کوٹھی کے عین سامنے دو گاڑیاں تیز رفتاری سے آ کر رک گئیں۔ اگلی گاڑی اسٹیشن وین تھی۔ پچھلی ایک بند جیپ تھی۔ گاڑیوں کا انداز دیکھتے ہی راجو چونک گیا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

''یہ کون ہیں؟'' رستم نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

''ٹھہرو، میں خود دیکھتا ہوں۔'' رستم نے کہا اور کلاشنکوف کو چادر کے نیچے چھپاتا ہوا زینوں کی طرف بڑھا۔ شانی سائے کی طرح اس کے پیچھے تھی۔ ''رستم! دھیان سے۔'' وہ لرزتی آواز میں بولی۔

رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ چوکیدار نے گیٹ بند رکھا ہوا تھا اور اسٹیشن وین والے سے شناخت مانگ رہا تھا۔ دفعتاً وین کا پچھلا دروازہ کھلا اور اس میں سے چوہدری اعجاز برآمد ہوا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ وہ چھوٹے دروازے کو دھکا دیتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ عقبی جیپ سے اس کے کارندے بھی باہر نکل آئے تھے..... شانی، خالو اعجاز کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گئی۔ اس کے اندر سے اس کے اندر سے ایک سوال دردناک پکار بن کر ابھرا۔ ''تو کیا وہ بری گھڑی آ گئی ہے؟''

☆=======☆=======☆

خالو اعجاز نے گرج کر کہا۔ ''چوہدری حشام! کہاں ہو؟''

چوہدری حشام شاید کسی اندرونی کمرے میں تھا۔ رستم اور شانی نے کامن روم میں سے دیکھا، گیٹ پر ہلچل نظر آ رہی تھی۔ چوہدری اعجاز کے قریباً سبھی کارندے گاڑیوں میں سے نکل آئے تھے۔

''رستم! کیا انہیں پتا چل گیا ہے کہ ہم یہاں ہیں؟'' شانی نے ڈری ہوئی سرگوشی کی۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' رستم نے جواب دیا۔ اس کی تیز نظریں گیٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

شانی نے دیکھا، خالو اعجاز کے کارندے بڑی افراتفری کے عالم میں بڑے گیٹ سے

www.pdfbooksfree.pk

اندر داخل ہونے لگے۔ایک تنومند کارندے نے کسی بے ہوش یا نیم بے ہوش شخص کو گود میں اٹھا رکھا تھا۔اس کارندے کے پیچھے دو افراد نے کسی لڑکی کو اٹھایا ہوا تھا۔لڑکی بھی بے حس و حرکت تھی۔اس کا ایک مرمریں بازو کٹی ہوئی شاخ کی طرح جھول رہا تھا۔

''جلد کرو.....اندر لے چلو۔'' خالو اعجاز نے چلاتے ہوئے کہا۔خالو اعجاز کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔

اسی اثنا میں اندرونی حصے سے تاؤ حشام تیز قدموں سے نمودار ہوا۔صورتِ حال دیکھ کر اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

تاؤ حشام کو دیکھ کر چوہدری اعجاز دہاڑا۔''یہ دیکھ حشام! کیا حشر ہوا ہے ان کا۔یہ سب تیرا کیا دھرا ہے.....تیرا کیا دھرا ہے۔''

تاؤ حشام نے آگے بڑھ کر اس شخص کو دیکھا جو ایک گرانڈیل کارندے کی گود میں تھا۔ اس وقت شانی کی نگاہ نے بھی اس بے ہوش شخص کو پہچان لیا۔وہ دم بخود رہ گئی۔یہ خالو اعجاز کا چھوٹا بھائی شاداب تھا۔خالو اعجاز اکثر شانی کے سامنے شاداب کی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے تھے۔آج یہ شاداب، بے ہوشی کی حالت میں.....ایک نیم عریاں، بے ہوش لڑکی کے ساتھ اس کوٹھی میں موجود تھا۔جوڑے کی حالت مخدوش نظر آتی تھی۔

وہ سب افراتفری کے عالم میں بے ہوش جوڑے سمیت ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔تاؤ حشام نا قابلِ فہم بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گیا۔شانی کو کم از کم یہ اطمینان تو ہو گیا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔رستم کے تنے ہوئے اعصاب تھمی قدرے ڈھیلے نظر آنے لگے۔ بہر حال، کلاشنکوف پر اس کی گرفت اب بھی موجود تھی۔

''یہ کیا چکر ہے رستم؟'' شانی نے رستم کے بازو سے لگے لگے سرگوشی کی۔

''لگتا ہے کوئی نشہ وغیرہ کھا لیا ہے انہوں نے۔''

اچانک شانی کا دھیان سپ گندل کی طرف چلا گیا۔کہیں یہ اسی خطرناک پودے کا شاخسانہ تو نہیں؟ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے وہ اسی چادر دیواری میں سپ گندل کی منحوس جھلک دیکھ چکی تھی۔ڈرائنگ روم کی دیوار گیر کھڑکی کا پردہ برابر نہیں تھا۔اندر ہونے والی بھاگ دوڑ شانی اور رستم کو دکھائی دے رہی تھی۔اس کے علاوہ بلند آہنگ میں بولے جانے والے فقرے بھی ان کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔خالو اعجاز بار بار تاؤ حشام پر برس رہا تھا۔''تم ذمے دار ہو۔جو کچھ کیا ہے تم نے کیا ہے۔یہ تو بچہ تھا.....تم تو سمجھ دار تھے۔تمہیں لالچ نے اندھا کیا ہے۔''

''میں نے اسے زہر تو نہیں دے دیا.....اور نہ میں چل کر اس کے پاس گیا تھا۔'' تاؤ

حشام جوابی طور پر دہاڑا۔

''جو چیز جان لے لے وہ زہر ہی ہوتی ہے اور اسے دیکھو.....یہ مر رہا ہے۔اگر کر سکتے ہو تو اس کا کچھ کرو۔یہ مر گیا تو میں تمہیں.....میں تمہیں پھانسی کے تختے پر پہنچا دوں گا۔''

تاؤ حشام کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔اس کی سمجھ میں جیسے کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔اس نے چمچ کے ذریعے کوئی سیاہی مائل لعاب دار دوا شاداب کے منہ میں انڈیلنے کی کوشش کی۔یہ دوا غالباً اس کی باچھوں سے بہہ گئی۔

ڈرائنگ روم میں جو گفتگو ہو رہی تھی، اس سے پتا چلا کہ طبیعت خراب ہونے کے بعد شاداب نے بڑے بھائی اعجاز سے کہا کہ وہ اسے چوہدری حشام کے پاس لے جائے۔وہ لوگ اسے گاڑی میں ڈال کر لاہور روانہ ہوئے۔ساتھ میں شاداب کی ساتھی لڑکی بھی تھی۔ راستے میں دونوں کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔

شانی نے دیکھا کہ شاداب کے جسم پر صرف بنیان اور ٹراؤزر تھا۔لڑکی نیم عریاں تھیں اور اس کے مرمریں بدن پر کھرونچوں اور خراشوں کے واضح نشان تھے۔رخساروں پر بھی نیل دکھائی دے رہے تھے۔اس کے لمبے ریشمی بال ڈرائنگ روم کے صوفے پر کسی سیاہ چادر کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔اس کی بے ہوشی بھی گہری دکھائی دیتی تھی۔یہ وہی شیمپو کے اشتہار میں کام کرنے والی لڑکی تھی۔

شانی کے کانوں میں وہ بات گونجنے لگی جو تھوڑی دیر پہلے اسے کوکی نے بتائی تھی۔اس نے کہا تھا کہ تاؤ نے سپ گندل سے کشید کی جانے والی دوا تیار کر لی ہے۔بلکہ وہ اسے خاص خاص لوگوں کو استعمال بھی کرا رہا ہے۔کوکی نے بتایا تھا کہ تاؤ حشام کے پاس آنے جانے والوں میں شانی کا ایک رشتے دار بھی شامل ہے۔

تو وہ رشتے دار یہی شاداب عرف شابی تھا۔اب ساری بات شانی کی سمجھ میں آنا شروع ہو گئی تھی۔اندر ڈرائنگ روم میں صورتِ حال تہلکہ خیز تھی۔یوں لگتا تھا کہ شاداب نے آخری سانس لینے شروع کر دیے ہیں۔خالو اعجاز فردِ غم سے چلا رہا تھا۔وہ کبھی نیم مُردہ شاداب کو جھنجوڑتا، کبھی اپنا سر پیٹنے لگتا تھا۔پھر اس نے تاؤ حشام کو دو ہتڑ مار کر شاداب سے دور ہٹا دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر چلایا۔''اسے ہسپتال لے چلو۔اس حرامی سے کچھ نہیں ہو گا۔یہ مار ڈالے گا اسے۔''

خالو اعجاز کے کارندے چیلوں کی طرح جھپٹے۔انہوں نے تنومند شاداب کو اٹھانے اور کمرے سے باہر لے جانے کی کوشش کی مگر لگتا تھا کہ اب بھاگ دوڑ کا وقت گزر گیا ہے۔

www.pdfbooksfree.pk

شاداب کے ہاتھ پاؤں مُردہ شاخوں کی طرح جھول رہے تھے۔ اس کا چہرہ جو کچھ دیر پہلے آگ کی طرح دہک رہا تھا، اب ٹھنڈا اور بے رنگ دکھائی دینے لگا تھا۔ کوٹھی کے برآمدے میں پہنچ کر شاداب کا جسم ایک بار پھر ایک صوفے پر رکھ دیا گیا۔ خالو اعجاز کی روتی کرلاتی آواز فضا کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ ''مار دیا..... میرے بھرا کو جان سے مار دیا۔ اس ظالم نے مجھ سے میرا بھرا چھین لیا۔ میں لٹ گیا..... میں برباد ہوگیا۔ او شاداب! آنکھیں کھول۔ اوئے، دیکھ میری طرف..... اوئے، مجھ سے بات کر۔''

خالو اعجاز اپنے چہیتے بھائی کے مُردہ جسم سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مارنے لگا۔

اندر شاید لڑکی بھی مشکل میں تھی۔ اس کا خوبرو چہرہ اندرونی حدت سے سرخ تھا اور سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ دو افراد نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے جلدی جلدی ایک زنانہ لباس بے ہوش لڑکی کے جسم پر گھسیٹا اور اسے اٹیشن وین میں ڈال کر لے گئے۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ اسے ہسپتال یا پرائیویٹ کلینک میں لے کر گئے ہوں گے۔

شاداب کی لاش کو ایک بار پھر ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ ڈرائنگ روم میں کہرام مچ گیا۔ سب سے زیادہ بلند اور کرب ناک آواز چوہدری اعجاز کی تھی۔ وہ لاڈلے بھائی کی لاش پر عورتوں کے انداز میں بَین کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے اس پر غشی طاری ہوئی۔ ہوش میں آتے ہی وہ ایک بار پھر نوحہ کناں ہوگیا۔ تاؤ حشام دائیں بائیں ہوگیا تھا، تاہم راجو اور کوکی ڈرائنگ روم میں نظر آ رہے تھے۔ اس ناگہانی موت پر ان کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

شانی اور رستم کامن روم کے عقبی دروازے سے نکلے اور بڑی احتیاط سے زینے چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ جو کچھ ہوا، وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے تک وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ خالو اعجاز اور اس کے بھائی سے ملاقات ہوگی اور اس طرح ہوگی۔

اوپر پہنچ کر رستم نے کہا۔ ''شانی! لگتا ہے یہ سب اسی منحوس بوٹی سپ گندل کی کارستانی ہے۔ شاید بڑے چوہدری مہر کی طرح تاؤ حشام کے پاس بھی سپ گندل موجود ہے۔''

''موجود نہیں ہے رستم! تاؤ اسے یہاں پھوارے میں اگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے کوکب نے بتایا ہے سب کچھ اور مجھے لگتا ہے کہ یہاں تاؤ حشام نے جو کچھ اگایا ہے، وہ صحیح سپ گندل بھی نہیں ہے۔ اس سے ملتی جلتی کوئی شے ہے۔ میں نے خود اس کے پتے دیکھے ہیں۔ اب یہ تاؤ کی جلد بازی ہی ہے کہ وہ ان پتوں سے دوا بنا رہا تھا بلکہ اس نے اس کا استعمال بھی شروع کرا دیا۔''

نیچے کی منزل پر افراتفری بہ دستور موجود تھی۔ گاہے بہ گاہے خالو اعجاز کی روتی بلکتی آواز

www.pdfbooksfree.pk

بھی سنائی دے رہی تھی۔ پھر یہ آواز سنائی دینا بند ہوگئی۔ کچھ دیر بعد کوکی آنکھوں کے ساتھ اوپر آئی۔ اس نے رستم اور شانی کو نیچے کی صورتِ حال بتائی اور اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی کہ چوہدری اعجاز کو ہسپتال لے جایا گیا ہے۔

''کیا ہوا انہیں؟'' شانی نے گھبرا کر پوچھا۔

''کھڑے کھڑے گر گئے ہیں۔ دائیں ٹانگ اور بازو بالکل حرکت نہیں کر رہے۔ اللہ خیر کرے، لگتا ہے کہ.....'' وہ کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

''تمہارا مطلب ہے..... فالج!''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' کوکی نے کہا۔

خالو اعجاز ایک نہایت برے روپ میں سامنے آئے تھے۔ کچھ عرصے سے ان کا کردار حد درجہ سازشی رہا تھا اور اب اس کے ٹھوس ثبوت بھی مل چکے تھے۔ شانی کے دل میں ان کے لیے عزت تو نہیں رہی تھی مگر ان کے لیے نفرت وہ اب بھی اپنے دل میں نہیں ابھار سکی تھی۔ شاید نفرت کرنا اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔ وہ واش روم میں چلی گئی۔ اس کی آنکھوں سے گرم آنسو امڈ پڑے۔ اس کے دل سے آواز نکلی..... یا اللہ رحم کر! خطا کاروں کی خطائیں معاف فرما۔ تُو معاف فرمانے والا ہے..... میں اپنے لیے اور خالو اعجاز کے لیے تجھ سے معافی مانگتی ہوں۔''

کچھ دیر آنسو بہانے اور منہ دھونے کے بعد وہ باہر نکلی تو رستم فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا اس کے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے فون بند کیا اور شانی سے مخاطب ہو کر دھیمی آواز میں بولا۔ ''شانی! معاملہ گڑبڑ ہوگیا ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

''کیوں..... کیا ہوا؟''

''شاید کچھ دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے۔ شاداب کے جو ساتھی بے ہوش لڑکی کو لے کر ہسپتال گئے تھے، انہوں نے وہاں بتا دیا ہے کہ شاداب اور اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ انہوں نے شاداب کے مرنے کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ پولیس پارٹی کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچ جائے گی۔''

''آپ کو یہ سب کس نے بتایا ہے؟''

''راجو نے..... وہ ہسپتال کی ایمرجنسی سے فون کر رہا تھا۔''

صرف دس پندرہ منٹ بعد ہی رستم اور شانی اس کوٹھی سے نکلنے کے لیے تیار تھے۔ کوکی، رستم کے لیے تاؤ حشام کا ایک جوڑا لے آئی تھی۔ یہ بوسکی کی لمبی قمیص اور سفید تہہ بند پر مشتمل

تھا۔ ساتھ میں سفید پگڑی بھی تھی۔ یہ لباس رستم کو نہ صرف پورا آ گیا بلکہ اس کے جسم پر سجا بھی..... شانی کے لیے سنبل نے اپنا ایک زرق برق جوڑا دے دیا۔ غالباً یہ کام دار جوڑا اس نے کوکی کی شادی پر پہنا ہوگا۔ ایک اٹیچی کیس میں رستم نے کلاشنکوف، اس کے راؤنڈ اور بقایا دو دستی بم رکھ لیے۔

کوکی ان دونوں کو روکنا چاہتی تھی مگر رستم اور شانی جانتے تھے کہ اب یہاں رکنا شدید خطرے کو دعوت دینا ہے۔ پولیس کسی بھی وقت اس کوٹھی میں دندنا سکتی تھی۔ وقتِ رخصت کوکی شانی سے لپٹ گئی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ ''اتنی چھوٹی ملاقات۔ ابھی تو ہم نے آپ کو ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔'' وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

راجو کا ایک ملازم موٹر رکشا لے آیا تھا۔ رستم اور شانی رکشا پر بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ اب صبح کے نو بج چکے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا اژدھام تھا۔ سکولوں، دفتروں اور کارخانوں میں جانے والے لوگ ایک تیز رَو سیلاب کی طرح لاہور کی سڑکوں پر امڈ آئے تھے۔ وہ اپنی اپنی سمت میں بہہ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بے خبر، اپنی ہی دُھن میں مگن..... اور ان کے درمیان رستم اور شانی تھے۔ دوسروں کی طرح وہ بھی چل رہے تھے..... لیکن وہ دوسروں کی طرح نہیں تھے۔ ان کا راستہ مختلف تھا۔ ان کی منزل جدا تھی۔ ان کے سینوں میں آگ تھی اور ان کے پیچھے موت تھی۔ بچھڑ جانے والے ساتھیوں کا غم ان کو اندر سے مسمار کر رہا تھا اور آنے والی گھڑیوں کی خوفناک سنگینی ان کی دھڑکنوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ ہاں، وہ دوسروں کے ساتھ چل رہے تھے لیکن دوسروں کی طرح نہیں تھے۔

رستم کے بازو سے لگے لگے شانی نے ایک لمحے کے لیے..... صرف ایک لمحے کے لیے سوچا..... کتنا اچھا ہوتا، آج وہ دونوں بھی گھر سے ناشتا کرنے کے بعد اپنے اپنے کام پر جانے کے لیے نکلے ہوتے..... یا پھر راوی کے کنارے، گلشن اقبال کے سرسبز میدانوں میں یا شالامار باغ کی پُرسکون چھاؤں میں کوئی خوشگوار مصروفیت ان کی منتظر ہوتی۔

یہ لاہور کی بھری پُری سڑکوں پر افراتفری کی گھڑیاں تھیں اور یہ افراتفری شانی اور رستم کے لیے مفید تھی۔ اس وقت انہیں کہیں کوئی خاص ناکا بھی نظر نہیں آیا۔ صرف جین مندر اور داتا دربار کے پاس چند پولیس والوں پر نگاہ پڑی۔ جلد ہی وہ راوی کے پل پر پہنچ گئے اور رکشا چھوڑ دیا۔ یہاں بیرونی شہروں کو جانے والی بسیں ایک دو منٹ کا سٹاپ کرتی تھیں۔ رستم اور شانی بھی فوراً میانوالی جانے والی ایک بس پر سوار ہو گئے۔ وہ دونوں دیکھنے میں نوبیاہتا جوڑا ہی لگتے تھے۔ شانی کا چہرہ چمکیلے کناروں والی شال کے گھونگھٹ میں چھپا تھا۔ رستم بھاری بھر

کم پگڑی اور لٹھے کے کھڑکھڑاتے تہہ بند کے ساتھ دیہاتی پنجاب کا گبھرو جوان دکھائی دیتا تھا۔ اٹیچی کیس بھی شوخ رنگ کا تھا اور نوبیاہتا جوڑے کے کردار میں رنگ بھرتا تھا۔ یہ بات صرف شانی جانتی تھی کہ اس وقت رستم کی ٹانگ میں شدید تکلیف ہے۔ یہ رستم کی برداشت تھی کہ یہ تکلیف اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی اور نہ اس کی چال سے!

رستم اور شانی کو پچھلی نشستوں پر جگہ ملی۔ یہ بس ایکسپریس نہیں تھی، تاہم یہ زیادہ اسٹاپ بھی نہیں کر رہی تھی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔ تیز ہوا اندر آ رہی تھی۔ رستم نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی پگڑی کا چوڑا پلو منہ کے آگے کر لیا۔ انداز وہی تھا جو لوکل بسوں کے مسافر گرد و غبار سے بچنے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ رستم کی بغلی جیب میں بھرا ہوا پستول تھا اور یہ مسلسل شانی کی پشت سے چبھ رہا تھا۔ اس چبھن میں اطمینان اور تحفظ کا بے پناہ احساس بھی تھا۔

''ہم کہاں جائیں گے رستم؟'' شانی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے سرگوشی کی۔

''ذہن میں کوئی خاص جگہ تو نہیں ہے۔ فی الوقت لاہور سے جتنی دور چلے جائیں، اتنا ہی اچھا ہے۔''

''آپ کی ٹانگ میں زیادہ درد تو نہیں؟''

''آپ نے یاد کرایا ہے تو یاد آیا ہے..... میں بالکل بھولا ہوا تھا۔'' رستم نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میں جانتی ہوں، آپ چھپا رہے ہیں۔'' شانی نے کہا اور شال کے اندر سے ہی اپنا ہاتھ رستم کے گھٹنے پر رکھ دیا۔ وہ شال کے اندر سے ہی ہولے ہولے اس کے گھٹنے کو دبانے لگی۔

''شانی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' رستم نے اس کا ہاتھ روکنا چاہا۔

شانی نہیں رکی۔ ان لمحوں میں اس کا دل چاہ رہا تھا، وہ رستم کا سارا درد اپنی پلکوں سے چن کر اپنے جسم میں اتار لے۔ اس سے لپٹ جائے اور اس کا ہر دکھ ہر آنسو اپنے اندر جذب کر لے۔

خوف، امید اور بے یقینی کے جھونکوں کے درمیان ان کا سفر جاری رہا۔ ایک موقع پر دو پولیس والے بس میں سوار ہو گئے۔ تاہم ان کی حیثیت صرف مسافروں کی تھی۔ جب تک وہ سرگودھا کے قریب بس سے اُتر نہیں گئے، شانی اور رستم تناؤ کی کیفیت میں رہے۔

بس میں ایک دو اخبار بھی چکر لا رہے تھے۔ رستم نے ایک قریبی مسافر سے اخبار لیا اور اس پر بہ ظاہر سرسری نظر ڈالی۔ یہ دوپہر کا اخبار تھا۔ اس میں بھی گلبرگ کے پولیس مقابلے کی

www.pdfbooksfree.pk

خبر موجود تھی۔ رستم اور اجمل خان کی تصویریں بھی چھپی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر شانی کو ایک طرح کے عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ پولیس کی طرف سے ایک بار پھر زور دے کر کہا گیا تھا کہ مفرور ملزم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ ایک امید افزا بات یہ تھی کہ شانی اور رستم کے علیحدہ سے فرار ہونے کا ذکر خبر میں موجود نہیں تھا۔

شانی نے کہا۔ ''رستم! مجھے ناصر، زری اور جہانگیر کی بہت فکر ہے۔ ان کا کیا بنے گا؟''

''ہو سکتا ہے، وہ ہم سے اچھی پوزیشن میں ہوں۔''

''ہم سے بری پوزیشن میں بھی تو ہو سکتے ہیں۔''

''کہیں ٹھکانے پر پہنچ جائیں، پھر ان سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔'' رستم نے کہا۔

میانوالی کے وسیع و عریض بس اڈے سے وہ ایک دوسری بس میں سوار ہوئے اور قریباً دو گھنٹے کے پُر اندیش سفر کے بعد عیسیٰ خیل پہنچ گئے۔ بھوک، پیاس سے ان کا برا حال تھا لیکن یہ تقاضے اندیشوں کے شور میں دبے ہوئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے چاروں طرف موت کے سائے رینگ رہے ہیں۔ عیسیٰ خیل کے بس اڈے پر چند پولیس اہلکاروں کی کڑی نظروں سے بچتے ہوئے وہ ایک لوکل ٹیکسی میں بیٹھے۔ عیسیٰ خیل کا یہ الگ تھلگ قصبہ رستم کو عارضی قیام کے لیے مناسب محسوس ہو رہا تھا۔ رستم نے شانی کو بتایا کہ اندر کے بازار میں ایک ٹھکانا اس کا دیکھا بھالا ہے۔ وہ ایک دو دن کے لیے وہاں رہ سکتے ہیں۔ یہ ''سلطان رضا ہوٹل'' تھا۔ رستم نے ٹیکسی سیدھی سلطان رضا ہوٹل کے سامنے رکوائی اور شانی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ اس تین منزلہ ہوٹل کے کمرے صاف ستھرے تھے اور ماحول بھی بہتر لگتا تھا۔

ہوٹل کا موٹا سا سُست الوجود منیجر رستم کو جانتا تھا مگر رستم کی حیثیت سے نہیں۔ اس نے رستم کو چوہدری جلال کہہ کر مخاطب کیا اور اس سے زمینوں کے بھاؤ اور دس مرلہ کوٹھیوں پر آنے والی لاگت وغیرہ پوچھی۔ جلد ہی رستم اور شانی دوسری منزل کے ایک آرام دہ کمرے میں تھے۔ اجمل خان اور دراج کی موت کا دکھ تو ایک لمحے کے لیے بھی شانی سے جدا نہیں ہوا تھا، تاہم ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کر اس دکھ کو آنکھوں کی راہ ملی اور شانی نے بستر کی چادر میں چہرہ چھپا کر دیر تک آنسو بہائے..... یہاں تک کہ اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا اور وہ آئندہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ بیڈ کے دوسرے سرے پر رستم موجود تھا اور وہ بھی شاید اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے کلاشنکوف اٹیچی کیس میں سے نکال کر بستر کے نیچے رکھ لی تھی۔ بھرا ہوا پستول اس کے تکیے کے نیچے رکھا تھا۔

شانی بستر پر کھسک کر تھوڑا سا آگے گئی اور نیم دراز رستم کے بازو سے لگ گئی۔ اس کے مضبوط سینے پر سر رکھ کر شانی کو لگا کہ مرنا بہت آسان ہے۔ مرنے کا خوف تو ہر ذی روح میں موجود ہوتا ہے۔ شانی میں بھی موجود تھا مگر جب سے وہ رستم کے قریب تھی، اسے موت کے معنی بدلے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

رستم نے بڑی نرمی سے اپنی انگلیاں شانی کے سر کے ریشمی بالوں میں داخل کر دیں۔ شانی نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ ''رستم! یقین نہیں آ رہا کہ پچھلے دو دن میں ہم نے اتنی موتیں دیکھیں ہیں..... اور آخر میں شاداب کی موت اور خالو اعجاز پر فالج کا حملہ.....''

رستم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شاداب جس طرح کی زندگی گزار رہا تھا، وہ عام طور سے اسی طرح کے انجام پر ختم ہوتی ہے۔ اپنی کوٹھی پر اس نے عیاشی کا اڈا بنا رکھا تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہاں اس نے ماڈل لڑکیاں جمع کی ہوئی تھیں۔ ان سے کسی شیمپو کے لیے اشتہاری فلم وغیرہ بنوا رہا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ یہ سب عیش کرنے کا ڈھکوسلا تھا۔ یہ لڑکی جو اس کے ساتھ ہی بے ہوش ہو کر لاہور پہنچی ہے، یہ ان ماڈل لڑکیوں میں شامل تھی۔ یہ بہت شرما رہی تھی۔ باقی لڑکیاں شاداب کو مشورہ دے رہی تھیں کہ وہ اس کی شرم اُتارنے کے لیے اسے کہیں گھمانے پھرانے کے لیے لے جائے..... گھمانے پھرانے کا ایڈیٹ یہ ہوا ہے جو آج صبح ہم نے دیکھا ہے.....''

شانی نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے رستم..... اس لڑکی اور شاداب کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں سپ گندل کا بھی دخل ہے۔ شاداب کا چہرہ اور لڑکی کا چہرہ دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ نار پور کی حویلی میں، میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہوا ہے۔ مہر جی اور اکبرا کے چہرے آج تک میری نظروں میں گھومتے ہیں۔ یہ سپ گندل انسان کو حیوان بناتی ہے اور صورتوں کو بگاڑ کر رکھ دیتی ہے.....''

شانی کی آنکھوں میں وہ بیتا ہوا منظر گھوم گیا جب نار پور کی حویلی میں مہر کا ملازم خاص اکبرا سپ گندل کے نشے میں چُور شانی پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ قیامت کے لمحے مر کر بھی شانی کے حافظے پر نقش رہنا تھے۔

''لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' شانی نے کہا۔ ''شاداب نے تو سپ گندل استعمال کی ہو گی..... مگر اس لڑکی نے کیوں کی؟''

''ہو سکتا ہے، شاداب نے اسے زبردستی کرا دی ہو۔ ایسے لوگ ہر حد تک چلے جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہی ہو گا، لڑکی کے چہرے اور جسم پر نیل تھے۔ اسے بری طرح نوچا

www.pdfbooksfree.pk

کھسوٹا گیا تھا۔اس پر بختی کی گئی تھی۔''

شانی کی نگاہوں میں بے ہوش لڑکی کا سراپا گھوم گیا اور وہ کانپ گئی۔ واقعی اس کا جسم انسانیت سوز سلوک کا گواہ تھا۔ وہ بڑی کراہت سے سوچنے لگی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مرد اور عورت کا انتہائی خوبصورت اور دل نواز تعلق ایسا رخ کیوں اختیار کرتا ہے؟ وہ رخ جس میں خوشی کے بجائے تکلیف، محبت کے بجائے نفرت اور بالآخر سرشاری کے بجائے ندامت ہوتی ہے.....اسے چوہدری فاخر یاد آیا۔ قاسم برلاس یاد آیا اور چوہدری بشیر یاد آیا۔ وہ بے ساختہ رستم کے بازو سے کچھ اور بھی چمٹ گئی۔ وہ بھی مرد تھے اور رستم بھی ایک مرد تھا.....مگر کتنا فرق تھا رستم میں اور ان میں! وہی فرق جو خوشبو اور بدبو میں ہوتا ہے، جوز ہر اور امرت میں ہوتا ہے۔

اس نے رستم کے سینے سے سر ٹکائے ٹکائے اپنی آنکھیں بند کیں اور عجیب لہجے میں بولی۔''رستم! زندگی پر سے میرا ایمان اٹھ چکا تھا۔ مجھے ہر مرد کے چہرے میں فاخر کا چہرہ نظر آتا تھا۔ آنکھوں سے شعلے برسانے والا، جانور کی طرح عورت پر جھپٹنے والا.....اسے روندنے والا اور اپنے گندے بوجھ سے اس کا دم روکنے والا..... میں مرد کے سائے سے نفرت کرنے لگی تھی۔ مگر پھر مجھے آپ ملے..... مجھے پتا چلا کہ تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ ایسے مہربان ہاتھ بھی ہوتے ہیں جو جسم کو چھو لیں تو مُردہ تن زندہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی پیار بھری نظریں بھی ہوتی ہیں جن کو محسوس کر کے، اپنے عورت ہونے پر فخر ہونے لگتا ہے۔ آپ میرے مسیحا ہیں رستم! مجھے اعتراف کرنے دیں کہ آپ نے مجھے پھر سے جینا سکھایا ہے۔''

''اور آپ نے میرے لیے جو کچھ کیا ہے، اس کا آپ کو پتا نہیں۔''

''مجھے سب پتا ہے رستم! پلیز، آج آپ صرف میری بات سنیں۔'' وہ آنکھیں بند کیے کیے اسی دل گداز لہجے میں بولی۔''آج آپ وعدہ کریں کہ اب کبھی مجھ سے جدا نہیں ہوں گے۔ ایک گھڑی کے لیے نہیں، ایک پل کے لیے نہیں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں..... پلیز رستم.....وعدہ کریں۔''

وہ رستم سے پیوست ہو گئی۔ اس کا رخسار رستم کے سینے میں دھنس رہا تھا۔

نیچے کسی سڑک سے کوئی ایمبولینس یا پولیس موبائل سائرن بجاتی ہوئی گزر گئی۔ رستم نے شانی کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔''تو آپ بھی مجھ سے ایک وعدہ کریں۔''

''بولیں۔''

''آپ نے خود کہا تھا کہ زندگی کیسی بھی ہو، زندگی ہوتی ہے۔ آپ وعدہ کریں کہ اگر آپ کو زندہ رہنے کا موقع ملا تو آپ زندگی کو ٹھکرائیں گی نہیں۔''

''یہ وعدہ تو آپ کو بھی کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے، میں بھی وعدہ کرتا ہوں لیکن شرط تو یہی ہے نا کہ.....اگر زندہ رہنے کا موقع ملا تو.....اور یہ شرط بہت کڑی ہے میرے لیے۔''

رستم کے موبائل فون کی بیل ہوئی۔ وہ بہت دیر تک ہیلو ہیلو کرتا رہا مگر کوئی جواب موصول نہیں تھا۔ اس سے پہلے وہ خود بھی جہانگیر سے رابطے کی بہت کوشش کرتا رہا تھا مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ شانی جانتی تھی، وہ ناصر اور جہانگیر کے لیے بہت پریشان ہے اور اس سے بھی زیادہ آپوزابہ کے لیے۔ کیونکہ وہ ایک عورت تھی اور اس کے ساتھ ایک کم عمر بچہ تھا۔

دیر سے کہہ کر رستم نے نیچے بازار سے مرہم پٹی کا سامان منگوایا۔ رستم کے بہت منع کرنے کے باوجود شانی نے اپنے ہاتھوں سے اس کی ٹانگ کی بینڈ یج کی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی اپنی زخمی انگلیاں بھی تکلیف سے اینٹھتی رہیں مگر اس تکلیف میں ایسی لذت تھی جسے وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کا سارا جسم ایسی ہی تکلیف سے بھر جائے۔ وہ رستم کے زخموں پر مرہم رکھتے رکھتے اپنی جان سے چلی جائے۔ مرہم پٹی کے بعد اس نے رستم کا سوجا ہوا پاؤں اپنی گود میں رکھا اور اسے ہولے ہولے دبانے لگی۔ اس کی نرم گداز ہتھیلیاں جیسے رستم کے تلوے کو چوم رہی تھیں۔ رستم نے اسے روکنا چاہا مگر وہ اس کی با ، کاٹ کر بولی۔''پلیز رستم! مجھے نہ روکیں۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ رستم کے ہونٹ سل گئے۔ رات تیسرے پہر رستم تو سو گیا لیکن شانی جاگتی رہی۔ ایک پہرے دار کی طرح وہ رستم کے اردگرد موجود رہی۔ پھر اس نے مصلی بچھایا اور خدا کے حضور سر بہ سجود ہو گئی۔ وہ ان پیاروں کے لیے دعا مانگتی رہی جو پچھلے چند دنوں میں ان سے جدا ہو گئے تھے۔ ڈولا، اجمل، دراج.....سب کے نام اس کی زبان پر آئے اور دعا بن گئے۔ پھر وہ ان ساتھیوں کے لیے خیر مانگنے لگی جو زندہ تھے مگر ان دونوں ہی کی طرح موت کے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے اور تو اور شانی کی اس نیم شب کی دعا میں خالو اعجاز بھی شامل ہو گیا۔ خالو اعجاز نے جو کچھ کیا تھا، وہ ایک زہریلے تیر کی طرح شانی کے سینے میں پیوست تھا۔ مگر وہ تو تیر مارنے والے کا بھی برا نہیں چاہ سکتی تھی۔ یہ اس کے بس میں ہی نہیں تھا۔

☆=======☆=======☆

www.pdfbooksfree.pk

اگلے روز انہوں نے کمرے میں ہی ناشتا تھا۔ شانی کی خواہش تھی کہ وہ اور رستم شدید ضرورت کے وقت ہی کمرے سے باہر نکلیں۔ دوپہر کا کھانا بھی کمرے میں ہی کھایا گیا۔ دوپہر کے وقت رستم نے ویٹر سے اخبار منگوایا۔ یہ لاہور ایڈیشن نہیں تھا اور اس میں رستم اور شانی کی دلچسپی کی کوئی خبر موجود تھی۔ بس، اندر کے صفحوں میں ایک چھوٹی سی اطلاع موجود تھی۔ ''زہریلی طاقت بخش دوا کھانے سے نوجوان صنعت کار ہلاک۔ اس کی ساتھی ہسپتال میں داخل۔''

اس اطلاع سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاداب کی ساتھی ماڈل گرل بچ گئی ہے۔ خبر میں سپ گندل کے حوالے سے کسی قسم کی تفصیل موجود نہیں تھی۔

شانی اور رستم کی اگلی شب بھی شدید غم اور کرب کے عالم میں گزری۔ رستم کی ٹانگ کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ گھٹنے سے نیچے پوری ٹانگ میں ورم آ گیا تھا۔ شانی مسلسل رستم کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ تیسرے روز صبح نو بجے کے لگ بھگ انہیں پہلی اچھی خبر ملی۔

رستم کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسو کی اور بری طرح چونک گیا۔ یہ ناصر کی آواز تھی۔ ''ہیلو ناصر! کہاں ہو تم؟'' رستم ٹانگ کی پرواہ کیے بغیر بستر سے کھڑا ہو گیا۔

''آپ کہاں ہیں بھائی؟''

''میں بالکل خیریت سے ہوں۔ تم اپنا بتاؤ۔ آپو زاہدہ اور زری کہاں ہیں؟''

''وہ سب خیریت سے ہیں۔'' ناصر کی آواز لرز رہی تھی۔

''تم لوگ لاہور میں ہو؟''

''نہیں بھائی! لاہور سے بہت دور ہیں۔ آپ سمجھیں کہ رحمت کے دو فرشتے ہمیں مل گئے ہیں۔ یہ ہمیں لاہور سے اٹھا کر کرم ایجنسی کے آزاد علاقے میں لے آئے ہیں..... افغان

بارڈر کے بالکل پاس! لگتا ہے کہ اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟''

''سو فیصد بھائی! میں فون پر آپ کو اس جگہ کا نام بتانا نہیں چاہتا۔ بس آپ سمجھیں کہ وہاں سے افغان بارڈر صاف نظر آتا ہے۔ تھوڑی سی کوشش کے ساتھ ہم بارڈر پار کر سکتے ہیں۔'' رستم نے اس حوالے سے ناصر کو تھوڑا سا مزید کریدا تو ناصر نے خرلاچی کے نواح میں کسی خشک نالے اور تین پہاڑیوں کا ذکر کیا۔ ان دونوں کی گفتگو سے شانی کو اندازہ ہوا کہ وہ اور ناصر پہلے بھی اس سرحدی علاقے میں جا چکے ہیں۔

''اب تم کس جگہ سے بات کر رہے ہو؟''

''میں اٹھارہ بیس میل پیچھے پارہ چنار کے قصبے میں آیا ہوا ہوں۔ صرف آپ کو فون کرنے کے لیے..... پچھلے دو گھنٹے سے کوشش کر رہا ہوں۔ بڑی مشکل سے رابطہ ہوا ہے۔''

''تم نے بتایا نہیں۔ تمہیں یہاں لانے والے لوگ کون ہیں؟''

''فون پر ان کے بارے میں بتانا بھی مناسب نہیں۔''

''کوئی اشارہ دو۔''

ناصر چند لمحے خاموش رہا پھر اس کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ''بھائی! ان رحمت کے فرشتوں کو بھیجنے والا وہی ہے جس سے اقبال ٹاؤن میں آپ کا جھگڑا ہوا تھا۔ آپ کا دل دکھا تھا اور اس کا بھی۔ شاید آپ نے دل ہی دل میں اسے بے وفا بھی جانا ہو۔ اس کی دوستی پر شک بھی کیا ہو۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں؟''

رستم کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اپنے روٹھے یار حاجی حیات کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما۔ دل میں ایک لہر سی اٹھی۔ کل رات ہی وہ حاجی کو یاد کرتا رہا تھا اور سوچتا رہا تھا، کیا وہ اپنا راستہ ہمیشہ کے لیے جدا کر چکا ہے؟ کیا ان مشکل ترین گھڑیوں میں بھی وہ مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھے گا؟ آج اس کا جواب مل گیا تھا اور اتنے اچھے طریقے سے ملا تھا کہ رستم خوشگوار حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ یہ بہت اہم اور بے حد تسلی بخش خبر تھی۔ اس کے ساتھی بخیریت تھے۔ رستم نے یکا یک خود کو ہوا کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ اسے یقین تھا کہ ناصر نے خیریت کی جو اطلاع دی ہے، وہ بالکل درست ہے۔

''آپ چپ کیوں ہو گئے؟'' فون پر ناصر کی آواز ابھری۔

''یہ سب کیسے ہوا؟''

''میں آپ کو فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا۔ یوں سمجھ لیں کہ قدرت کو ہماری سلامتی منظور

www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ ہم لاہور سے نکلنے کے بعد سوز وکی لوڈر پر گوجرانوالہ کی طرف جا رہے تھے کہ فون پر ان لوگوں سے رابطہ کیا۔ اس کے بعد سب کچھ ان لوگوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنی جان پر کھیل کر انہوں نے ہمیں یہاں پہنچایا ہے۔ کوہاٹ روڈ پر ایک ناکے پر گولی بھی چلی جس میں ہمارا ایک مددگار زخمی ہوا۔ آپ ملیں گے تو تفصیل بتاؤں گا۔''

''اب کیا ارادے ہیں؟''

''ہمارے مددگار آپ سے رابطہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو بھی حفاظت سے یہاں پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ اس وقت کہاں ہیں؟''

رستم کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ ابھری۔ ''جب تم فون پر اپنے ٹھکانے کا نہیں بتا سکتے تو میں کیسے بتاؤں؟''

''آپ بھی کوئی اشارہ دے دیں۔''

''میرے سارے اشارے تو اسی بندے کی طرف جاتے ہیں جس سے میں نے حساب کتاب کرنا ہے۔'' رستم کا مطلب ڈپٹی ریاض سے تھا۔ اس کے لہجے میں عجیب وحشت تھی۔

دوسری طرف ناصر خاموش ہو گیا۔ وہ رستم کے دل کا بھید ی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ رستم کسی صورت حاجی حیات اور اس کے ساتھیوں کو اپنا ٹھکانا نہیں بتائے گا۔ حاجی حیات سے رابطہ ہو جاتا تو پھر وہی قضیہ چھڑ جاتا تھا۔ حاجی نے اس بات پر زور دیا تھا کہ رستم وقتی طور پر زیر پوش ہو جائے۔ ڈپٹی سے بدلے کا خیال دل سے نکال دے اور یہ رستم کو کسی طور قبول نہیں تھا۔

ریسیور سے ناصر کی بوجھل آواز ابھری۔ ''آپ وعدہ خلافی کر رہے ہیں بھائی۔ آپ نے کہا تھا، یہ مشترکہ لڑائی ہے۔ آپ اکیلے نہیں لڑیں گے۔''

''لڑائی تو ایک ہی ہے یار..... سمجھو کہ مورچے علیحدہ علیحدہ ہیں۔ تم پر میرے ساتھیوں، میری بہن اور بھانجے کی ذمے داری ہے۔ تم اپنے مورچے پر ڈٹے رہو۔ میں بھی اگر سرخرو ہو گیا تو تم لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

ناصر خاموش تھا۔ شاید اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے مختصر الفاظ میں رستم کو بتایا کہ آپو زاہدہ اور چھوٹا سرمد ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ ان دونوں کو پہلوان نے گوجر خان کے قریب بھائی اکرام کے سپرد کر دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ بھائی اکرام اور پہلوان کے درمیان رابطہ تھا اور بھائی اکرام پہلے سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ خبر رستم کے لیے اطمینان بخش تھی۔ کچھ دیر اس بارے میں بات ہوئی پھر رستم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

''اب تمہارے مددگار کہاں ہیں؟''

''آس پاس ہی ہیں۔'' ناصر نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ان میں سے ایک واپس چلا گیا ہے۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ رنگ والی میں اس کا ایک قریبی ساتھی موجود ہے اور حویلی میں آتا جاتا ہے۔ وہ کوشش کرے تو منّے کو بھی حویلی سے نکال کر یہاں لایا جا سکتا ہے۔'' منّے کی بات کرتے کرتے ناصر کو جیسے ایک دم شانی کا خیال آیا۔ وہ بولا۔ ''بھابی کہاں ہیں؟''

''وہ میرے ساتھ ہی ہیں۔ سو فیصد خیریت سے ہیں۔''

''بات کر سکتا ہوں؟''

رستم نے فون شانی کی طرف بڑھایا۔ شانی نے ''ہیلو'' ہی کہا تھا کہ دروازے پر اچانک دستک ہوئی۔ رستم نے فون شانی سے واپس لے لیا اور بولا۔ ''اچھا برادر! کوئی آیا ہے۔ موقع ملا تو دوبارہ بات کریں گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔

''کون؟'' رستم نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

''میں جی، ویٹر گلزار!'' مدھم آواز ابھری۔

رستم نے چند لمحے سوچا پھر پہلو ٹول کر پسٹل کی موجودگی کا یقین کیا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے ویٹر گلزار بتیسی نکالے کھڑا تھا۔ اس کے عقب میں ایک اور سانولا سا شخص تھا۔ ویٹر گلزار بولا۔ ''یہ ڈسپنسر ماجد ہے جی۔ میرا پرانا دوست ہے۔ سامنے بازار میں اس کی ڈسپنسری ہے۔ آپ کو چوٹ شوٹ لگی ہے نا۔ میں نے کہا شاید آپ کو ضرورت ہو۔''

رستم نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اگر ضرورت ہوتی تو میں خود کہہ دیتا۔''

''مم..... معافی چاہتا ہوں جی..... لیکن مجھے آپ کی فکر تھی۔''

رستم کو لگا شاید اس نے اضافی ٹپ کے لالچ میں ایسا کیا ہے۔ عموماً ہوشیار ویٹر اس طرح کے کام کرتے رہیں۔ ڈسپنسر کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا جس میں مرہم پٹی کا مکمل سامان موجود تھا۔ اب چونکہ وہ آ ہی گیا تھا، رستم نے ان دونوں کو اندر بلا لیا۔ عین ممکن تھا کہ ڈسپنسر بہتر طور پر اس کی پنڈلی کی مرہم پٹی کر سکتا۔ ڈسپنسر مقامی طرز کے لباس میں تھا۔ شانی ساتھ والے کمرے میں تھی۔ مگر رستم جانتا تھا کہ وہ اس کمرے میں ہونے والی ساری گفتگو سن رہی ہے۔

رستم نے ڈسپنسر کو اپنی متاثرہ پنڈلی دکھائی۔ ''یہاں کیا ہوا ہے جناب؟'' اس نے رستم کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بس چوٹ لگ گئی ہے۔ تم زیادہ سوال جواب نہ کرو۔ پٹی کھول کر زخم دیکھو اور کچھ کر

www.pdfbooksfree.pk

سکتے ہو تو کرو۔''

ڈسپنسر رستم کی پٹی کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ یکا یک رستم اس کے متعلق شک میں مبتلا ہو گیا۔ یوں لگا کہ ڈسپنسر ہونے کے باوجود اسے پٹی کھولنی نہیں آتی۔ وہ پٹی کو ساتھ ساتھ رول کرنے کے بجائے بکھیرتا جا رہا تھا۔ رستم نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ یکا یک اسے خطرے کا شدید احساس ہوا۔ اسے ڈسپنسر کا ایک پہلو کافی بھاری محسوس ہوا۔ شاید گرتے کے نیچے شلوکے میں کوئی ہتھیار تھا۔

رستم کے چونکنے کو غالباً ڈسپنسر نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''پٹی بالکل چمڑی (چمکی) ہوئی ہے۔ میں گرم پانی لے کر آتا ہوں جناب۔''

وہ تیزی سے واپس مڑا لیکن وہ رستم سے زیادہ تیزی نہیں دکھا سکتا تھا۔ رستم کے دل نے گواہی دی کہ یہ ڈسپنسر نہیں، سادہ کپڑوں میں پولیس والا ہے اور اگر ایک سیکنڈ کی تاخیر ہوئی تو وہ کمرے سے باہر ہو گا۔ رستم نے لپک کر اس کی گردن پکڑ لی۔ اس شخص کا ہاتھ برق رفتاری سے اپنے پہلو کی طرف بڑھا۔ شاید وہ شلوکے میں اپنا آتشیں ہتھیار نکالنا چاہتا تھا۔ اب شبے کی گنجائش مطلق نہیں تھی۔ رستم نے بڑی بے رحمی سے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ دھم کی زوردار آواز کے ساتھ وہ لڑکھڑا گیا اور گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے ساتھ ہی رستم کی ٹانگ کی طوفانی ضرب ویٹر گلزار کے سینے پر لگی۔ وہ اچھل کر باتھ روم کے دروازے سے لگا اور دروازہ کھولتا ہوا اندر جا گرا۔ اس موقع پر شانی نے بھی کردار ادا کیا وہ تیزی سے سامنے آئی اور اس نے باتھ روم کے دروازے کو باہر سے کنڈی چڑھا دی۔ مبینہ ڈسپنسر کو رستم کی دوسری ضرب اپنی گردن پر سہنی پڑی۔ یہ بھاری پسٹل کی ضرب تھی۔ یہ ضرب اس شخص کے لیے کافی ثابت ہوئی اور وہ پٹ سے اوندھے منہ قالین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ رستم نے اس کے شلوکے سے ریوالور کھینچ لیا۔

اندر ویٹر دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ''بچاؤ بچاؤ!'' اس نے دو بار زور سے کہا۔ مگر اس کی آواز باتھ روم کے مختصر خلا میں ہی گونج کر رہ گئی۔ ''اس کا دھیان رکھیں شانی۔'' رستم نے بے سدھ ڈسپنسر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور باتھ روم کا دروازہ کھول دیا۔ بدحواس ویٹر دروازہ کھلتے ہی باہر کو بھاگا۔ وہ دس گنا تیزی بھی دکھاتا تو شاید رستم سے نہ بچ سکتا۔ رستم نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ وہ ڈکراتا ہوا دوبارہ باتھ روم میں گر گیا۔ اس کا سر ڈیوسہ کے بالکل قریب تھا۔ رستم نے سائیلنسر لگے پسٹل کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی۔ ''آواز نکالی تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔'' وہ ہیجانی انداز میں اپنے سر کو نفی میں ہلانے لگا۔ اس کا منہ بھاڑ کی

طرح کھل گیا تھا۔ طوطے جیسی ناک زرد تھی جیسے اس پر رنگ کر دیا گیا ہو۔ رستم نے اس کے سینے پر پاؤں رکھا تو وہ چکنے فرش پر تھوڑا سا اوپر کو کھسک گیا اور اس کا سر باقاعدہ ازیہ (پاٹ) کے اندر چلا گیا۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ جوڑے۔ ''خدا کا واسطہ! مجھے گولی نہ مارنا، میرا کوئی قصور نہیں۔''

''تو پھر میرا قصور ہے۔ یہ تیرا باپ، پولیس والا تیرے ساتھ کیوں آیا ہے؟''

''نہیں، یہ تو ڈسپنسر ہے.....''

ابھی فقرہ ویٹر کے منہ میں ہی تھا کہ رستم نے بے دریغ اس کے منہ پر پسٹل کی ضرب لگائی۔ اس کا دانت ٹوٹنے کی آواز آئی۔ منہ پھٹ گیا اور خون ''پاٹ'' میں بہہ نکلا۔

''پلیز رستم!'' شانی کی کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔ وہ رستم کے عقب میں تھی۔ شانی کی نگاہ کو باتھ روم کے خون آلود منظر سے بچانے کے لیے رستم نے باتھ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ ویٹر اب باقاعدہ رو رہا تھا۔ اس کا سر بہ دستور پاٹ کے اندر تھا۔

رستم نے پسٹل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور پھنکارا۔ ''دیکھ..... مجھے ایک ایک لفظ سچ بتا دے ورنہ ابھی تیرا مغز اس پاٹ میں بہتا ہوا نظر آئے گا۔''

ویٹر خرانٹ اور سخت جان تھا مگر رستم کے لب و لہجے نے اسے چند سیکنڈ میں توڑ دیا، وہ گھگیایا۔ ''مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آپ کو بال بچے کا واسطہ!''

''یہ پولیس والا ہے نا؟'' رستم نے پوچھا۔ ویٹر نے تیزی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اور کتنے بندے ہیں اس کے ساتھ؟''

''اکیلا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں اور کوئی نہیں۔''

رستم نے ایک اور بے رحم ٹھوکر اس کے منہ پر ماری اور پاؤں عین اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ''اس پیو کو کیوں لایا ہے یہاں؟''

جواب میں ویٹر نے ہکلاتے گھگیاتے اور خون تھوکتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اخبار میں رستم کی پرانی تصویر دیکھ کر اور رستم کے زخم کے بارے میں جان کر اسے کچھ شک ہوا تھا۔ اسے لگا کہ شاید یہ چوہدری جلال ہی وہ نامی گرامی ڈکیت ہے جسے پنجاب پولیس ہر طرف ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اتنا مشہور و معروف بندہ اس چھوٹے سے شہر کے اس چھوٹے سے ہوٹل کے اس کمرے میں ہو اور وہ خود اسے سروس مہیا کر رہا ہو۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کا یہ تذبذب رستم کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا۔ ویٹر گلزار نے تھانے میں اطلاع دینے یا منیجر کو بتانے کے بجائے اپنے طور پر اپنا

www.pdfbooksfree.pk

شک رفع کرنا چاہا۔ وہ اپنے اس دوست اے ایس آئی کو سب کچھ بتا کر یہاں لے آیا تا کہ وہ رستم سے مل کر کوئی رائے قائم کر سکے۔

ویٹر گلزار کی بات سے رستم کو یقین ہو گیا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ مگر اب اس ہوٹل سے جلد از جلد نکلنا رستم اور شانی کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ رستم نے گلزار کو گریبان سے کھینچ کر پاٹ میں سے نکالا اور فلش کر کے اس کا خون اندر سے صاف کر دیا۔

''تم نے چوں چراں بھی کی نا تو آج شام تک تمہاری نماز جنازہ ادا ہو جائے گی۔'' رستم نے سفاک لہجے میں کہا۔

اس نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا اور باتھ روم کے ایک کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ رستم نے باتھ روم کا دروازہ کھولا اور شانی سے کہا۔ ''ایک کام کریں۔ اٹیچی میں نائیلون کی رسی پڑی ہے، وہ مجھے دیں۔''

شانی تیزی سے اٹیچی کی طرف بڑھ گیا۔ رستم کا ارادہ تھا کہ گلزار کی مشکیں کس کے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر باتھ روم میں بند کر دے..... مگر جو کچھ ہوا اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ رستم بھی چکرا گیا۔ غالباً ویٹر گلزار کا حد سے بڑھا ہوا خوف ہی اس کے لیے مہلک ثابت ہوا۔ رستم کی توجہ دو سیکنڈ کے لیے شانی کے ہاتھ میں پکڑی رسی پر مبذول ہوئی۔ گلزار کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح باتھ روم سے برآمد ہوا اور کمرے کے بیرونی دروازے کی طرف بھاگا۔

کچھ کہنے یا کرنے کی مہلت نہیں تھی۔ سائیلنسر لگا پسٹل رستم کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ٹرائیگر دبایا۔ گولی گلزار کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی اور کھوپڑی میں گھس گئی۔ وہ پہلے دروازے سے ٹکرایا پھر پہلو کے بل قالین پر گرا۔ اس کا سر بے ہوش پڑے اے ایس آئی کے پاؤں میں آیا تھا۔ شانی کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور اس نے ایک ہاتھ سے اپنا منہ مضبوطی سے دبا لیا تھا۔ گلزار کی گردن سے ابلتے خون نے چند سیکنڈ میں قالین کو داغ دار کر دیا.....

''یہ کیا ہوا رستم؟'' شانی ہکلائی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ یہ دستک اَن گنت اندیشوں کو ابھار گئی۔ سائیلنسر لگے پسٹل کی آواز تو ایسی نہیں تھی کہ باہر سنی جا سکتی۔ عین ممکن تھا کہ گلزار کے دروازے سے ٹکرانے کی آواز نے کسی کو متوجہ کیا ہو یا پھر یہ گلزار اور اے ایس آئی کا کوئی ہم راز ساتھی ہی ہو۔ رستم نے گلزار کا بے جان جسم گھسیٹ کر دروازے کے سامنے سے ہٹایا۔ شانی کو ساتھ والے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور کلاشنکوف بیڈ کے نیچے سے نکال کر بیڈ پر رکھ دی اور اوپر چادر ڈال دی۔ دستک ایک بار پھر ہوئی۔

www.pdfbooksfree.pk

''کون؟'' رستم نے پوچھا۔

''آپ خیریت سے تو ہیں جی؟'' باہر سے ایک شائستہ آواز آئی۔

رستم نے دروازہ تھوڑا سا کھولا۔ سامنے ایک دبلا پتلا لڑکا کھڑا تھا۔ عمر اٹھارہ انیس سال رہی ہو گی۔ ''ایکسکیوزمی بھائی جان! کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ ابھی بہت شور ہوا ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، کچھ نہیں۔ میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

''کین آئی ہیلپ یو پلیز!'' لڑکے نے بڑے بااخلاق انداز میں پوچھا۔

''نہیں، شکریہ..... میں ٹھیک ہوں۔'' رستم نے سپاٹ لہجے میں کہا اور لڑکے کی کھوجتی نظروں سے بچنے کے لیے دروازہ بند کر دیا۔

اس زندگی سے بھرپور ہنستے مسکراتے لڑکے کو کیا معلوم تھا کہ وہ کتنے مہیب خطرے کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کا ہلکا سا شک اور اس کی تھوڑی سی دلیری اسے بے وقت موت کے جبڑوں میں پہنچا سکتی تھی۔ پتا نہیں کیوں اس لڑکے کو دیکھ کر رستم کو اپنا ماضی یاد آ گیا تھا۔ کبھی وہ بھی تو اسی طرح تو اندگی اور خوشی سے بھرپور ہوا کرتا تھا۔ اس کی باتوں سے شہد ٹپکتا تھا اور اس کی آنکھوں سے توانا روشنی پھوٹتی تھی۔ وہ بھی اسی طرح ہر وقت کسی کا دکھ بانٹنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ مگر پھر وقت نے اس سے اس کا سارا اخلاق، ساری مسکراہٹ اور ساری خوشی چھین لی تھی۔ اس کے بدلے، اس کے ہاتھ میں لہو ٹپکاتا ہوا خنجر تھما یا تھا اور اس کے پاؤں سے بگولے باندھ دیئے تھے۔

اگلے پانچ منٹ کے اندر اندر رستم اور شانی اس کمرے کو چھوڑنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ رستم نے کلاشنکوف ایک بار پھر اٹیچی کیس میں رکھ دی تھی۔ بے ہوش اے ایس آئی اور مُردہ ہیڈ ویٹر کی لاش باتھ روم میں پہنچا دی گئی تھی۔ ہیڈ ویٹر گلزار کی موت کا شانی کے ساتھ ساتھ رستم کو بھی افسوس ہوا تھا۔ مگر جو کچھ ہوا، اس میں زیادہ ضل گلزار کی غلطی کا تھا اور یہ اس کی پہلی غلطی نہیں تھی۔ پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ رستم کو شناخت کرنے کے لیے فقط ایک ڈھیلے ڈھالے اے ایس آئی کو لے کر اس کمرے میں گھس آیا تھا۔

رستم اور شانی نیچے لابی میں پہنچے۔ ریسپشن پر موجود شخص رستم کے ہاتھ میں اٹیچی کیس دیکھ کر چونکا۔ ''آپ جا رہے ہیں چوہدری صاحب؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''نہیں..... ابھی کسی کام سے نکلے ہیں۔ شام تک آ جائیں گے۔'' اس کے ساتھ ہی رستم نے چند بڑے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔ ''یہ رکھ لو۔ رسید واپسی پر لے لوں گا۔''

''او کے جناب!'' اسسٹنٹ منیجر مطمئن ہو گیا۔ رستم اور شانی دروازے کی طرف بڑھے تو وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔ ''کمرے کی صفائی کروادوں جی؟''

''نہیں، ضرورت نہیں۔'' رستم نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ بلڈنگ کی سائیڈ پر آئے۔ یہاں پارکنگ موجود تھی۔ ایک قطار میں دس بارہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اب دن کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یہ ستمبر کی شروعات تھی۔ فضا میں گہرا حبس موجود تھا۔ رستم نے متلاشی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ایک اچھی حالت کی سیاہ مرسیڈیز گاڑی میں اسے ایک شخص ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ شکل وصورت سے ڈرائیور لگتا تھا۔ گاڑی پر لاہور کا نمبر تھا۔ رستم آگے بڑھا۔ اس نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور اٹیچی کیس پچھلی نشست پر رکھ دیا۔ اس کے بعد اگلا دروازہ کھول کر وہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نما شخص حیران نظروں سے رستم کو دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں شانی بھی پچھلے دروازے سے گاڑی میں چلی آئی۔ رستم نے گول چہرے والے جواں سال ڈرائیور نما شخص کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھ! میری قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول ہے لیکن اس پستول سے تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اگر نقصان پہنچے گا تو تب..... جب تُو میری بات نہیں مانے گا۔''

جواں سال شخص کا چہرہ ایک دم ہلدی ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھولنے اور باہر نکلنے کے لیے اضطراری حرکت کی مگر رستم نے اتنی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑا کہ وہ پتھر ہو کر رہ گیا۔ رستم پھر پھنکارا۔ ''دیکھ! میں ابھی پانچ منٹ پہلے اوپر کمرے میں ایک بندہ قتل کر چکا ہوں..... اب تجھے مارنا بھی میرے لیے مشکل نہیں۔ جان بچانی ہے تو گاڑی اسٹارٹ کر اور پارکنگ سے نکل۔'' رستم کے لب ولہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ اس شخص کا ہاتھ فوراً گاڑی کے اگنیشن کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بولا۔ ''میں غریب بندہ ہوں۔ مجھ پر رحم کرو جی۔''

''تم خود پر رحم کرو گے تو رحم ہی ہو گا۔ بس چپ چاپ چلتے جاؤ۔''

اس نے لرزتے کانپتے گاڑی پارکنگ سے نکالی اور سڑک پر آ گیا۔ رستم نے دیکھا، وہی لڑکا جو تھوڑی دیر پہلے کمرے کے دروازے پر ملا تھا اب ہوٹل کے گیٹ پر کھڑا جوس والے سے انار کا جوس پی رہا تھا۔ اس کا اپنا رنگ بھی قندھاری انار سے ملتا جلتا ہی تھا..... زندگی اور رعنائی سے بھرپور! اس نے خوش دلی سے رستم کو سلام کیا۔ رستم نے اس کے سلام کا جواب دیا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس نے بھی ہاتھ ہلایا۔ رستم کو یوں لگا جیسے یہ خوش باش نوجوان کسی اور دنیا کا باسی ہے اور وہ کسی اور دنیا کا رہنے والا ہے..... یا پھر..... کسی اور

دنیا کی طرف جا رہا ہے۔

ڈرائیور پھر ہکلایا۔ ''سڑ جی! مجھ کو چھوڑ دیں جی۔ یہ گڈی جہاں جی کڑے لے جائیں۔ میں بالکل شور نہیں ڈالوں گا۔''

شانی عقب میں تھی، ڈرائیور کی آواز اور اس کے ڈیل ڈول نے اسے چونکا دیا۔ اسے ایک بھولا بسرا چہرہ یاد آ گیا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟'' شانی نے پوچھا۔

نوجوان ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا اور شانی کے شبے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ اس نیم احمق سے کافی عرصہ پہلے مل چکی تھی۔ جب وہ لاہور میں قاسم برلاس اور قاسم جیسے دوسرے شکاریوں سے جان بچاتی پھر رہی تھی تو رکشا ڈرائیورز کریا کے گھر میں پناہ گزیں ہوئی تھی۔ اس چند روزہ قیام میں اس کا واسطہ لفافہ سیکر جننے اور اس کے اول جلول بیٹے گلابے سے پڑا تھا۔ یہ گلابا ہی تھا۔ گلابے نے بھی شانی کو دیکھ لیا تھا اور اب اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا..... پھر اس کے حماقت مآب چہرے پر حیرت پھیلتی چلی گئی۔ ''تت، تم!'' وہ ہکلایا۔

''سامنے دیکھو..... اُلو کے پٹھے۔'' رستم دہاڑا۔

گلابے نے سامنے دیکھ کر تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا اور پرانے ماڈل کی یہ مرسیڈیز ایک نئی نکور ہنڈا کار کا بوسہ لیتے لیتے رہ گئی۔

''تم ان کو جانتے ہو؟'' رستم نے گلابے سے پوچھا۔

''نن..... نہیں..... جی ہاں۔''

''جانتے ہو یا نہیں؟'' رستم نے پھنکار کر پوچھا۔

گلابے کی آواز جیسے اس کے گلے میں ہی پھنس گئی تھی۔ اس کے بھدے ہونٹ ہل رہے تھے مگر وہ بول نہیں پا رہا تھا۔

شانی نے کہا۔ ''ہاں رستم! میں نے آپ سے ایک مرتبہ لاہور کے رکشا ڈرائیورز کریا کا ذکر کیا تھا نا..... یہ اسی کا بیٹا ہے گلابا۔ میں کچھ دن ان لوگوں کے ہاں رہی تھی۔''

''سلاماں لیکم جی..... سلاماں لیکم۔'' گلابے نے پیچھے مڑ کر شانی کی طرف دیکھا اور اپنا کانپتا ہاتھ ماتھے پر لے جا کر سلام کیا۔

''اوئے آگے دیکھ باندر کے پتر!'' رستم نے اس دفعہ باقاعدہ گلابے کی گردن پر جھانپڑ مارا۔

گلابے نے ایک بار پھر تیزی سے اسٹیئرنگ گھمایا اور گاڑی فٹ پاتھ پر چڑھتے چڑھتے بچی۔ نوجوان گلابے کی پیشانی پر پسینہ دھاروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ آنکھوں سے نیچے پہنچتے

www.pdfbooksfree.pk

پہنچتے اس پسینے میں سرے کی کچھ کالک بھی شامل ہوگئی تھی۔ وہ ایک بار پھر گھگیایا۔ ''میں نے آپ کو پہچان لیا ہے شہناز بی بی۔ اب تو یہ گھڑی کی بات ہی نکل آئی ہے۔ آپ جانتی ہیں، میں بالکل بڑا (برا) بندہ نہیں ہوں۔ آپ مجھ کو معافی دے دیں جی۔ مجھ کو جانے دیں۔ یہ گڈی جہاں مرضی لے جائیں۔''

شانی کے ذہن میں وہ سارے منظر گھوم گئے جن کا تعلق رکشا ڈرائیورز کریا کے گھر سے تھا۔ گلابے کی ماں جنتے لفافے بناتی تھی اور اپنے ساتھ شانی کو بھی اس کام پر لگاتی تھی۔ شانی کے حوالے سے جنتے کا رویہ ''مالِ مفت، دلِ بے رحم'' والا تھا۔ وہ شانی کو اپنے اوٹ پٹانگ بیٹے یعنی گلابے کی بیوی بنانے کی اسکیمیں سوچنے لگی تھی اور بیٹا یعنی گلابا بھی کون سا کم تھا۔ وہ اپنی عقل سمجھ کے مطابق شانی کو پھانسنے کی کوششیں کرتا تھا۔ گرم جلیبیوں اور پستے بادام کا لالچ دے کر اسے اوپر چوبارے میں بلاتا تھا..... آج برسوں بعد سرِ راہ پھر گلابے سے ملاقات ہوئی تھی۔ زندگی کی شاہراہ پر چلتے ہوئے ایسے ہی شناسا لوگ ملتے اور اوجھل ہوتے رہتے ہیں۔

گاڑی شہر سے باہر نکل آئی تھی اور اب بنوں کی طرف جانے والی سڑک پر رواں تھی۔

شانی نے کہا۔ ''گلابے! تم تو ریڑھی لگاتے تھے نا..... ڈرائیوری کیسے شروع کر دی؟''

''بس جی..... گاجر، سیب کا مڑبہ بیچتے بیچتے ایک محلے دار کی بیٹی سے میرا ویاہ ہوگیا۔ میرا سسر ایک سیٹھ کی ڈرائیوری کرتا ہے، اس نے مجھے بھی ڈرائیوری دلا دی۔''

''یہ تو لاہور کا نمبر ہے۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' رستم نے پوچھا۔

''میڑا مالک لکڑی..... (لکڑی) کا کام کرتا ہے۔ ہم ٹمل سے لکڑی لینے گئے ہوئے تھے۔ بنوں کے رستے سے واپس آئے ہیں۔ صبح چار بجے یہاں پہنچے ہیں۔ میرا مالک تھک گیا تھا۔ اس کے گردے میں پیر بھی ہے۔ وہ سونے کے لیے ہوٹل میں چلا گیا ہے۔ کہتا تھا سات آٹھ گھنٹے آرام کے بعد پھر آگے چلیں۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا، تب ایک بار پھر فریادی لہجے میں بولا۔ ''مجھے جانے دیں جی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں.....''

''اوئے حرامی! آگے دھیان رکھ۔'' رستم نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔ اس مرتبہ بھی گاڑی لہرا کر رہ گئی۔

''کتنے بچے ہیں تمہارے؟'' شانی نے پوچھا۔

''تین جی۔'' اس نے یوں کہا جیسے جرم کا اعتراف کر رہا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے شانی کے دل میں رحم کا جذبہ ابھارنے کے لیے ایک آدھ بچہ زیادہ بتایا ہو۔

شانی کو اس کی حالت پر ترس آ رہا تھا۔ وہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ کسی بھی وقت کسی حادثے

کا سبب بن سکتا تھا۔ اس سے جتنی جلدی جان چھڑالی جاتی اتنا ہی اچھا تھا۔ اسے یہ ڈر بھی تھا کہ گلابے کی بدحواسی کی وجہ سے کہیں اس کے ساتھ بھی دیر گلزار جیسا واقعہ پیش نہ آ جائے۔

شانی نے گلابے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، تمہارے مالک کو گاڑی غائب ہونے کا پتا کب تک چلے گا؟''

گلابے نے پہلے ہونٹوں کی طرح شانی کا منہ دیکھا پھر بولا۔ ''میرے خیال میں شام پانچ چھ بجے تک تو ان کو سونا ہی سونا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کمرے سے باہر آئیں گے۔''

''اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو کیا کرو گے؟'' شانی نے اچانک پوچھا۔

گلابے کا چہرہ تھوڑا سا گلابی ہوا۔ وہ بے ساختہ بولا۔ ''آپ کو اور آپ کے میاں کو بے شمار دعائیں دوں گا جی۔'' پھر اس نے سوالیہ نظروں سے شانی کو دیکھا جیسے تصدیق چاہتا ہو کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔

''دعاؤں کے علاوہ اور کیا کرو گے؟'' رستم نے خشک لہجے میں کہا۔

''جیسا آپ کہیں گے، بالکل ویسا ہی کروں گا۔ اگر ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہوں تو جو کالے چور کی سزا، وہ میری۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا جیسے اپنی ہی قسم کھا رہا ہو۔

''اگر ہم کہیں کہ ایک دن کے لیے کہیں غائب ہو جاؤ تو.....؟'' رستم نے استفسار کیا۔

''آپ کہیں تو ایک ہفتے کے لیے غیب ہو جاتا ہوں جی۔'' وہ رستم کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ وہ رستم سے سخت خوف زدہ نظر آتا تھا۔

شانی جانتی تھی کہ گلابا اندر سے کتنا کمزور اور ڈرپوک ہے۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ واقعی غائب ہو جائے گا۔ شانی نے رستم کو اشارہ کیا۔ رستم نے گاڑی سڑک سے اتروا کر درختوں کے درمیان رکوا دی۔ یہ کافی محفوظ جگہ تھی۔ سڑک پر بھی ٹریفک خاصا کم تھا۔ شانی اور رستم گاڑی سے باہر نکل آئے۔ گلابے کو گاڑی میں ہی رہنے دیا گیا۔ تاہم رستم نے احتیاطاً گاڑی کی چابی اگنیشن میں سے نکال لی تھی۔ ''کیا کرنا ہے شانی؟'' رستم نے باہر نکل کر پوچھا۔

''میرے خیال میں تو اسے چھوڑ بھی دیں تو یہ ایک دو دن کے لیے کہیں غائب ہو جائے گا..... یہ اندر سے بہت ڈرا ہوا ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہوگیا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے ہوٹل میں ایک بندے کا خون کیا ہے۔''

''لیکن ہمیں یہ رسک لینا نہیں چاہیے۔ بہتر تو یہ ہے کہ اسے بے ہوش کر کے کہیں پھینک دیا جائے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''آپ کا مطلب ہے چوٹ وغیرہ لگا کر؟'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی جلدی سے بولی۔ ''نہیں رستم! یہ بڑا سادہ دل ہے اور اندر سے بہت کمزور بھی۔ ہمیں اسے یہ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔''

''اگر کہیں بھوکا پیاسا پڑا رہا تو..... یا کسی اور مصیبت کا شکار ہو گیا؟''

''اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا شانی..... ویسے بھی یہ تھوڑی سی سختی اس کے لیے اچھی ہو گی۔ مالکوں کو گاڑی چھینے جانے کا یقین آئے گا۔''

شانی کو قائل کرنے کے بعد رستم اور شانی دوبارہ گاڑی میں آئے۔ گلابے کے چہرے پر مسلسل ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ جب رستم نے نائیلون کی رسی نکالنے کے لیے اپنی کیس کھولا اور اس میں گلابے کو سیاہ رنگ کی خوفناک کلاشنکوف نظر آئی تو اس کی باقاعدہ گھگھی بندھ گئی..... اس نے شانی کو فریادی نظروں سے دیکھا۔ شانی نے آنکھوں میں اسے تسلی دی۔ رستم نے صرف تین چار منٹ میں گلابے کی مشکیں کس دیں۔ جب اس نے گلابے کے منہ میں کپڑا ٹھونسنے کے لیے اسے منہ کھولنے کو کہا تو اس نے اتنا زیادہ منہ کھولا کہ اس کا تالو اندر تک نظر آنے لگا۔ رستم نے کپڑا ٹھونس کر اوپر سے ایک اور رومال نما کپڑا باندھ دیا۔ گلابا ہر حکم پر بلا چوں و چرا عمل کر رہا تھا۔ رستم نے اسے ساتھ والی نشست پر منتقل کیا اور خود گاڑی ڈرائیو کر کے درختوں کے اندر ہی اندر کافی آگے لے گیا۔ یہاں ایک جوہڑ کے کنارے خود رَو سرکنڈوں کے درمیان اسے ایک جگہ مناسب نظر آئی۔ اس نے گلابے کو اٹھا کر وہاں ڈال دیا۔ امید نہیں تھی کہ یہاں کوئی جلد ہی گلابے تک پہنچ سکے گا۔ گلابا اس صورت حال پر مطمئن نظر آتا تھا وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں رستم اور شانی کو اپنے بھرپور تعاون اور دوستی کا یقین بھی دلا رہا تھا..... گلابے کے لیے شانی کی ہمدردی دیکھتے ہوئے رستم نے کچھ نوٹ گلابے کی جیب میں ٹھونس دیئے۔

شانی نے گلابے پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور رستم کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی..... رستم نے دوبارہ سڑک پر جانے کے بجائے درختوں کے اندر ہی اندر کچے پکے راستے پر سفر کرنا مناسب سمجھا۔ شدید ترین حبس اور گرمی کے بعد شمال کی طرف سے اچانک بادل گھر آئے تھے۔ یہ بڑے سیاہ بادل تھے۔ ان کے اندر بجلی لی تڑپتی لکیریں تھیں اور وہ جوق در جوق شمالی افق پر اُمڈتے چلے آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دن میں رات کا سماں ہو گیا۔ اردگرد کے درخت، کھیت اور نشیب و فراز سب تاریکی میں ڈوبتے محسوس ہوئے۔ پہلے کچھ دیر ہوا چلی پھر تیز بارش ہونے لگی۔ رستم اور شانی نے گاڑی کی کھڑکیوں کے شیشے چڑھا دیئے اور ونڈ

اسکرین پر وائپر حرکت کرنے لگے۔

زندگی میں واقعات ایسے ہی اچانک اور بے ترتیبی سے رُونما ہوتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے انہیں ایک اجنبی شہر میں اجنبی لوگوں کے درمیان گلابا مل گیا تھا اور اب حبس اور گرمی کے بے کنار صحرا میں تابڑ توڑ بارش سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ ایک نیم پختہ راستے پر جا رہے تھے۔ ان کے اردگرد ویرانہ تھا۔ بس کہیں کہیں گنے یا چارے کا کوئی کھیت دکھائی دے جاتا تھا۔ وہ کہاں جا رہے تھے، انہیں کچھ پتا نہیں تھا۔ کیوں جا رہے تھے، یہ بھی پتا نہیں تھا۔ رستم کے ذہن میں بس یہ موہوم سا خیال تھا کہ وہ شانی کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔

''ہمیں کہاں جانا ہے؟'' شانی نے رستم کے کندھے سے لگے لگے پوچھا۔

''یہاں سے شاید دس پندرہ میل دور لکی نام کا قصبہ ہے۔ وہاں میرا ایک پرانا واقف کار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی حویلی میں دو چار دن کے لیے ٹھکانا مل جائے.....''

''دو چار دن بعد کیا کریں گے؟'' شانی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''دو چار دن میں سوچ لیں گے کہ کیا کرنا ہے۔'' رستم نے بھی کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

گاڑی میں کافی فیول موجود تھا۔ وہ چلتے رہے۔ بارش کی بوچھاڑوں کے درمیان، جھومتے درختوں کے درمیان اور فراٹے بھرتی ہوا کے درمیان! بس کہیں کہیں انہیں کوئی بیل گاڑی نظر آ جاتی تھی..... یا ٹریکٹر جس پر موجود افراد نے اپنے اوپر پولی تھین کی شیٹ وغیرہ تان رکھی ہوتی تھی۔ اس طوفانی بارش میں کہیں کسی پولیس ناکے یا نگرانی وغیرہ کا امکان نہیں تھا۔

دس بارہ میل چلنے کے بعد رستم کو محسوس ہوا کہ یہ کچا پکا راستہ پختہ سڑک تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ وہ الجھن محسوس کرنے لگا۔ ''رستم! کہیں ہم راستہ تو نہیں بھول گئے؟'' شانی نے اس کے کندھے سے لگے لگے پوچھا۔

''شاید.....'' وہ دائیں بائیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''بارش تو تیز ہوتی جا رہی ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... شاید ابھی تھوڑی دیر میں اندھیرا بھی ہو جائے۔'' رستم نے کہا۔

شانی کا سر رستم کے کندھے پر تھا۔ اس کی چمکیلی شال کا نقرئی کنارہ رستم کے گھٹنے پر پھیلا ہوا تھا۔ شانی کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔ ''رستم! کتنا اچھا ہوا گر ہم واقعی راستہ بھول

www.pdfbooksfree.pk

جائیں۔ کہیں بہت دور جا نکلیں..... کسی انجانی جگہ! جہاں سے آگے کوئی راستہ نکلتا ہی نہ ہو۔ جہاں ہمیشہ ایسی ہی بارش ہوتی رہتی ہو، ایسے ہی دن میں اندھیرا چھایا رہتا ہو۔''

''آپ بولتی ہیں تو لگتا ہے شاعری کر رہی ہیں۔'' رستم بھی گمشدہ آواز میں بولا۔

ان کے سامنے بجلی زور سے چمکی اور کڑاکے کے ساتھ جیسے شیشم اور گوندی کے درختوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ شانی کچھ اور بھی رستم کے بازو سے پیوست ہو گئی۔ رستم نے ایک ہاتھ کو اسٹیئرنگ سے ہٹا کر شانی کے کندھے پر رکھا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ گاڑی پانی کی چادر میں آگے بڑھتی رہی۔ وہ اپنی اپنی جگہ سوچتے رہے کہ ان کے آنے کے بعد سلطان رضا ہوٹل میں کیا حالات ہوئے ہوں گے اور سرکنڈوں میں پڑا گلاباکس حال میں ہوگا۔ کچھ ہی دیر میں شام نے بادلوں کے ساتھ مل کر تاریکی کو گہرا کرنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ اچانک رستم اور شانی کو رکنا پڑا۔ نیم پختہ راستہ ایک نشیبی جگہ سے ہو کر گزرتا تھا اور یہاں بارش کے تیز رفتار پانی نے ندی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ رستم نے گاڑی عین اس پانی کے کنارے روک دی۔ اس میں سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ رستم جانتا تھا کہ بعض اوقات وزنی بسیں اور ٹریکٹر ٹرالیاں بھی ایسے ریلوں میں بہہ جاتی ہیں۔ یہ تو پھر ایک کار تھی جس میں فقط دو افراد سوار تھے۔

کچھ دیر تک پانی کا جائزہ لینے کے بعد رستم نے کہا۔ ''ہمیں پانی کے اُترنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''اور پانی تب تک نہیں اُترے گا جب تک بارش نہ رکے۔''

''ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد بھی ایک دو گھنٹے تک پانی چڑھا رہے۔'' انہوں نے گاڑی موڑی اور آئی گزر گاہ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ یہاں کیچڑ بہت زیادہ تھی۔ گاڑی بار بار لہرا رہی تھی۔ رستم کو محسوس ہوا کہ راستے کے بغیر زیادہ آگے تک جانا ممکن نہیں۔ لمبے سرکنڈوں اور خودرَو درختوں کے درمیان ایک جگہ وہ رک گئے۔ اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ مزید سفر کے حوالے سے بہتر وقت کا انتظار کرنے کے لیے یہ جگہ مناسب تھی۔

رستم نے ہیڈ لائٹس بجھا دیں۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ دونوں کو بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مرسیڈیز کے کشادہ ڈی بورڈ میں کچھ میٹھے اور نمکین بسکٹس کے علاوہ چکن پیٹیز بھی موجود تھے۔ عقبی نشست کے پیچھے بورڈ پر ایک فلاسک بھی رکھا تھا۔ شانی نے دیکھا، اس میں دودھ پتی نما چائے اب بھی گرم ہے۔ انہوں نے چائے کے ساتھ کچھ بسکٹس لیے اور بارش رکنے کا انتظار کرنے لگے۔ بارش تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد قدرے ہلکی تو ہو جاتی تھی مگر

رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ آبی گزر گاہ میں بہتے پانی کا شور انہیں کافی فاصلے سے بھی سنائی دیتا تھا۔

رستم نے کہا۔ ''شانی! آپ پچھلی سیٹ پر چلی جائیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں۔''

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' شانی سیٹ کو اسٹریچ کر کے وہیں نیم دراز ہو گئی۔

رستم نے بھی کچھ دیر بعد سیٹ اسٹریچ کر لی۔ شانی نے محبت سے معمور لہجے میں پوچھا۔

''ٹانگ کا درد اب ٹھیک ہے؟''

''ہاں۔ درد والی گولیوں سے کچھ فرق پڑا ہے۔''

شانی نے رستم کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار کے نیچے رکھ لیا اور عجیب جذب کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں۔

ہاتھ کے راستے محبت کی نہایت توانا اور دل گداز لہریں رستم کے جسم میں سرایت کرنے لگیں۔ رستم نے نیم دراز حالت میں ہی آگے کو کھسک کر شانی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ اس کے سینے میں گم سی ہو گئی۔ رستم نے اس کے گرد اپنی بانہوں کا حصار بنا دیا۔ وہ ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے اور باہر بارش کی بوچھاڑیں گاڑی سے ٹکراتی رہیں۔ رستم نے بڑی نرمی سے شانی کے نم رخساروں اور ہونٹوں کو چوما۔ اسے لگا کہ مہیب طوفانوں میں گھرے ہوئے اس قاتل سمندر میں یہ گاڑی ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے اور یہاں زندگی اپنی حدتوں کے ساتھ موجود ہے۔ اگر کوشش کی جائے تو اس زندگی کو چھوا جا سکتا ہے۔

دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت پڑے رہے اور باہر بادوباراں کی رات گرجتی رہی، آگے کو کھسکتی رہی۔ ان کے درمیان فاصلہ تھا۔ وہ دونوں خاموش تھے مگر ان کی خاموشی بات کر رہی تھی۔ رستم کی نگاہیں اپنی بی بی کے حسین سراپا پر تھیں۔ کچھ دلہن جیسے زرق برق لباس میں تھیں اور دلہن ہی نظر آتی تھی۔ رستم نے دل ہی دل میں کہا۔ ''شانی! کیا اب ہمیں بھی نہیں ملنا..... اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک دوسرے سے جدا ہو جانا ہے، ہمیشہ کے لیے.....''

''آپ نے کچھ کہا؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''نہیں تو۔'' رستم نے جواب دیا۔

شانی نے پھر رستم کا ہاتھ تھام لیا۔ رستم کے اندر اپنی بی بی کے لیے مہیب خلا موجود تھا..... اور یہ صرف جذباتی خلا ہی نہیں تھا، جسمانی خلا بھی تھا۔ اس کو اپنے اندر کا یہ احساس کبھی بھی برا نہیں لگا تھا کہ وہ بی بی کو تمام تر روحانی اور جسمانی شدتوں کے ساتھ چاہتا ہے۔ وہ بہت فخر سے اعتراف کرتا تھا کہ وہ جس طرح بی بی کی روح سے عشق کرتا ہے، اسی طرح بی بی

www.pdfbooksfree.pk

کے جسم سے بھی کرتا ہے۔ بی بی کے رخسار، ان کے ہونٹ، ان کی گردن جس پر کسی شے کا گمان ہوتا تھا..... اور ان کا خوشبو دار سانس اور ان کے تراشے ہوئے بدن کی نرمی اور حدت..... وہ ان سب کا دیوانہ تھا۔ ہاں، یہ بات تھی کہ ان ساری قربتوں کو حاصل کرنے کے بعد بھی اس کے اندر اپنی بی بی کی چاہت کا الاؤ دھیما نہیں پڑتا تھا..... اور شاید یہی بات تھی کہ اس کے اندر اپنی بے پایاں خواہشوں کے حوالے سے کوئی ندامت پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ہاں، یہ وہی عشق تھا جس کے بارے میں اماں سیانی نے کہا تھا، یہ ملاپ سے کم ہوتا ہے نہ جدائی سے..... اور یہ بھی کہ اگر ہیر رانجھا مل بھی جاتے تو وہ زندگی کی آخری سانسوں تک ہیر رانجھا ہی رہتے۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟'' شانی نے غنودہ آواز میں کہا۔

''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟''

''کیا یہ بارش ہمیشہ اسی طرح نہیں رہ سکتی؟''

''ہمیشہ کا تو پتا نہیں..... مگر اب تو ہو رہی ہے۔''

''آپ اسے روک لیں۔'' شانی نے رستم کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے کہا۔

رستم اس کے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔ یکا یک ایک نامانوس آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ ماحول کے سحر سے نکل آئے اور ایک دم اٹھ بیٹھے۔ رستم نے فوراً اپنے لوڈڈ پسٹل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دور کچھ فاصلے پر درختوں کے اندر انجن کا شور سنائی دے رہا تھا..... درختوں سے اوپر بارش کی بوچھاڑوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی روشنی بھی انہیں دکھائی دی۔

''یہ کیا ہے رستم؟'' شانی نے دہل کر پوچھا۔

''لگتا ہے کہ پولیس کی گاڑی ہے۔ بلکہ شاید دو ہیں۔ ایک پولیس کی ہے، ایک پرائیویٹ جیپ ہے۔''

''کیا انہیں ہمارے بارے میں پتا چل گیا ہے؟''

''کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ روٹین کا گشت ہو۔''

چار پانچ منٹ تک رستم اور شانی نے بڑی بے چینی سے انتظار کیا کہ یہ دونوں گاڑیاں آگے نکل جائیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ غالباً وہاں درختوں کے درمیان کوئی ٹین کا شیڈ وغیرہ تھا جس پر رستم اور شانی کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔ دونوں گاڑیاں وہاں موجود تھی۔ اب ان کی ہیڈ لائٹس آف کر دی گئی تھیں۔ بس اندرونی بتیاں جل رہی تھیں۔ بارش اب پہلے سے ہلکی ہو گئی تھی۔ گاڑیوں میں موجود افراد میں سے کوئی بلند آواز سے بولتا تھا تو اس کی آواز کی مدھم لہریں

رستم اور شانی کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ پولیس والے یہاں قیام کا ارادہ رکھتے ہیں..... اور یہ بے حد خطرناک تھا۔

رستم قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اب زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتے تھے مگر انجن اسٹارٹ کرنے سے پولیس والے ہوشیار ہو سکتے تھے۔ گاڑی کو چھوڑ کر جانا بھی سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ ایک بات رستم کے ذہن میں آ رہی تھی۔ پندرہ بیس قدم آگے ایک ڈھلوان سی شروع ہوتی تھی۔ گاڑی اس ڈھلوان پر پہنچ جاتی تو سو ڈیڑھ سو گز تک انجن کے بغیر ہی چلتی چلی جاتی۔ ''کیا سوچ رہے ہیں؟'' شانی نے سرگوشی کی۔

''ہمیں یہاں سے نکلنا ہو گا۔ آپ گاڑی میں ہی رہیں، میں باہر نکل کر گاڑی کو دھکا لگاتا ہوں۔ ہم اس سامنے والی ڈھلوان تک پہنچ گئے تو کافی آگے نکل جائیں گے۔''

''مگر آپ اکیلے کیسے کریں گے۔ آپ کی ٹانگ.....؟''

''آپ بے فکر رہیں..... ہو جائے گا۔''

رستم نے گاڑی کو نیوٹرل کر دیا اور ہینڈ بریک ہٹا دیا۔ اس کے بعد وہ بڑی احتیاط سے باہر نکل آیا۔ گرجتے برستے موسم نے اس کا استقبال کیا۔ پانی کی تیز بوچھاڑوں نے اسے لمحوں میں شرابور کر دیا۔ اس نے گاڑی کو دھکا لگانا شروع کیا۔ ٹانگ میں ٹیسیں اٹھنے لگیں مگر وہ لگا رہا۔ آٹھ دس میٹر آگے جانے کے بعد گاڑی رک گئی۔ اس کا ایک پہیہ شاید کسی چھوٹے سے گڑھے میں تھا۔ رستم نے پورا زور لگایا مگر کیچڑ کے سبب اس کے پاؤں پھسل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اچانک یہ مشکل آسان ہو گئی۔ رستم نے چونک کر دیکھا۔ شانی بھی اس کوشش میں شریک ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر تھی اور اپنی طرف سے گاڑی کو دھکیل رہی تھی۔ گاڑی حرکت کرتی ہوئی اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں اسے دھکیلنے کی ضرورت نہیں رہی۔ رستم نے اس کا ہینڈ بریک کھینچا۔ دونوں گاڑی کے اندر بیٹھے، دروازے بند کیے اور ہینڈ بریک ہٹا دیا۔ گاڑی پہلے سست روی سے رینگی پھر اس کی رفتار میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ ڈھلوان پر آگے بڑھتی رہی تھی۔ کہیں کہیں رستم کو بریک استعمال کرنا پڑا۔ تاہم تو بڑھتی بارش میں وہ بڑی خاموشی کے ساتھ قریباً ڈیڑھ سو میٹر دور چلے آئے۔ بجلی کی چمک گاہے بہ گاہے قرب و جوار کو روشن کر دیتی تھی۔ آگے بڑھنا دشوار تھا مگر کوشش کی جا سکتی تھی۔ وہ آبی گزرگاہ کے ساتھ ساتھ ڈرائیو کر سکتے تھے۔

شانی سرتاپا بھیگ گئی تھی۔ اس کے لمبے بال اس کے چہرے اور گردن سے چپکے ہوئے تھے۔ زرق برق لباس بھی شرابور تھا۔ ''آپ کو سردی تو نہیں لگ رہی؟''

www.pdfbooksfree.pk

''آپ کو نہیں لگ رہی تو مجھے بھی نہیں لگ رہی۔''

وہ ڈرائیو کرنے لگا۔ شانی نے ایک بار پھر بڑی اداسی سے اپنا سر رستم کے کندھے سے لگا دیا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں رستم کہ گلابے کو ڈھونڈ لیا گیا ہو اور اردگرد کی پولیس الرٹ ہو گئی ہو۔''

''گلابا نہ بھی ڈھونڈا گیا ہو مگر سلطان رضا ہوٹل والا معاملہ تو کھل چکا ہوگا۔ بے ہوش اے ایس آئی ہوش میں آ گیا ہوگا اور اس نے بتا دیا ہوگا کہ اس کمرے میں کون کون ٹھہرا تھا۔ ہمارے چلے جانے کے بعد پولیس کو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہوٹل میں ہم ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔''

''پتا نہیں کیوں رستم..... میرا دل کہتا ہے کہ ہمارے اردگرد ہمیں تلاش کرنے والے موجود ہیں۔ وہ کسی بھی وقت.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی، اس کا گلا رندھ گیا۔

''میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' وہ عجیب لہجے میں بولا۔

''آپ اور میں دو نہیں ہیں اور آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اب ایک پل کے لیے بھی مجھے خود سے جدا نہیں کریں گے۔'' وہ آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ آنکھوں کے گوشے نم تھے۔

وہ جیپ تیے چلتے رہے۔ راستہ سخت ناہموار اور دلدلی تھا لیکن وہ اب پختہ راستے پر چلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ایک دو جگہ گاڑی پھنس بھی گئی، تاہم وہ کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان کا رخ ہنوں کے پہاڑی علاقے کی طرف تھا..... بارش کی طوفانی کیفیت اب ختم ہو چکی تھی مگر وہ رکی نہیں تھی۔ کبھی رم جھم اور کبھی سرلائے کی شکل میں آسمان مسلسل پانی گرا رہا تھا۔ ایک مقام کے سوا انہیں اپنے اردگرد کہیں آبادی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ ایک جگہ ایک بیلے کے اندر ان کی گاڑی پنکچر بھی ہوئی اور انہیں ٹائر بدلنا پڑا۔

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے جب اچانک ان کی گاڑی کو شدید جھٹکا لگا اور وہ خطرناک زاویے سے بائیں طرف جھک گئی۔ اس کا اگلا پہیہ بری طرح نرم زمین میں دھنس گیا تھا۔ رستم نے پہیہ نکالنے کے لیے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھایا تو یکایک انجن جھرجھری لے کر خاموش ہو گیا۔ رستم نے کئی بار سیلف مارا..... مگر بوڑھی مرسیڈیز ہمت ہار چکی تھی۔ رستم نے باہر نکل کر بونٹ اٹھایا اور انجن میں تاک جھانک کی۔ کچھ دیر بعد وہ بونٹ بند کر کے گاڑی میں آن بیٹھا۔

''لمبی خرابی لگتی ہے۔ شاید ٹائمنگ بیلٹ ٹوٹ گئی ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''اب کیا ہوگا؟'' شانی گھبرا کر بولی۔

''گاڑی چھوڑنا پڑے گی۔''

انہوں نے سامان سمیٹا، اٹیچی کیس اٹھایا اور گاڑی سے باہر نکل آئے۔ دھیمی بارش جاری تھی۔ کبھی کبھی بجلی کی روشن لکیریں سیاہ آسمان کو اتھل پتھل کر دیتی تھیں۔ وہ پیدل چلنے لگے۔ ایک موی شاپر میں لپٹا ہوا پسٹل رستم کی جیب میں تھا..... اور خطرے کے وقت فوراً اس کے ہاتھ میں پہنچ سکتا تھا۔ یہاں چاروں طرف خودرَو جھاڑیاں تھیں اور ویرانی تھی۔ ایسے علاقوں میں گیدڑ، سؤر اور جنگلی بلے وغیرہ موجود ہوتے ہیں مگر موسلا دھار بارش نے شاید انہیں بھی پناہ گاہوں میں دبکنے پر مجبور کر دیا تھا..... کچھ آگے جا کر گھنے درختوں کے درمیان شانی کو ایک چھوٹی سی شکستہ عمارت نظر آئی۔ ''یہ کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''شاید مسجد!'' رستم نے جواب دیا۔

وہ مسجد کی طرف بڑھ گئے۔ لگتا تھا کہ یہ عرصے سے خالی پڑی ہے۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ چھوٹا سا محراب اور منبر..... برآمدہ بھی مختصر تھا۔ کمرے کے اندر گرد و غبار سے اٹی ہوئی فقط ایک شکستہ چٹائی پڑی تھی۔ رستم نے اٹیچی سے پنسل ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی میں دیکھا۔ طاقوں کے اندر دیے تھے جو نہ جانے کب سے بجھے ہوئے تھے۔ کونوں میں جالے لٹک رہے تھے۔ برآمدے میں کسی دور دراز کے دیس سے آنے والے پرندے نے گھونسلا بنا رکھا تھا۔ برآمدے کے پاس ہی شانی اور رستم کو ایک تنگ دہانے کا کنواں نظر آیا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بھی خشک پڑا ہے۔ بارش کی رفتار پھر بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک دم گہرا اندھیرا چھا گیا تھا۔ جیسے صبح صادق نمودار ہوتے ہوتے واپس لوٹ گئی ہو۔ انہوں نے کچھ دیر یہاں رکنا مناسب سمجھا۔ رستم نے اپنی پنڈلی کی گیلی پٹی اتار پھینکی۔ اٹیچی میں صاف پٹی اور روئی موجود تھی۔ پہلے اس نے شانی کی انگلیوں کی بینڈیج کی۔ پھر شانی نے رستم کی پنڈلی پر پٹی باندھی۔ پیدل چلنے کے سبب زخم سے پھر خون رِسنے لگا تھا۔ اس چھوٹی سی مسجد کی ویرانی دیکھ کر شانی کے دل کی عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے یہ چار دیواری مدت سے کسی انسان کی راہ تک رہی ہو۔ یہاں تو شاید کسی تہوار پر بھی کوئی دیا نہیں جلاتا تھا۔

شانی نے اپنی اوڑھنی سے مسجد کی اکلوتی صف کو صاف کیا۔ چھت سے لٹکے ہوئے جالے اس نے اپنے ہاتھ سے اتارے۔ برآمدے کے پاس ہی ایک پختہ گڑھے میں بارش کا پانی جمع ہو گیا تھا۔ شانی نے یہاں سے وضو کیا اور فجر کی نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ رستم اپنا سائیلنسر لگا پسٹل گود میں رکھے بیٹھا رہا۔ اس نے احتیاطاً چار دیواری کے دروازے کو اندر

سے کنڈی چڑھادی تھی۔

پھر نہ جانے رستم کے دل میں کیا آئی کہ اس نے بھی وضو کیا اور ایک گوشے میں نماز ادا کرنے لگا۔ اس کے چاروں طرف مہیب اندیشوں کی چاپ تھی۔ اس نے کہیں سنا تھا کہ ہر نماز کو آخری نماز سمجھ کر ادا کرنا چاہیے۔ نماز پڑھتے ہوئے اس کی عجیب کیفیت ہوگئی۔

گاڑی سے نکلتے ہوئے شانی نے بسکٹس اور پیٹیز وغیرہ اٹیچی میں رکھ لیے تھے..... دودھ پتی والا فلاسک بھی ایک موٹے شاپر میں لپیٹ کر اٹیچی میں سنبھال لیا تھا۔ رستم نے سلام پھیرا تو شانی نے کہا۔ ''کچھ کھالیں۔''

''نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا۔ آپ کھالیں۔''

رستم کے ''نہ نہ'' کہتے بھی شانی نے ہلکا پھلکا ناشتہ سجادیا۔ اٹیچی کیس کو اس نے میز کے طور پر استعمال کیا تھا۔ رستم نے چند بسکٹ لیے اور چائے پی۔ شانی نے بھی چائے کا آدھا کپ لیا۔ یہ فلاسک کا ڈھکن ہی تھا جسے وہ کپ کے طور پر استعمال کررہے تھے۔ اچانک شانی نے رستم کو چونکتے دیکھا۔ شانی نے غور کیا اور اسے بھی مدھم انسانی آوازیں سنائی دیں یا شاید یہ ایک سے زیادہ آوازیں تھیں۔ یہ آوازیں خودرَو جھاڑیوں کے پار سے آرہی تھیں..... قریباً ڈیڑھ دوسو قدم کے فاصلے سے! شاید ہوا کا رخ ان کی سمت نہ ہوتا تو یہ آوازیں ان کے کانوں تک نہ پہنچ پاتیں۔

''کون لوگ ہوسکتے ہیں؟'' رستم نے کہا۔

''ہوسکتا ہے، آس پاس کے دیہاتی ہوں۔''

آپ یہیں رکیں، میں آگے جاکر دیکھتا ہوں۔'' رستم نے کہا۔

''نہیں، میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔'' شانی نے رستم کا بازو تھام لیا۔

رستم اور شانی مسجد کے شکستہ دروازے سے نکل کر جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ پسٹل رستم کے کُرتے کے نیچے تھا لیکن ایک لٹھے میں اس کے ہاتھ میں آسکتا تھا۔ رستم کے سفید تہہ بند کا نچلا کنارہ بارش میں چلنے سے کیچڑ آلود ہو چکا تھا۔ وہ دونوں بارش کی بوچھاڑوں میں آگے بڑھتے قریباً دوسو قدم دور آگئے۔ اس سے آگے نشیبی جگہ تھی۔ شانی کا خیال تھا کہ شاید مقامی خانہ بدوشوں سے ان کی ملاقات ہونے والی ہے یا پھر چرواہوں کا کوئی ڈیرا ہوگا۔ مگر جو کچھ انہوں نے نشیب میں دیکھا، وہ بالکل غیر متوقع تھا۔ صبح کے ملگجے اجالے میں انہیں ایک لینڈ کروزر جیپ نظر آئی۔ وہ گھنے درختوں تلے کھڑی تھی۔ جیپ سے باہر دو افراد موجود تھے اور بارش سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ ذرا غور کرنے پر شانی اور رستم کو اندازہ ہوا کہ دونوں

www.pdfbooksfree.pk

افراد کے ہاتھوں میں شراب کی چھوٹی بوتلیں ہیں۔

ایک شخص کو پہچان کر شانی کا لہو سنسنا اٹھا۔ اگر اس کی نگاہ دھوکا نہیں کھا رہی تھی تو یہ ڈپٹی ریاض کا دوست، اجرالی سردار تہور خان تھا۔ یہ نہایت گرانڈیل شخص تھا۔ ریاض کی ڈیفنس والی کوٹھی میں، بے گناہ سکینہ کو تشدد کر کے موت کے گھاٹ اُتارنے والوں میں یہ شخص بھی شامل تھا۔ شانی کے دل میں آئی کہ وہ رستم کو چلا چلا کر بتائے کہ یہ شخص بھی سکینہ کے قاتلوں میں شامل ہے لیکن وہ کیسے بتا سکتی تھی؟ اس نے تو رستم کو ابھی تک سکینہ کی موت کے بارے میں بھی نہیں بتایا تھا۔ شانی نے رستم کا چہرہ دیکھا اور لرز گئی۔ یہ رستم کا وہی روپ تھا جو دیکھنے والے کو لرزہ براندام کر دیتا تھا۔ ایک بے کراں وحشت تھی جو تابڑ توڑ بارش ہی کی طرح رستم کے چہرے پر برس رہی تھی۔

اسی دوران میں گاڑی کے اندر سے ایک باوردی پولیس والا نکلا اور اس نے مسکراتے ہوئے تہور خان کو ایک اور چھوٹی بوتل تھمادی۔ ''یہ کون لوگ ہیں رستم؟'' شانی نے پوچھا۔

''یہ اجرالی سردار ہیں اور ان کے ساتھ دو پولیس والے بھی ہیں۔'' رستم کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے آرہی تھی۔

''آپ ان کو جانتے ہیں؟''

''میں ان کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ ان کی صورتیں رات دن میری نظروں میں گھومتی ہیں۔ یہ پانچ بندے ہیں اور پانچوں کے پانچوں ان لوگوں میں شامل ہیں جنہوں نے وڈے ڈیرے پر قتلِ عام کیا۔'' رستم کے سانسوں کی لَے تیز ہوتی جارہی تھی اور آنکھوں میں نیلگوں شعلے رقصاں ہوگئے تھے۔ شانی اندر تک لرز گئی۔ اس کی چھٹی حس نے بارود اور خون کی بُو سونگھی اور اس کے کانوں نے چلاتی ہوئی دردناک آوازیں سنیں۔

''یہ..... لوگ یہاں کیا کررہے ہیں؟'' وہ ہکلائی۔

''وہی جو انہیں کرنا چاہیے۔ یہ گُنجے کے تخم اپنی موت کو ڈھونڈ رہے ہیں۔'' رستم نے پھنکارا پھر اس نے شانی سے کہا۔ ''میں ایک منٹ میں آیا۔'' اس سے پہلے کہ شانی اسے روک سکتی یا کچھ بھی کہتی وہ مسجد کی طرف بھاگ گیا۔ اس کی چال میں لنگڑاہٹ واضح طور پر محسوس ہوتی تھی۔ شانی کا دل رونے لگا۔ اس کے دل سے بے ساختہ دعا نکلی..... کاش! رستم کے آنے سے پہلے یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔

مگر ایسا نہیں ہوا..... رستم جس طرح بگولے کی طرح گیا تھا، اسی طرح واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ کلاشنکوف شانی نے دور ہی سے دیکھ لی۔ اپنا پسٹل وہ غالباً اٹیچی میں ہی

رکھ آیا تھا۔ ''آپ..... کیا کرنے لگے ہیں رستم؟''

''آپ دیکھتی جائیں..... اور اگر..... نہیں دیکھ سکتیں تو..... اپنا رخ دوسری طرف کر لیں۔'' رستم کے لہجے میں وحشت اور درندگی کی بلند و بالا لہریں تھیں۔ وہ سرتاپا موت نظر آ رہا تھا۔ شانی کو یوں لگا جیسے کوئی کمزور دل شخص اس کی صورت دیکھ کر ہی جان ہار سکتا ہے۔ شانی نے رستم کے اس مہلک ترین روپ کے بارے میں کئی بار دوسروں سے سنا تھا لیکن آج وہ خود دیکھ رہی تھی اور سکتے کی سی کیفیت محسوس کر رہی تھی۔

شانی کو وہیں گھنی جھاڑیوں کے درمیان چھوڑ کر وہ تیزی سے لینڈ کروزر جیپ کی طرف بڑھنے لگا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ کسی شکاری جانور کی سی ہوشیاری سے ڈھلوان پر اُڑتا جا رہا تھا۔ شانی کو محسوس ہوا کہ اس کا شدت سے دھڑکتا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ چند سیکنڈ بعد شانی نے پہلے فائر سنے، یہ چھوٹے چھوٹے دو برسٹ تھے۔ پھر رستم کی للکار شانی کے کانوں تک پہنچی۔ یہ آواز بجلی کی کڑک سے کم لرزہ خیز نہیں تھی۔ شانی نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھول دیں۔ لینڈ کروزر کے ایک سائیڈ کے شیشے چکنا چور ہو چکے تھے۔ ایک پولیس والے کی لاش جیپ کے پائیدان پر پڑی تھی، ایک شاید اندر موجود تھا اور وہ بھی بالکل بے حرکت تھا۔ باقی تینوں افراد نے اپنے ہاتھ کھڑے کر لیے تھے اور جیپ سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ رستم کی مہلک کلاشنکوف کا رخ ان کے سینوں کی طرف تھا۔ یہ تینوں دبنگ اجرالی سردار تھے لیکن ان لمحوں میں قطعی بے بس دکھائی دے رہے تھے۔ یقیناً انہیں اپنے ہتھیاروں تک پہنچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

''اپنی قمیصیں اتارو۔'' رستم دہاڑا۔

انہوں نے پس و پیش کیا۔ رستم نے ایک اور برسٹ ان کے قدموں میں چلایا۔ ان تینوں نے اپنی قمیصیں اتار دیں۔ ان میں سے ایک نے قمیص کے نیچے ہولسٹر لگا رکھا تھا۔ دوسرے نے چمڑے کی پیٹی میں شاید خنجر اڑسا ہوا تھا۔ رستم بھی یہی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ دونوں ہتھیار بھی اجرالی سرداروں کے جسم سے علیحدہ کروا دیے۔

دونوں پولیس والوں کی طرح یہ اجرالی سردار بھی وڈے ڈیرے پر ہونے والی خون ریزی کے ماسٹر مائنڈز تھے۔ انہوں نے ریاض ہنڈ سے ملی بھگت کی تھی اور چند پہاڑوں پر ملکیت کی خاطر عام معافی کے پروگرام کو سبوتاژ کیا تھا۔ ڈیرے کے مکینوں کو جان سے مروا دیا تھا۔ آج یہ ماسٹر مائنڈز سردار غلام کبیر ہی کی طرح رستم کے نشانے پر تھے۔ انہوں نے جیسے موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا تھا اور سرتاپا سکتہ زدہ نظر آ رہے تھے۔ رستم نے ان تینوں کو ایک

گرے ہوئے درخت کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ وہ بلا چون و چرا عمل کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک شاید کچھ بول بھی رہا تھا۔ غالباً وہ رستم کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ نیچے گرائے تو رستم گرجا۔ ''ہاتھ اوپر..... ہاتھ اوپر!''

اس نے لرز کر دوبارہ ہاتھ اوپر کر دیے۔ اس کی چربی دار توند اس کے باقی جسم ہی کی طرح تھل تھل کر رہی تھی۔ اس کی دہشت سے پھٹی ہوئی آواز ہوا کے دوش پر تیر کر شانی کے کانوں تک پہنچی۔ ''رستم! مینڈا قصور نئیں..... مجھ کو ان لوگوں نے جبردستی اپنے ساتھ رکھا۔ میں قسم کھاتا ہوں.....''

''بکواس بند کرو۔'' رستم دہاڑا۔ ''مجھ سے تم لوگوں کا کچھ چھپا ہوا نہیں۔''

اسی دوران میں ہٹا کٹا تہور خان بے دم ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔ شاید اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی تھی۔ کافی فاصلے سے بھی اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد دکھائی دے رہا تھا۔ رستم نے اس کی ٹانگوں کے قریب زمین پر ایک سنگل فائر کیا اور اس کو پھر سے اٹھنے اور ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا..... پہلے فریاد کناں شخص نے موت کو بالکل سامنے دیکھ کر رستم کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے اور دوبارہ کچھ کہنے کی کوشش کی۔ یہی شخص کچھ دیر پہلے گہرے نشے میں نظر آ رہا تھا۔ اب اس کا نشہ یوں ہرن ہوا تھا کہ وہ ایک دم شیر سے گیدڑ دکھائی دینے لگا تھا۔

رستم پھر دہاڑا۔ ''بند کرو یہ بکواس اور میں نے کہا ہے ہاتھ اوپر رکھو اور تمہیں پتا ہے، ہاتھ اوپر اٹھانے کا کیا مطلب ہوتا ہے..... پتا ہے تمہیں؟'' رستم کے لہجے میں وحشت اور دیوانگی تھی۔ اس شخص نے ہاتھ اٹھانے کے بعد کچھ کہا جو شانی کے کانوں تک نہیں پہنچا۔ رستم چلایا۔ ''حرامزادو..... ہاتھ اٹھانے کا مطلب ہوتا ہے..... ہم نے مقابلہ ختم کیا، ہم نے ہار مانی۔ ہم نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کیا۔ ایسے لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ہے یا گولیوں سے چھلنی کیا جاتا ہے؟ بولو، کیا کیا جاتا ہے ان کے ساتھ؟..... بولو..... بولو.....'' رستم کی آواز دور تک گونجی۔

جواب ندارد تھا، بس تین کانپتے ہوئے جسم تھے اور چھ اجل دیدہ آنکھیں تھیں۔ پھر رستم نے برسٹ چلایا۔ تینوں نیم برہنہ افراد گولیاں کھا کر اوندھے سیدھے گرے۔ شانی نے آنکھیں بند کر لیں..... دوسرا برسٹ چند سیکنڈ بعد چلا..... اور پھر تیسرا!

شانی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ بازوؤں میں چھپایا ہوا تھا۔ پھر وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ پتا نہیں کیوں؟

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ بارش مدھم تھی۔ اجالا پھیلا ہوا تھا۔ شانی کو تینوں

www.pdfbooksfree.pk

لاشیں صاف نظر آئیں۔ خون میں ڈوبی ہوئی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی۔ ان میں سے ایک شخص نے مُردہ حالت میں بھی اپنے ہاتھ سر سے بلند کر رکھے تھے۔ جیسے اسے آخر وقت تک امید رہی ہو کہ اگر وہ ہاتھ کھڑے رکھے گا تو شاید بچ جائے۔ درست کہا جاتا ہے، بے انصافی سے انتقام جنم لیتا ہے اور ظلم سے سفاکی پروان چڑھتی ہے۔

رستم کو شانی نے جھکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے زمین سے وہ خنجر اٹھا لیا جو ایک مقتول سردار کے جسم سے جدا ہوا تھا، تب وہ جیپ کی طرف بڑھا۔ وہ غالباً اس کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔

رستم نشیب میں تھا۔ شانی بلندی پر تھی۔ اچانک اس کی نگاہ درختوں کے درمیان ایک متحرک جسم پر پڑی..... بلکہ یہ دو جسم تھے۔ وہ رستم سے قریباً سو میٹر دور تھے اور تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ''رستم..... رستم!'' شانی چلائی۔ آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی۔

''کیا بات ہے شانی؟'' رستم نے نشیب سے آواز دی۔

''کوئی آ رہا ہے، آپ کی طرف..... آپ کے سامنے سے!'' شانی کی آواز میں خوف کی لہریں تھیں۔

رستم نے اپنے سامنے دیکھا۔ چند سیکنڈ بعد اسے بھی خطرے کا احساس ہو گیا۔ وہ تیزی سے جیپ کی آڑ میں ہو گیا اور کلاشنکوف درختوں کی طرف سیدھی کر لی۔ پندرہ بیس سیکنڈ بعد دونوں افراد موقعہ واردات کے قریب پہنچ گئے۔ تاہم وہ سامنے نہیں آئے۔ انہوں نے خود کو درختوں کی اوٹ میں چھپائے رکھا۔ شاید انہوں نے لینڈ کروزر جیپ کے چکنا چور شیشے دیکھ لیے تھے اور ہو سکتا ہے کہ لاشوں پر بھی ان کی نگاہ پڑ گئی ہو۔

''رستم! انہوں نے خود کو درختوں کے پیچھے چھپا لیا ہے..... یہ دو ہیں۔''

''اسلحہ ہے؟''

''ہاں جی! ایک کے پاس رائفل ہے شاید۔''

رستم نے کلاشنکوف سے سنگل شاٹس چلائے..... دوسری طرف سے بھی فائر ہوا۔ رستم کو ان کی پوزیشن کا اندازہ ہو گیا۔ اگلے تین چار منٹ میں دونوں طرف سے گولیاں چلیں۔ رستم کلاشنکوف استعمال کر رہا تھا۔ دوسری طرف سے خود کار رائفل اور پسٹل کا فائر آ رہا تھا۔ رستم کی ہدایت پر شانی نے خود کو ایک تناور درخت کی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ اچانک شانی نے دیکھا کہ رستم کے حریفوں میں سے ایک گر گیا ہے۔ اسے گولی لگ گئی تھی۔

شانی نے بلند آواز میں رستم کو اطلاع دی۔ ''ایک گر گیا ہے، دوسرے نے اس کی رائفل اٹھائی ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

رائفل سے چند سنگل شاٹ چلائے گئے۔ پھر اندازہ ہوا کہ رائفل خالی ہو گئی ہے۔ پسٹل شاید پہلے ہی خالی ہو گیا تھا۔

رستم درختوں کی آڑ لیتا ہوا کچھ آگے چلا گیا۔ دوسرا بندہ بھاگ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ شانی اس بارے میں رستم سے کچھ کہتی..... یا خاموش رہنے کا فیصلہ کرتی، رستم کو اس کے بھاگنے کا علم ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑا..... چند سیکنڈ بعد شانی نے رستم کی للکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ پسپا ہونے والے کو رکنے کا کہہ رہا تھا۔

پسپا ہونے والا کھلی جگہ پر تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر رکا نہیں تو کلاشنکوف بھون ڈالے گی۔ وہ رک گیا۔ کچھ دیر بعد شانی نے ان دونوں کو آگے پیچھے جیپ کی طرف آتے دیکھا..... وہ قریب آئے تو شانی دنگ رہ گئی..... یہ ڈپٹی ریاض تھا۔ شانی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا لیکن شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی.....

ڈپٹی ریاض ہمیشہ کی طرح عام کپڑوں میں تھا۔ اس نے سیاہ پتلون کے اوپر ٹریک سوٹ جیسی ٹیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں کیچڑ آلود جوگرز تھے۔ ایک ٹیلی اسکوپ اس کے گلے سے جھول رہی تھی اور وا کی ٹا کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آتش فشاں کی طرح دہکا ہوا ہے اور رستم پر جھپٹ پڑنے کے لیے بس ایک چھوٹے سے موقع کا منتظر ہے۔ اپنے تین ساتھیوں کی خونچکاں لاشوں کے قریب پہنچ کر ریاض کا چہرہ اور بھی بھیانک نظر آنے لگا..... ہاں..... یہ ڈپٹی ریاض ہنلر ہی تھا۔ وہ بدترین شخص جو رستم کو درکار تھا۔

رستم نے شانی کو بار بار آواز دی۔ مجبوراً شانی کو نیچے اترنا پڑا۔ وہ کیچڑ آلود زمین پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی رستم اور ریاض کے پاس پہنچ گئی۔ ریاض کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے قہر سے بار بار زمین پر تھوک رہا تھا۔ اس کے اردگرد چھ لاشیں تھیں اور ان لاشوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ یہ چھ لاشیں ان سرکردہ افراد کی تھیں جنہوں نے وڈیرے کے خونی آپریشن کو فائنل شکل دی تھی۔ ممکن ہے کہ ایک دو اور بھی ہوں مگر اپنی کسی نیکی کے سبب وہ فی الوقت یہاں موجود نہیں تھے۔

رستم پھنکارا۔ ''دیکھ لے ریاضے! میں نے کہا تھا نا، تجھے ایک دن لالے اور اس کے ساتھیوں کے خون کا حساب دینا پڑے گا..... اور تُو اپنے آلے دوالے کی دیواریں جتنی مرضی اُچی کر لے میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا۔''

ریاض نے ایک بار پھر تھوکا اور بولا۔ ''رستے! اسلحے کے زور پر بڑھکیں مارنا بہت آسان

ہوتا ہے۔ اس ماں (کلاشنکوف) کو نیچے رکھ کے دیکھ۔"

شانی نے دیکھا کہ یہ فقرہ ادا کرنے سے پہلے ریاض کی نگاہ رستم کی زخمی ٹانگ پر گئی تھی۔ بھاگ دوڑ کے سبب ٹانگ لہولہان ہوگئی اور رستم کے لیے اس پر وزن ڈالنا مشکل ہو رہا تھا۔ شانی نے کراہتے ہوئے کہا۔ "نہیں رستم! اس کی باتوں میں نہ آنا..... آپ زخمی ہیں۔"

مگر شانی کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی رستم کلاشنکوف کیچڑ میں پھینک چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمن کو بھنبھوڑنا چاہتا ہے اور چیر پھاڑ دینے کی خواہش رکھتا ہے۔

شانی کے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اسے لگا کہ وہ لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ اس نے ایک کیکر کے تنے کا سہارا لیا..... وہ آمنے سامنے تھے۔ دو بدترین دشمن..... ایک مدت سے وہ ایک خوفناک جنگ لڑ رہے تھے۔ مگر کبھی اس طرح ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے تھے۔ فقط ایک دفعہ پوٹھوہار کے ٹیلوں میں وہ چند سیکنڈ کے لیے ایک دوسرے کے رُوبرو ہوئے تھے۔ رستم نے ریاض کے سینے پر ٹانگ رسید کر کے اسے نشیب میں گرا دیا تھا اور پولیس والوں کے نرغے سے بچ کر نکل گیا تھا۔ آج اس برستی بارش میں، گرجتے بادلوں کے نیچے..... ان سنسان درختوں کے اندر..... وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ تماشائی نگاہ شانی کی تھی۔ یوں لگتا تھا، اس پورے علاقے میں دور دور تک ان تینوں کے سوا کوئی ذی روح موجود ہی نہیں۔

جیپ کے قریب ایک رائفل پڑی تھی۔ اس کی سنگین اُتر کر دور جا گری تھی۔ ریاض نے لپک کر یہ سنگین اٹھالی۔ رستم نے جواب میں وہ خنجر قمیص کے نیچے سے نکال لیا جو کچھ دیر پہلے اس نے اجرالی سردار سے رکھوایا تھا۔ اپنے تہہ بند کو اس نے گھٹنوں سے اوپر تک اڑس کر مضبوط گرہ لے لی۔

ریاض جیسے طیش سے دیوانہ ہو کر رستم پر جھپٹا۔ اس کی چنگھاڑ دل ہلا دینے والی تھی۔ اس اچانک حملے سے بچنے کے لیے رستم نے بائیں طرف ہٹنا چاہا مگر بائیں طرف ہٹنے کے لیے دائیں ٹانگ پر وزن ڈالنا ضروری تھا اور دائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رستم پوری طرح ریاض کے وار سے بچ نہیں سکا۔ سنگین اس کا دایاں بازو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ شانی بے ساختہ چلا اٹھی۔ پہلے وار کی کامیابی سے ریاض کا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ اس نے اگلے ہاتھ کا وار رستم کی گردن پر کیا جو اس کی ٹھوڑی کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ رستم پیچھے ہٹتے ہٹتے درخت کے گرے ہوئے تنے سے ٹکرایا اور پشت کے بل گر گیا۔ ریاض پھر ایک خوفناک چنگھاڑ کے

ساتھ رستم پر حملہ آور ہوا اور اس کے اوپر آیا۔ شانی نے رستم کی کراہ سنی۔ شاید سنگین نے دوبارہ اس کے جسم کو زخمی کیا تھا۔

یہ بڑا خوفناک تجربہ تھا..... یہ بڑا ہی خوفناک احساس تھا۔ یہ کوئی فلمی منظر نہیں تھا..... جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ دو افراد جن کے ہاتھوں میں تیز دھار آلے تھے، پوری وحشت کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ کسی بھی وقت ان میں سے کسی کا پیٹ چاک ہو سکتا تھا یا گردن اُدھڑ سکتی تھی..... یا کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ کیچڑ میں لتھڑ گئے اور ناقابلِ شناخت ہو گئے۔ شانی نے دیکھا، ریاض ابھی تک رستم کے اوپر تھا اور بڑی بے رحمی سے اس کی زخمی ٹانگ پر جوگرز بوٹ کی ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ شانی کے دل سے جیسے لہو رسنے لگا۔ یکایک شانی نے ریاض کو اچھل کر دور گرتے دیکھا۔ اس کا کندھا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ شانی کے دل میں سے دعا نکلی کہ یہ ریاض کا اپنا خون ہی ہوگا۔ پانی کیچڑ اور گھاس میں گرنے کے بعد ریاض نے دیوانہ وار دائیں بائیں ہاتھ چلائے۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ سنگین اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ رستم کھڑا ہو گیا۔ یہ گھائل ریاض پر وار کرنے کا بہترین موقع تھا مگر حیران کن طور پر رستم نے اسے وقت دیا۔ یہاں تک کہ خوفناک رنگیلی سنگین دوبارہ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ رستم نے ہاتھ کے اشارے سے ریاض کو پھر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ ریاض اپنی ڈکشن کی بدترین گالیاں بکتا ہوا رستم پر جھپٹا۔ اس بار رستم پوری طرح تیار تھا۔ اس نے نہ صرف وار بچایا بلکہ ریاض کی گردن پر ہاتھ چلایا۔ گردن کے عقب سے موٹی چربی کٹ کر لٹک گئی اور ریاض ڈکراتا ہوا لینڈ کروزر کی سائیڈ سے ٹکرایا۔ رستم نے اس کی پشت پر وار کیا۔ خنجر کئی انچ تک ریاض کے چربی اور گوشت میں دھنس گیا۔ رستم نے خنجر کو کھینچنے کی کوشش کی تو دونوں ایک بار پھر پانی اور کیچڑ میں گرے۔ ریاض کا سر درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا۔ سنگین پھر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ سنگین پر جھپٹا۔ شانی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ رستم نے پھر اسے سنگین تک پہنچنے کا موقع دیا۔ رستم کیا کر رہا تھا؟ کیوں کر رہا تھا؟ کیا وہ ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا؟ وہ کیوں ریاض جیسے موذی کو بار بار موقع دے رہا تھا؟ وہ اپنی شدید زخمی ٹانگ کے سبب کسی بھی وقت ریاض سے زیر ہو سکتا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں بارش کی بوچھاڑ کے درمیان رستم اور ریاض میں سخت خونی جدوجہد ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو زخم لگائے۔ رستم کی دو تین خوفناک ٹکروں نے ریاض کے چہرے کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ اس خونی لڑائی کے دوران میں رستم نے کم از کم ایک مرتبہ مزید ریاض کو گری ہوئی سنگین اٹھانے کا موقع دیا۔

www.pdfbooksfree.pk

ریاض اتنا ہانپ چکا تھا کہ اس کی نہایت زہریلی اور قہرناک زبان اب اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بس زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اس کا سارا جسم لہولہو تھا۔ پھر اچانک شانی نے دیکھا کہ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ اٹھا ہے۔ وہ جو آج تک سب کو بھگاتا ہی رہا تھا، اب خود بھاگ رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ رستم نے جیپ کے پاس گری ہوئی رائفل اٹھائی اور ریاض کے پیچھے لپکا۔

شانی بھی ان کے پیچھے لپکی۔ رستم نے بھاگتے بھاگتے ایک دو فائر کیے لیکن گنجان جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے ریاض کو نشانہ بنانا آسان نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان..... بہ مشکل پچاس ساٹھ قدم کا فاصلہ تھا۔ رستم کسی بھی وقت ریاض کے سر پر پہنچ سکتا تھا۔ ریاض بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ رستم نہیں موت ہے جو اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ اپنے گھائل جسم کے ساتھ بار بار پھسل رہا تھا اور اٹھ رہا تھا۔ ''تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے۔'' رستم اس کے قریب پہنچتے ہوئے وحشی آواز میں دہاڑا۔

ریاض نے بھاگتے بھاگتے اچانک رخ بدلا اور شکستہ مسجد میں گھس کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ رستم بگولے کی طرح اس کے پیچھے گیا۔ رستم کی طوفانی ٹکر سے دروازے کی کنڈی ٹوٹ گئی اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ ''رستم نہیں..... نہیں۔'' شانی نے پھر پکار بلند کی۔

رستم کے پانچ چھ سیکنڈ بعد شانی بھی مسجد میں داخل ہو گئی۔ اس نے لرزہ خیز منظر دیکھا۔ رستم رائفل کے وزنی کندے سے ریاض کو بے رحمی سے مار رہا تھا۔ ریاض کے اگلے دانت ٹوٹ گئے تھے، ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ایک آنکھ کی پلک چر کر نیچے لٹک رہی تھی اور ایک کلائی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کی مزاحمت یکسر دم توڑ چکی تھی۔ رائفل کی ضربیں کھا کھا کر وہ مسجد کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور گر رہا تھا۔

''نہیں رستم!'' شانی کربناک آواز میں چلائی۔ ''یہ مسجد ہے۔''

رستم تو جیسے کچھ سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ شانی کے روکتے روکتے اس نے ریاض کو اندرونی فرش پر گرایا اور اس کی لہولہان گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ پاؤں کے دباؤ سے بے ساختہ ریاض کا منہ کھل گیا۔ رستم نے رائفل کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ یہ آخری لمحے تھے۔ وہ وحشت ناک آواز میں دہاڑا۔ اس نے بس دو الفاظ ہی کہے۔ ''ریاض.....

ریاض!'' شانی اپنی پوری ہمت سے اسے روکنے کی کوشش کرتی رہی مگر اس نے سیون ایم ایم رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ ایک بار..... دو بار..... لیکن یہاں ایک انہونی ہوئی۔ گولی نہیں چلی..... رائفل خالی ہو چکی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

نیم جان ریاض کی آنکھیں موت کی وحشت سے یوں پھیلی ہوئی تھیں جیسے ابھی حلقوں سے باہر نکل آئیں گی۔ رستم نے رائفل پھینکی اور چنگھاڑتا ہوا اس اپیچی کیس کی طرف بڑھا جو کونے میں رکھا تھا۔ شانی سمجھ گئی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ پسٹل نکالنے لگا تھا۔ شانی اس سے لپٹ گئی..... ''نہیں رستم..... ایسا نہ کرو۔''

رستم نے پسٹل نکال لیا۔ شانی پوری جان سے رستم کے ہاتھ سے لپٹ گئی۔ اس نے پسٹل کا رخ فرش کی طرف موڑ دیا..... ''نہیں رستم!'' وہ بار بار یہی کہتی جا رہی تھی۔ ریاض سکتہ زدہ پڑا تھا۔

رستم کو فرطِ غضب نے دیوانہ کر دیا تھا۔ اسے جیسے خبر ہی نہیں تھی کہ اسے کون روک رہا ہے..... کیوں روک رہا ہے؟ ان لمحوں میں بس اس کی ایک ہی خواہش تھی، وہ ریاض کو ٹھنڈا کر دے..... اس نے ریاض کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ شانی اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگی۔ ریاض نے اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی اور اپنے کٹے پھٹے جسم کو سمیٹ کر صحن کی طرف بڑھا۔ رستم نے آخری زور لگایا مگر شانی پسٹل کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی گئی۔

ریاض لنگڑاتا اور لڑکھڑاتا ہوا بیرونی دروازے سے نکلا اور..... گھنے درختوں میں گھستا چلا گیا۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا.....

رستم کو جیسے اچانک جھٹکا لگا۔ اس نے چونک کر شانی کی طرف دیکھا۔ اس کی شدید ہیجانی کیفیت ذرا ماند پڑی۔ اس کے بے حد تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ تاہم اس کی آنکھوں سے اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے اپنے خون آلود ہونٹوں کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہیں سکا۔ بڑی حسرت کے ساتھ اس نے گھنے درختوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر شانی کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ کچھ ہی لمحے بعد اس نے پسٹل پر سے اپنی گرفت ختم کر دی اور شانی سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تب وہ بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا..... جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ وہ کتنی ہی دیر دیوار سے ٹیک لگائے ایسے ہی بیٹھا رہا۔ اس کی ٹھوڑی سے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون ٹپکتا رہا۔ کھینچا تانی میں شانی کا لباس بھی کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کی کہنیوں اور گھٹنوں سے کھال چھل گئی تھی۔ زخمی انگلیوں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد رستم اٹھا۔ اسے ایک دم نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ کھڑکی کی پختہ چوکھٹ پر مارنا شروع کر دیا۔ اس کا چہرہ فرطِ کرب سے بگڑا ہوا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس

نے ہاتھ کو لہولہان کر لیا۔

''رستم! کیا کر رہے ہو؟'' شانی چلائی اور تڑپ کر رستم کا ہاتھ تھام لیا۔

کھال چھیل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ اس نے زخمی ہاتھ کو چوما، سینے سے لگایا اور رونے لگی۔

وہ عجیب آواز میں بولا۔ ''میں نے آپ کو گھسیٹا، آپ کو زخمی کیا۔ مجھے بہت زیادہ سزا ملنی چاہیے..... بہت زیادہ ملنی چاہیے۔''

اس کی آنکھیں جو ہمیشہ خشک رہتی تھیں، آج نم ہو گئیں۔ ان میں سے آنسو گرے اور اس کی نرم داڑھی میں جذب ہو گئے۔ شانی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے کیچڑ آلود سینے کو چومنے لگی۔ اس کی لہولہو گردن کو چومنے لگی۔ ''نہیں رستم! آپ نے کچھ نہیں کیا ہے۔ جو کچھ کیا ہے میں نے کیا ہے اور..... اور میں نے بھی اس لیے کیا ہے کہ..... یہ مسجد ہے..... خدا کا گھر ہے..... اس نے یہاں پناہ لی تھی۔ اس نے پناہ لی تھی یہاں.....''

دونوں خاموش رہے۔ ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ دونوں کے جسم خونچکاں تھے..... اور رستم کے زخمی جسم سے تو لہو باقاعدہ ٹپک رہا تھا۔ باہر بارش کے ساتھ ہوا بھی شامل ہو گئی تھی اور پانی کی بوچھاڑیاں اس شکستہ ویران مسجد کی دیواروں سے ٹکراتی محسوس ہوتی تھیں۔

ایک بہت بڑا طوفان آ کر گزر رہا تھا..... اور اس طرح گزر رہا تھا کہ ابھی تک رستم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ بالکل آخری لمحوں میں ریاض اس سے بچ کر نکل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ اس جگہ زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ اگر وہ مزید زندہ رہنا چاہتے تھے تو انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا اور یہ بات شانی بھی جانتی تھی مگر دوسری طرف وہ رستم کی دگرگوں حالت بھی دیکھ رہی تھی۔ سب سے بری حالت اس کی ٹانگ کی تھی..... یوں لگتا تھا کہ ٹانگ کی کھال مختلف جگہوں سے چر گئی ہے اور لہو اگل رہی ہے۔

اس شکستہ بے آباد مسجد کو چھوڑتے ہوئے شانی جذباتی ہو گئی۔ اس نے محراب و منبر کو دیکھا۔ محراب کے ساتھ والی دیوار پر الوداعی انداز میں ہاتھ پھیرا اور دل ہی دل میں بولی..... اے خانۂ خدا! ہمیں معاف کرنا۔ ہم تیری ویرانی کو رونق تو نہ دے سکے، الٹا تیرے در و بام کی بے حرمتی کی..... تیرے تقدس کو پامال کیا۔ ہم تیرے گناہ گار ہیں..... اور اتنے کم نصیب ہیں کہ خواہش کے باوجود کچھ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتے..... لیکن ہم دعا کرتے ہیں کہ کسی روز

www.pdfbooksfree.pk

تجھے آباد کرنے والے آئیں، تیرے طاقوں میں مدت سے بجھے ہوئے دیے روشن ہوں۔ تیری سنسان دیواروں میں اذان کی آواز گونجے۔ وہ دیوار کو ہاتھ سے چھوتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆=======☆=======☆

سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ خوف کی ایک لہر گاہے بہ گاہے شانی کے سینے سے اٹھتی تھی اور پورے جسم میں پھیل جاتی تھی۔ وہ رستم کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ رستم وہی لینڈ کروزر جیپ ڈرائیو کر رہا تھا جس کے شیشے کلاشنکوف کی مار سے چکنا چور تھے اور جس میں مرنے والوں کا خون لوتھڑوں کی شکل میں جما ہوا تھا۔ وہ وحشی بارش میں موقعہ واردات سے قریباً بارہ کلومیٹر آگے آ چکے تھے۔ اب ان کے اردگرد چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ رستم کے اندازے کے مطابق ان کا رخ مغرب میں بنوں کے پہاڑوں کی طرف تھا۔ ریاض کا طاقتور اڈا کی ٹا کی عین اس جگہ سے ملا تھا جہاں ریاض اور رستم میں کئی منٹ تک دو بدو لڑائی ہوئی تھی۔ اس اڈا کی ٹا کی کے ملنے سے رستم اور شانی کو اتنی تسلی ضرور تھی کہ زخمی ریاض فوری طور پر اپنے ساتھیوں سے رابطہ نہیں کر سکے گا۔ اس کے باوجود وہ تادیر اس جیپ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک کچے راستے پر رستم نے جیپ روک دی۔ اس نے ڈیش بورڈ میں اور نشستوں کے نیچے کوئی کام کی چیز تلاش کرنا چاہی مگر شراب کی چھوٹی بوتلوں، فحش تصویروں والے رسائل کے پنوں اور سگریٹ کے پیکٹوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اپنے اٹیچی کیس کے ساتھ وہ دونوں جیپ سے نکل آئے۔ مسجد سے نکلنے کے بعد سے رستم یکسر خاموش تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی گویائی ہی سلب ہو گئی ہے۔ اس کے سپاٹ چہرے سے شانی کے لیے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شانی کو سب سے زیادہ تشویش اس کی ٹانگ کی طرف سے تھی۔ جیپ سے نکل کر وہ بیس تیس قدم جیپ کے رخ پر ہی چلتے گئے۔ اٹیچی کیس رستم نے ہی تھام رکھا تھا مگر اس کا وزن سہارنے میں شانی اس کی مدد کر رہی تھی۔

''رہنے دیں شانی!'' رستم نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

شانی نے اٹیچی کے ہینڈل پر سے اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ لنگڑاتے ہوئے بیس تیس قدم چلنے کے بعد رستم رک گیا۔ وہ دائیں طرف مڑا۔ یہاں گھاس کی ایک طویل پٹی راستے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ وہ اس پر آ گیا۔ شانی اور وہ دونوں اس گھاس پر چلنے لگے۔ مراب رستم واپس آ رہا تھا۔

''میں سمجھی نہیں رستم؟''

''وہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے شانی۔'' رستم نے..... بدستور ویران لہجے میں کہا۔

اس کی بات شانی کی سمجھ میں آ گئی۔ کچی زمین پر اپنے پاؤں کے نشان بنا کر رستم نے تعاقب کرنے والوں کو الجھانے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ یہاں جھاڑیاں گنجان ہوتی جا رہی تھیں۔ کئی جگہوں پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ راستہ مسدود ہو جائے گا۔ یہ بالکل غیر آباد علاقہ تھا۔ بس کہیں کہیں کسی گائے بھینس کا گوبر یا بکریوں کی مینگنیاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ شانی کو رستم کی قوت برداشت کا علم تھا۔ پھر بھی وہ دیکھ رہی تھی کہ اس سے چلنا دشوار ہوتا جا رہا ہے۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی مگر اس علاقے میں معالج تو درکنار کوئی انسان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رستم کے جسم اور خاص طور سے ٹانگ کی حالت دیکھ دیکھ کر شانی کا دل رو رہا تھا۔

''تھوڑی دیر رک جائیں رستم؟'' شانی نے التجائی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں شانی! یہ خطرناک ہوگا۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

''لیکن آپ کی ٹانگ.....''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔''

وہ جیسا ٹھیک تھا..... شانی کو اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کا تہہ بند گھٹنوں تک کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ کُرتہ سامنے سے پھٹ چکا تھا اور بالائی جسم پر کئی جگہ سنگین کے گہرے کٹ تھے..... خاص طور سے بائیں پہلو پر تو گہرا زخم آیا تھا اور یہاں سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا۔ خون جو رستم کا تھا..... جس کا ایک ایک قطرہ شانی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔

''آپ کے پہلو کا زخم کھلتا جا رہا ہے۔ پلیز! آپ کہیں بیٹھ جائیں۔'' شانی نے روہانسی آواز میں کہا۔

''شانی آپ سمجھنے کی کوشش کریں..... ہمیں زیادہ سے زیادہ دور جانا ہے۔''

رستم نے اسی طرح خود کو گھسیٹتے ہوئے قریباً ایک کلومیٹر سفر مزید طے کیا۔ پھر رستم کی حالت دیکھنا شانی کے بس میں نہیں رہا۔ وہ خود کو نڈھال ظاہر کرتی ہوئی ایک جگہ بیٹھ گئی۔ رستم کو بھی بیٹھنا پڑا۔ شانی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ رستم کے خون اگلتے جسم کو دیکھ سکے۔ بارش اب ہلکی پھوار کی شکل اختیار کر گئی تھی تاہم بادل بدستور موجود تھے۔

کچھ دیر دم لینے کے بعد وہ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ خون کے اخراج کے سبب رستم کا رنگ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شانی جانتی تھی کہ وہ حتی الامکان اپنی حالت کو شانی سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک جگہ وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ انہیں کہیں قریب سے لخ لخ کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی شخص کسی بیل، گھوڑے وغیرہ کو ہانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رستم نے

کُرتے کے نیچے سے پسٹل نکال لیا اور آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ دونوں جھاڑیوں میں رک کر انتظار کرنے لگے۔

''بیل گاڑی لگتی ہے۔'' شانی نے سرگوشی کی۔ رستم نے سر اثبات میں ہلایا۔

یہ ایک بیل گاڑی ہی تھی۔ اس میں دو توانا بیل بندھے ہوئے تھے اور وہ گاڑی کو تیزی سے کھینچتے چلے جا رہے تھے۔ ''گاڑی'' درمیانی عمر کا سرخ و سپید توانا شخص تھا۔ اس نے غالباً بارش سے لطف اندوز ہونے کے لیے بالائی لباس اتار رکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی تھی۔ وہ کچھ گنگنا رہا تھا اور آم چوس رہا تھا۔

رستم نے پسٹل کُرتے کے نیچے چھپایا اور گاڑی کے سامنے آ گیا۔ گاڑی (گاڑی بان) لہولہان رستم کو دیکھ کر ٹھٹکا اور اس نے جلدی سے باگیں کھینچ لیں۔ بیل گاڑی رک گئی۔ صحت مند گاڑی جست لگا کر نیچے اُترا اور رستم کی طرف بڑھا۔ ''او جواناں! کیا ہوا تم کو؟ یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟''

رستم نے کہا۔ ''ہم میاں بیوی آ رہے تھے۔ رستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور گاڑی میں ڈال لیا۔ بڑی مشکل سے جان بچی ہے۔''

گاڑی نے رستم کو سر تا پا دیکھا اور اس کے زخم زخم جسم کو دیکھ کر اس کی روشن آنکھوں میں ہمدردی کی جوت جاگی۔ ''اوئے تیرا تو برا حال ہے برادر تیری گھر والی بھی ساتھ ہے؟''

اس دوران میں شانی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلی اور رستم کے پاس آ گئی۔ ''اوہو..... تیری تو گھر والی بھی کافی پھلل ہے۔'' گاڑی نے تاسف سے کہا۔

پھر اس خیال سے کہ وہ ایک جوان عورت کے سامنے نیم عریاں ہے، اس نے جلدی سے اپنی بھیگی ہوئی قمیص پہن لی۔ اس کی توانا گردن میں چاندی کا بھاری تعویذ اچھا لگ رہا تھا۔

شانی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! میرے شوہر کی ٹانگ بہت زخمی ہے۔ کیا تم ہمیں اپنے ساتھ گاڑی پر بٹھا سکو گے؟''

''یہ کوئی کہنے والی بات ہے میری بھین۔'' گاڑی نے صدق دل سے کہا اور رستم کے ہاتھ سے کیچڑ آلود اٹیچی کیس لے کر بیل گاڑی پر رکھ لیا۔ پھر اس نے رستم کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنے مضبوط کندھے کا سہارا دیا اور بیل گاڑی پر سوار کر دیا۔ شانی بھی رستم کے ساتھ ہی ایک بوری پر بیٹھ گئی۔

''تمہارے ساتھ یہ معاملہ کس جگہ پر ہوا ہے برادر؟'' گاڑی نے پوچھا۔

www.pdfbooksfree.pk

رستم نے اسے مختصراً بتایا کہ وہ کیسے ڈاکوؤں کے جتھے چڑھے اور کیسے نکلے۔

''تمہارے سوٹ کیس میں کوئی بہت قیمتی شے تو نہیں ہے۔ اگر ہے تو اسے گڈ (بیل گاڑی) کے نیچے چھپا دیتا ہوں۔''

''نہیں بھائی! بس عام استعمال کا سامان ہے۔'' شانی بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''یہ ہم کس جگہ پر ہیں بھائی؟''

''ہم عیسیٰ خیل اور بنوں شہر کے درمیان میں ہیں۔ یہاں بہت کم آبادی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا گاؤں نور خیل یہاں سے ڈیڑھ میل آگے ہے۔ میرا نام غلام محمد ہے۔'' گاڑی نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں پشتو لہجے کی ہلکی سی جھلک موجود تھی۔

گاڑی غلام محمد نے مڑ کر ایک بار پھر رستم کی حالتِ زار دیکھی اور پریشان ہو کر بولا۔ ''برادر! تمہیں تو فوری طور پر علاج کی ضرورت ہے۔ تمہارے بہت سا خون نکل گیا ہے۔ گراں پہنچ کر میں تمہارے لیے کوئی انتظام کرتا ہوں۔ اگر نہ ہوا تو پھر ہم تمہیں بنوں کے ہسپتال میں لے جائیں گے۔ تم ایک دم بے فکر رہو۔''

اس نے بیل گاڑی کو تیز ہانکنا شروع کر دیا۔ ہچکولوں سے رستم کو تکلیف ہو رہی تھی اور یہ تکلیف رستم کے چہرے سے عیاں تھی۔ تاہم شانی جانتی تھی کہ پیدل چلنا اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ اپنے گراں کے نزدیک پہنچ کر غلام محمد نے اپنی بھیگی ہوئی چادر نچوڑ کر رستم کو دے دی تاکہ وہ اپنے خون آلود لباس کو چھپا سکے۔ رستم نے اس چادر سے احتیاط کے ساتھ اپنے جسم کو ڈھانپ لیا۔ گیڑی جو اس کے گلے میں پڑی تھی، اس نے دوبارہ اپنے سر پر باندھ لی۔ شانی نے بھی اپنے کیچڑ آلود لباس کو اپنی اوڑھنی میں اچھی طرح چھپا لیا۔

''لگتا ہے تم دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے؟'' غلام محمد نے شانی کے زرق برق لباس سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ نور محمد افسردہ لہجے میں بولا۔ ''پھر تو گہنے وغیرہ بھی گئے ہوں گے؟''

''نہیں، کچھ زیادہ نہیں تھے۔ باقی گھر میں ہی چھوڑ آئے تھے۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

اب آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے ایک دو راہگیر ملے جنہوں نے مقامی لہجے میں غلام محمد سے سلام دعا کی۔ ایک شخص نے غلام محمد کے ساتھ موجود مہمانوں کے بارے میں بھی پوچھا۔ غلام محمد نے گول مول جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔

یہ درختوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی نیم پہاڑی بستی تھی۔ سرسبز درختوں میں چھپے ہوئے نیچی چھتوں والے مکانات تھے۔ بارش رکنے کے بعد شلوار قمیصوں میں ملبوس بہت سے بچے گلیوں میں نکل آئے تھے اور غلیلوں سے چڑیوں کا شکار کر رہے تھے۔ غلام محمد ان دونوں کو سیدھا اپنے گھر میں لے گیا۔ اس گھر میں وہ فقط اپنی جواں سال بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دو تین کمروں والا یہ گھر صاف ستھرا تھا۔ ماں کی طرح بچوں کے چہرے بھی روشن روشن تھے۔ بڑا بچہ پانچ چھ سال کا اور چھوٹا ڈھائی تین سال کا تھا۔ غلام محمد کی تھوڑی سی زمین تھی جہاں وہ کاشت کاری کرتا تھا۔ غلام محمد کی بیوی شانی سے باتیں کرنے لگی اور رستم، غلام محمد کے ساتھ بیٹھک نما کمرے میں چلا گیا۔

غلام محمد کی بیوی آسیہ بنوں شہر سے آگے میرم شاہ کی رہنے والی تھی اور پشتو کے علاوہ پشتو لہجے میں اردو بولتی تھی۔ وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''چھوٹی بہن! تمہارا شوہر تو بہت زخمی ہے۔ اس کو دیکھ کر امارا دل کانپ گیا۔ کیا تم پولیس میں پرچہ کرائے گا؟''

''ہم غریبوں کی کون سنتا ہے بہن۔ خواہ مخواہ کی مصیبت ہی گلے پڑے گی۔ شکر ہے جان بچ گئی۔''

شانی نے غلام محمد کی بیوی کو بتایا کہ وہ خوشاب سے داؤد خیل جا رہی تھی، اپنی شادی شدہ بہن سے ملنے کے لیے..... رستے میں یہ واقعہ پیش آ گیا۔

اتنے میں بیٹھک سے غلام محمد نے آواز دے کر شانی کو بلایا۔ شانی بیٹھک میں پہنچی۔ رستم کا پھٹا ہوا کیچڑ آلود لباس اب غلام محمد کے لباس سے تبدیل ہو چکا تھا۔ تاہم اس لباس پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ پہلو کے گھاؤ پر غلام محمد نے پٹی بھی باندھی تھی مگر یہ پٹی بھی سرخ ہو گئی تھی۔ رستم نیم دراز تھا۔ اس نے اپنی شدید زخمی ٹانگ سامنے لکڑی کی تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔

شانی لرز گئی۔ گھٹنے سے نیچے ٹانگ کا رنگ نیلگوں ہو رہا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ڈیڑھ سال پہلے رستم کی ٹانگ کٹی تھی۔ غلام محمد نے کہا۔ ''ٹانگ کی حالت بالکل اچھی نہیں ہے۔ بہن! میں ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں۔''

''ڈاکٹر کہاں سے آئے گا؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''میری بہن کا بیٹا پکا ڈاکٹر ہے۔ بنوں ہسپتال میں کام کرتا ہے۔ آج کل یہاں نور خیل آیا ہوا ہے، میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔''

شانی نے تذبذب میں رستم کی طرف دیکھا۔ رستم نے رضامندی کے انداز میں آنکھیں

www.pdfbooksfree.pk

بند کرلیں۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور لگتا تھا کہ تکلیف حد سے بڑھی ہوئی ہے۔

غلام محمد چھتری پکڑ کر باہر جانے لگا تو رستم نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ رستم نے کہا۔ ''غلام محمد! میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں کسی کو ہمارے بارے میں اور..... ہماری حالت کے بارے میں پتا نہ چلے.....''

''تم ایک دم بے فکر رہو برادر! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ ان چوروں، ڈکیتوں کی سی آئی ڈی بڑی تیز ہوتی ہے اور یہ ڈاکٹر صیب ہے نا، یہ اپنا بچہ ہے۔ اس کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں۔ جیسا کہیں گے ویسا کرے گا۔''

رستم کو تسلی دے کر غلام محمد تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔ شانی ہمت کر کے رستم کے زخموں کو دیکھنے لگی۔ غلام محمد نے ایک دو جگہ عارضی پٹی بھی باندھی تھی مگر خون پھر بھی رس رہا تھا۔ پہلو کے علاوہ کلائی کا ایک گھاؤ بھی بڑا گہرا تھا۔ ہڈی تک نظر آ رہی تھی۔ شانی کا دل رو رہا تھا۔ وہ اپنی چوٹیں بھول گئی تھی۔ رستم اور شانی کے داغ دار کپڑوں کو بدلنے کے لیے غلام محمد کی بیوی ایک مردانہ اور ایک زنانہ جوڑا لے آئی۔ زنانہ جوڑا شانی کے جسم پر ٹھیک آیا مگر مردانہ جوڑے میں رستم کا بس گزارہ ہی ہو سکا۔ یہ شلوار قمیص تھی۔ یہ گہرے رنگ کی تھی۔ اس پر بھی خون کے ایک دو دھبے نمودار ہوئے مگر یہ زیادہ نمایاں نہیں تھے۔

کچھ ہی دیر بعد اٹھائیس تیس سال کا ایک خوش رُو شخص اندر آ گیا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے رستم کا معائنہ کیا۔ ٹانگ کی حالت دیکھ کر اس کے کلین شیو چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

''ٹانگ کا زخم تھوڑا پرانا لگ رہا ہے..... اور لگتا ہے خاصا سپھک ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں جی! چار پانچ دن پہلے موٹر سائیکل سے گر گئے تھے۔'' شانی نے مختصر وضاحت کی۔

مقامی ڈاکٹر دھیان سے زخم دیکھتا رہا۔ ٹانگ کی مجموعی حالت دیکھ کر اسے الجھن ہو رہی تھی..... وہ شانی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''پہلے بھی اس ٹانگ کا کافی بڑا آپریشن ہو چکا ہے۔''

''ہاں جی! یہ کافی پرانی بات ہے۔ ان کی ٹانگ کٹ گئی تھی..... بس کے حادثے میں۔''

ڈاکٹر نے اس حوالے سے ایک دو سوال پوچھے۔ شانی نے مناسب جواب دیئے تاہم ڈاکٹر کے چہرے پر الجھن برقرار رہی۔ وہ غلام محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ماموں! میں مرہم پٹی تو کر دیتا ہوں۔ ایک دو زخموں کو ٹانکے لگنے ہیں، وہ بھی لگا دیتا ہوں مگر ٹانگ کی طرف سے

مجھے تسلی نہیں ہے..... اللہ کرے، ایک آدھ دن میں بہتر ہو جائے ورنہ ان کو ہسپتال لے جانا ضروری ہے۔''

غلام محمد نے شانی کی طرف دیکھا۔ شانی بولی۔ ''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! اگر ان کی حالت کچھ ٹھیک ہو جائے تو میں ان کو واپس خوشاب لے جاؤں گی۔ وہاں میرے ایک دو رشتے دار ہیں.....''

ڈاکٹر کا نام بایزید خان تھا۔ وہ سرجری کورس بھی کر رہا تھا۔ اس کے میڈیکل باکس میں طبی امداد کا کافی سامان موجود تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے رستم کا شدید درد اور بخار کم کرنے کے لیے اسے دو انجکشن دیئے۔ پھر اس کے زخموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس نے دلجمعی سے کام کیا اور مرہم پٹی مکمل کر لی۔ شانی نے اپنی زخمی انگلیاں اوڑھنی میں چھپائے رکھی تھیں۔ چونکہ انگلیوں کا زخم بھی تھوڑا پرانا تھا، اس لیے وہ اسے ڈاکٹر کے سامنے لانا نہیں چاہتی تھی۔ ڈاکٹر بایزید خان نے جاتے جاتے غلام محمد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ماموں! ان کو بستر پر آرام کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی ٹانگ کو جتنا کم سے کم ہلائیں اتنا ہی بہتر ہے۔''

دن ڈھلتے ہی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ یہ سلسلہ چراغ جلنے تک چلتا رہا۔ اس چھوٹی سی بستی میں بجلی نہیں تھی۔ شام ہونے کے کچھ ہی دیر بعد کھانا وغیرہ کھا لیا گیا اور بستی پر غنودگی چھانے لگی۔ شانی اور رستم کے لیے بیٹھک نما کمرے میں ہی سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں وہ دونوں جاگتے رہے۔ باہر تواتر سے بارش کا پانی کچے پکے مکانوں پر گرتا رہا اور گاہے بہ گاہے بجلی چمکتی رہی۔

رستم اور شانی کی چارپائیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ رستم کمر تک چادر اوڑھے چت لیٹا تھا..... بالکل خاموش..... اور ساکت! شانی نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ کو تھاما اور اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ ہاتھ کتنی دیر رستم کے ہونٹوں پر رکھا رہا پھر رستم کی کھوئی کھوئی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''شانی! میں بہت شرمندہ ہوں..... مجھے معاف کر دیں۔''

''کس بات کی معافی رستم!''

''میں اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ مجھے اس وقت اس گُنت (ریاض) کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آپ کو گھسیٹا..... آپ کو زخمی کیا۔ آپ سے کھینچا تانی کی۔ مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے اس ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دوں۔''

www.pdfbooksfree.pk

''آپ نے کچھ نہیں کیا لیکن اب آپ ایسی باتیں کر کے مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ کیا آپ کے پہلے زخم کم ہیں جو اور زخم لگانے کا سوچ رہے ہیں۔ آپ کو..... آپ کو کیا پتا، آپ کے جسم سے نکلنے والا خون کا ایک ایک قطرہ میری جان کو نچوڑ رہا ہے۔''

اس نے بڑے جذباتی انداز میں رستم کا زخمی ہاتھ چوما اور چومتی چلی گئی۔ وہ بڑی نرمی اور آہستگی سے اس کے بستر میں چلی آئی۔ اس کے سینے، گردن اور رخساروں کو شانی نے کئی بار بوسہ دیا پھر نرم ریشم کی طرح اس سے لپٹ کر اشک بہانے لگی۔

رستم نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''شانی! بس ایک بار..... اپنی زبان سے کہہ دیں..... آپ نے مجھے معاف کیا۔ میری سختی کے لیے مجھے معاف کیا..... ایک بار کہہ دیں۔''

اس کا یہ جذباتی پن شانی کو ششدر کر دیا کرتا تھا۔ وہ آج بھی ششدر ہو گئی۔ معافی تو شانی کو مانگنی چاہیے تھی۔ رستم کی زندگی کا اولین مقصد شانی کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ ریاض، بدترین مات کھانے کے باوجود رستم سے بچ کر نکل گیا..... اور وہ اس بہت بڑی بات کو یکسر بھول کر شانی کی چند خراشوں کے لیے اس سے معافی تلافی کر رہا تھا۔

شانی کا دل چاہا کہ اسے اپنے سینے میں سمیٹ لے۔ اس کی ساری ذہنی اور جسمانی تکلیفوں سمیت اسے ہر بلا سے بچا کر کہیں دور نکل جائے..... دنیا کے کسی انجانے گوشے میں! کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے لیے ایک بھرپور کوشش کی جا سکتی ہے؟ وہ رستم کے شانے سے لگے لگے اور آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ ''آپ جو چاہتے تھے..... وہ ہو گیا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو گیا ہے کہ ڈیرے پر ظلم کرنے والے اصل لوگ مارے گئے ہیں۔ ریاض بھی بری طرح زخمی ہوا ہے اور آپ کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہونے کے بعد جان بچا کر بھاگا ہے..... کیا یہ سب کافی نہیں ہے؟'' اس نے آخری سوال بہت ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

رستم کافی دیر خاموش رہا پھر اس نے عجیب دل فگار لہجے میں کہا۔ ''شانی! کاش میرے بس میں ہوتا۔ میں ان لوگوں کو بار بار زندہ کر کے مار سکتا ہے..... آپ میری بات چھوڑیں..... آپ بتائیں کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟''

''رستم! کیا ہم..... ڈپٹی ریاض کو معاف نہیں کر سکتے؟''

''شانی! آپ..... آپ.....'' وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ زخمی آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔

کتنی ہی دیر گھمبیر خاموشی طاری رہی۔ نیم تاریکی میں بارش کی صدا گونجتی رہی یا ان کے دھڑکتے دلوں کی آہٹ سنائی دیتی رہی۔ آخر شانی نے ایک بار پھر اسے اپنے نرم بازوؤں میں سمیٹا اور آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ ''رستم! زندگی میں بس ایک بار آپ سے کچھ مانگنا

چاہتی ہوں، اس کے بعد کبھی نہیں..... کچھ نہیں.....''

رستم کے جسم میں لرزش نمودار ہوئی۔ اس نے چند گہری سانسیں لیں اور عجیب لہجے میں کہا۔ ''آپ کچھ نہ مانگیں شانی..... آپ..... بس حکم دیں۔''

شانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''حکم نہیں رستم! ایک التجا..... شاید پہلی اور آخری۔''

''آپ کہیں بی بی!''

شانی نے رستم کو کچھ اور بھی اپنی بانہوں میں سمویا اور بولی۔ ''رستم! آئیں..... اپنی زندگی بچانے کی ایک آخری کوشش کریں..... سب کچھ بھول کر، سب کچھ معاف کر کے..... یہاں سے کہیں نکل جائیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں دشمنی اور بدلے کی یہ آگ نہ پہنچ سکے۔ جہاں بس میں اور آپ ہوں..... کوئی نہ ہو..... کوئی بھی نہیں۔''

شانی کی بانہوں میں رستم ساکت تھا۔ بالکل بے جان..... بے روح..... شانی کو لگا، دھڑکن کے سوا اس کے جسم میں زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں۔ خاموشی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ شانی کے کان رستم کی آواز سننے کے لیے بے تاب تھے۔ آخر یہ آواز ابھری اور شانی کی منتظر سماعت سے ٹکرائی۔ یہ عجیب آواز تھی، یہ عجیب لہجہ تھا۔ رستم نے کہا۔ ''شانی! یہ کیسے ہو سکتا ہے..... آپ کچھ کہیں اور میں ماننے سے انکار کر دوں..... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں.....''

رستم کی آنکھ سے ٹپکنے والا ایک گرم آنسو شانی کی پیشانی پر گرا اور اس کے رخسار کی طرف بہہ گیا۔

''شکریہ رستم..... شکریہ!'' شانی نے کہا اور اس کے گرد اپنی نرم بانہوں کا حصار مضبوط کر دیا۔ وہ کیا تھا۔ ایک سرکش ہوا تھا..... ایک بے اماں موج تھا۔ پنجاب پولیس کی ہتھکڑیوں میں استعمال ہونے والا بے شمار لوہا اسے زنجیر کرنے میں ناکام رہا تھا..... لیکن ان لمحوں میں وہ کسی ناتواں جسم کی طرح شانی کی بانہوں میں تھا۔ اس نے جیسے خود کو شانی کی بانہوں میں گرا دیا تھا۔ اس کی مرضی کے سپرد کر دیا تھا۔

وہ وارفتگی سے گویا ہوئی۔ ''رستم! آپ کی ٹانگ ذرا بہتر ہو جائے تو ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ ہم پارہ چنار اور خرلاچی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ بس ایک دن کا سفر ہے۔ یہ ایک دن کا سفر کچھ بھی نہیں۔ ہم یہ طے کر لیں گے۔ وہاں خرلاچی کے قریب وہ سب موجود ہیں۔ ناصر، جہانگیر، زری..... اور پہلوان..... وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جتنا انتظار کر سکے، ضرور کریں گے۔'' اس نے چند لمحے توقف

www.pdfbooksfree.pk

کیا اور رستم کو گفتگو میں شامل کرنے کے لیے بولی۔ ''افغان بارڈر خرلاچی سے کتنی دور ہے رستم؟''

''بس ایک دو میل۔'' رستم نے جواب دیا۔

''یہ کچھ بھی نہیں ہے اور ہم بارڈر پار نہ بھی کریں تو بھی وہ ایسا علاقہ ہے جہاں بڑی آسانی سے کچھ عرصے کے لیے چھپا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے شانی..... جیسا آپ کہیں۔''

''آپ کی..... اپنی رائے کیا ہے؟ کیا ہمیں پارہ چنار اور خرلاچی کی طرف جانا چاہیے؟''

''ہم..... کسی بھی طرف جا سکتے ہیں لیکن.....''

''لیکن کیا رستم؟''

وہ زخمی آواز میں بولا۔ ''لیکن یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے شانی..... کسی صورت نہیں..... ڈپٹی ریاض بے حد عیار بندہ ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اگر ہم نکلے تو کس طرف جائیں گے۔''

''زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اپنی بھرپور کوشش کریں گے رستم! کیا پتا..... کیا پتا.....'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ چند لمحے بعد وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''رستم! میرے ابا جی اللہ بخشے کہا کرتے تھے کہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر درگزر کرنے والا اور معاف کرنے والا خدا کو بہت پسند ہے۔ کیا پتا رستم! ہماری یہ چھوٹی سی نیکی ہی ہمارے کسی کام آ جائے اور ہم مصیبتوں کے اس گھیرے سے نکل جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے نا رستم؟''

''آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا شانی۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

شانی نے اس کا زخمی رخسار چوما۔ ''تو پھر آنکھیں بند کر کے سو جائیں..... کل جب صبح ہو گی تو ہم ایک نئے انداز سے سوچیں گے۔''

''آپ بھی سو جائیں۔''

''نہیں، میں جاگوں گی۔'' شانی بولی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو مزید مدھم کر دی اور رستم کے لمبے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں چلانے لگی۔ کمرے سے باہر رات کسی ناگن کی طرح آگے کو سرک رہی تھی۔ اس کی پھنکار میں اَن گنت اندیشے سرسرا رہے تھے۔

صبح نکھری ہوئی تھی مگر شانی کی آنکھوں میں یہ ''نکھار'' رستم کی تکلیف کے سبب دھندلایا

ہوا تھا۔ رات آخری پہر رستم کی ٹانگ کی تکلیف مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ حتی الامکان ضبط کر رہا تھا مگر کاہے بہ گاہے کراہنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ صبح سویرے ہی غلام محمد اپنے ڈاکٹر بھانجے کو بلانے چلا گیا۔ ڈاکٹر بایزید خان نے آ کر رستم کی ٹانگ کی پٹی کھولی..... شانی نے دیکھا کہ رستم کی پوری پنڈلی میں تریڑیں سی نمودار ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ گوشت مُردہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کانپ گئی۔ ٹانگ کی یہ کیفیت اس حصے تک تھی جو ڈیڑھ دو سال پہلے رستم کے جسم سے دوبارہ جوڑا گیا تھا۔

تو کیا..... رستم کی ٹانگ کا یہ حصہ دوبارہ اس کے جسم سے جدا ہو رہا ہے؟ یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح شانی کے دل میں پیوست ہو گیا۔

تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر بایزید خان نے مایوسی سے سر ہلایا اور شانی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ شانی باہر آئی تو بایزید خان نے کہا۔ ''آپ کے شوہر کی حالت ٹھیک نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ انہیں فوری طور پر ہسپتال لے جائیں۔''

''لل..... لیکن۔'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

''دیکھیں، آپ اس معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' ڈاکٹر بایزید خان نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ ٹانگ کا زہر جسم میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے اگر یہ واقعی پھیل گیا تو..... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جان بھی جا سکتی ہے۔''

شانی کا سینہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہاں کوئی پرائیویٹ ہسپتال نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے۔''

''آپ ہسپتال سے اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں؟'' ڈاکٹر نے شانی کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی بات ہے تو بتائیں۔ ہمیں دھوکے میں نہ رکھیں۔''

''کوئی بات نہیں ڈاکٹر! بس ان لوگوں سے ڈر آ رہا ہے جنہوں نے ہمیں پکڑا تھا۔''

اس جواب سے ڈاکٹر بایزید خان پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ رستم کی ٹانگ کے حوالے سے بھی اس کے چہرے پر شدید الجھن نظر آ رہی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''آپ کے شوہر کی زخمی ٹانگ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ ٹانگ مکمل طور پر اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ جسم کے ایسے حصے دوبارہ جوڑے نہیں جا سکتے۔ اگر یہ جڑ بھی جائیں تو زندہ نہیں رہتے۔ مگر یہ جڑا ہوا ہے۔ کیا یہ ٹانگ بالکل علیحدہ ہو گئی تھی؟''

''نہیں جی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ کچھ رگیں جڑی رہ گئی تھیں۔''

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔ ویسے، یہ آپریشن ہوا کہاں تھا؟'' ڈاکٹر بایزید خان نے تفتیشی

www.pdfbooksfree.pk

انداز میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب میں کچھ کہتی، غلام محمد تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا اور آنکھوں میں تشویش دکھائی دیتی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور شانی کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو بی بی؟''

''میں نے آپ کو بتایا تھا۔''

''تم نے غلط بتایا تھا۔ تم وہ نہیں ہو۔ پولیس اردگرد کی بستیوں میں تم دونوں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ وہ جو کچھ بتا رہے ہیں، وہ بہت حیران کرنے والا ہے۔''

شانی سمجھ گئی کہ ان کے میزبان پر بہت کچھ ظاہر ہو چکا ہے۔ اب کچھ چھپانا بے سود تھا۔ وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ''میں آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہوں گی۔ جو کچھ مجھ پر اور میرے ساتھی پر بیتی ہے، سب کچھ آپ کو بتا دیتی ہوں۔ اس کے بعد آپ جو فیصلہ بھی کریں، مجھے قبول ہے۔ ہمیں چھوڑ دیں، ماردیں..... یا پولیس کے حوالے کر دیں۔ جو آپ کا جی چاہے۔''

''تم کیا بتانا چاہتی ہو؟'' غلام محمد نے پوچھا۔

''سب کچھ..... اگر کہتے ہیں تو بالکل شروع سے بتا دیتی ہوں۔''

''ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تم بتاؤ، مجھے اس سے زیادہ پتا ہو۔'' غلام محمد نے عجیب آہنگ میں کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''رستم سیال کا نام ہمارے لیے نیا نہیں ہے اور خاص طور سے میرے لیے اور رستم کے ساتھ ساتھ میں تمہارے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ تم شانی بی بی ہو نا..... رنگ والی کی چوہدرانی؟'' غلام محمد نے لرزتے لہجے میں کہا۔ شانی حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ غلام محمد کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ ''ہاں شانی بی بی! یہاں بہت سے لوگ تمہارے اور رستم کے بارے میں جانتے ہیں۔ سچ پوچھو تو لالا فرید، رستم سیال اور حسنے گجراتی نے ہم لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی ہوئی ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے سیکسر میں اجرالی سرداروں کے ہاتھ توڑے اور ہم جیسے بے سہارا لوگوں کو ان کی زور دستیوں سے بچایا..... لالے فرید کے ننھیالی ہمارے علاقے کے تھے۔ وہ اکثر یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے..... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن مجھ جیسے نمانے، ناچیز کے گھر میں لالے کا ساتھی رستم سیال آئے گا۔ میں بڑا چھوٹا بندہ ہوں۔ اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ پھر بھی جو کچھ مجھ سے اور میرے گھرانے سے ہو سکا، میں تم لوگوں کے لیے ضرور کروں گا۔''

''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔'' شانی نے کہا۔

''ہاں بی بی! میں نے اس سے پہلے کبھی رستم سیال کو یا آپ کو نہیں دیکھا۔ نہ کبھی کسی سے ملا ہوں۔ بس ایک دو دفعہ لالے فرید کو دور سے دیکھا تھا..... صرف ایک دو دفعہ لیکن ہمارے گراں کے بہت سے لوگ آپ کو نہ جانتے ہوئے بھی جانتے ہیں۔ آپ ہمارے اپنے ہیں۔'' غلام محمد کا گلا رندھ گیا۔

''مگر ہم آپ پر بوجھ بننا نہیں چاہتے۔ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ بس ان کی ٹانگ.....''

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا بی بی۔ آپ کوئی بوجھ دل پر نہ رکھیں۔ ہم تو وہ لوگ ہیں بی بی جو کسی کو بھی پناہ دے دیں پھر پیچھے نہیں ہٹتے۔ آپ تو رستم سیال اور شانی بی بی ہو۔''

ڈاکٹر بایزید خان خاموش کھڑا تھا۔ ابھی تک اس نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی نظر آتا تھا۔ غلام محمد نے شانی کو تو رستم کے پاس بھیجا اور خود بایزید کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رستم ٹرنکولائزر کے زیر اثر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کی ہلکی کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کی پنڈلی کا رنگ اور جلد کی کیفیت دیکھ کر شانی کا دل خون ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پنڈلی تا دیر اس کے جسم کا حصہ نہیں رہ سکتی۔

پندرہ بیس منٹ بعد غلام محمد نے شانی کو پھر پہلے والے کمرے میں بلایا۔ ڈاکٹر بایزید خان جا چکا تھا۔ غلام محمد نے افسردہ لہجے میں شانی کو بتایا کہ رستم کی ٹانگ کے بارے میں بایزید کی رپورٹ اچھی نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ٹانگ کے ٹھیک ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ رستم کے جسم کے ساتھ رہی تو اس کی زندگی سخت خطرے میں پڑ جائے گی۔

شانی کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ڈاکٹر بایزید خان جو کہہ رہا ہے وہ درست ہے لیکن اس بات کو قبول کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا..... اگلے ایک گھنٹے کے اندر شانی کے دل و دماغ میں ایک جاں گسل کشمکش جاری رہی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا اور اکیلے کرنا تھا..... وہ ایک طوفان کی زد میں تھی۔ غلام محمد نے شانی کو بتا دیا تھا کہ اگر ٹانگ کو علیحدہ کرنا ہوا تو ہسپتال کی ضرورت پڑے گی۔ تاہم وہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ بایزید خان یہیں پر یہ کام کرنے کو تیار ہو جائے۔

سہ پہر تک رستم کی حالت مزید بگڑ گئی۔ اسے تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بولا۔ ''شانی! یہ ٹانگ میری جان لے لے گی۔ اس میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کو کاٹ کر پھینک دیں۔''

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے اس کے رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ ”کچھ بھی آپ کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔ ہم جو فیصلہ کریں گے، سوچ سمجھ کر کریں گے..... اور آپ کا مشورہ لیں گے۔“

”میرا کوئی مشورہ نہیں ہے شانی۔ میں نے سب کچھ آپ پر چھوڑ دیا ہے..... سب کچھ آپ پر۔“ وہ جیسے کہیں بہت دور سے بول رہا تھا۔

اسی دوران میں ڈاکٹر بایزید خان آ گیا۔ وہ بڑی تکلیف دہ شام تھی۔ یہ نامہرباں شام..... جیسے شانی کو روندتی اور کچلتی ہوئی گزر گئی۔ اسے ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا پڑا۔ ڈاکٹر بایزید خان بالکل تیار نہیں تھا لیکن وہ ماموں کے اصرار کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ ناکافی سامان اور غیر موزوں ماحول کے باوجود اس نے تین لالٹینوں کی روشنی میں ایک گھنٹے کا آپریشن کیا اور رستم کی نیم مُردہ ٹانگ اس کے جسم سے علیحدہ کر دی۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ رستم کے جسم کا وہ حصہ جو کچھ عرصہ پہلے ایک غیر فطری عمل کے تحت اس کے جسم سے جوڑا گیا تھا پھر علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ شاید کبھی اس کے جسم کا حصہ بنا ہی نہیں تھا۔ وہ بس ایک ”تجربہ“ تھا..... جو کچھ دیر چلنے کے بعد ناکام ہو گیا تھا یا پھر ایک حیران کن پودے کی طلسم کاری تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنا اثر کھو بیٹھی تھی.....

☆=======☆=======☆

اگلے 72 گھنٹے میں شانی نے مہمان نوازی اور بے لوث قربانی کی ایسی مثال دیکھی جسے آخری سانس تک بھلانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ غلام محمد شاید ان فرشتوں میں سے تھا جو اب بھی کہیں کہیں اس زمین پر بسیرا رکھتے ہیں۔ شانی اور رستم کو پناہ دے کر وہ اپنے چھوٹے سے بنتے کھیلتے گھرانے کے لیے ایک شدید ترین خطرہ مول لے رہا تھا مگر اسے پرواہ نہیں تھی۔ شانی کی ہر بات کے جواب میں وہ بڑی خوش دلی سے پوٹھوہاری کا ایک شعر بولتا تھا جس کا مطلب تھا..... بندہ پانی میں غوطہ لگا کر سوکھا رہ سکتا ہے مگر اس مصیبت سے نہیں بچ سکتا جو اس کے مقدر میں ہو اور نہ اس راحت سے محروم رہ سکتا ہے جو اس کے نصیب میں ہو۔ وہ لالے فرید کا پرستار تھا اور اس حوالے سے رستم کا بھی۔ اس کا رویہ دیکھ کر شانی کو ڈھوک شاہاں کی وہ ایثار پیشہ لڑکی مہراں یاد آ گئی جس کے بارے میں رستم نے اسے بتایا تھا۔ مہراں نے رستم کو ایک مشکل صورتِ حال سے نکالنے کے لیے اپنا کومل جسم ایک نہایت مکروہ اور کرخت شخص کے حوالے کر دیا تھا۔ غلام محمد کا ایثار بھی مہراں سے کم نہیں تھا..... اپنی حاملہ بیوی اور دو پھول جیسے بچوں کی زندگی کی پرواہ کیے بغیر تن من دھن سے شانی اور رستم کا سہارا بنا ہوا تھا۔ شانی نے

سوچا..... جب تک ظلم رہے گا، تب تک ظلم سے ٹکرانے والے اور لہولہو ہونے والے بھی رہیں گے اور جب تک لہولہو ہونے والے رہیں گے، گمنام بستیوں میں ان کا سہارا بننے والے مہرباں..... اجمل خان اور غلام محمد بھی رہیں گے

حیرت انگیز طور پر رستم کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ خون کی کمی کے سبب اس کا رنگ گہرا زرد تھا۔ بخار اور شدید درد میں افاقہ تھا۔ آج وہ لاٹھی کے سہارے دو چار قدم چلا بھی تھا۔ ڈاکٹر بایزید خان روزانہ آ کر رستم کے زخموں کی بینڈیج کر رہا تھا..... خاص طور سے اس کی ٹانگ کی۔ تاہم شانی صاف محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر بایزید خان اس ساری صورتِ حال سے خوش نہیں ہے۔ وہ شانی اور رستم سے بس بہت ضروری بات ہی کرتا تھا۔ شانی دل سے سمجھتی تھی کہ بایزید خان کا رویہ بے جا نہیں ہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی سوچتا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جلد از جلد رستم کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔ مگر غلام محمد جو اطلاعات پہنچا رہا تھا۔ ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ تلاش کرنے والے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی تک یہی غنیمت تھا کہ وہ نورخیل نائی اس چھوٹی سی الگ تھلگ بستی میں نہیں پہنچے تھے۔ اگر وہ پہنچ جاتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ شانی پچھلے دو دن میں گاہے بہ گاہے رستم کے موبائل فون پر بھی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس کے دل میں یہ موہوم آس موجود تھی کہ شاید کسی طرح ناصر اور جہانگیر وغیرہ سے رابطہ ہو سکے لیکن یہاں سگنلز ہی نہیں مل رہے تھے۔

تیسرے روز رات کو شانی اور غلام محمد میں دیر تک بحث ہوئی۔ آخر شانی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ”بھائی! اگر آپ ہمارے جانے کا انتظام نہیں کریں گے تو ہم از خود نکل جائیں گے۔ اُلر پیدل چلنا پڑا تو پیدل چل پڑیں گے..... اور ایسا کرنے سے جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہو گا، اس کے ذمے دار آپ لوگ ہوں گے۔“

شانی کے فیصلہ کن رویے نے غلام محمد کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی بیوی سے تا دیر مشورہ کیا۔ بیوی، غلام محمد کی چچازاد تھی۔ وہ بھی اسی کی طرح کھلے دل اور حیران کن اخلاق کی مالک تھی۔ شانی نے دیکھا تھا، ہر معاملے میں میاں بیوی کی رائے ایک ہوتی ہے۔ یہ بڑا پیارا سا گھرانہ تھا..... ایک ایسا ہی گھرانہ جو کہیں شانی کے ذہن میں بھی بسا ہوا تھا..... مگر اب شانی کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔ گھر والی سے مشورہ کرنے کے بعد غلام محمد نے شانی کو بتایا کہ وہ آٹھ دس گھنٹے میں ان کے جانے کا انتظام کر دے گا۔

رات کو لالٹین کی روشنی میں شانی اور رستم کے درمیان پھر مکالمہ ہوا۔ رستم نے بے حد افسردہ لہجے میں کہا۔ ”شانی! اب تو میں اور بھی بے کار ہو گیا ہوں۔ ہمیں حقیقت کو مان لینا

www.pdfbooksfree.pk

چاہیے۔ یہ لوگ ہمیں پارہ چنار کی طرف نکلنے نہیں دیں گے۔ آپ کے پاس اب بھی موقع ہے، آپ.....''

شانی نے رستم کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اگر آپ نے ایسی باتیں کرنی ہیں تو پھر مجھے اپنے ہاتھ سے ختم کر دیں۔''

رستم چپ ہو گیا۔ گردن ایک بار پھر جھک گئی۔ شانی نے کہا۔ ''آپ اندھیرا دیکھ رہے ہیں مگر مجھے امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں۔ آپ نے خود بتایا ہے کہ خرلاچی گاؤں تک تقریباً ایک دن کا سفر ہے۔ ہم لوکل بس پر یہ سفر کر سکتے ہیں۔''

''لیکن سڑک تک کیسے پہنچیں گے؟'' رستم نے پوچھا۔

''اس کا انتظام غلام محمد کر رہا ہے۔ وہ گندم اور تمباکو وغیرہ لے کر ایک قریبی قصبے کی طرف جاتا ہے۔ وہ ہمیں اپنی بیل گاڑی میں چھپا کر لے جائے گا۔''

رستم کسی دل سوز سوچ میں گم رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ''شانی! کہیں آپ کے ذہن میں یہ خیال تو نہیں کہ آپ نے..... آپ نے بالکل آخری لمحوں میں ریاض کی جان بچا لی ہے۔ اس کے بدلے میں وہ بھی ہم سے کسی طرح کی رعایت کرے گا۔''

''رستم! ہم نے جو کچھ کیا کسی بدلے کے لیے نہیں کیا۔ ہم نے اپنا کام کیا۔ اس نے کیا کرنا ہے یہ سوچنا اس کا کام ہے۔''

''شانی! اگر آپ کے ذہن کے کسی دور دراز کونے میں بھی یہ بات موجود ہے تو اسے نکال دیں۔ ریاض کو میں اس کی پیدا کرنے والی ماں سے بھی بڑھ کر جانتا ہوں۔ وہ بد ذات..... کُتے کی اس دُم جیسا ہے جو سو سال حقے کی نلی میں رہ کر بھی ٹیڑھی رہتی ہے۔''

''میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی رستم۔ ہمیں تو بس اپنے بارے میں سوچنا ہے، یہاں سے نکلنے کے بارے میں۔''

رات دو بجے کے لگ بھگ غلام محمد کہیں سے ایک پرانی بیسا کھی لے آیا۔ یہ لاٹھی کی نسبت بہت بہتر تھی..... اور یہ رستم کے لیے نئی شے نہیں تھی۔ روکیٹ بستی میں وہ کئی ماہ اس کے سہارے چلتا رہا تھا..... اور وہ دن اس کی زندگی کے سہانے دنوں میں سے تھے۔ وہ مر کر بھی انہیں نہیں بھول سکتا تھا۔ غلام محمد نے ایک بڑی سی خستہ حال چادر کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ اس میں ایک پیوند لگا ہوا تھا۔ اٹیچی کیس میں سے کلاشنکوف گولیاں اور دستی بم نکال کر ایک بستر میں گول گول لپیٹ دیئے گئے۔ اس بستر کو سوت کی رسی سے باندھ دیا گیا۔ شانی نے رستم کے لمبے بال سمیٹ کر اور پن کر کے ایک کام دار ٹوپی میں چھپا دیئے۔ غلام محمد کی بیوی آسیہ نے

دیسی گھی کے پراٹھے اور تلے ہوئے انڈے..... راستے میں ناشتہ کرنے کے لیے ایک بڑے رومال میں لپیٹ دیئے۔ رات آخری پہر تین بجے کے لگ بھگ رستم اور شانی جانے کے لیے تیار تھے۔ ڈاکٹر بایزید خان موقع پر موجود تھا..... اس کے چہرے پر تناؤ تھا..... وہ جیسے جلد از جلد رستم اور شانی کو اس گھر سے باہر دیکھنا چاہتا تھا۔

وقتِ رخصت شانی نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا، وہ ہم بھول نہیں سکتے، اس موقع پر شکریے کے سارے لفظ چھوٹے محسوس ہو رہے ہیں۔''

بایزید کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ اس نے ذرا سا مسکرانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ شانی دل کی گہرائی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں ڈاکٹر! آپ پریشان ہیں۔ آپ کو اندیشہ ہے کہ ہم نے جلد بازی سے دیر پکڑے جانا ہے۔ میں آپ کے اندیشے کو غلط نہیں کہہ سکتی مگر ایک بات کا آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ ہم پکڑے گئے اور بدترین تکلیف سے بھی گزرے تو آپ کا اور آپ کے ماموں کا نام ہماری زبانوں پر نہیں آئے گا..... مرتے دم تک بھی نہیں۔''

اس بار بایزید خان نے صرف شکریہ کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ مزاجاً ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند شخص لگتا تھا۔

گھر کے کشادہ صحن میں گندم کی چھوٹی بوریوں سے لدی ہوئی بیل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس میں بڑی سمجھ داری سے رستم کے لیے اور شانی کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ بستر بند کو غلام محمد نے اپنے پاس رکھنا تھا۔ رستم کو بیل گاڑی پر چڑھے میں تھوڑی سی دشواری ہوئی۔ جب رستم اور شانی اوپر پہنچ گئے تو غلام محمد نے تمباکو کے چند گٹھے اور تین چار گندم کی بوریاں مزید رکھ کر ان دونوں کو بالکل چھپا دیا۔

بیل گاڑی کا سفر طویل اور بے حد تناؤ والا تھا۔ اندیشوں کے دیو..... ان کے اردگرد چنگھاڑ رہے تھے۔ باہر سے آنے والی ہر آواز پر انہیں کسی پولیس اہلکار یا اجرالی ہرکارے کا شبہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی شانی کے ذہن میں ڈاکٹر بایزید خان کے حوالے سے بھی ہلکا سا شک گزرتا تھا کہ کہیں وہ کسی طرح کی مخبری نہ کر دے مگر اس نسبت سے آخر تک خیریت ہی گزری۔ صبح تین بجے کے چلے ہوئے وہ دوپہر کو منزل تک پہنچے۔ غلام محمد نے ان کو باہر نکالا۔ یہ جھاڑیوں سے گھری ہوئی ایک جگہ تھی۔ سامنے بلند اور خشک پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ ''وہ سامنے سڑک ہے برادر! مل جانے والی بس یہاں سے مل جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پارہ چنار کی بس ہی مل جائے۔''

''اب آپ جائیں۔'' شانی نے آنکھوں میں اشک لے کر کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

''نہیں نہیں، جب تک آپ سوار نہ ہوں گے، میں یہیں رہوں گا۔''

رستم یکسر خاموش تھا۔ اپنی جسمانی تکلیف اور ذہنی رنج والم سے لڑتا ہوا..... اس نے جیسے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شانی کے بہاؤ کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ ریاض سے ہونے والے خونی ٹکراؤ کے بعد سے اس پر عجیب بے حسی طاری تھی۔

اپنے محسن غلام محمد سے رخصت ہونے کے بعد شانی اور رستم پروگرام کے مطابق علیحدہ علیحدہ پختہ سڑک کی طرف بڑھے۔ میلی کچیلی چادر میں لپٹا ہوا اور بیساکھی کے سہارے..... بہ مشکل چلتا ہوا رستم ایک قابل رحم شخص لگ رہا تھا۔ گول بستر اس کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ شانی اس سے کافی پیچھے تھی۔ دونوں سڑک کے کنارے ایک سنگ میل پر پہنچے۔ یہاں دیسی برقعے میں لپٹی ہوئی دو عورتیں اور تین خان صاحبان کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ دو تین بچے بھی تھے۔ شانی اور رستم ایک دوجے سے دور اور لاتعلق کھڑے رہے۔ شانی نے اپنا جسم اور چہرہ مکمل طور پر مقامی طرز کی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر قطعی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کس عمر کی عورت ہے۔

بس نے تھوڑا سا انتظار تو کرایا لیکن خوشی کی بات یہ تھی کہ یہ سیدھی پارہ چنار جانے والی بس تھی۔ رستم کے سوار ہونے کے بعد شانی بھی سوار ہوگئی۔ وہ دونوں بس کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں بیٹھے۔ رستم بستر بھی بس کے اندر لے جانے میں کامیاب رہا۔ شانی اگلے حصے میں تھی اور گاہے بہ گاہے کن انکھیوں سے دیکھ لیتی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے جیسے بہت دور تھا۔ کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا..... غمزدہ و رنجور! جسمانی تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

☆=======☆=======☆

ٹل میں بس صرف آدھ گھنٹہ رکی اور پارہ چنار کی طرف روانہ ہوگئی۔ خشک پہاڑوں اور مفلس کھیتوں کے درمیان یہ ایک طویل تھکا دینے والا سفر تھا۔ شانی اور رستم کے لیے یہ اعصابی طور پر بھی تھکا دینے والا تھا۔ راستے میں انہیں کئی جگہ لیویز کے ناکے نظر آئے۔ ایک دو جگہ رکی ہوئی بس کے اندر لیویز کے اہلکاروں نے تاکا جھانکی بھی کی۔ شانی کے دل کی دھڑکنوں میں ہر آن اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں شانی کو اپنے اردگرد پشتو کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور ہر شخص کے کندھے پر رائفل نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ لڑکوں کے کندھوں پر بھی ہلکی پھلکی رائفلیں موجود تھیں۔

یہاں پاکستانی اور افغانی دونوں طرح کی کرنسی نظر آ رہی تھی۔ جب شام کی سیاہی پھیل چکی تو شانی کو دور شمال مغربی افق پر ایک پہاڑی سلسلے کی بالائی لکیر نظر آئی۔ شانی نے اپنے قریب بیٹھی برقع پوش عورت سے پوچھا۔ ''وہ سامنے والے پہاڑ پارہ چنار کے ہیں؟''

''نہیں بہن! وہ افغانستان کا پہاڑ ہے۔''

''اور پارہ چنار؟''

''ام کو ٹھیک سے پتا نہیں۔ پارہ چنار بائیں طرپ ہے۔ ام بس آدھ گھنٹے کے اندر پہنچ جائے گا۔''

شانی کو اپنی رگوں میں خون کی گردش بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بالآخر وہ منزل کے قرب وجوار میں تھے۔ اسے افق پر وہ پہاڑ دکھائی دے رہے تھے جن کے پار انہیں پناہ مل سکتی تھی۔ ایک نئی زندگی، ایک نیا موقع۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ سوچا۔ ''کیا وہ وہاں تک پہنچ پائیں گے؟ کیا آنے والا ایک ڈیڑھ گھنٹا بخیریت گزر جائے گا؟'' اس کا دل گواہی دینے لگا کہ ایسا ہوگا۔ قدرت انہیں نئی سرزمین پر نئی زندگی شروع کرنے کا ایک موقع دے گی۔ مگر اس کی چھٹی حس دوسرے انداز کی پکار بلند کرنے لگی..... جب وہ بس سے اتریں گے، انہیں چپے چپے پر نگراں آنکھیں نظر آئیں گی۔ وہ اس ماحول میں بالکل اجنبی اور جدا دکھائی دیں گے۔ خاص طور سے رستم..... وہ فوراً نگاہوں میں آ جائے گا۔

وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہی اور بس پاک افغان سرحد کی طرف بڑھتی رہی۔ ایک چیک پوسٹ پر انہیں روکا گیا۔ یہاں سڑک پر باقاعدہ پھاٹک سا بنایا گیا تھا۔ حسب سابق شلوار قمیص والے دو رائفل بردار اہلکاروں نے بس میں نگاہ دوڑائی۔ وہ نیچے اترنے لگے مگر ایک اہلکار مڑا۔ اس کی نگاہ پچھلی نشستوں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ رستم بھی انہی نشستوں پر موجود تھا۔ شانی کا دل اچھل کر گلے میں آ گیا۔ اہلکار پچھلی نشستوں کے پاس گئے..... اور رستم کے سامنے رک گئے۔ پہلے انہوں نے پشتو میں کچھ پوچھا پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولے۔ ''ہاں بھئی! کہاں سے آیا ہے؟''

''بنوں سے۔'' رستم کا چہرہ پتھر کی طرح بے تاثر تھا۔

''کہاں جا رہا ہے؟''

''پارہ چنار..... حاجی اکرم علی کے پاس۔''

اہلکاروں نے دو تین مزید سوال پوچھے۔ وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ پچھلے اہلکار نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے کھولو۔''

www.pdfbooksfree.pk

رستم چند سیکنڈ ساکت رہا۔ شانی جانتی تھی۔ یہ موت سے پہلے کا سکوت ہے..... یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ رستم ایک گہری سانس لے کر نیچے جھکا۔ اس نے بستر کھولا۔ شانی کی دھڑکنیں اس کی پسلیاں توڑنے لگیں۔ بستر کے اندر کلاشنکوف ایک بیڈشیٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔ رستم نے بیڈشیٹ کے اندر سے ہی فائر کیا۔ دھماکے سے گولی اہلکار کے سینے میں گھسی اور وہ پشت کے بل ایک طرف کی نشستوں پر گرا۔ پوری بس میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ دیوانہ وار چلائے اور نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے اہلکار نے رائفل سیدھی کرنا چاہی۔ کلاشنکوف سے دو مزید فائر ہوئے اور یہ اہلکار بھی زخمی ہو کر گر گیا۔ رستم بس کے عقبی دروازے کے بالکل پاس تھا۔ اسے بیساکھی سنبھالنے اور بس سے نکلنے میں پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ میں تھی اور کینوس کا تھیلا اس کے کندھے پر تھا۔

رستم کے ساتھ ہی شانی بھی اگلے دروازے سے نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ اردگرد موجود خضدار، لیویز اہلکار یا دیگر لوگ۔ کچھ سمجھتے یا کرتے، رستم قریب کھڑے ایک سوزوکی لوڈر میں داخل ہو گیا اور کلاشنکوف کی نال ڈرائیور کی گردن سے لگا دی۔ نوجوان ڈرائیور کی آنکھیں دہشت سے کھلی رہ گئیں۔ یہ سواریاں ڈھونے والا لوڈر تھا اور اس کے پچھلے حصے میں نشستیں تھیں۔ جونہی شانی ایک نشست پر بیٹھی، رستم ڈرائیور سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔

''تمہاری بھی جان جائے گی۔ جان بچانی ہے تو گاڑی بھگا دو۔''

معلوم نہیں کہ قبائلی ڈرائیور رستم کا فقرہ سمجھا یا نہیں مگر اس کا مفہوم ضرور سمجھ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ دو مسلح اہلکار لوڈر کی طرف جھپٹے، انہوں نے فائر کیے۔ ایک گولی شانی کو چھو کر گزری اور سائیڈ ونڈو کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ رستم نے اہلکاروں کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں اور انہیں زمین بوس کر دیا۔

''تیز چلو۔'' وہ لرزہ خیز آواز میں دہاڑا۔

ہیبت زدہ ڈرائیور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ ''بائیں موڑو۔'' رستم نے کلاشنکوف کی نال اس کی گردن میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی سڑک سے اُتاری اور پہاڑیوں کے درمیان کچے راستے پر ڈال دی۔ شانی نے کانپ کر دیکھا۔ رستم کی ہوٹی ٹانگ کی پنڈلی خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے پہلو کے زخم کا منہ بھی شاید کھل گیا تھا۔ ہلکی پھلکی گاڑی زوردار ہچکولے کھا رہی تھی اور شانی کا سر بار بار چھت کے پائپوں کے ٹکرا رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی تاریکی میں اسے چند تیز رفتار ہچکولے کھاتی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ کراہ کر بولی۔ ''رستم! وہ پیچھے آ رہے ہیں۔''

درمیانی فاصلہ کافی تھا۔ ویسے بھی راستہ پُر پیچ ہونے کی وجہ سے عقب میں آنے والے فائر نہیں کر سکتے تھے۔ سوزوکی لوڈر اچھلتی کودتی بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ رستم نے کلاشنکوف کی نال ڈرائیور کی گردن میں گھسیڑ رکھی تھی۔ غالباً اسے یہ ڈر بھی تھا کہ ڈرائیور کہیں گھبرا کر چھلانگ ہی نہ لگا دے۔ ''شانی! آپ سیٹ پر لیٹ جائیں۔'' رستم نے کہا۔ شانی نے ہدایت پر عمل کیا۔ ''تیز چلو خان!'' رستم گاہے بہ گاہے ڈرائیور پر گرج رہا تھا۔

''اور تیز چلے گا تو گاڑی الٹے گا۔'' ڈرائیور نے کراہتے ہوئے کہا۔

''الٹ کر کسی دریا میں نہیں گر جائے گا۔'' رستم نے اس کے سر پر کلاشنکوف کا بیرل رسید کیا۔ وہ تقریباً دو میل تک اسی طرح چلتے رہے۔ وہ اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ قرب و جوار بالکل تاریک تھے۔ گاہے بہ گاہے عقب میں آنے والی گاڑیوں کی روشنیاں چمک جاتی تھیں پھر چند فائر سنائی دیئے۔ یہ دھماکے خیز فائر ہیوی ری پیئر کے تھے۔ راستہ دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ لوڈر کو شدید جھٹکا لگا اور وہ زوردار آواز سے بائیں طرف جھک گیا۔ نیچے سے کسی نکیلے پتھر نے اس کا انجر پنجر پھاڑ دیا تھا۔ ''اوہ خدایا!'' ڈرائیور نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''شانی! آپ اُتر آئیں۔'' رستم پکارا۔

شانی اُتر آئی۔ رستم نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ واپس بھاگ جائے۔ رستم نے جیسے ہی یہ بات کہی، ڈرائیور نے ڈھلوان پر دوڑ لگا دی۔ رستم اور شانی آگے بڑھنے لگے۔ تاروں کی روشنی ان کی مدد کر رہی تھی۔ ''شاید وہ پیچھے آ رہے ہیں۔'' شانی نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

رستم نے مڑ کر دیکھا۔ اسے بھی نشیب میں ٹارچوں کی روشنیاں چمکتی نظر آئیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پیچھے آنے والوں نے بھی گاڑیاں چھوڑ دی ہیں۔ رستم نے ایک جگہ رک کر کینوس کے بیگ سے نیا میگزین نکالا۔ اسے کلاشنکوف سے اٹیچ کیا اور چھوٹے چھوٹے تین برسٹ چلائے۔ کلاشنکوف کی دہلا دینے والی آواز سناٹے میں دور تک گونجی اور کئی سیکنڈ تک پہاڑیوں میں اس کی بازگشت سنائی دی۔ روشنیاں پہلے اوجھل ہو گئیں پھر بکھری بکھری دکھائی دیں۔ پیش قدمی کرنے والوں کے قدم رک گئے تھے۔

رستم اور شانی پھر اوپر چڑھنے لگے۔ بیساکھی کے ساتھ رستم کو خاصی دشواری پیش آ رہی تھی۔ شانی گاہے بہ گاہے اسے سہارا دیتی تھی۔

''رستم! ہم کہاں تک جائیں گے۔'' وہ دل فگار آواز میں بولی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ..... جیسا کہیں گی میں ویسا کروں گا۔'' وہ درد سے کراہا۔ وہ اب تک اسی کیفیت میں تھا جس میں، ریاض سے ٹکراؤ کے بعد مبتلا ہوا تھا۔ اس نے جیسے

www.pdfbooksfree.pk

اپنا سر تسلیم خم کر لیا تھا اور سب کچھ..... سب کچھ شانی کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

''یہ کون سے پہاڑ ہیں رستم؟'' شانی نے ہانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ناصر نے انہی تین پہاڑوں کے بارے میں بتایا تھا۔ ان کے پار افغان سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ خرلاچی کا گاؤں ہماری دائیں طرف ہے۔''

''ناصر اور جہانگیر کہاں ہوں گے؟''

''اگر ہم اس پہاڑ کو ذرا بائیں طرف سے پار کر لیں تو ہم اس گاؤں کی طرف اتریں گے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''کیا ہم ان تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے رستم؟'' شانی نے عجیب حسرت آمیز آہنگ میں کہا۔

''اس موقع پر کیا کہا جا سکتا ہے شانی؟''

ایک بار پھر عقب سے فائرنگ ہوئی۔ یہ تین چار رائفلیں تھیں جو ایک ساتھ چلائی گئی تھیں۔ رستم اور شانی ڈھلوان کے ساتھ لگ گئے۔ فائرنگ کے انداز سے ظاہر ہوا کہ یہ اندھی فائرنگ ہے۔ پیچھے آنے والوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ رستم اور شانی کا رخ کس طرف ہے۔

''شاید یہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی فائر کریں اور انہیں ہمارے رخ کا ٹھیک سے پتا چلے۔'' شانی نے کہا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور شانی کے ساتھ اوپر چڑھنا جاری رکھا۔ ایک موڑ مڑتے ہی وہ عقب کے نشیب میں دور تک دیکھنے کے قابل ہو گئے۔ یہ نظارہ ہرگز خوش کن نہیں تھا۔ نشیب میں چمکتی روشنیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کافی لوگ ان کے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ پھیل کر بڑھ رہے تھے۔ کسی وقت ان کی دور افتادہ آوازیں ہوا پر تیر کر ان تک پہنچ جاتی تھیں۔ ان آوازوں میں طیش تھا اور آگ کی لپک تھی۔

یہ تکلیف دہ سفر جاری رہا۔ پیچھے آنے والے ایک بار پھر قریب آتے جا رہے تھے۔ شانی نے کہا۔ ''رستم! مجھے لگتا ہے، ہم چوٹی پر پہنچنے والے ہیں۔'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی بولی۔ ''اس چوٹی پر پہنچ کر شاید ہم وہ گاؤں دیکھ سکیں جہاں ناصر، جہانگیر اور دوسرے ساتھی ہیں۔''

''شاید!'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

''آپ نے کہا تھا کہ گاؤں سے سرحد زیادہ دور نہیں ہے..... کیا پتا ہم سرحد پار کر ہی جائیں۔'' شانی نے امید ظاہر کی۔

''اصل مسئلہ تو گاؤں تک پہنچنے کا ہے۔'' رستم نے کہا۔

www.pdfbooksfree.pk

اچانک رستم کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا کئی میٹر نیچے چلا گیا۔ ''رستم..... رستم!'' شانی چلائی اور رستم کی طرف بڑھی۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ کلاشنکوف ابھی تک اس کے گلے میں تھی، تاہم کینوس کا تھیلا کندھے سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ بیساکھی بھی دور تک پھسل گئی تھی۔ شانی نے پہلے بیساکھی پکڑی پھر رستم کی طرف لپکی۔ اس کا دل دہل گیا۔ رستم کے کئی زخموں سے خون رِسنے لگا تھا۔ ٹانگ سے لپٹی ہوئی پٹی خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔ شاید پہلو کے کچھ ٹانکے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ گرنے سے کلاشنکوف کا میگزین علیحدہ ہو گیا اور کچھ گولیاں بکھر گئیں۔

''رستم..... رستم!'' شانی نے اسے کسی بچے کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹا اور اٹھنے میں مدد دی۔ وہ اٹھ تو بیٹھا..... مگر اس کی حالت ابتر تھی۔ ٹانگ کے زخم سے باقاعدہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔ شانی نے اضطرابی حالت میں ٹارچ جلانا چاہی مگر رستم نے اسے روک دیا۔ یہی وقت تھا جب پھر فائرنگ بھی ہونے لگی۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونجے اور گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزرنے لگیں۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ کوئی گولی کینوس بیگ میں ہی نہ جا لگے..... ''شانی! ہمیں کسی آڑ میں ہونا ہوگا۔'' رستم نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

وہ انتہائی برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھا اور شانی کے سہارے سے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر انہیں دو پتھروں کے درمیان ایک خلا سا نظر آیا۔ رستم اور شانی کسی نہ کسی طرح اس خلا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک قدرتی کھوہ تھی۔ پہاڑوں میں ایسی پناہ گاہیں عام ہوتی ہیں۔ اس کھوہ کے اندر ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ پتھر کی دیواریں اور لکڑی کے وزنی تختوں کی چھت۔ ماضی میں شاید یہاں کوئی چیک پوسٹ بنائی گئی تھی مگر اب یہ خالی پڑی تھی۔ ایک طرف کی دیوار بھی گری ہوئی تھی۔ سنگلاخ چھت کی کسی اندرونی آب جو کا پانی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ رستم اور شانی اندر چلے گئے۔ ایک چوبی کھڑکی میں سے جنوب کے نشیب کو دور تک دیکھا جا سکتا تھا یہاں تک کہ پارہ چنار کی دور افتادہ روشنیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

تعاقب کرنے والے قریب آتے جا رہے تھے۔ شانی اور رستم کے کانوں تک ان کی طیش بھری آوازیں پہنچنے لگیں۔ اس موقع پر رستم نے پھر کلاشنکوف سے چند فائر کیے۔ اس وارننگ دیتی ہوئی فائرنگ سے قریب آنے والوں کے قدم رک گئے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ پتا بھی چل گیا کہ رستم اور شانی کہاں ہیں۔

یہ نازک ترین صورتِ حال تھی۔ شانی روئی اور پٹیوں کی مدد سے رستم کی ٹانگ سے بہتا

خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی اور وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا فائر کر رہا تھا۔

''رستم! خون نہیں رک رہا۔'' شانی کراہی۔

''آپ چھوڑ دیں۔ خود ہی رک جائے گا۔'' وہ نحیف آواز میں بولا۔

''رستم! کیا ہم..... خود کو ان کے حوالے کر دیں؟''

''میں نے کہا ہے نا..... میں وہی کروں گا..... جو آپ کہیں گی۔''

کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولی۔ ''لیکن یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ شاید اسی جگہ ہمیں.....'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

رستم نے چھ سات گولیوں کا ایک برسٹ چلایا۔ کسی کے چلانے اور نشیب میں لڑھکنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ جواب میں چیک پوسٹ کی پتھریلی دیوار پر تابڑ توڑ گولیاں برسائی گئیں۔ ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہوئیں۔

یہ خطرناک لمحے تھے۔ پیچھے آنے والے جوش میں آ کر چیک پوسٹ پر چارج کر سکتے تھے۔ اس موقع پر رستم نے ایک دستی بم کی سیفٹی پن کھینچ کر اسے پوری طاقت سے ڈھلوان پر پھینک دیا..... روشنی کے ساتھ سماعت شکن دھماکا ہوا اور جیسے چاروں طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ رستم اور شانی کو اندازہ ہوا کہ گھیرا ڈالنے والے ہراساں ہو کر تھوڑے فاصلے پر چلے گئے ہیں۔ کلاشنکوف کے ساتھ ساتھ دستی بموں کی موجودگی یقیناً انہیں بہت محتاط رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''آپ کے پاس کتنی گولیاں ہیں رستم؟''

''ہم صبح تک انہیں روک سکتے ہیں۔''

''اس کے بعد؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں شانی۔''

شانی چند لمحے چپ رہی پھر اس نے فرش پر بیٹھے بیٹھے اپنا سر رستم کے کندھے سے ٹکا دیا۔ ''رستم! لگتا ہے ہم نہیں بچ سکیں گے۔''

''شاید..... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' وہ کچھ فاصلے پر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شانی نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور اسے اپنا دل بالکل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ نیچے ڈھلوان سے کافی آگے تاریک نشیب میں بہت سی مزید روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ روشنیاں ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''یہ کیا ہے رستم؟''

''شاید گاڑیاں ہیں۔ مگر اتنی دور سے بس اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔''

''یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ''بس ہم دو کے لیے اتنے زیادہ لوگ؟''

''یہ ڈرے ہوئے لوگوں کی نشانی ہوتی ہے شانی۔''

نشیب میں رینگنے والی روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں۔ پھر ان میں پولیس کاروں کی ریوالونگ بلیو لائٹس بھی دکھائی دینے لگیں۔ رستم اور شانی کے اردگرد فائرنگ رک گئی تھی۔ شاید فائرنگ کرنے والے کمک اور اعلیٰ افسران کی ہدایات کا انتظار کر رہے تھے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹہ اسی طرح گزر گیا۔ گاہے بہ گاہے ہلکی فائرنگ کے سوا کوئی کارروائی نہیں ہوئی تاہم یہ بات تھی کہ مسلح افراد نے انہیں مکمل طور پر گھیرا ہوا تھا۔ خون کے مسلسل اخراج سے رستم کے لب و لہجے میں غیر معمولی نقاہت اُتر آئی تھی۔ شانی جانتی تھی کہ وہ نیم جان ہے اور اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ شانی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کے بازو کے ساتھ لگ کر اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر کھڑکی میں سے جھانکا اور کراہی۔ ''رستم! وہ قریب آتے جا رہے ہیں..... وہ کافی زیادہ ہیں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں شانی! ہم آخری دم تک لڑیں گے۔''

اچانک میگا فون پر ایک گرج دار آواز ابھری۔ یہ لیویز کے کسی پڑھے لکھے افسر کی آواز تھی۔ اس نے رستم کا نام لے کر اسے ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ رستم نے جواب میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اب یہ بات بالکل صاف ہو چکی تھی کہ رستم اور شانی کو شناخت کیا جا چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میگا فون پر ایک اور آواز ابھری اور یہ وہی مخوس آواز تھی جسے وہ پہلے بھی بہت مرتبہ سن چکے تھے۔ یہ آواز پہچاننے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہ ریاض کی آواز تھی۔ وہ قہر ناک انداز میں گرجا۔ ''رستے! ذلیل موت مرنے سے بہتر ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دے۔ یہ تیرے لیے آخری موقع ہے۔ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آ.....''

شانی اور رستم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ریاض ان کی توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہاں پہنچ گیا تھا۔ اب پتا نہیں کہ وہ حالات کا اندازہ لگا کر پہلے سے اس علاقے میں موجود تھا یا پھر کسی برق رفتار سواری پر آیا تھا۔

اگلے پانچ منٹ میں ریاض نے میگا فون پر دو تین مرتبہ رستم اور شانی کو مخاطب کیا۔ وہ اپنی ڈکشنری کے بدترین الفاظ بول رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے زہریلے تیروں کی طرح تھے جو سینے

www.pdfbooksfree.pk

سے آر پار ہو جاتے تھے۔

رستم نے کلاشنکوف سے دو تین طویل برسٹ چلائے..... قریب آنے والے مسلح افراد پھر فاصلے پر جاتے محسوس ہوئے۔ یہ مزاحمت انہیں سمجھا رہی تھی کہ رستم سیال، محصور ہونے کے باوجود ترنوالہ نہیں ہے۔ وہ آسانی سے جان نہیں ہارے گا۔

ایک بار پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ مگر شانی جانتی تھی کہ اس خاموش تاریکی میں موت کے بیسیوں ہرکارے موجود ہیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سر رستم کے شانے سے ٹکا دیا۔ رستم نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ چاند کی مدھم روشنی اب کھوہ کے اندر پہنچنے لگی تھی۔ سامنے کھوہ کی چھت سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والا پانی ایک ملائم سیاہ پتھر پر گر رہا تھا۔ یہ قطرہ دو چار دن سے نہیں گر رہا تھا، نہ ہی دو چار سالوں سے..... یہ شاید دو چار صدیوں سے گر رہا تھا یا پھر اَن گنت زمانوں سے۔ نیچے سیاہ پتھر میں ایک سوراخ نمودار ہو گیا تھا۔ رستم نے کھوئے کھوئے نحیف لہجے میں کہا۔ ''شانی! آپ دیکھ رہی ہیں..... پتھر پر پانی بھی مسلسل گرتا رہے تو آر پار ہو جاتا ہے..... لیکن..... کچھ لوگ سنگلاخ پتھروں سے بڑھ کر سخت ہوتے ہیں۔ ان پر اَن گنت زمانوں کی محبت اور مہربانی بھی کوئی اثر نہیں چھوڑتی۔ یہ شخص جو ابھی اسپیکر پر اپنے منہ سے شعلے نکال رہا تھا، یہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔''

شانی سمجھ گئی کہ رستم کا اشارہ ریاض کی طرف ہے۔ رستم بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''شانی! آپ کے سینے میں بڑا نرم اور محبت کرنے والا دل ہے۔ آپ ہر چیز میں اچھائی تلاش کرتی ہیں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں سے آپ جیسے لوگ کبھی اچھائی نہیں ڈھونڈ سکتے۔ مجھے پتا ہے شانی! آپ ہر ہر موڑ پر ریاض پر احسان کرتی رہی ہیں۔ آپ نے اس کی فطرت کو بدلنے کی اپنی طرف سے ہر کوشش کی ہے۔ مجھے پتا ہے شانی! آپ نے ریاض کو بدلنے کی اچھی نیت کے ساتھ مجھ سے بھی بہت کچھ چھپایا ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

''وہی جو آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔'' اس نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''جب میں ریاض کے بھیجے طفیل کو چھوڑنے کے لیے گیا تھا..... اسے چھوڑنے سے پہلے ہی آپ ناصر اور جہانگیر کے پاس واپس آ چکی تھیں۔ مگر آپ نے مجھ سے یہ خبر چھپالی۔ آپ نہیں چاہتی تھیں کہ طفیل قید رہے اور ریاض کے اندر جلتا ہوا بھانبڑ اور اونچا ہو جائے۔''

شانی چپ رہی، وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

رستم نے اپنے شدید زخمی پہلو کو دباتے ہوئے کہا۔ ''اور شانی! مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ

آپ کی قریبی سہیلی سکینہ مر چکی ہے۔ اسے تکلیف دے کر مارنے والا یہی ریاض حرامی تھا۔ آپ نے یہ بات بھی مجھ سے چھپائی۔ صرف اس لیے کہ شاید اس طرح ریاض کے دل میں کسی طرح کی کوئی نرمی پیدا ہو جائے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں رستم!'' شانی گردن جھکائے جھکائے سسکی۔

''اور مجھے یہ بھی پتا ہے شانی کہ آپ نے ڈیفنس میں ریاض کی بیوی اور بچے کو بچانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ آپ نے شدید خطرہ مول لیا اور زخمی بھی ہوئیں..... آپ کی انگلیوں سے ابھی تک خون رستا ہے..... آپ نے ہر موڑ پر ریاض کو دعائیں دی ہیں شانی! اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید وہ بدل جائے..... مجھ سے وہ، جیپ والا واقعہ بھی چھپا ہوا نہیں ہے.....''

شانی اَشک بار سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب یہ حرامزادہ آپ کو گوجرانوالہ سے وڈے ڈیرے کی طرف لا رہا تھا اور تایا معصوم بھی ساتھ تھے۔ اس نے جیپ میں آپ کے کپڑے پھاڑ دیئے تھے، سب کے سامنے.....''

شانی چپ رہی..... رستم کی معلومات پر اسے حیرانی ہو رہی تھی۔ اس نے نہ جانے کون کون سی باتیں پیٹ میں ڈال رکھی تھیں۔ اس کی بے پناہ برداشت کا شانی کو اعتراف تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''شانی! یہ دو چار واقعے نہیں، درجنوں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے بہت سے موقعوں پر ریاض سے مہربانی اور درگزر کا سلوک کیا..... لیکن میں نے کہا ہے نا، کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔ ان لوگوں کے تکبر کا علاج مہربانی اور محبت سے کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ان کی بیماری کی ایک ہی دوا ہوتی ہے۔ اینٹ کے بدلے میں ان کے کھوپڑے پر پتھر مار کر ان کا بھیجا نکال دیا جائے۔''

''مگر رستم..... پتھر مارنے سے بھی تو سارے مسئلے حل نہیں ہوتے.....''

''مجھے معاف کرنا شانی! میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ جس طرح پتھر مارنے سے سارے مسئلے حل نہیں ہوتے، اسی طرح محبت اور مہربانی سے بھی ہر مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ہاں شانی..... میں سوچتا ہوں..... دنیا میں اربوں کھربوں روپے کا اسلحہ کیوں بنایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ دماغوں والے لوگ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بندے کی خصلت میں اچھائی کم اور برائی زیادہ ہے..... اور یہ برائی صرف اسلحے کے زور پر ہی کنٹرول میں رہتی ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے چونک کر رستم کا زخم زخم چہرہ دیکھا۔ رستم خود کو اَن پڑھ اور گنوار کہتا تھا۔ مگر اکثر وہ اپنی ترنگ میں ایسی بات کہہ جاتا تھا جو کسی فلسفی کے قول سے کم نہیں ہوتی تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں رستم!'' شانی بھی کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''مگر داناؤں نے یہ بھی تو کہا ہے کہ شہر طاقت سے فتح ہو سکتے ہیں لیکن دلوں کو صرف محبت سے جیتا جا سکتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے رستم..... کہ دلوں کو جیتنے کے لیے بہت سا وقت چاہیے ہوتا ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے اور بہت ساری برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اور شاید وہ بھی ہمارے پاس نہیں تھی..... کم از کم میرے پاس تو نہیں تھی۔''

''اگر آپ کے پاس برداشت نہیں تو پھر کس کے پاس ہوگی؟'' رستم نے عجیب آہنگ میں کہا۔

اچانک ایک برسٹ چلا۔ پتھریلی دیوار لرز اٹھی اور پتھر کی بہت سی کرچیاں ان کے ارد گرد بکھر گئیں۔ رستم نے بھی جوابی طور پر دو سنگل شاٹ چلائے۔ چونکہ وہ بلندی پر تھا اس لیے اس کی فائر گنز خطرناک ثابت ہوئی تھی۔

موبائل فون اب تک رستم کی جیب میں تھا۔ شانی نے اسے نکال کر دیکھا۔ وہ مُردہ ہو چکا تھا اور اگر اس کی بیٹری موجود بھی ہوتی تو یہاں سگنلز کا ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سوچنے لگی، ان کے ساتھی ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں اور نہ ہی سرحد زیادہ دور ہے۔ مگر یہ تھوڑا سا فاصلہ بھی اب شاید صدیوں پر محیط تھا..... ایک بار پھر اس کا دھیان ڈپٹی ریاض کی طرف چلا گیا۔ رستم کے الفاظ شانی کے کانوں میں گونجنے لگے۔ یہ وہ پتھر ہے جس پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا..... اثر کر ہی نہیں سکتا۔ وہ سوچنے لگی۔ ''کیا واقعی کچھ لوگ بدترین مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔'' رستم کی یہ بات حقیقت تھی کہ شانی نے ہر ہر موڑ پر ریاض کی بے پناہ نفرتوں کا جواب بے پناہ برداشت اور صلح جوئی سے دینے کی کوشش کی تھی اور اپنے دل میں یہ امید پالی تھی کہ شاید یہ شخص بھی اتنا برا نہ ہے، جتنا ہے..... بلکہ شانی کے دل کے کسی گوشے میں اب سے چند گھنٹے پہلے تک بھی یہ آس موجود تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا کھوہ سے فقط چالیس پچاس میٹر کی دوری پر ہوا تھا۔ ''اوہ خدایا! مجھے لگتا ہے یہ بارودی سرنگ ہے۔'' رستم نے کہا۔

''مگر بارودی سرنگ کہاں سے آئی؟''

''کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے، یہ کسی نے یہاں پہلے سے دبا رکھی ہو۔'' رستم کراہتے ہوئے بولا۔

سرنگ پھٹنے کے کچھ ہی دیر بعد مسلح افراد کا وہ گھیرا پھیلتا ہوا محسوس ہوا جو بہ تدریج تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ آوازیں جو پہلے قریب سے آ رہی تھیں، اب فاصلے پر چلی گئی ہیں۔ اس واقعے کو کیا کہا جا سکتا تھا؟ شاید قدرت کی طرف سے ان کو تھوڑی سی مزید مہلت دی گئی تھی..... لیکن کب تک..... آخر کب تک؟ شانی نے بے حد دکھ سے سوچا۔

''رستم! اس کھوہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں؟ ہو سکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔''

شانی اور رستم میں اس موضوع پر چند فقروں کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ بڑی خاموشی سے آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پوسٹ چھوڑنے سے پہلے رستم نے چند آخری فائر کیے اور شانی کے ساتھ کھوہ میں آگے بڑھنے لگا۔ اسے چلنے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ ہر تیس چالیس قدم پر شانی اسے کہتی۔ ''رک جائیں۔ ذرا سانس لیں۔'' وہ کسی معمول کی طرح رک جاتا اور شانی کے سہارے بیٹھ جاتا۔ ان کے دل میں یہ آس موجود تھی کہ شاید یہ کھوہ انہیں کسی طرف سے راستہ دے دے۔ مگر یہ آس تادیر قائم نہیں رہی۔ قریباً نصف فرلانگ چلنے کے بعد کھوہ بند ہو گئی۔ کھوہ کے آخری سرے پر بھی ایک ویسی ہی شکستہ پوسٹ موجود تھی جیسی وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ دیواروں سے جالے لگے ہوئے تھے۔ دو چار چمگادڑوں کی موجودگی بھی ثابت ہوئی۔ خبر نہیں، یہ کیسی جگہیں تھیں اور کن لوگوں نے کس مقصد کے لیے استعمال کی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی ایک دیوار پر پڑی تو یہاں روغن سے چند نعرے لکھے نظر آئے۔ یہ روسی فوجیوں کے خلاف تھے۔

رستم کے سارے ہی زخموں کے منہ جیسے کھل گئے تھے۔ اس کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی نے ایک بار پھر اپنی چادر پھاڑی۔ ''یہ کیا کر رہی ہیں؟'' وہ کمزور آواز میں کراہا۔

''آپ کی ٹانگ پر اور پٹی باندھ دوں۔''

''یہ بھی دو منٹ میں بھیگ جائے گی۔'' رستم نے اسے روک دیا۔ اس کی آواز اٹک رہی تھی۔

''رستم! میں آپ کی ٹانگ کا کیا کروں؟ مجھے لگتا ہے کہ آپ کا سارا خون اس زخم کے رستے نکل جائے گا۔'' وہ دلدوز آواز میں بولی۔

''اس خون نے اب ویسے بھی تو نکل ہی جانا ہے شانی۔''

''ایسا مت کہیں آپ۔'' اس نے رستم کا خونچکاں شانہ چوما۔

''حقیقت کو مان لینا چاہیے شانی!'' اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی۔

www.pdfbooksfree.pk

شانی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا غنودگی بھرا ذہن، بند آنکھوں کے ساتھ ایک تصوراتی منظر دیکھنے لگا۔ اسے لگا جیسے یہاں سے کچھ فاصلے پر ان پہاڑوں کے پار ایک گھر میں ناصر، جہانگیر، زری، نذیر اور پہلوان موجود ہیں۔ وہ رستم اور شانی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان راہ دیکھنے والوں میں اس کا منا بھی شامل ہے۔ پہلوان اسے رنگ والی سے یہاں لے آیا ہے۔ وہ اپنی توتلی زبان میں پہلوان سے پوچھ رہا ہے۔ ''انکل! میلی تاتی جلدی آ جائیں گی؟''

شانی نے تصور ہی تصور میں اس کا ماتھا چوما اور دل ہی دل میں بولی۔ ''موت اور زندگی کے درمیان ہوں میرے مُنے۔ کچھ کہہ نہیں سکتی..... نہ آ سکی تو معاف کر دینا۔''

رستم کے پاس اب آخری دستی بم تھا۔ یہ شاید اس نے کسی خاص وقت کے لیے سنبھال رکھا تھا۔ گولیوں کی تعداد بھی بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ چوبیس گولیوں والا الگ لوڈ میگزین تھا۔ اس کے علاوہ دس پندرہ گولیاں تھیلے میں تھیں۔ رستم ان کو بڑی کفایت سے استعمال کر رہا تھا۔ پسٹل میں بھی صرف دو یا تین گولیاں باقی تھیں۔ جس جگہ رستم بیٹھا تھا، وہاں کافی خون جمع ہو گیا تھا۔ یہ رستم ہی کا خون تھا اور اس کے جسم کے مختلف زخموں سے نکلا تھا۔

اچانک شانی نے دیکھا کہ رستم اپنی کلاشنکوف کو زور زور سے جھٹکے دے رہا ہے۔ پھر اس نے کلاشنکوف کے بیرل کو دو تین بار زمین پر مارا۔ ''کیا ہوا رستم؟''

''یہ کام نہیں کر رہی..... لگتا ہے..... یہ بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔'' وہ بڑے کرب سے بولا۔

اس نے بیرل کا رخ چھت کی طرف کر کے تین چار بار ٹرائیگر دبایا مگر ٹرائیگر بلٹ کو ہیمر کرنے کے بجائے آزادانہ حرکت کر رہا تھا۔ رستم نے میگزین ہٹا کر، دو تین بار دوبارہ اینج کیا۔ مختلف کل پرزوں کو حرکت دی مگر کلاشنکوف خاموش ہو چکی تھی۔ جب رستم کھوہ کی طرف آتے ہوئے بلندی سے لڑھکڑایا تھا تو کلاشنکوف بری طرح پتھروں سے ٹکرائی تھی۔ شاید اسی وقت اس میں نقص پیدا ہوا تھا جو اب نمایاں ہو کر ظاہر ہو گیا تھا۔

رستم کے لیے یہ ایک اور شدید دھچکا تھا۔ وہ ایک دم گم صم سا ہو گیا۔ وہ گولیاں جو اب تک وہ بچا بچا کر رکھ رہا تھا، ایک دم بے کار ہو گئی تھیں۔ ان کی حقیقت کھوہ کے کنکروں سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ رستم کچھ دیر مزید کلاشنکوف سے الجھتا رہا پھر اس نے بے عجیب بے پروائی سے اسے ایک طرف رکھ دیا..... اور اب اس کے پاس پسٹل تھا جس میں فقط تین گولیاں تھیں اور ایک دستی بم تھا..... اور یہ بم بھی ایسا ہتھیار نہیں تھا جو موت کے بڑھتے ہوئے ہرکاروں کو تادیر

ان سے دور رکھ سکتا..... اور موت کے ہرکارے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن موجود تھے یہاں سے تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر دہانے سے آگے پہاڑیوں میں، جھاڑیوں میں اور پتھروں کے پیچھے..... ہر جگہ وہ تاریکی کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ ان کی سرچ لائٹس، جاسوس کُتے اور آتشیں ہتھیار اس کی جگہ کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے تھے۔ ڈپٹی ریاض شاید ایک بار پھر میگا فون پر کچھ بول رہا تھا۔ اس کی بہت مدھم آواز دہانے تک تو یقیناً پہنچ رہی تھی مگر رستم اور شانی کی اس نئی پناہ گاہ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اس کی اناؤنسمنٹ سے پتا چلتا تھا کہ وہ رستم اور شانی کو ابھی تک دہانے والی پناہ گاہ میں ہی سمجھ رہا ہے۔

خون کی کمی کے سبب رستم کا گلا خشک ہونے لگا۔ اسے پانی کی شدید طلب تھی مگر پانی یہاں نہیں تھا۔ شانی بھی شدید پیاس محسوس کر رہی تھی تاہم رستم کی تکلیفوں نے اور حالات کی سنگینی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ ایک بند کھوہ کی شکستہ پناہ گاہ میں تھے اور اپنی طرف رینگتی ہوئی موت کی پرچھائیاں دیکھ رہے تھے۔

''رستم! مجھ سے بہت ناراض ہیں نا آپ؟'' وہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ ریاض آپ سے بچ کر نکل گیا۔''

''بے شک، یہ خواہش پوری نہیں ہوئی مگر یہ اطمینان تو ہے کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ آخر وقت تک میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں رہے گا۔''

''ہاتھ میں ہاتھ ہی نہیں رہے گا۔ اگر مرنا پڑا تو جان بھی جان کے ساتھ جائے گی۔''

''ہم ہار گئے ہیں نا شانی؟''

''نہیں رستم! ہماری ہار ہزار جیتوں پر بھاری ہے۔ ہم لڑنے والوں کے خلاف آخری وقت تک لڑے ہیں اور ہمیں یہ فخر ہے کہ ہم نے اپنے بدترین دشمن کو بھی زیر کرنے کے بعد معاف کیا ہے۔ ریاض بچ گیا رستم! مگر ہم نے اپنے ظرف سے اسے ایسے زخم لگائے ہیں جن کی جلن اسے زندگی بھر..... بے قرار رکھے گی۔''

وہ کتنی ہی دیر ایک دوسرے سے لگے خاموش بیٹھے رہے۔ بھنبھناہٹ جیسی ان آوازوں کو سنتے رہے جو ہوا کی لہروں پر تیر کر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی آوازیں تھیں۔ ان آوازوں میں بلا کی دہشت اور غضب ناکی تھی۔

شانی نے رستم کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل پر اپنا زخمی ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''رستم! وہ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا کریں گے۔ ان کے ہاتھ آنے کے بجائے مرنا آسان لگ رہا ہے۔''

www.pdfbooksfree.pk

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں شانی! آپ اس بات کو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ ابھی پستول میں تین گولیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک گولی میری مشکل آسان کر سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے شانی! آپ کے ہاتھ کی چلی ہوئی گولی مجھے کوئی تکلیف نہیں دے گی۔ بس آپ میرا سر اپنی گود میں رکھ لیں..... پستول کی نال کو یہاں رکھیں۔ میرے کان سے ذرا اوپر اور گھوڑا دبا دیں۔ مجھے پورا بھروسہ ہے شانی! مجھے بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔ میں حرام موت مرنے سے بھی بچ جاؤں گا۔'' وہ بولنے کے ساتھ ساتھ کراہ رہا تھا۔

''میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔''

''تو کیا آپ مجھے اذیت سے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں..... وہ مجھے یہاں..... زندہ پکڑنا چاہیں گے..... اور اس کے بعد وہ میرے ساتھ جو کچھ کریں گے، وہ آپ کے تصور میں نہیں آ سکتا۔''

''لیکن..... لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے رستم۔ ابھی زندگی کا امکان باقی ہے۔ ابھی ہم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''اب یہ خود کو دھوکا دینے والی بات ہے شانی! جو کچھ ہونے والا ہے، وہ آپ بھی دیکھ رہی ہیں۔''

''آپ ہی تو کہتے تھے، موت سے پہلے مرنا گناہ ہے۔'' وہ سسکی۔

''تو پھر وعدہ کریں شانی! جب وقت آ جائے گا اور آپ دیکھ لیں گی کہ وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں تو آپ مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مار دیں گی۔''

''جو وقت ہم دیکھنا نہیں چاہتے، اس کے بارے میں کیوں سوچیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔'' وہ اپنا رخسار رستم کے شانے سے رگڑتے ہوئے بولی۔

وہ کہہ رہی تھی لیکن ان دونوں کے ذہن جیسے بہ تدریج موت کو قبول کرتے جا رہے تھے..... اور ایک دوسرے کی قربت انہیں مرنے کا حوصلہ بخش رہی تھی۔ موت جواب اٹل تھی..... جس سے مفر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رستم کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی نے اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کی زخمی پیشانی پر اپنے ہونٹوں کو مستقل ٹھہرا دیا۔

اچانک ایک لرزہ خیز آواز نے انہیں سرتاپا دہلا دیا۔ شانی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ ڈپٹی ریاض کی قہرناک آواز اتنی جلدی سنے گی اور اتنی قریب سے۔ یہ آواز بہ مشکل بیس پچیس فٹ کے فاصلے سے ابھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی

نہایت تیز روشنی نے ان کی آنکھیں چُندھیا دیں۔ یہ دراصل سرچ فوکس لائٹ تھی۔ یہ اپنے دائرے میں آنے والی ہر شے کو روشن تر کر رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ پتھروں کی طرح ساکت بیٹھے رہ گئے۔ ڈپٹی ریاض کے پیچھے دو اور سائے بھی تھے۔ ان میں سے ایک دراز قد تھا۔ یہ دونوں افراد بھی مسلح تھے۔ ڈپٹی ریاض کے اپنے ہاتھ میں جدید خودکار رائفل تھی۔ ڈپٹی کی آنکھیں آتش فشاں کے دو دہانوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ عہدِ قدیم کے کسی منگول حملہ آور کی طرح غیر متوقع طور پر اچانک یلغار کر کے ان کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دفعتاً اس سنگلاخ زمین سے اُگ آیا ہے۔

رستم کا ہاتھ پستول کی طرف بڑھا۔ ڈپٹی ریاض گرجا۔ ''خبردار..... ہاتھ پیچھے رکھ۔'' رستم رک گیا۔

ریاض کا قبائلی ساتھی جو درمیانے قد کا تھا، آگے بڑھا اور اس نے پستول کو رستم کے قریب سے اٹھا لیا۔ کلاشنکوف پہلے ہی دور پڑی تھی۔ ریاض دانت بھینچ کر پھنکارا۔ ''لگتا ہے، تیری یہ ماں خالی ہو چکی ہے۔ اسی لیے دور پڑی ہے۔'' اس نے قبائلی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہزارہ خان اٹھا لے اس کلاشنکوف کو بھی۔'' ہزارہ خان نے حکم کی تعمیل کی۔ دستی بم والا تھیلا رستم کے عقب میں تھا مگر اس پر بھی ریاض کی عقابی نظر پڑ گئی۔ ''اس تھیلے کو بھی اٹھا لو جس میں یہ اپنے بہن کا جہیز ڈال کر پھر رہا ہے۔''

قبائلی ہزارہ خان بندوق تان کر آگے بڑھا۔ رستم مزاحمت کے قابل نہیں تھا۔ وہ دیکھتا رہا اور ہزارہ خان کینوس کا تھیلا بھی اٹھا کر لے گیا۔ ہزارہ خان کے ہاتھ میں بھی سرچ فوکس لائٹ تھی۔ اس کی روشنی ریاض پر پڑی۔ شانی نے دیکھا کہ ریاض کے درم زدہ چہرے پر پٹیاں تھیں۔ اس کی ایک کلائی پر سفید پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ وہ خونخوار لہجے میں دہاڑا۔ ''کھڑے ہو جاؤ دونوں بہن بھائی۔''

دونوں بیٹھے رہے۔ ڈپٹی نے دونوں کو غلیظ ترین گالیاں دیں اور شانی کی پسلیوں میں رائفل کی نال کھسیڑتے ہوئے اسے اٹھنے کا حکم دیا۔ شانی لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی لیکن رستم میں اتنی سکت بھی باقی نہیں بچی تھی۔ اس کی سانس رک رہی تھی..... اور آنکھیں جیسے خود بخود بند ہو رہی تھیں۔ ریاض کے اشارے پر قبائلی ہزارہ خان نے آگے بڑھ کر رستم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ نیم جان رستم زیادہ مزاحمت نہیں کر سکا۔ ہزارہ خان نے رستم کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔ رستم کا زریں لباس خون سے نچڑا ہوا تھا۔ کٹی ہوئی ٹانگ والا خون آلود پائنچا حسرت آمیز انداز میں جھول رہا تھا۔ بیساکھی پاس ہی

www.pdfbooksfree.pk

پڑی تھی مگر ہزارہ خان نے رستم کو بیساکھی دینے کی زحمت نہیں کی۔ ریاض کے حکم پر اس نے بیساکھی کو دیوار سے ٹکرا کر توڑا اور دور پھینک دیا۔

ٹارچوں کی روشنی میں شانی سر جھکائے کھڑی تھی۔ رستم بھی کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے سوچنے سمجھنے اور بولنے کی ذمے داری شانی پر ڈال دی ہے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ''شانی! یہی شخص تھا نا، چار دن پہلے جس کی موت کا راستہ آپ نے روکا تھا لیکن کچھ بھی ہے..... میرا عشق، میرا ایمان ہے اور میرے عشق میں اختلاف اور انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جو آپ کا رستہ..... وہی میرا رستہ ہے..... جو آپ کی چاہ وہی میری۔'' شانی نے درد بھری نظروں سے رستم کو دیکھا۔

ریاض سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کیا دیکھ رہی ہے بی بی جان! تیرے اس منہ بولے خصم میں اب کوئی تڑ شڑ نہیں رہی ہے۔ اس کے سامنے تیرے ٹوٹے بھی کر دوں تو یہ اب سلطان راہی نہیں بن سکتا۔ روپے میں بارہ آنے مُردار ہو چکا ہے یہ حرامزادہ۔''

اور ریاض شاید غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ رستم نیم جان تھا۔ سخت سے سخت انسان کی برداشت کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے اور رستم پر یہ حد آ چکی تھی۔

ریاض نے اے کے 56 رائفل سیدھی کی۔ ''دل تو نہیں چاہتا چن مکھنی..... کہ تم دونوں کو اتنی آسان موت دوں..... پر میں ایک غریب مسکین پلسیا ہوں۔ تم دونوں حرامزادوں کے کلے بڑے پکے ہیں۔ کیا پتا کل کلاں پھر چھوٹ جاؤ اور میرے سینے پر چڑھ کر دھمالیں ڈالنے لگو۔ اس لیے تم دونوں کی عاشقی معشوقی کا دی اینڈ اسی جگہ کر دینا بہتر ہے۔'' پھر وہ ہزارہ خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیوں بھئی ہزارہ خان! کر دوں نا دی اینڈ..... بجا دوں نا قومی ترانہ؟''

''بالکل ریاض صیب! اب دیر کس بات کی ہے۔ مارو فائر اور لمبا کر دو کنجری کو اور اس کے کنجر یار کو اور بہتر ہے کہ ان کے پیٹ میں گولیاں مارو، دس پندرہ منٹ تڑپ پھڑک تو دکھائیں گے۔''

ریاض پھنکارا۔ ''کیا خیال ہے ہیر سیال! پہلے اپنے ڈھڈ میں تُو گولی کھائے گی یا تیرا یہ بہن خور یار؟''

''ریاض! تُو نے جو بھی کرنا ہے جلدی کر دے۔'' شانی سسکی۔ ''اور اچھا ہے کہ پہلے مجھے مار دے۔''

''ہائے اوئے خستیاں..... قربان جانواں اس بھوٹڑی عاشقی کے۔'' ریاض نے زہر

اگلا اور رائفل کی گولی اس طرح چلائی کہ رستم اور شانی کے درمیان سے گزر کر دیوار میں لگی۔ وہ دونوں محفوظ ساکت کھڑے رہے۔ ریاض ایک دم مطمئن سے بے قابو ہو کر رستم پر پل پڑا۔ وہ رائفل کے کندے سے رستم کو اندھا دھند مارنے لگا۔ نیم جان رستم نے مزاحمت کی مگر یہ مزاحمت چڑھے ہوئے دریا میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ وہ مزید زخمی ہو کر گر گیا۔ شانی تڑپ کر رستم اور ریاض کے درمیان آ گئی۔ ریاض شانی کو دھکیلتا ہوا ایک بار پھر دور جا کھڑا ہوا۔ وہ ایک دم آتش فشاں ہو گیا تھا۔ وہ خوفناک آہنگ میں گرجا۔ ''کھڑے ہو جاؤ..... کھڑے ہو جاؤ دونوں۔'' شانی کھڑی ہو گئی مگر رستم دوبارہ نہیں اٹھ سکا۔

وہ وہیں خاک و خون میں لتھڑا پڑا رہا۔ اسے زمین بوس دیکھ کر شانی بھی بیٹھ گئی۔ اس نے رستم کو بانہوں میں بھر لیا۔

ریاض چنگھاڑا۔ ''حرامزادی! کیا سمجھتی تھی تُو؟ میں تیری نیک پروینی اور تیری میٹھی چھری سے حلال ہو جاؤں گا؟ تُو ففے کٹنی ماں کی ففے کٹنی دھی ہے۔ تیری عاجزی مسکینی، تیری لولو پوپو باتیں، یہ سب کچھ گندا ناٹک ہے۔ تیری جیسی گندی نالی کی کیڑیاں اونچی کرسیوں پر چڑھنے کے لیے ایسے ہی مومن مولویانیاں بنتی ہیں۔ یہ کوئی نئی سائنس ایجاد نہیں کی تُو نے، یہ بڑا ٹوٹا ٹوٹکا ہے اور..... اور میں نے کہا تھا نا، میں تجھ جیسی کچی جادوگرنیوں کو اپنے پیشاب کی دھار میں بہا دیتا ہوں۔ کہا تھا نا میں نے؟''

شانی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آنسو بھی ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس نے اے کے 56 رائفل کی نال شانی کی طرف سیدھی کی اور چنگھاڑا۔ ''مرنے سے پہلے اپنی زبان سے اقرار کر کہ تُو ففے کٹنی ہے..... بہروپن ہے۔ تیری نظر ایم این اے کی کرسی پر اور اس سے بھی آگے تھی۔ تُو اس ڈاکو کے ساتھ بغیر نکاح کے سوتی تھی۔ تیرے پیٹ میں اس کے گناہ کی نشانی ہے۔ اقرار کر اپنے منہ سے..... نہیں تو تجھے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا۔ اگر نہ لٹکاؤں تو اپنے باپ کا تخم نہیں ہوں۔ اقرار کر.....''

شانی بس سسکتی رہی۔ ریاض جیسے دیوانگی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ ہذیانی تھا اور آنکھوں سے چنگھاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس نے جیبیں ٹٹول کر ایک فل اسکیپ سادہ کاغذ نکالا۔ یہ کاغذ اس نے شانی کی طرف پھینکا اور فاؤنٹین پین شانی کے منہ پر دے مارا۔ ''پکڑ یہ پین..... پکڑ!'' وہ گرجا۔

شانی نے پین بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ''لکھ اس کاغذ پر جو باتیں میں نے تجھ سے کہی ہیں۔ لکھ..... نہیں تو تیرے اس یار کو نیچے سے کاٹ دوں گا اور تجھے اوپر سے برابر کر دوں گا۔

www.pdfbooksfree.pk

لکھ حرامزادی! تا کہ سندر ہے تیرے اوپر۔"

شانی سسکی۔ "میں نہیں لکھ سکتی۔"

"کیوں؟"

شانی نے اشک بار آنکھیں اٹھا کر ریاض کو دیکھا اور بولی۔ "میری انگلیاں زخمی ہیں۔"

ریاض کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ یقیناً اسے یاد آیا ہوگا کہ یہ انگلیاں کیسے زخمی ہوئی تھیں اور یہ بھی یاد آیا ہوگا کہ کیوں ہوئی تھیں۔ مگر وہ غیظ و غضب کا چڑھا ہوا دریا تھا۔ چھوٹی موٹی رکاوٹیں اس کا رستہ کہاں روک سکتی تھیں۔ وہ اسی آتش فشاں لہجے میں بولا۔ "کسی کتے کے بی کا کوئی احسان نہیں ہے مجھ پر۔ سن رہی ہے تُو، کوئی احسان نہیں ہے۔ میں نے اتار پھینکے ہیں بہت سے احسان۔ وہاں تیری رنگ والی حویلی میں تیرا وہ ٹھرکی بڈھا معصوم علی زندہ ہے اور تیری وہ بدکار پھوپھی بھی اپنے حصے کی دودھ جلیبیاں کھا رہی ہے۔ میں نے تیرا کافی سارا احسان برابر کر دیا ہے۔ صرف ایک جنازہ نکالا ہے۔ دو جنازے تجھے معاف کیے ہیں۔ چل لکھ۔ چل لکھ..... نہیں تو پہلی گولی تیرے اس ہاتھ پر ہی ماروں گا۔"

شانی نے کوشش کی مگر انگلیوں سے خون رسنے لگا۔ "مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔" وہ بے بسی کی انتہا کو چھو کر بولی۔

اس نے شانی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور للکارا۔ "اچھا، اپنے منہ سے بول..... بول جو میں نے کہا تھا۔ بول تُو نفے کٹنی ہے، بہروپن ہے۔ جادو ٹونے کرتی ہے۔ بول میں کہتا ہوں۔" اس کے لہجے میں ہذیان تھا۔

رستم کے جسم میں جنبش جاگی مگر وہ گوشت پوست کا انسان تھا۔ ناتوانی کی حد سے گزر چکا تھا۔ اب وہ دل و جان سے چاہتا بھی تو قابلِ ذکر مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔

ریاض کے بے پناہ جبر سے مجبور ہو کر شانی ریاض کے پیچھے پیچھے بولنے لگی۔

بول۔ "میں نفے کٹنی ہوں۔"

"میں نفے کٹنی ہوں۔"

"بول میں بہروپن ہوں۔"

"میں بہروپن ہوں۔"

"میں نے سب کو دھوکا دیا۔"

"ہاں، میں نے سب کو دھوکا دیا۔"

"میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔"

"ہاں، میں نے دیا۔"

"پورا فقرہ بول حرامزادی! میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔ میں نے ان کا پیسا کھایا۔"

"میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔ میں نے ان کا پیسا کھایا۔"

"میری نظر ایم این اے کی کرسی پر تھی۔"

"میری نظر کرسی پر تھی۔"

"میں اپنے لالچ اور حرص کے لیے اپنے لوگوں سے معافی مانگتی ہوں۔"

"میں اپنے لالچ اور حرص کے لیے اپنے لوگوں سے معافی مانگتی ہوں..... ہاں، میں معافی مانگتی ہوں۔ مجھے سب معاف کر دیں۔ میں نے جن کو دھوکا دیا اور جن کو دھوکے دینے کے ارادے رکھتی تھی۔ میں نے جن کو لوٹا اور جن کو لوٹنے کے ارادے رکھتی تھی۔ مجھے سب معاف کر دیں اور ریاض! تم بھی معاف کر دو۔" وہ روتی گئی اور بولتی چلی گئی۔ "میں ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگتی ہوں اور تم سے بھی۔ بس، اب اتنا احسان مجھ پر کرو۔" اس کا سر جھک گیا۔ بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ چھپا لیا۔ ہزارہ خان کے ہاتھوں میں چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا جو اس نے بند کر دیا۔

ریاض کی آنکھیں بدستور شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے رائفل شانی اور رستم کی طرف سیدھی کی۔ سینٹی کیچ ہٹایا اور انگلی ٹرائیگر پر رکھ دی۔ اس کی انگلی کی ایک حرکت رنگ والی کی چھوٹی چودھرانی اور مظلی پنجاب کے ڈکیت رستم سیال کو عدم آباد روانہ کر سکتی تھی۔ انگلی ٹرائیگر پر تھی اور ٹرائیگر منتظر تھا اور ٹرائیگر سے آگے رائفل کا بیرل تھا..... اور بیرل سے آگے دو لٹے پٹے جسم تھے..... اور انگلی ٹرائیگر پر حرکت نہیں کر رہی تھی۔ انگلی کیوں حرکت نہیں کر رہی تھی؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ یہ صدیوں کی بساط پر فیصلے کا لمحہ تھا..... اور روزِ ازل سے ایسے حیران کن لمحے آتے ہی رہتے ہیں۔ جب وقت کے طوفانوں میں ظلم اور برداشت ٹکراتے ہیں۔ جفا اور وفا میں رَن پڑتا ہے، خنجر اور گردن کا تصادم ٹھہرتا ہے تو پھر ایسی ساعتیں آتی ہیں۔ ان ساعتوں میں کچھ ہو جاتا ہے۔ شیشے کی ضرب سے پتھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھول کی پتیوں سے ہیروں کے جگر کٹ جاتے ہیں اور نازک گردنیں، خنجروں کو کند کر دیتی ہیں..... ہاں، ایسا ہوتا ہے اور پتھروں کو اور ہیروں کے جگر کو اور تیز دھار خنجروں کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ یہ انقلاب آفریں تبدیلی کب آئی۔ ریاض جیسے پھنکارتے، شعلے برساتے انسان بھی کبھی کبھی ایسی تبدیلیوں کی زد میں آتے ہیں۔ ان کو بھی پتا نہیں چلتا کہ ان کے اندر کب تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ ان کے اندر کے لات منات کب ٹوٹنا شروع ہوئے اور

www.pdfbooksfree.pk

ان کے سینے کے نیلے شعلوں کو کب پیہم برسنے والی بارشوں نے دھواں کر دیا۔

بے شک یہ حیران کن لمحے تھے۔ ریاض کی اے کے 56 رائفل تنی ہوئی تھی۔ چہرہ انگارہ تھا اور سانس چڑھی ہوئی تھی مگر رائفل خاموش تھی۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں ریاض کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں دکھائی دیں۔ وہ کھڑا کھڑا جیسے پتھر ہو چکا تھا۔ وہ لمحے تھے یا صدیاں تھیں لیکن وہ جو کچھ بھی تھا بالآخر گزر گیا۔ ایک وحشی چنگھاڑ کے ساتھ ریاض نے گولیاں چلائیں۔ اس نے کل چار فائر کیے۔ یہ چاروں فائر رستم اور شانی کے سروں کے کافی اوپر سے گزرے اور سنگلاخ دیوار پر لگے۔ ہر طرف پتھریلی کرچیاں بکھر گئیں۔

قبائلی ہزارہ خان حیرت سے گنگ تھا اور ریاض کا چہرہ تک رہا تھا۔ ریاض نے رائفل گھما کر دیوار پر دے ماری۔ وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گری۔ ریاض، شانی پر جھپٹا..... دیوانگی کے عالم میں اسے کئی دو ہتڑ رسید کیے اور دہاڑا۔ ''ٹو کس مٹی کی بنی ہوئی ہے..... ٹو کیا ہے..... ٹو کیا ہے؟''

پھر وہ بے دم سا ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے اپنے اٹھے ہوئے گھٹنوں پر کہنیاں رکھیں اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ کیا کرے۔

اچانک اس کا واکی ٹاکی جاگا۔ کافی دیر ہپ ہوتی رہی۔ آخر اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''ہیلو..... ہیلو ریاض صیب..... ہیلو! خو آپ کہاں پر ہے؟''

ریاض نے چند لمحے توقف کیا اور بے حد بوجھل آواز میں بولا۔ ''میں یہاں آگے آیا ہوا ہوں..... اوور!''

''ابھی اندر سے تین چار گولیاں چلنے کا مدھم آواز آیا ہے۔ خیریت تو ہے؟ اوور!''

''ہاں خیریت ہے۔ یہاں اندھیرے میں کچھ شک ہوا تھا۔ اس لیے گولیاں چلائیں..... اوور!''

''مفرور کا پتا چلا؟ اوور!''

''نہیں، ابھی نہیں۔ اوور اینڈ آل!'' ریاض نے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔

شانی کو لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کیا واقعی ہو رہا تھا یا وہ مر چکی تھی؟ اسے اپنے اردگرد کی ہر شے چکراتی دکھائی دی۔ اسے اب بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونا ہے۔

ریاض نے عالم وحشت میں اپنی رائفل دور پھینک دی تھی۔ یہ پوسٹ کے پیچھے ایک

تاریک گوشے میں جا گری تھی۔ دراز قد پنجابی ہیڈ کانسٹیبل اسے اٹھانے کے لیے بڑھا۔ شانی کی چھٹی حس نے پکار کر کسی انجانے خطرے کی اطلاع دی۔ اچانک ساعت شکن دھماکا ہوا اور اس نے دراز قد شخص کو اڑ کر دور گرتے دیکھا۔ یہ خیال شانی کے ذہن میں برق کی طرح کوندا کہ یہ زمین میں چھپی کسی مائن کا دھماکا ہے مگر شاید یہ ایک مائن نہیں تھی۔ اکٹھی کئی مائنز کا بلاسٹ تھا۔ رستم اور خود شانی بھی ہوا میں اچھل کر گرے۔ اس کے ساتھ ہی شانی کو احساس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں کسی نہایت وزنی شے کے نیچے دب گئے ہیں۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ پوسٹ کی چھت بھی دھماکے سے گر گئی ہے اور اس کا ایک کندھا کسی وزنی شے کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے شعلے بھڑکتے دکھائی دیئے۔ ''رستم..... رستم!'' وہ چلائی مگر جہاں رستم گرا تھا، وہاں اب ملبے کا ایک پہاڑ ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ اس ڈھیر پر ایک زخمی چمگادڑ پھڑ پھڑا رہی تھی۔

ہر طرف دھول اور دھواں تھا۔ دونوں ٹارچوں کی روشنی بھی اس دھوئیں میں کہیں چھپ گئی تھی۔ اب صرف آگ کی روشنی تھی اور آگ چاروں طرف سے بڑھ رہی تھی۔ شانی کو ریاض اور ہزارہ خان بھی کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ چند ساعتوں بعد شانی کو لگا کہ اردگرد کا ٹمپریچر ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے پاؤں وزنی شے کے نیچے سے کھینچنا چاہے مگر یکسر ناکام رہی۔ ''بچاؤ..... بچاؤ۔'' وہ اضطراری کیفیت کے تحت چلائی۔

اس کے نتھنوں میں بارود کی مہک بُو تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کے بال جھلس رہے ہیں۔ تو کیا یہ آخری لمحے تھے؟ اس کی قسمت میں آگ میں جل کر مرنا تھا؟ رستم کہاں تھا؟ رستم کہاں تھا؟ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ ڈپٹی ریاض پر پڑی۔ وہ قریباً تیس فٹ کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس آگ کو دیکھ رہا تھا جو شانی کو نگلنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔

ریاض کا چہرہ یکسر سپاٹ تھا۔ یقیناً وہ بھی جان چکا تھا کہ شانی کے پاؤں آزاد نہیں ہیں۔ آگ کی لپٹوں اور دھوئیں سے شانی کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی اوڑھنی جلنا شروع ہو گئی۔ اس نے آخری بار پاؤں آزاد کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر اس نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا..... اس نے ڈپٹی ریاض کو دیکھا۔ وہ جو دہشت، بربریت اور درندگی کی علامت تھا۔ جو صرف زندہ درگور کرنا اور مارنا جانتا تھا..... ہاں، وہی ریاض شانی کی طرف لپک رہا تھا..... اسے آگ کی لپٹوں سے نکالنے کے لیے۔ اس کی آنکھوں میں ان لمحوں میں، انسانی ہمدردی کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ یہ ناقابل یقین نظارہ تھا۔ شانی نے اسے دوڑتے اور آگ میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ شانی کے پاس آیا۔ اسے ملبے کے بوجھ کے نیچے سے نکالنے کی کوشش

www.pdfbooksfree.pk

کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریاض کے بال بھی جھلسنے لگے۔ اس کے چہرے کے گرد لپٹی ہوئی سفید پٹی نے آگ پکڑ لی۔

''الو کی پٹھی! خود بھی زور لگا۔'' وہ شانی کو کھینچتے ہوئے دہاڑا۔

شانی نے اپنی سی کوشش کی مگر دونوں پاؤں مفلوج ہو چکے تھے۔

ریاض نے ملبے کو، آگ کو اور اس ساری صورتِ حال کو کئی گندی گالیاں دیں اور ایک جلتی ہوئی شہتیر کو شانی کے پاؤں پر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے اپنے ہاتھ جل گئے۔ باہر سے ہزارہ خان چلایا۔ ''چھوڑ دو ریاض صیب! دوسرا چھت بھی گرنے والا ہے..... باہر آ جاؤ۔''

ریاض نے کوئی جواب نہیں دیا اور شانی کو کھینچنے کی کوشش کرتا رہا۔

''چھوڑ دو۔'' شانی کراہی۔ ''تم خود کو بچاؤ۔''

''بکواس بند کرو۔'' ریاض نے کہا اور پورا زور لگا کر شانی کو کھینچا۔ وہ تھوڑا سا کھسکی مگر مکمل طور پر باہر نہ آ سکی۔ ریاض کے کپڑوں نے پہلو کی طرف سے آگ پکڑ لی۔ شانی کے اپنے کپڑے بھی جل رہے تھے۔ اسے لگا، وہ انگاروں سے لپٹی ہے۔

''ریاض صیب! کیا ہو گیا تم کو..... چھوڑ دو اس خبیث کو۔'' ہزارہ خان پھر چلایا۔

اسی دوران میں شانی کے پاؤں ایک جھٹکے سے آزاد ہو گئے۔ جھٹکے سے ریاض بھی گرا..... اس کے ہاتھ میں ایک چٹائی آئی۔ یہ چٹائی اس نے شانی کے گرد لپیٹی، اسے اپنے بازوؤں میں لیا اور دوڑتا ہوا آگ کے گھیرے سے باہر آ گرا۔ ہزارہ خان نے جلدی سے ایک بھاری کپڑا ریاض کے جسم پر ڈال کر اس کی آگ بجھائی۔ وہ تینوں بری طرح کھانس رہے تھے۔

''رستم..... رستم! کہاں ہو تم؟'' شانی دھوئیں کے اندر سے ملبے کے ڈھیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سلگتے ہوئے ملبے کو ننگے ہاتھوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ ریاض نے اسے کھینچ کر ملبے سے دور کیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک زور کا کڑاکا ہوا۔ بالائی چھت بھی دھماکے سے ملبے کے ڈھیر پر گر گئی اور یہی نہیں ہوا، کھوہ کی چھت کا بے شمار ملبہ بھی ساتھ ہی گرا۔ ہزاروں ٹن پتھروں نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا۔

''رستم..... رستم!'' شانی دیوانہ وار چلاتی چلی گئی..... پکارتی چلی گئی۔

ریاض نے اسے بانہوں میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے آگ اور قاتل دھوئیں میں کودنے سے بہ مشکل روکے ہوئے تھا۔ ہزارہ خان دیکھ رہا تھا اور حیرت سے گنگ تھا۔ واکی ٹاکی پر مسلسل سگنل

موصول ہو رہے تھے۔ ریاض نے کال ریسیو نہیں کی۔ تپش اور دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔

''ہزارہ خان! اسے یہاں سے نکالنا ہے۔'' ریاض نے عجیب لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ شانی کی طرف تھا جو اس کے بازوؤں میں تھی۔

''ام سمجھا نہیں ریاض صیب!''

''میں نے فارسی نہیں بولی۔ اسے پہاڑ سے پار کرنا ہے۔ تم آگے چلو..... تمہیں راستے کا پتا ہے۔'' وہ تینوں بری طرح کھانس رہے تھے۔ سب سے برا حال شانی کا تھا۔ وہ بہت کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ گاہے بہ گاہے اس کی سانس بالکل گم ہو جاتی تھی۔ وہ اب جو کچھ بھی بول رہی تھی، وہ اس کے گلے کے اندر ہی گونج رہا تھا۔

ہزارہ خان نے ٹارچ اٹھائی اور گہرے دھوئیں میں راستہ بناتا ہوا چل دیا۔ ریاض نے شانی کو بانہوں میں لے رکھا تھا اور اپنے ساتھ کھینچ رہا تھا۔ شانی نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ وہ رستم کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اس گہرے سیاہ دھوئیں میں، بے گور و کفن، اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس نے چاہا، وہ بھی اسی سیاہ دھوئیں میں ختم ہو جائے مگر ریاض کی بانہیں اس کے نیم جان جسم کو کھینچتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ کھوہ کے اندر سے پھوٹنے والے ایک نہایت تنگ راستے سے گزر رہے تھے۔ یہاں سے بہ مشکل ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ شانی نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، اس راستے کے اوپر شاید کھلا آسمان تھا..... مگر دھواں یہاں بھی بھرا ہوا تھا۔

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ وہ بھی مر رہی ہے۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ اس کی سانس اس کے سینے سے بچھڑ رہی تھی۔ وہ گر گئی۔ اسے لگا کہ ہزارہ خان اسے کندھے پر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے پھر اس کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

وہ نہ جانے کب تک اس تاریکی میں رہی۔ اس تاریکی میں گاہے بہ گاہے کچھ دور افتادہ آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ کچھ لمس، کچھ بالکل تاریک مناظر..... جیسے یہ سب کچھ کسی اور دنیا میں ہو رہا ہے۔ اس بے ہوشی کے عالم میں اسے احساس ہوا کہ وہ رستم کے ساتھ ہے۔ ایک نہایت چمکیلی شام میں۔ روکیٹ بستی کا خوب صورت گھر ہے اور ٹیلے ہیں۔ وہ رستم کا مضبوط ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے..... ہنستی جا رہی ہے، بولتی جا رہی ہے۔

لیکن پھر یہ سب کچھ ایک اتھاہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی گہرے، بہت گہرے کنوئیں میں اترتی جا رہی ہے..... رستم اس کے ساتھ نہیں۔ وہ یکسر تنہا ہے۔

نہ جانے بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے یہ دورانیے کب تک آتے جاتے رہے پھر شانی کو

www.pdfbooksfree.pk

محسوس ہوا کہ رات کا وقت ہے اور وہ کسی گاڑی میں ہچکولے کھا رہی ہے..... اس کے ارد گرد کچھ لوگ موجود تھے۔ اسے ناصر کی آواز سنائی دی۔ پھر جہانگیر کی..... پھر کوئی پشتو میں زور سے بولا۔

شانی نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اس کے گرد چھائی ہوئی تاریکی کا پردہ رفتہ رفتہ چاک ہونے لگا۔ وہ کسی جیپ نما گاڑی میں تھی۔ گاڑی کے اندر ہلکی روشنی تھی۔ اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر بہت سی کریم لگی ہوئی تھی۔ اسے سامنے ہی ایک برقع پوش عورت نظر آئی..... رستم کہاں ہے؟ یہ سوال دہکتے ہوئے تیر کی طرح اس کے سینے میں اُتر گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چلائی۔ ''رستم..... رستم!''

کسی نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ یہ ناصر تھا..... ہاں، یہ ناصر تھا۔ اس کے سر پر ایک بڑی پگڑی نظر آ رہی تھی۔ ''رستم کہاں ہے ناصر؟'' شانی نے اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

ناصر نے نرمی سے کہا۔ ''آپ لیٹ جائیں بھابی! آپ زخمی ہیں۔''

''مجھے رستم کے بارے میں بتاؤ۔ خدا کے لیے بتاؤ۔ وہ زندہ ہیں نا؟''

''ہاں، وہ زندہ ہیں..... آپ لیٹ جائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔'' ناصر نے عجیب لہجے میں کہا۔

''دیکھو ناصر! مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں؟''

اچانک شانی کے نتھنوں میں اسپرٹ کی بُو گھسی۔ اسے بازو پر سوئی چبھنے کا احساس ہوا۔ وہ کچھ دیر آہ و بکا کرتی رہی۔ ''دیکھو ناصر..... دیکھو جہانگیر..... ان کو مُردہ نہ سمجھنا۔ وہ زندہ ہیں۔ ان کو ڈھونڈو۔ وہ ملبے کے نیچے ہیں..... وہ مل جائیں گے.....'' وہ بولتی رہی اور ایک بار پھر بہ تدریج تاریکی کے سمندر میں ڈوب گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک گھر میں تھی۔ یہ نیچی چھت والا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ شانی نے پہچان لیا، یہ زری تھی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ گاڑی میں اس نے جس برقع پوش کو دیکھا تھا وہ زری ہی تھی۔ شانی کو ہوش میں آتے دیکھ کر زری تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اس کے ساتھ ہی ناصر کو آوازیں دینے لگی۔ ناصر بھاگا ہوا اندر آیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا لیکن اب سر پر پگڑی نہیں تھی۔

شانی پر ایک بار پھر ہیجانی کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور مسلسل رستم کے بارے میں سوال کرنے لگی۔ ناصر نے زری کو باہر بھیجا اور شانی کو بڑی محبت سے بستر پر لٹا دیا۔ ''بھابی! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا لیکن آپ کو حوصلے اور ہمت سے سننا ہوگا۔''

''میں سنوں گی۔ تم بتاؤ۔'' وہ کراہی۔

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''رستم بھائی لاپتا ہیں لیکن ہم ان کی طرف سے ابھی مایوس نہیں ہیں۔ وہاں کھوہ میں بہت سا ملبہ گرا ہے۔ پہاڑی کا ایک حصہ ڈھے گیا ہے۔ بہت سے پاکستانی اور افغانی لوگ تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔''

''لیکن ہمیں کیسے پتا چلے گا..... وہ کیسے ہیں؟''

''آپ بے فکر رہیں۔ اس کا بھی انتظام ہے۔ پہلوان اور نذیر خان کے رابطے سرحد کی دونوں طرف ہیں۔''

ناصر کافی دیر تک شانی کو سمجھانے اور سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے شانی کو بتایا کہ وہ چیک پوسٹیں دراصل ان لشکریوں کے ٹھکانے تھے جو کچھ عرصہ پہلے روسی فوجوں سے لڑتے رہے۔ اس علاقے میں اکثر جگہوں پر اب بھی بارودی سرنگیں موجود ہیں۔ یہ ایک ساتھ پھٹ جانے والی چار پانچ سرنگیں ہی تھیں جنہوں نے اتنا بڑا دھماکا کیا۔

شانی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے کون لایا تم لوگوں کے پاس؟''

''ہم بارڈر کے پاس بور کی گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کل رات آخری پہر ایک قبائلی ہمارے پاس آیا۔ اس نے اپنا نام ہزارہ خان بتایا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اور اس کے دو ساتھی بچھلے کئی گھنٹے سے ہمیں ارد گرد کی بستیوں اور ڈیروں پر تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے مجھے اور ہمارے میزبان کو ساتھ لیا اور گاؤں سے باہر ایک درے میں لے آیا۔ وہاں آپ ایک چٹائی پر بے ہوش پڑی تھیں۔ آپ کو اپنے ساتھ لانے والا ڈپٹی ریاض تھا۔ ڈپٹی ریاض کا بایاں پہلو بری طرح جلا ہوا تھا۔ چھاتی کی طرف سے کھال اُتر گئی تھی اور جرابی نظر آ رہی تھی۔ اس نے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا۔''

''اس نے کچھ کہا؟''

''ہاں۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑے طیش میں تھا۔ پتا نہیں کیا کیا بول رہا تھا..... جلن کی وجہ سے بھی اس کا برا حال تھا۔ پھر وہ ہزارہ خان کے ساتھ واپس چلا گیا۔''

''اس نے کچھ کہا ناصر! مجھے بتاؤ..... اس کے لفظوں میں بتاؤ۔'' شانی نے اصرار کیا۔

ناصر کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر کہنے لگا۔ ''اس نے آپ کو..... گالی دی اور بولا، اس کو بتا دینا کہ ڈپٹی ریاض نے کبھی کسی کا احسان اپنے سر پر نہیں رکھا۔ میں نے اس کی اور اس کے خصم کی جان بخشی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا خصم سرنگ میں سے نکل نہیں سکا۔ اگر وہ ملا تو اسے بھی پارسل کر دوں گا تم حرامیوں کے پاس۔''

''جب وہ یہ کہہ رہا تھا ناصر..... اس کے چہرے پر کیا تھا؟''

www.pdfbooksfree.pk

ناصر پُر سوچ انداز میں سامنے دیوار کو تکتا رہا۔ آخر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

''بھابی! کبھی آپ نے کسی پتھر کو روتے دیکھا ہے؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''جب ریاض یہ باتیں کر رہا تھا..... میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مجھے اپنی نظر پر یقین نہیں آیا۔ مجھے..... بالکل یہی لگا جیسے کوئی پتھر رو رہا ہے..... ریاض اور آنسو..... سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے نا؟''

شانی کی آنکھوں میں بھی تازہ آنسو امڈ آئے۔ ''اس نے کچھ اور کہا؟''

''نہیں بھابی..... بس جاتے جاتے اس نے کوئی شے پتھر پر مار کر توڑ دی۔ وہ پرزے پرزے ہوگئی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس کی کیسٹ بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اس کے بعد وہ رکا نہیں۔ ہزارہ خان کے ساتھ واپس بارڈر کی طرف چلا گیا۔''

شانی نے گھٹنوں میں منہ چھپایا اور سسکتی رہی۔ اس کے دونوں پاؤں زخمی تھے اور ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ناصر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ کے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔''

''کیا؟'' وہ گھٹنوں میں سر دیئے دیئے بولی۔

''آنکھیں کھول کر دیکھ لیں۔''

شانی نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے دروازے میں مُنا کھڑا تھا۔ اس نے زری کی انگلی تھام رکھی تھی۔ اس کے عقب میں پہلوان تھا۔ ''منے!'' شانی نے پکارا۔ وہ جیسے صدیوں کا بچھڑا ہوا تھا۔ بھاگ کر آیا اور شانی سے لپٹ گیا۔

☆=======☆=======☆

اگلا ایک مہینہ انتہائی کرب، اضطراب اور انتظار کا مہینہ تھا۔ شانی کے کان ہر لحظہ کسی اچھی خبر پر لگے ہوئے تھے..... اور وہ اچھی خبر کہیں نہیں تھی۔ یہاں وہ پہلوان کے ایک قبائلی دوست تمیز علی خان کے آبائی ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان یہ ایک الگ تھلگ بستی تھی۔ بہ مشکل پندرہ بیس گھر اور یہ سب لوگ آپس میں رشتے دار تھے۔ نزدیکی شہر خوست تھا اور وہ جنوب مشرق میں قریباً چالیس..... کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

تمیز خان اپنی تین اونٹنیوں پر عارضی لکڑی خرلاچی منڈی میں لے کر جاتا تھا۔ وہ ہر پانچویں چھٹے روز پاکستانی علاقے سے ہو کر آتا تھا اور ناصر، جہانگیر وغیرہ کو صورت حال سے آگاہ کرتا تھا۔ سرنگ جس جگہ سے بیٹھی تھی، وہاں پہاڑی میں کئی دراڑیں نمودار ہوگئی تھیں۔

وہاں سے ملبہ ہٹانا اور کسی کو تلاش کرنا خاصا دشوار گزار کام تھا۔ اس کے علاوہ مزید بارودی سرنگوں کا اندیشہ بھی موجود تھا۔ سترہویں اٹھارہویں دن تمیز خان کی زبانی، شانی تک ایک اچھی خبر پہنچی تھی..... اور وہ یہ کہ پورے اٹھارہ روز بعد ملبے کے نیچے سے ایک شخص زندہ نکلا تھا۔ یہ وہی دراز قد پنجابی ہیڈ کانسٹیبل تھا جو رستم کے ساتھ ہی ملبے کے نیچے دب گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو شدید زخمی تھے۔ زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے پھر بھی وہ اپنی سانس کی ڈور کسی نہ کسی طرح بحال رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ عمارت کے ملبے کے نیچے بن جانے والے ایک خلا میں موجود رہا تھا۔ اس خبر کے بعد شانی اور اس کے ساتھیوں کی امید بندھی۔ وہ رستم کے بارے میں پھر سے تھوڑے پُر امید ہوگئے۔

اب اس واقعے کو بھی نو دس دن گزر چکے تھے۔ آس امید کے چراغوں کی لَو پھر مدھم پڑنے لگی۔ شانی کے لیے دنیا اندھیر تھی..... اور تو اور وہ مُنے کی طرف سے بھی بالکل بے پرواہ ہو چکی تھی۔ مُنے کی دیکھ بھال زری ہی کر رہی تھی۔ شانی زیادہ تر گھر کی چھت پر جا کر چارپائی پر لیٹی رہتی۔ وہ جنوب کے ان پہاڑوں کی طرف دیکھتی رہتی جن کے پار اس کا جیون ساتھی رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہتا، اس کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی۔

وہ جیسے ہوا کے ہاتھ پیغام بھیجتا تھا۔ میری شریکِ حیات اور میرے دوستو! میرا انتظار کرنا۔ مجھے بھول نہ جانا۔ میری واپسی کے امکان اپنے دل میں زندہ رکھنا اور امکان تو بہت سے ہیں..... ممکن ہے کہ میں ملبے کے نیچے زندہ موجود ہوں۔ ممکن ہے کہ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہو اور کسی نامعلوم جگہ پر رکھا گیا ہو اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں کھوہ سے نکلنے میں کامیاب رہا ہوں۔ کسی جگہ رکا، کسی جگہ چھپا اچھے وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔

ہوا پیغام دیتی رہی اور وقت گزرتا رہا..... وہ آس سب کے دلوں میں زندہ رہی جو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹی اور سب سے زیادہ شانی کے دل میں اس آس کا بسیرا تھا۔ اسے شب و روز کی ہر ہر ساعت میں کسی کی آمد کا انتظار رہتا تھا۔

ایک دن زری نے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے عقب سے اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کا رخسار چوم کر بولی۔ ''دیکھو! تم نے اپنا کیا حالت بنا لیا۔ تم کو دیکھ کر میرا دل روتا..... تم ایسا مت کرو۔''

وہ بولی۔ ''زری! کچھ بھی میرے بس میں نہیں۔ زندگی نہ موت۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے معاف کر دیا کرو۔''

''دیکھو! ناصر ہر وقت مجھ کو ٹوکتا کرتا۔ اگر تم بھی کرتا تو پھر میں واپس چلا جاؤں گا۔''

www.pdfbooksfree.pk

اس نے پرانی دھمکی دی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ شانی نے تڑپ کر دیکھا۔ ناصر اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی خبر ہے لیکن یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی شاید۔

شانی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ پتھر کی طرح ساکت۔ ''کک..... کیا ہوا..... ناصر؟'' وہ ہکلائی۔

ناصر نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے گہری سانس لی اور بولا۔ ''ڈپٹی ریاض مر گیا بھابی۔''

''کیا..... کیسے؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ بھونچکی رہ گئی۔

''ہاں بھابی! یہ کنفرم اطلاع ہے۔ پہلوان اخبار بھی ساتھ لایا ہے۔'' ناصر نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''وہ ہسپتال میں تھا۔ اس کا ایک تہائی جسم جل چکا تھا۔ خاص طور سے سینہ۔ پچھلے دس بارہ روز سے اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔ پرسوں جمعے کی دوپہر کو اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اسے لاہور سے اسلام آباد لایا جا رہا تھا مگر وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔''

آج کل شانی کی آنکھوں کو آنسوؤں کی قلت تھی۔ مگر اس دلدوز خبر نے اس کی آنکھوں کے سوتے پھر کھول دیئے۔ وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کی نگاہوں میں وہ آخری مناظر گھومنے لگے جب ریاض..... ریاض نہیں رہا تھا۔ چند انقلابی لمحوں نے اس کی اندرونی اچھائی کو اس کی ساری ظاہری باطنی برائیوں پر غالب کر دیا تھا۔ وہ جان کی پرواہ کیے بغیر نہایت دلیری سے آگ میں جھپٹا تھا اور شانی کو باہر نکالنے کی دیوانہ وار کوشش کی تھی۔

شانی کا دل چاہا کہ آج دنیا کے بڑے بڑے دانشور اس کے سامنے ہوں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے رُوبرو کھڑی ہو جائے۔ وہ ان سے کہے..... ابھی انسان سے مایوس ہونے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی برے سے برے انسان کے اندر بھی اچھائی موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اچھائی تہہ در تہہ غلافوں اور خولوں میں چھپی ہوئی ہو لیکن وہ موجود ہے۔ اسے تدبیر، برداشت اور پیہم محبت کے زور سے نکالا جا سکتا ہے..... اور جب وہ نکل آئے گی اور ہمیں اسے نکالنے کا ڈھنگ آ جائے گا تو پھر دیکھنا..... اس دنیا کا چہرہ اور ہو جائے گا۔

☆=======☆=======☆

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے..... شانی کی آنکھیں کھلے کواڑوں اور سنسان راستوں پر لگی رہیں لیکن جس کا انتظار تھا، وہ نہیں آیا..... وہ نہیں آیا۔ وہ شاید کہیں تھا ہی نہیں۔ مگر وہ اس آس کا کیا کرتی جو ہر روز اس کے اندر مر مر کر جاگتی تھی۔ یہ آس کہتی تھی، وہ تیرے بغیر کیسے جا سکتا ہے۔ وہ کہیں موجود ہوگا، زندہ ہوگا، تیرے عشق نے اسے زندہ رکھا ہوگا۔

یہ آسیں ایسی ہی دیوانی ہوتی ہیں۔ یہ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتیں۔ فنا کے گھاٹ اُتر کر پھر زندہ ہو جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی سہارے!

کہتے ہیں جو مر جاتے ہیں ان کے لیے چین آ جاتا ہے لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ آخری سانس تک تڑپاتے رہتے ہیں..... اور شانی تڑپ رہی تھی۔

سورج ڈوبتا رہا اور اُبھرتا رہا۔ ہوائیں اپنا لمس بدلتی رہیں۔ دھوپ اپنے زاویے تبدیل کرتی رہی۔ شامیں، صبحیں..... اور دوپہریں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہیں..... اسی طرح پورے سات ماہ گزر گئے۔ شانی کے پاس رستم تو نہیں آیا لیکن اس کی آخری نشانی آ گئی۔ یہ ایک ہمکتا، مسکراتا بچہ تھا۔ ایک چھوٹا رستم۔ وہ اپنی ماں کے بالوں میں اپنی ننھی انگلیاں پھنساتا اور اسے کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کرتا تھا..... جیسے اس کا دھیان اس کے بے پناہ دکھ سے ہٹانا چاہتا ہو اور وہ چند لمحوں کے لیے کامیاب بھی ہو جاتا تھا..... مگر صرف چند لمحوں کے لیے!

ناصر اور جہانگیر مستقل طور پر اس بوری کی نامی گاؤں میں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ انہوں نے یہاں خود کو فرضی ناموں عباس خان اور عبدالعزیز کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ عبدالعزیز یعنی جہانگیر کے پاس کافی کرنسی موجود تھی۔ روسی جنگ کے بعد افغانستان میں پاکستانی کرنسی کا ریٹ آسمان کو چھو رہا تھا۔ اس روپے سے جہانگیر اور ناصر نے ایک باغ اور دو کھیت خرید لیے۔ کھیت تو انہوں نے ٹھیکے پر دے دیئے مگر باغ کی نگہداشت اپنے ذمے رکھی۔ وہ سب اپنے اپنے ماضی کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ شانی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے بعد اس کے پیچھے کیا ہوا ہے اور اب وہ معلوم کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ کو بھی ان پہاڑوں تک محدود کر لیا تھا اور اسی میں عافیت تھی۔

باغ خریدنے کے دو تین مہینے بعد شانی کے بے حد اصرار پر ناصر اور زری نے شادی کر لی۔ یہ شادی رستم کی آخری خواہش کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ شانی اور جہانگیر نے گھر کا ایک حصہ ناصر اور زری کے لیے مخصوص کرنا چاہا مگر انہوں نے ہر صورت اکٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ ناصر کو شانی کی ذہنی کیفیت کا پتا تھا۔ وہ شانی کو ہر دم مصروف اور رونق میں رکھنا چاہتا تھا..... لیکن جب دل میں رونق نہ ہو تو باہر کی گہما گہمیاں یکسر بے اثر رہتی ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد علاقے کے حالات اچھے نہیں تھے۔ شانی مُنے کو باہر بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے گھر ہی میں اس کی تعلیم شروع کر دی تھی۔ مُنے کے ساتھ زری بھی اکثر اس کے پاس پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ چند ماہ کا بچہ ان کے آس پاس کھیلتا رہتا تھا۔ شانی نے اس کا نام راسب رکھا تھا..... راسب کا مطلب تھا با تحمل، بُردبار!

www.pdfbooksfree.pk

زندگی کے شب و روز اسی عجیب دھوپ چھاؤں میں گزرتے چلے جا رہے تھے۔ کسی اداس شام میں جب وہ تنہا ہوتی، سنسان گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی..... اسے لگتا وہ کچھ دیر پہلے یہاں تھا۔ کسی کونے کھدرے سے اسے اور اپنے بچے کو دیکھتا ہوا گزر گیا ہے۔ وہ گلی میں نکل کر دور تک دیکھتی لیکن کوئی نہ ہوتا۔ وہ پلٹ آتی۔ پھر ویرانی میں سے ایک بھولی بسری آواز ابھرتی اور اس کے کانوں میں گونجنے لگتی..... میریاں گلاں یاد کریں گی، رورو کے فریاد کریں گی، فیر میں تینوں یاد آواں گا۔

.....اور پھر پورے تین سال گزر گئے۔ گہرے زخم مندمل ہونا شروع ہو گئے۔ رونے دھونے اور تلاش کرنے والوں کو یقین ہونے لگا کہ رستم اب نہیں ملے گا..... زندگی رواں رہی۔ اب ہوائیں اسی طرح چلتی تھیں۔ موسم اسی طرح بدلتے تھے، کھیتوں میں مزدور کام کرتے تھے..... چشموں سے پانی نکلتا تھا، باغوں میں پھول کھلتے تھے، چاندنی چٹکتی تھی اور اَبر آلود راتوں میں آسمان سے برف کے گالے گرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ آسمان سے جنگی طیارے چنگھاڑتے ہوئے گزر جاتے، افق پر دھوئیں کے مرغولے دکھائی دیتے..... اور کبھی کبھی رات بھر دور کے پہاڑوں میں فائرنگ کی آوازیں آتی رہتیں..... ہاں، سب کچھ ویسا ہی تھا..... لیکن شانی کے لیے سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ اس کا کوئی زخم مندمل نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہر گھاؤ خونچکاں تھا۔ زمانہ بھول سکتا ہے اور بھول کر زندہ رہ سکتا ہے..... مگر خوشبو اپنے پھول سے بچھڑ کر کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ چاندنی کا وجود چاند سے اور ندی کا وجود پانی سے مشروط ہے۔

سرما کی ایک زرد دوپہر میں شانی اپنے دونوں بچوں کے ساتھ باغ کے کنارے کھڑی تھی۔ اسے دور پہاڑیوں پر ہجوم نظر آیا۔ ''یہ کیا ہے جہانگیر؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید جنگی سردار کسی نئی لڑائی کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو مارنے کے سوا ان کا کام ہی کیا ہے۔''

اسی دوران میں ناصر آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ لڑائی کی نہیں، صلح کی منصوبہ بندی ہے۔ دو جنگی گروپ ایک دوسرے کے قیدی رہا کر رہے ہیں۔ ہماری بستی کے کئی لوگ بھی واپس آ رہے ہیں۔''

ناصر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ظہر کی نماز کے فوراً بعد بستی کے چوراہے میں دیگیں کھڑکھڑاتی جانے لگیں پھر شانی نے بستی کے رہا ہونے والے چند نوجوانوں کو بستی میں آتے دیکھا۔ اسے ایسے منظر بڑے اچھے لگتے تھے۔ جب کوئی بچھڑا ہوا ملتا تھا۔ جب بانہیں ایک دوسرے کو لپٹاتی

تھیں۔ جب رخسار چومے جاتے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکتے تھے۔

اور وہ باغ کے کنارے کھڑی چپ چاپ دیکھتی رہی۔ بوڑھی مائیں، جوان بہنیں اور شرماتی لجاتی بیویاں اپنے بچھڑے ہوؤں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے منہ میں مٹھائی ڈالی جا رہی تھی۔ ہار پہنائے جا رہے تھے، نفیریاں بج رہی تھیں۔ پھر یہ ہنگامہ ختم ہو گیا، جیسے سب ہنگامے ختم ہو جاتے ہیں۔

شانی پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی قینچی تھی۔ وہ انگوروں کی بیل سے سرخی مائل انگوروں کے گچھے بڑے سلیقے سے علیحدہ کر رہی تھی اور ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کام میں مُنا بھی اس کی مدد کرنے لگتا تھا۔ چھوٹا راسب ایک چٹائی نما کپڑے پر سو رہا تھا۔ اچانک شانی کو لگا، اس کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ ایک نادیدہ لہر اس کے جسم سے ٹکرائی، اس نے آنکھیں سکوڑیں۔ اس کی سانس جیسے سینے میں رک گئی۔ دل کی دھڑکن تھم گئی اور کائنات کی گردش بھی۔ وہ دیکھتی چلی گئی۔ وہ وہم تھا یا حقیقت؟ نہیں وہم اتنا ٹھوس اور واضح تو نہیں ہوتا..... وہ اب پختہ عمر کا شخص نظر آتا تھا۔ اس کے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر لمبے جھاڑ جھنکار بال تھے۔ اس کے نقوش پر ماہ و سال کی دبیز گرد تھی۔ مگر اس کی آنکھیں..... اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ اسی پہلے دن کی طرح جب وہ اسی طرح اجڑا اجڑا، لٹا لٹایا چوہدری فاخر کی حویلی میں نظر آیا تھا۔ ان کئی برسوں میں ان آنکھوں میں ذرا سی تبدیلی بھی تو نہیں آئی تھی۔

شانی کو لگا کہ وہ بے ہوش ہو کر جائے گی لیکن پھر اس نے سوچا، اگر اسے گرنا ہی ہے تو وہ اپنے محبوب کی بانہوں میں گرے، یا پھر اس کے پاؤں میں..... ''رستم!'' وہ عجیب آواز میں سسکی..... وہ بھاگی، اس کے بازو پھیلے، اس کی اوڑھنی ہوا میں لہرائی۔ اس کا سینہ پُرنور محبت کی ''تجلی'' سے تھرایا..... اور وہ لپٹ گئی۔ اپنے شوہر سے، اپنے محبوب سے۔

☆=======☆=======☆

اور یہ رات تھی۔ سرما کی رات..... جب گھروں سے باہر سردی دندناتی ہے اور گھروں کے اندر آتش دان دہکتے ہیں۔ وہ سب بھی ایک انگیٹھی کے گرد بیٹھے تھے۔ رستم، ناصر، جہانگیر، شانی اور زری..... رستم کی لکڑی اور پلاسٹک کی ٹانگ اس کے جسم کا حصہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چھاتی اور گردن پر بھی جلنے کے پرانے نشان موجود تھے۔ مُنا اس کی گود میں سر رکھے بے خبر سو رہا تھا۔ رستم کا آنا ایک ایسے سپنے جیسا تھا جس پر یقین کرتے بنتی تھی نہ جس کو جھٹلاتے۔ وہ اپنی طویل رُوداد ختم کر چکا تھا۔ وہ سب کچھ بتا چکا تھا..... سب کچھ۔ وہ

www.pdfbooksfree.pk

اس قاتل رات میں کیسے رینگتا ہوا گرم ملبے کے ڈھیر سے نکلا، کیسے ایک دراڑ میں سے رینگ کر کھلی فضا میں پہنچا اور پھر کیسے وہ کئی دن تک ایک یوسف زئی بیوہ عورت کے گھر میں چھپا رہا..... وہ بتا چکا تھا کہ کس طرح اس نے بعد کے کئی ماہ تک شانی اور ساتھیوں کی تلاش چپکے چپکے جاری رکھی اور پھر کس طرح وہ خوست کے ایک وزیرستانی راہ زن کو قتل کرنے کے بعد ایک جنگلی گروپ کا حصہ بن گیا۔ دریائے کرم کے ساتھ کوہ سفید کی ویران گھاٹیوں میں ایک ''دارلارڈ'' کے ساتھ اپنی آوارہ گردی کے بارے میں بھی رستم نے سب کچھ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کیسے وہ مخالف گروپ کے ہاتھوں قید ہو کر پورا ایک سال قید میں پڑا رہا ہے۔ قید کے دوران میں ہی اسے اپنے ایک ساتھی سے معلوم ہو گیا تھا کہ دو پاکستانی اپنی دو عورتوں کے ساتھ اس ''بورکی'' نامی بستی میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پاکستانی تھوڑی بہت ڈاکٹری بھی جانتا ہے۔ یہ اشارے رستم کے لیے کافی ثابت ہوئے تھے۔

رستم کی رُوداد ختم ہوئی تو شانی، ناصر اور جہانگیر نے خود پر بیتنے والے حالات سے آگاہ کیا۔

اور پھر ڈپٹی ریاض کا ذکر چھڑ گیا..... وہ جو سب سے برا تھا..... اور جو سب سے بازی لے گیا۔ وہ بدلا تو ایسے بدلا کہ دیکھنے والوں کی انگلیاں دانتوں میں دبی رہ گئیں۔ اس نے ایک ہی کایا پلٹ شب میں اپنی سفاکی اور بے حسی کی سارے داغ اپنے خون سے دھو دیئے۔

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

وہ جاتے جاتے ان سب کوتاہ نظروں کی آنکھیں کھول گیا جو انسان کو صرف اچھے یا صرف برے روپ میں دیکھتے ہیں..... اور جس کو برے روپ میں دیکھتے ہیں اس کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔

فضا جب زیادہ گمبھیر ہونے لگی تو رستم نے مُنے کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سب کے لیے ایک تحفہ بھی لایا ہوں اپنے ساتھ!''

''کیا ہے؟'' شانی نے پوچھا۔

''میرا ایک ساتھی جو میرے ساتھ ہی رہا ہوا ہے۔ پتا ہے وہ کون ہے؟''

''کون؟'' شانی اور زری نے ایک ساتھ پوچھا۔

''اجمل خان!''

''اجمل؟ کس اجمل کی بات کر رہے ہیں؟'' ناصر نے کہا۔ وہ سب حیرت سے رستم کو

دیکھنے لگے۔

''اجمل خان جو شاید ایک نئے روپ میں ہمارے پاس آ گیا ہے۔ یہ قندھار کا رہنے والا ہے۔ اس کا قد اجمل سے تھوڑا چھوٹا ہے لیکن اجمل ہی کی طرح ہنس مکھ اور رول والا ہے۔ اس کا پورا نام اجمل خان اچکزئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آئے گا۔ اس کے سامنے تم مجھے جلال کے نام سے پکارو گے۔ اسے یہی نام معلوم ہے۔''

ابھی اجمل خان اچکزئی کی بات ہو ہی رہی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہو گئی۔ ناصر اٹھا اور پھر تھوڑی دیر بعد اجمل خان ان کے درمیان تھا۔ اس کے کندھے پر وزنی رائفل اور گولیوں والی دو بیلٹس تھیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ان سب میں گھل مل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد یوں لگنے لگا کہ وہ سب اسے عرصے سے جانتے ہیں۔ اس کے چہرے اور گردن پر زخموں کے نشان اس کی جنگجو طبع کے غماز تھے۔ وہ رستم کو بے تکلفی سے جلال اور جلالم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شانی کو بھی بڑے خلوص سے بہن جی کہنے لگا۔ گرم قہوے کی بڑی سی چسکی لیتے ہوئے اس نے کہا۔ ''بھائیو! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوا۔ آپ کو بھی ہوا ہو گا۔ ام چاہتا ہے، یہ خوشی برقرار رہے۔ اس لیے اپنے بارے میں ام آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔''

''آپ کہیں جی۔'' ناصر نے کہا۔

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''برادر! ام دل کا برا نہیں۔ پر ام کو غصہ بہت زیادہ آتا ہے اور جب آتا ہے، ام بہت سخت دل ہو جاتا ہے۔ ایک دم پتھر کے ماپق (مافق)۔ مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے۔ اپنی اس خامی پر ام خود بھی بہت شرمندہ ہے۔''

رستم نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ ایک محبت بھری نظر اپنے سوتے ہوئے دو ڈھائی سالہ بچے پر ڈالی پھر کن انکھیوں سے شانی کو دیکھا۔ شانی کا آدھا چہرہ اوڑھنی کے پیچھے تھا اور باقی آدھے پر انگیٹھی کی روشنی رنگ بکھیر رہی تھی۔ وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''اجمل! تمہاری اس سخت دلی کا علاج ہمارے پاس ایک دیوی ہے..... جس کا جادو سخت سے سخت لوہے کو موم کر دیتا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کون سا دیوی؟''

''دیوی یعنی دیوی!''

''ام اب بھی نہیں سمجھا جلالم؟''

''تم دیویوں کے بارے میں نہیں جانتے؟'' اجمل خان نے معصوم انداز میں نفی میں جواب دیا۔ رستم نے لڑکی سے باہر دور کوہ سفید کی تاریک چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اجمل خان! دیویاں وہ نرم و نازک عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے سینے میں بے حد مضبوط دل

www.pdfbooksfree.pk

رکھتی ہیں۔ ان کے حوصلے پہاڑوں سے اونچے ہیں۔ یہ بڑی نرمی اور محبت سے آہستہ آہستہ منہ زور پانیوں کے راستے بدل دیتی ہیں..... اور پانیوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ ہاں اجمل خان! یہ دیویاں کہانیوں کو نیا رنگ دے دیتی ہیں..... تاریخ کا چہرہ بدل دیتی ہیں۔''

''جلالم! تمہارا یہ باتیں بالکل اماری سمجھ میں نہیں آرہا۔'' اجمل خان نے سر کھجایا۔

رستم گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم نے پنجاب کے ایک بڑے سخت پولیس افسر ریاض ہٹلر کا نام سنا ہے نا؟''

''بالکل..... جب ام راولپنڈی میں تھا، ام نے سنا تھا لیکن آپ اس کو کیوں یاد کر رہا ہے؟''

''اس پولیس افسر کو بھی ایک دیوی کے جادو نے لوہے سے موم کر دیا تھا..... سوچو اجمل خان! اگر ایسا سخت شخص موم ہو سکتا ہے تو تم تو کوئی چیز نہیں ہو.....'' رستم کا لہجہ جذباتی تھا اور تحسین آمیز بھی۔

''آپ کا بات اب بھی اماری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید ام نے زیادہ نسوار رکھا لیا ہے۔''

ناصر اور جہانگیر خاموشی سے سن رہے تھے..... اور سمجھ بھی رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہانگیر، ناصر اور زری سونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اجمل خان اچکزئی بھی اٹھ گیا..... وہ اپنے جیل کے ساتھی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔

''جلالم! ام جانتا ہے، تم بڑے لمبے عرصے بعد اپنے بچے اور اپنی بیوی صاحبہ سے ملا ہے۔ رات بہت ہو گیا ہے۔ ام زیادہ دیر تمہارے اور بیوی صاحبہ کے درمیان روڑا بننا نہیں چاہتا۔''

ناصر، زری اور جہانگیر بھی چلے گئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اپنی دیوی کو دیکھتا رہا۔ انگیٹھی میں آگ سلگ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر برفیلی چوٹیوں اور تاریک نشیب و فراز پر سرد ہواؤں کے قافلے اُتر رہے تھے..... یہ شروعات تھی ایک نئی کہانی کی.....!

☆=======ختم شد=======☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

www.pdfbooksfree.pk

عین۔شین۔قاف

محمد ریاض ماہی

- عشق و محبت کے اس سوداگر کی کہانی۔ جس نے عشق نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی..... مگر اس کی ضد اور انا عشق کے پہلے حرف ''عین'' کی اسیر بن گئی۔
- شرابی اور آوارہ مزاج احمد سبحانی جب عاشق بنا تو ''عین'' نے اس کو روح کی گہرائی تڑپا دینے والا تاوان دینے پر مجبور کر دیا۔ شیطان ملعون کے کاری وار ''عین'' کی سرخروئی کی راہ میں دیوار تھے۔
- اس عاشق کا قصہ جس کا دعویٰ تھا کہ اس کا عشق ''شین'' سے شک نہیں بلکہ ''شین'' سے شہادت پر مبنی ہے۔ وہ خاندان سے بغاوت کر کے شہر محمد ﷺ کا مسافر بنا تو طوفان نے اس کا راستہ روک لیا۔ کیا اس نے عشق کی سربلندی کے لیے جان کی بازی لگا کر عشق کا دوسرا حرف ''شین'' سرخرو کر دیا؟
- سادات گھرانے کی وکالت عشق کے خلاف دلیل بن گئی جبکہ مدعیہ ایک طوائف تھی۔ گندگی اور کیچڑ میں لتھڑی ہوئی طوائف نے ''قاف'' کو اپنا پیرہن بنا لیا۔
- وہ عشق کے قاف کی ایسی اسیر بنی کہ دنیاوی عذابوں نے اس کی زندگی اجیرن بنا دی۔ اس نے ''قاف'' کو کس طرح خراج پیش کیا؟
- محبت و عقیدت میں ڈوبے ہوئے الفاظ عشق کی رعنائیوں سے لبریز سطریں عبادت گزار فقرے بہترین اسلوب عشق الٰہی اور محبوبِ الٰہی کے عشق میں جانوں کے نذرانے تحفتاً پیش کرنے والوں کی کہانی۔
- عین۔شین۔قاف کی سچی اور سُچی تشریح۔ حرفی ''عشق'' کی حشر سامانیاں۔
- عشق حقیقی پر اب تک لکھی جانے والی کتب کو فراموش کرا دینے والی شاندار تحریر۔

ناشر
علی صبا پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اُردو بازار لاہور 7247414

علی بکسٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور